۲

زادراہ

پیغمبر اسلامؐ کی نصیحتیں

جناب ابوذرؓ سے

دوسری جلد

تالیف: آیت اللہ محمد تقی مصباح یزدی

مترجم: سید قلبی حسین رضوی

مجمع جہانی اہل بیتؑ




بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا رحم کرنے والا مہربان ہے"

قال رسول اللہ ﷺ: "انی تارک فیکم الثقلین، کتاب اللہ، وعترتی اهل بیتی ما ان تمسکتم بهما لن تضلّوا ابدا و انهما لن یفترقا حتّیٰ یردا علیّ الحوض".

حضرت رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: "میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں: (ایک) کتاب خدا اور (دوسری) میری عترت اہل بیت (علیہم السلام)، اگر تم انھیں اختیار کئے رہو تو کبھی گمراہ نہ ہوگے، یہ دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں"۔

(صحیح مسلم: ۷/۱۲۲، سنن دارمی: ۲/۴۳۲، مسند احمد: ج ۳، ۱۴، ۱۷، ۲۶، ۴/۵۹، ۳۶۶ و ۳۷۱، ۵/۱۸۲ اور ۱۸۹، مستدرک حاکم: ۳/۱۰۹، ۱۴۸، ۵۳۳ وغیرہ۔)

زاده راه

خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران کراچی
شمارہ دیوی:
شمارہ ثبت:
تاریخ ثبت:

زادراہ

پیغمبر اسلامؐ کی نصیحتیں

جناب ابوذرؓ سے

خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران کراچی
شمارہ دیوی: ۲۹۷/۳۱۸
شمارہ ثبت: ۱۰۱۷۶
تاریخ ثبت: ۱۳۸۲/۱۱/۲۲

دوسری جلد

تالیف: آیت اللہ محمد تقی مصباح یزدی

مترجم: سید قلبی حسین رضوی

مجمع جہانی اہل بیتؑ

سرشناسه : مصباح، محمدتقی، ۱۳۱۳ -
عنوان قراردادی : رتوشه. اردو
عنوان و پدیدآور : زاد راه: پیغمبر اسلام کی نصیحتین جناب ابو ذر رض سی / تالیف محمدتقی مصباح یزدی؛ مترجم قلبی‌حسین رضوی؛ تهیه‌کننده اداره ترجمه [مجمع جهانی اهل بیت (ع)].
مشخصات نشر : قم: مجمع جهانی اهل البیت(ع)، ۱۳۸۵.
مشخصات ظاهری : ۲ ج.
شابک : (ج. ۱) 964-529-149-6 (۲. ج) 964-529-121-6
وضعیت فهرست نویسی : فیپا
یادداشت کلی : اردو
عنوان دیگر : پیغمبر اسلام کی نصیحتین جناب ابوذر رض‌سی.
موضوع : محمد(ص)، پیامبر اسلام، ۵۳ قبل از هجرت - ۱۱ ق. --- کلمات قصار.
موضوع : ابوذر غفاری، جندب بن جناده، - ۳۲ ق.
موضوع : احادیث اخلاقی.
شناسه افزوده : مجمع جهانی اهل بیت(ع)، اداره ترجمه.
شناسه افزوده : مجمع جهانی اهل بیت(ع).
رده بندی کنگره : ۱۳۸۵ ۹۰۴۶ م۶ر/BP۱۴۲/۵
رده بندی دیویی : ۲۹۷/۲۱۸
شماره کتابخانه‌ملی : ۸۵م-۴۶۹۸۲

نام کتاب: زادراہ (دوسری جلد)
تالیف: آیت اللہ محمد تقی مصباح یزدی
ترجمہ: سید قلبی حسین رضوی
تصحیح: فیروز حیدر فیضی
نظر ثانی: مرغوب عالم عسکری
پیشکش: معاونت فرہنگی، ادارۂ ترجمہ
ناشر: مجمع جہانی اہل بیت"
طبع اول: ۱۴۲۸ھ ۲۰۰۷ء
تعداد: ۳۰۰۰
مطبع: اعتماد

ISBN:964-529-149-6
www.ahl-ul-bayt.org
info@ahl-ul-bayt.org

عرض ناشر

یقیناً اہل بیت علیہم السلام کی وہ میراث، جسے ان کے مکتب نے ذخیرہ کیا اور اس کے ماننے والوں نے برباد ہونے سے بچایا اسے ایک ایسے مکتب سے تعبیر کیا جاتا ہے جو اسلامی معارف کے تمام اصول وفروع کو حاوی ہے، لہٰذا اس مکتب کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ایسے با استعداد افراد کی تربیت کرے جو اس کے صاف وشفاف چشمہ سے کچھ گھونٹ نوش کرسکیں، اور امت اسلامیہ کو فیض پہنچانے کیلئے ایسے اکابر علماء کو پیش کرے جو اہل بیت علیہم السلام کے نقش قدم پر گامزن رہتے ہوئے تمام اعتراضات نیز مختلف مذاہب کے مسائل اور اسلام کے داخلی اور خارجی گوناگوں مکاتب خیال کا بہتر سے بہتر جواب دیتے ہوئے، صدیوں کے اعتراضات کا حل پیش کریں، چنانچہ اسی مقصد کی تکمیل کے لئے اہل بیت علیہم السلام اور ان کے ہدایت بخش مکتب کی تاسی میں مجمع جہانی اہل البیت نے بھی اپنی ذمہ داری محسوس کی اور حریم رسالت، نیز ان کے ایسے حقوق کے دفاع کرنے کیلئے پیش قدمی کی جن پر ارباب فرق و مذاہب نیز اسلام دشمن عناصر اعتراضات کی بوچھاڑ کررہے ہیں، یہ سچ ہے کہ مکتب اہل بیت ہمیشہ ہونے والے اعتراض کا جواب دیتا اور اس کی ردکرتا آرہا ہے، اس کے علاوہ یہ بھی کوشش کرتا ہے کہ دشمن کے سامنے اپنے استقلال اور ثبات قدمی کا مظاہرہ کرے اور ہر دور میں اپنی مراد کو پہنچے۔

بیشک علمائے اہل بیت علیہم السلام کی کتابوں میں موجود تجربے اپنی نوعیت میں بے نظیر اور انوکھے ہیں کیونکہ یہ ایک ایسے علمی ذخیرہ ہیں، جن کی تائید عقل و برہان کرتی ہے، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ نفسانی خواہشات سے دور رہ کر مذموم تعصب سے اجتناب کرتے ہوئے اپنے فن میں متبحر اور ماہر علماء، مفکرین اور دانشوروں کو ایسے جالب انداز اور جاذب خطاب میں فکر ونظر کی دعوت دیتا ہے، جسے عقل تسلیم اور فطرت سلیم

قبول کرتی ہے، مجمع جہانی اہل البیت علیہم السلام کی بھی یہی کوشش ہے کہ حقیقت کے طالب افراد کے لئے انھیں تالیفات اور بحثوں سے حاصل شدہ بے نیاز تجربوں کے ذریعہ ایک نئے مرحلے کا آغاز کرے، اور گزشتہ اکابر علمائے شیعہ کی تالیفات، تصنیفات اور تحقیقات کو شائع کرنے کے ساتھ ساتھ اس مکتب سے وابستہ دیگر افراد اور مستبصرین کی تالیفات، تحقیقات، نیز ان کے دیگر آثار کی بھی نشر واشاعت کرے تاکہ حق کے متلاشی افراد کیلئے یہ تالیفات اور کتابیں ایک شیریں اور خوشگوار چشمہ کے مانند بن جائیں، اور مکتب اہلبیتؑ نے جن حقائق کو بیان کیا ہے ان کا فتح باب ہو سکے، وہ بھی ایک ایسے دور میں جبکہ عقلیں کامل ہو رہی ہوں اور انسان کا ایک دوسرے سے رابطہ بڑی تیزی اور آسانی سے ہو جاتا ہو۔

محترم قارئین سے امید ہے کہ وہ ہمیں اپنے قیمتی خیالات اور گرانقدر مشوروں سے نوازتے ہوئے تعمیری نظریات اور تنقید کا اظہار کریں گے۔

جس طرح ہم ان تمام اہمیت کی حامل مراکز، علماء، مؤلفین اور مترجمین سے اسلام محمدی کی اصل تہذیب اور بنیادی ثقافت کے تحفظ کی درخواست کرتے ہیں، اسی طرح خداوند عالم کی بارگاہ میں التجاء کرتے ہیں کہ وہ ہمارے اس قلیل عمل کو قبول کرتے ہوئے اپنی خاص عنایت کے زیر سایہ اپنے خلیفہ حضرت مہدی (عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف) کی رعایت کرنے کی روز افزوں توفیق سے نوازے۔

ہم اس کتاب کے مؤلف جناب آیۃ اللہ محمد تقی مصباح یزدی اور اس کے مترجم جناب سید قلبی حسین رضوی نیز اپنے ان تمام ساتھیوں کے شکر گزار ہیں، جنھوں نے اس اثر کی تکمیل میں حصہ لیا، بالخصوص ان حضرات کے بھی مشکور ہیں جو ادارہ ترجمہ میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں۔

ثقافتی ادارہ، مجمع جہانی اہل البیت علیہم السلام

فہرست

عرض ناشر..... ۷

اکیسواں درس:..... ۱۹

تفکر کی اہمیت اور غفلت سے بچنے کے عوامل کے تحفظ کی ضرورت..... ۲۱

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تین نصیحتیں..... ۲۲

الف) تشییع جنازہ کے وقت آہستہ گفتگو کرنا..... ۲۲

ب) جنگ کے دوران آہستہ گفتگو کرنا..... ۲۶

ج) قرآن مجید کی قرائت کے دوران آہستہ گفتگو کرنا..... ۲۸

بیدار کرنے والے عوامل سے بے توجہی کا انجام..... ۳۰

کاہلی اور بیہودہ ہنسنے کی مذمت..... ۳۲

عبادت میں تفکر کا اثر..... ۳۵

بائیسواں درس:..... ۳۷

حق و باطل کی وسعت..... ۳۹

حق و باطل اور اس سے استفادہ کے مواقع..... ۳۹

حق و باطل کی ظاہری شکل وصورت.....۴۱

انسان مختار، صاحب انتخاب اور امتحان الٰہی.....۴۳

انسان اور حق و باطل کی طرف دو اندرونی کششیں.....۴۶

حسی اور دنیوی لذتوں کی طرف عمومی تمایل.....۵۰

تیئسواں درس.....۵۵

فقیہ کامل اور توحید افعالی کی اعتقادی عملی صورت.....۵۷

حضرت ابراہیمؑ اور توحید افعالی پر اعتقاد.....۵۸

غیر خدا پر اعتماد، توحید افعالی پر عدم اعتقاد کا نتیجہ.....۶۰

شیخ انصاری اور شیطان کے پھندے سے فرار.....۶۲

تواضع، عزت و سربلندی کا سبب.....۶۴

حضرت سجاد علیہ السلام اور نقص و فقر ذاتی کا ادراک.....۶۶

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام میں حقیقی ایمان کا ثمرہ ونتیجہ.....۶۹

چوبیسواں درس:.....۷۱

اعمال کے محاسبہ و موازنہ کی اہمیت اور خدائے متعال سے شرم.....۷۳

محاسبہ، ایک ناقابل اجتناب ضرورت.....۷۴

مشارطہ، مراقبہ اور محاسبہ.....۷۶

الف) مشارطہ.....۷۶

ب) مراقبہ.....۷۸

ج) محاسبہ.....۷۹

محاسبۂ نفس کا فائدہ..... ۸۰

بُرے عمل کا نتیجہ شرمندگی..... ۸۵

شرم و حیا کا مفہوم اور اس کی حد..... ۸۷

غلط رسم ورواج کے فروغ پانے کے عوامل..... ۸۹

پچیسواں درس..... ۹۵

بہشت تک پہنچنے کا راستہ اور حیاء الٰہی کے جلوے..... ۹۷

طولانی آرزوں کی مذمت اور امید سے اس کا فرق..... ۹۸

دنیا وسیلہ یا ہدف ومقصد..... ۱۰۰

غنی مطلق کی طرف توجہ غیر خدا سے بے نیازی کا سبب..... ۱۰۱

موت کی یاد اور حیائے الٰہی کے جلوے..... ۱۰۶

آراستگی اولیاء دین کی سیرت..... ۱۱۱

چھبیسواں درس:..... ۱۱۵

مخلصانہ دعا اور شائستہ عمل کا نقش اور اثر..... ۱۱۷

دعا کے مفہوم کی طرف ایک اشارہ..... ۱۱۷

دعا اور درخواست میں انسانوں کے مراتب میں فرق..... ۱۲۰

بارگاہ الٰہی میں فقر و ناتوانی کے اظہار کی اہمیت..... ۱۲۳

شائستہ اعمال کے ساتھ دعا کی ضرورت..... ۱۲۵

شائستہ اور صالح انسان کے وجود کی برکتیں..... ۱۲۹

ستائیسواں درس..... ۱۳۵

خدا وند متعال کے نزدیک مخلص بندے کی قدر و منزلت.....۱۳۷
انسان کی بلندی و برتری کا معیار.....۱۳۸
آزادی واخلاص کا اثر.....۱۴۲
اٹھائیسواں سبق:.....۱۵۱
عبادت و بندگی کی عظمت اور ان کے تکوینی اثرات.....۱۵۳
انسان کے اعمال کے بارے میں زمین کی گواہی.....۱۵۴
زمین اور بے جان موجودات کی ستائش کی کیفیت.....۱۵۴
مخلوقات کا شعور و آگاہی اور ان کا اثر قبول کرنا.....۱۵۸
انوار ائمہ اطہار علیہم السلام کی وسعت اور اس کے حدود.....۱۵۹
گواہوں اور شاہدوں کی نظروں سے اعمال کا مخفی نہ ہوتا.....۱۶۱
بندگی میں اخلاص، شادمانی اور فخر و مباہات کا سبب.....۱۶۳
اخلاص، بہترین عمل کا سبب.....۱۶۶
انتیسواں درس.....۱۶۹
انسان کی سب سے بڑی دولت بندگی و عبادت.....۱۷۱
دنیا کا انسان کے لئے طفیلی ہونا.....۱۷۱
انسان کامل کی شرافت و کرامت.....۱۷۳
بہشت، مومنین اور اہل بیت کے دوستداروں کی جگہ.....۱۷۶
صاحبان بہشت.....۱۷۷
الف: انبیاء اور پیغمبر اسلامؐ کا مقام.....۱۷۹

ب :صالحین کا مقام.....۱۸۱

ج:صدیقین کا مقام.....۱۸۱

خدا کے منتخب بندوں کے لئے عصمت کا ایک خاص درجہ.....۱۸۳

ایمان میں صداقت کی اہمیت اور اس تک پہنچنے کا راستہ.....۱۸۶

تیسواں درس.....۱۹۱

ذکر کی اہمیت ،تربیت ساز معاشرت اور انتخاب دوست کا معیار.....۱۹۳

گوشہ نشینی کے فوائد.....۱۹۴

معاشرت اور دوسروں کے ساتھ زندگی گزارنے کے فوائد.....۱۹۶

الفت و برادری' خدا کی ایک مہربانی.....۲۰۰

دوست کے انتخاب کا معیار.....۲۰۳

غافلوں کے اجتماع میں خدا کا ذکر کرنے کی عظمت.....۲۰۷

گفتگو کرنے کے بارے میں انسان کی ذمہ داری.....۲۰۸

مومن کے ساتھ کھانا کھانے کے محاسن اور فاسق کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز.....۲۱۰

اکتیسواں درس.....۲۱۵

زبان وسیلہ ہدایت یا وسیلہ گمراہی ۲۱۷

ترقی اور بالیدگی کیلئے زبان اور دیگر اعضاء و جوارح سے استفادہ کرنا.....۲۱۸

زبان سے بہرہ مند ہونے اور اس کی آفات سے بچنے کا طریقہ.....۲۲۱

مزاح اور افراطی باتوں سے پرہیز.....۲۲۴

ہدایت کے طریقوں کا یکساں نہ ہونا.....۲۲۸

بولنے اور دیگر رفتار کے ردعمل اور نتائج پر نظر.....۲۳۱

محققانہ باتوں کو نقل کرنے کی ضرورت اور افواہ پھیلانے سے پرہیز....۲۳۴

بتیسواں درس:.....۲۳۹

خدا کی عظمت و جلالت کے نمونے.....۲۴۱

پیغمبر اسلامؐ اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی ناشناختہ عظمت و منزلت.....۲۴۲

خدائے متعال کی اطاعت اور پیغمبرؐ و ائمہ اطہارؑ کی اطاعت کے درمیان رابطہ...۲۴۵

مومنوں کی عزت و احترام کی ضرورت:.....۲۴۹

الف) سن رسیدہ مسلمانوں کا احترام.....۲۵۱

ب) قرآن مجید کے حاملوں اور اس پر عمل کرنے والوں کا احترام.....۲۵۴

ج) با انصاف اور عادل حاکم کا احترام.....۲۵۸

معاشرے میں حکومت اور قانون کی ضرورت ۲۵۸

صالح اور شائستہ حاکم کے شرائط.....۲۶۰

ولی فقیہ صالح اور شائستہ ترین ۲۶۵

تینتیسواں درس.....۲۶۹

زبان کو محفوظ رکھنے کی ضرورت اور اس کے آفات کی مذمت.....۲۷۱

اعمال کا ایک دوسرے کے مقابل اثر یا احباط و تکفیر.....۲۷۲

دوسروں کی عیب جوئی کرنے کی مذمت.....۲۷۷

چاپلوسی اور بے جا ستائش کی مذمت.....۲۸۱

دوسروں کی طعنہ زنی اور زخم زبان کی مذمت..... ۲۸۶

اپنی بات پر ہٹ دھرمی کرنے کی مذمت..... ۲۸۹

چونتیسواں درس..... ۲۹۳

عبادتوں کے جلوے اور اسلام میں مسجدوں کا نقش..... ۲۹۵

عبادت کا مفہوم اور اس کی وسعت..... ۲۹۶

الف۔عبادت کے لئے ایک تقسیم بندی..... ۲۹۷

ب۔نماز' کمال بندگی اور تقربِ الٰہی..... ۳۰۰

ج۔نماز کی طرف توجہ دلانے والے عوامل اور

مقدمات کے شرعی ہونے کا فلسفہ..... ۳۰۳

مسجد' لقاء اللہ کے عاشقوں کی معراج..... ۳۰۶

مسجد کی طرف لوگوں کے توجہ دینے کا فلسفہ..... ۳۱۰

مساجد کی اہمیت کو درک کرنے کی ضرورت اور

اس میں داخل ہونے کے آداب..... ۳۱۲

مسجد میں حاضر ہونے اور اس میں عبادت کرنے کی فضیلت..... ۳۲۰

خدا کے محبوب ترین بندے..... ۳۲۴

پینتیسواں درس..... ۳۲۹

تقویٰ' زہد اور پرہیزگاری کی منزلت..... ۳۳۱

تقویٰ کا مفہوم اور خوف سے اس کا رابطہ..... ۳۳۲

تقویٰ کی اہمیت اور اس کو حاصل کرنے کے راستے..... ۳۳۴

مراتب تقویٰ پر ایک نظر.....۳۴۰

آثار تقویٰ پر ایک نظر.....۳۴۱

متقین کے حساب و کتاب کی خصوصیت اور چند دوسری خصوصیات.....۳۴۸

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بیان میں زہد و تقویٰ.....۳۵۲

چھتیسواں درس.....۳۵۹

پیغمبر اسلام کی نظر میں بردباری، تواضع اور توکل.....۳۶۱

حلم و بردباری کا بلند مرتبہ و منزلت.....۳۶۲

حلم و بردباری، اولیائے الٰہی کے لئے زینت بخش.....۳۶۷

نرمی و تواضع اور چاپلوسی اور خوشامد کے درمیان فرق.....۳۷۰

مشرکوں کے مقابلہ میں پیغمبر اسلام کا نرمی سے پیش نہ آنا.....۳۷۴

توکل کی عظمت و منزلت.....۳۸۰

توکل اور مادی و معنوی اسباب و عوامل سے استفادہ.....۳۸۳

تقویٰ اور توکل کے درمیان رابطہ.....۳۸۹

سینتیسواں درس:.....۳۹۳

تقدیرات الٰہی، پر اعتقاد اور صحیح خود باوری کا اثر.....۳۹۵

حق کے سامنے تسلیم ہو جانا، پریشانیوں کے برطرف ہونے کا سبب.....۳۹۶

قضا و قدر پر ایک نظر.....۳۹۹

یقین کی اہمیت اور اس کے مراتب.....۴۰۲

اولیائے الٰہی اور تقدیرات الٰہی پر رضایت.....۴۰۷

مقام صبر اور اس کی اہمیت پر ایک نظر..... ۴۱۴
خدا کی مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دینے کا اثر..... ۴۱۹
اڑتیسواں درس:..... ۴۲۵
خدا کی معرفت اور اس کا حکیمانہ نظام..... ۴۲۷
انسان اور اس کا خدا سے رابطہ..... ۴۲۸
مشکلات اور آسائش میں خدا کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت..... ۴۳۳
خدا سے مدد چاہنے اور اس سے درخواست کرنے کی ضرورت..... ۴۳۷
خدا کی حکیمانہ تدبیر کی معرفت اور یقین کا نتیجہ..... ۴۴۳
انسان کی معنوی بلندی اور تکامل میں مشکلات کا رول..... ۴۴۶
قناعت اور لوگوں سے بے نیازی..... ۴۴۹
انتالیسواں درس:..... ۴۵۳
خدائے متعال کی نظر میں قدر و منزلت کا معیار..... ۴۵۵
ایمان و عمل صالح اور انسان کی بلندی کا معیار..... ۴۵۶
اسلام کی نظر میں مفید اور قابل قدر مشغلے..... ۴۵۸
ثقافتی اور مذہبی پروگراموں میں اخلاص کی اہمیت..... ۴۶۴
نیت اور اندرونی رجحانات کی اہمیت..... ۴۶۶
محرک اور نیت کو صحیح و سالم بنانے کا راستہ..... ۴۶۹

اکیسواں درس

تفکر کی اہمیت اور غفلت سے بچنے کے عوامل کے تحفظ کی ضرورت

- پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تین نصیحتیں:
  - الف: تشییع جنازہ کے وقت آہستہ گفتگو کرنا
  - ب: جنگ کے دوران آہستہ گفتگو کرنا
  - ج: قرآن مجید کی قرائت کے دوران آہستہ گفتگو کرنا
- بیدار کرنے والے عوامل سے بے توجہی کا انجام
- کاہلی اور بیہودہ ہنسنے کی مذمت
- عبادت میں تفکر کا اثر

تفکر کی اہمیت اور غفلت سے بچنے کے عوامل کے تحفظ کی ضرورت

"یَا اَبَاذَرٍّ! اِخْفِضْ صَوْتَکَ عِنْدَ الْجَنَائِزِ وَ عِنْدَ الْقِتَالِ وَ عِنْدَ الْقُرآنِ.
"یَا اَبَاذَرٍّ! اِذَا تَبِعْتَ جَنَازَةً فَلْیَکُنْ عَقْلُکَ فِیْهَا مَشْغُولاً بِالتَّفَکُّرِ وَالْخُشُوعِ وَ اعْلَمْ اِنَّکَ لاَ حِقٌ بِهِ
یَا اَبَاذَرٍّ! اِعْلَمْ اَنَّ کُلَّ شَیءٍ اِذَافَسَدَ فَالْمِلْحُ دَوَاؤُه وَاِذَافَسَدَ الْمِلْحُ فَلَیسَ لَهُ دَوَاءٌ وَاعْلَمْ اَنَّ فِیکُمْ خُلْقَینِ الضِّحْکُ مِنْ غَیرِ عَجَبٍ وَالْکَسَلُ مِنْ غَیرِ سَهْوٍ یَا اَبَاذَرٍّ! رَکْعَتَانِ مُقْتَصِدَتَانِ فِی تَفَکُّرٍ خَیرٌ مِنْ قِیَامِ لَیْلَةٍ وَالْقَلْبُ سَاهٍ"

اس سے پہلے انسان میں خوف وخشیت پیدا ہونے کے اسباب وعوامل پر بحث ہوئی۔ کہا گیا کہ من جملہ عوامل کہ جو انسان میں خوف خدا پیدا کرتے ہیں، قیامت کے دن جہنم کے عذاب کے بزرگ ہونے اور بہشت کی نعمتوں کی اہمیت ووسعت پر توجہ کرنا ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیانات کے اس حصہ کا گزشتہ مطالب سے اس لحاظ سے ربط ہے کہ قلبی اور اندرونی حالات، جیسے، خوف، خشیت، شوق، امید، محبت وانس یہ سب چیزیں صرف اس صورت میں پیدا ہوسکتی ہیں کہ جب انسان توجہ دے اور اس کا دل بیدار اور آگاہ ہو، لیکن اگر انسان غافل ہے اور اس کی توجہ ضعیف ہے اس صورت میں یہ حالات یا بالکل اس کے اندر پیدا نہیں ہوں گے یا ضعیف اور کم رنگ صورت میں رونما ہوں گے۔

جب انسان غفلت یا سنگدلی اور بے رحمی میں مبتلا ہوتا ہے اور خود بہ خود ان رذائل اخلاقی کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اس کی اس پست حالت سے باہر آنے کے لئے، کچھ عوامل واسباب مدنظر رکھے گئے ہیں، ان عوامل واسباب میں سے کچھ انسان کے اندر سے جاری ہوتے ہیں اور ان میں سے کچھ خارجی ہیں، کبھی خارج میں کوئی حادثہ پیش آتا ہے، کوئی بات سننے میں آتی ہے یا ایسے شرائط پیدا ہو جاتے ہیں جو انسان کے لئے متنبہ اور بیدار ہو کر غفلت سے نجات پانے کا سبب بن جاتے ہیں۔ البتہ یہ تاثیر توفیقات الٰہی کے زمرہ میں ہے اور ان فرصتوں کی قدردانی کی جانی چاہیے اور انسان کو شکر گزار بننا چاہیے۔ تاکہ خدا کی مہربانیوں اور توفیقات میں اضافہ ہو جائے، اگر ان فرصتوں سے استفادہ نہیں کیا گیا اور قدردانی نہیں کی گئی تو انسان کی غفلت اور بے رحمی میں اضافہ ہوئے گا، اس سلسلہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"یَا اَبَاذَرٍّ: اِخْفِضْ صَوْتَکَ عِنْدَ الْجَنَائِزِ وَ عِنْدَ الْقِتَالِ وَ عِنْدَ الْقُرآنِ.

"اے ابوذر! جنازوں کے پاس، دین کے دشمنوں سے جنگ کے دوران اور تلاوت قرآن مجید کے وقت آہستہ گفتگو کرو؟

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیث کے اس حصہ میں اخلاق، تربیت اور حفاظت سے مربوط تین نصیحتیں فرماتے ہیں:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تین نصیحتیں:

الف۔ تشییع جنازہ کے وقت آہستہ گفتگو کرنا:

بہت مناسب ہے انسان آہستہ بات کرے اور بلند گفتگو نہ کرے یہ ایک شائستہ ادب ہے جس کے بارے میں حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی ہے:

﴿وَاغْضُضْ مِنْ صَوتِکَ اِنَّ اَنکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوتُ الْحَمِیرِ﴾ (لقمان/۱۹)

آہستہ گفتگو کرو اور اپنی آواز دھیمی رکھو کہ سب سے بدتر آواز گدھے کی ہوتی ہے۔

اگر چہ عادی مواقع پر آہستہ بات کرنا مطلوب ہے، لیکن بعض مواقع پر متعارف اور معمول کی حد سے بھی بہت آہستہ بات کرنی چاہیے یا خاموشی اختیار کی جانی چاہیے۔ مثال کے طور پر جب انسان کو اپنی فکر اور توجہ کو کسی امر کے لئے متمرکز کرنا ہے تو وہ دوسرے امور کو چھوڑ کر اس امر کی طرف توجہ کرتا ہے، اور یہ فطری بات ہے کہ من جملہ مواقع میں سے کہ جہاں پر انسان کو فکر واندیشہ میں غرق ہو کر عبرت حاصل کرنی

چاہیے وہ تشییع جنازہ میں شرکت کا وقت ہے، یہاں پر انسان کو توجہ رکھنی چاہیے کہ کبھی یہ موت اسکے پیچھے بھی آنے والی ہے۔

اس بنا پر دنیوی امور کے بارے میں بات کرنے سے وہ پرہیز کرتا ہے اور اس کی توجہ اس انسان کی تقدیر پر متمرکز ہوتی ہے جس کا جنازہ لوگوں کے کاندھوں پر ہوتا ہے تاکہ عبرت حاصل کرے، افسوس کہ ہم اس مطلب کی طرف توجہ نہیں کرتے، حتی تشییع جنازہ کے دوران بھی آداب کی رعایت نہیں کرتے ہیں اور عبرت حاصل کرنے کی فکر میں نہیں ہوتے ہیں، یہ اس صورت میں ہے جب کہ تاکید کی گئی ہے کہ تشییع جنازہ کے وقت خاموشی، آرام، وقار اور اطمینان سے راستہ چلو اور تمہاری توجہ صرف جنازہ کی طرف مبذول ہو، لہٰذا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"یا أَبَاذَرٍّ: اِذَا تَبِعْتَ جَنَازَةً فَلْيَكُنْ عَقْلُكَ فِيْهَا مَشْغُولاً بِالتَّفَكُّرِ وَالْخُشُوعِ وَ اعْلَمْ اِنَّكَ لاَحِقٌ بِهِ"

اے ابوذر! جنازہ کے پیچھے چلتے وقت اپنی عقل کو تفکر اور خشوع میں مشغول رکھو اور یہ جان لو! کہ تم بھی اس سے ملحق ہونے والے ہو۔

من جملہ امور جو انسان کو غفلت سے باہر لا سکتے ہیں، ایک ایسے مومن کے جنازہ کا مشاہدہ کرنا ہے کہ جس نے ایک عمر تلاش اور دنیا کی نعمتوں سے بہرہ مند اور کامیاب ہو کر وفات پائی ہے اور اس کے جنازہ کو قبرستان کی طرف لے جا رہے ہیں، یقیناً انسان کو اس غمناک منظر کا مشاہدہ غفلت سے نکالتا ہے، کیونکہ دنیا اور اس کی (دل فریب) رعنائیوں کی طرف متوجہ ہونا اور اس میں گرفتار ہو جانا غفلت کا سبب بنتے ہیں اور جو چیز انسان کو آخرت کی طرف متوجہ کرے، وہی غفلت سے بیداری اور اس سے دوری کا سبب بنتی ہے، اس لحاظ سے بیداری اور غفلت سے دور ہونے کا بہترین وسیلہ یہ ہے کہ انسان آنکھیں کھول کر دیکھے کہ ایک شخص نے ایک عرصہ تک سعی و کوشش کے بعد اپنی زندگی کو مکمل کیا ہے اور اب وہ عالم آخرت کی طرف کوچ کر رہا ہے۔ گرچہ انسان جانتا ہے کہ موت قطعی ہے اور سب مر رہے ہیں، لیکن دنیا سے رخصت ہونے والے کا مشاہدہ کرنا، اسے جاننے سے زیادہ اثر رکھتا ہے۔

ایک مومن کے تشییع جنازہ میں شرکت کی فرصت کو اپنے نفس کی اصلاح، نفسانی خواہشات سے اجتناب اور اصلاح کے لئے غنیمت جاننا چاہیے اور فکر و ہوا اس کو ادھر اُدھر، پراکندہ ہونے سے دوری اختیار

کرنی چاہیے اور صرف اپنی عافیت کے بارے میں فکر کرنی چاہیے، سوچنا چاہئے کہ یہ وہ راہ ہے جسے دیر یا جلد ہمیں بھی طے کرنا ہے، پس کیا یہ دنیا کی چند روزہ زندگی یہ اہمیت رکھتی ہے کہ ہم بے پرواہو کر اس کے لئے تلاش کریں؟ ہمیں چاہئے کہ ہم اس بارے میں غور وفکر کریں کہ، کیا ہم نے آخرت کی زندگی کے بارے میں صحیح کوشش کی ہے یا نہیں؟

موت کے بارے میں تفکر کرنا جیسا کہ روایتوں میں اس کی تاکید کی گئی ہے بااثر ترین عوامل میں سے ہے، جو شیطان سے دوری اور صحیح راستہ پر گامزن ہونے کا سبب بن سکتا ہے، انسان کو فکر کرنی چاہیے کہ شاید ایک گھنٹہ بعد زندہ نہیں رہے گا کیونکہ کوئی شخص مطمئن نہیں ہے وہ کب تک زندہ ہے، لہٰذا لمبی آرزوں کے مقابل جو غفلت اور قساوت کا سبب بنتی ہیں، موت کی طرف توجہ کرنا انسان کے لئے غفلت سے دوری اور بیداری کا سبب بنتا ہے، اور ممکن ہے یہ تفکر واندیشہ اور یہ شیوۂ عمل انسان اور اس کی تقدیر کو بدل کے رکھدے۔

یہ فطری بات ہے، جب انسان اپنے انجام کے بارے میں غور کرے گا اور اپنے آپ کو خدائے متعال کی عظمت کے سامنے مغلوب پائیگا تو اس کے دل میں ناکامی، ذلت اور خشوع کی حالت پیدا ہوگی اور اس کے آثار ظاہر میں بھی نمایاں ہوں گے چنانچہ جب مومن نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے اور اپنے مقابل میں خدا کی عظمت کو پاتا ہے، تو اس میں خضوع وخشوع پیدا ہوتا ہے، البتہ یہ ایک ایسا امر ہے جس کی تاکید کی گئی ہے اور مومن کی واضح ترین خصوصیت کے طور پر ذکر ہوئی ہے، جو اس کے لئے کامیابی کا سبب بنتی ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ﴾ (مومنون/۱۔۲)

''یقیناً صاحبان ایمان کامیاب ہوگئے جو اپنی نمازوں میں گڑگڑانے والے ہیں''

(اس کے مقابل جو خدا کی عظمت کو نہیں دیکھتے اور نماز کے مفہوم پر غور وفکر نہیں کرتے ہیں، ان میں خضوع وخشوع پیدا نہیں ہوتا ہے)

چنانچہ ہم نے کہا کی خشوع دل میں پیدا ہوتا ہے اور اس کے آثار انسان کے اعضاو جوارح سے آنکھوں میں ظاہر ہوتے ہیں، لیکن کبھی خشوع کے بارے میں بعض اعضائے بدن سے بھی نسبت دی جاتی ہے، چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْساً﴾ (طٰہٰ/۱۰۸)

''(قیامت کے دن) ساری آوازیں رحمٰن کے سامنے خاشع ہوں گی اور تم سنسناہٹ کے علاوہ کچھ نہیں سن سکو گے۔''

ایک دوسری جگہ فرماتا ہے:

﴿خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ وَ قَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سَالِمُوْنَ﴾ (قلم/۴۳)

''ان کی نگاہیں شرم سے جھکی (خاشع) ہوں گی، ذلت ان پر چھائی ہوگی اور انھیں اس سے پہلے بھی سجدوں کی دعوت دی گئی تھی جب وہ بالکل صحیح وسالم تھے۔''

جو کچھ بیان ہوا اس کی بنا پر، تشییع جنازہ میں شرکت اور اس شخص کے انجام پر توجہ کرنا جو اس دنیا سے رخصت ہوا ہے اور قیامت کے منظر پر توجہ کرنا اور اس کے حالات اپنی آگاہی کے مطابق ذہن میں تصور کرنا، خضوع، خشوع اور غفلت سے دوری کا سبب ہے، لیکن اگر انسان اس وقت بھی اسی طرح بے فکر رہے جیسے کہ کچھ بھی نہیں ہوا ہے اور صرف دنیا کی فکر اور باتوں میں مشغول ہو، تو اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

جب کوئی شخص اس دنیا سے چلا جاتا ہے تو بعض لوگ اس کی موت سے استفادہ کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں، اگر وہ پروفیسر تھا، تو اس فکر میں ہیں کہ اس کی جگہ پر گامزن ہو جائیں، اگر رئیس تھا تو خوشحال ہیں کہ اس کا عہدہ انھیں ملے گا، اگر کوئی ڈاکٹر مر گیا ہے تو دوسرے اس فکر میں ہیں کہ اس کی حیثیت وموقعیت کو حاصل کریں، افسوس اور شرم کی بات ہے! جو حادثہ انسان کے لئے قیامت اور اس کی زندگی کے انجام پر توجہ کرنے کا سبب ہونا چاہیے تھا، برعکس اسے دنیا میں غرق کر ڈالتا ہے۔ جہاں پر انسان کو عبرت حاصل کر کے بیداری کے عامل کو اپنے اندر فراہم کر کے زندگی گزارنا چاہیے تا کہ فرضیات اور اوہام سے دوری اختیار کرے، اس کے برعکس بعض لوگ غفلت اور بے رحمی سے دوچار ہونے کی وجہ سے بیشتر اوہام اور مفروضات میں پھنس جاتے ہیں نیز انھیں جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے والے مناظر نہ صرف انہیں بیدار نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کی بے رحمی اور سنگدلی میں اضافہ کرتے ہیں۔ اسی لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذر کو گوش گزار فرماتے ہیں کہ منجملہ مواقع جو انسان کے لئے خوف، خشیت، خضوع وخشوع پیدا کر سکیں، تشییع جنازہ میں شرکت کرنا ہے، اس شرط پر کہ باتوجہ ہو، اپنے ہوش وحواس کو قابو میں رکھے اور شور شرابہ سے پرہیز

کرے، صرف اپنی طرف توجہ کرے اور آہستہ آہستہ بات کرے تا کہ فکر و اندیشہ کو جاری رکھ سکے، کیونکہ بلند آواز میں بولنا حتی بات کرنا، انسان کے دل کو مشغول کر دیتا ہے اور اسے حضور قلب کی طرف توجہ کرنے سے روکتا ہے۔

ایک دن تہران میں ایک شخص نے علامہ طباطبائیؒ سے پوچھا، میں کیا کروں تا کہ نماز میں مجھے حضور قلب پیدا ہو؟ علامہ نے جواب میں فرمایا: باتیں کم کرو، شاید ہم اس پر تعجب کریں کہ باتیں کرنے سے نماز میں حضور قلب کا پیدا نہ ہونا یہ کیوں کر ہو سکتا ہے، (اتفاقاً وہ شخص باتونی تھا) یقیناً بولنے اور باتیں کرنے سے انسان کی فکری، روحی اور نفسیاتی طاقت صرف ہوتی ہے، بالخصوص اگر بولنا رسمی ہو یعنی موعظہ، تقریر و تدریس ہو، جب بعض لوگ انسان کی تقریر سنتے ہیں تو وہ احتیاط کرتے ہیں کہ کوئی غلط بات نہ کہیں، اس لحاظ سے ان کی پوری توجہ اس کی تقریر کی طرف متمرکز ہوتی ہے اور یہ چیز اسے اپنے بارے میں فکر کرنے سے روکتی ہے، اس لئے باتیں کم کرنا اور آہستہ آواز میں بولنا انسان کو اپنی طرف زیادہ توجہ کرنے کا سبب بنتا ہے، اور وہ فکر پراکندگی سے دوری اختیار کرتا ہے۔

تشییع جنازہ میں شرکت کرتے وقت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حالت کے بارے میں ایک حدیث میں آیا ہے:

"کَانَ النَّبِیُّ اِذَاتبِعَ جَنَازَۃً غَلَبَتْہُ کَآبَۃً وَاَکْثَرَ حَدِیثُ النَّفْسِ وَاَقَلَّ الْکَلَامَ"[1]

"تشییع جنازہ کے دوران پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر انتہائی غم واندوہ کا عالم طاری ہوتا تھا، آپ بیشتر غور و فکر میں ہوتے تھے اور باتیں کم کرتے تھے۔"

ب) جنگ کے دوران آہستہ گفتگو کرنا:

حملہ اور جنگ کے دوران سپاہیوں کی حالت اور عسکری اسرار کے پنہان ہونے کے پیش نظر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ کے دوران آہستہ بات کرنے کی تاکید فرماتے ہیں، جنگ میں ایسے شرائط پیش آتے ہیں، بالخصوص جنگی حکمت عملی اور جنگی علاقوں سے معلومات حاصل کرنے کی منصوبہ بندی کے وقت، جن کے پیش نظر ضروری ہو جاتا ہے کہ جنگی اسرار کی حفاظت اور دشمن کی نظر سے اپنے سپاہیوں کی

۱۔ بحار الانوار (طبع بیروت) ج ۷۸/ص ۲۶۴

پوزیشن چھپائے رکھنے پر دقت کی جائے، ممکن ہے کبھی بلند آواز میں گفتگو کرنا اور نامناسب حرکات اس امر کا سبب بن جائے کہ دشمنی حکمت عملی اور حملے کے منصوبہ سے آگاہ ہو جائے جن کے نتیجہ میں مجاہدین کی جان بھی خطرے میں پڑے اور حملے کا منصوبہ اور پلان بھی ناکام ہو جائے۔

ہمارے مجاہدین نے اس حقیقت کو آٹھ سالہ جنگ کے دوران اچھی طرح تجربہ کیا ہے: یعنی بعض اوقات پوزیشن ایسی خطرناک، نازک اور حساس ہوتی تھی کہ ان کی ایک رفتار بھی فیصلہ کن ہوتی تھی، انہیں ایسی راہ پر چلنا پڑتا تھا کہ پاؤں کے کھسکنے کی آواز بھی بلند نہیں ہونی چاہیے تھی، حقیقت میں جنگی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں دشمن کے غافلگیر ہونے کے اصول سے استفادہ کرتے تھے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس نصیحت میں ایک اور نکتہ یہ ہے کہ جنگ اور عملیات کی اہمیت وحساسیت کے تقاضا کے مطابق فوج کو عسکری اہداف کے حصول کے لئے اپنی تمام تر طاقت کو بروئے کار لانا چاہیے، اس نقطہ نظر کے مطابق خاموشی، آرام اور حواس کو متمرکز کرنے سے اپنی اندرونی اور پوشیدہ طاقت کو ہماہنگ کر کے پوری قوت و طاقت اور انتہائی صلاحیت کے ساتھ دشمن سے نبرد آزما ہو اور ایسی چیزوں سے قطعاً پرہیز کریں جو ان کی فکر اور طاقت کو جنگ وحملہ سے منصرف کرنے کا سبب ہو، اسی اہمیت کے پیش نظر حضرت علی علیہ السلام جنگ جمل میں اپنے بیٹے محمد بن حنفیہ سے عسکری نصیحت کے طور پر فرماتے ہیں:

"تزول الجبال ولا تزل عضّ على ناجذك أعر الله جمجمتك تِدْ في الارض قدمك إرْمِ ببصرك اقصى القوم وغُضّ بصرك وَاعلم ان النصر من عند الله سبحانه"[1]

پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے لیکن تم اپنی جگہ سے نہ ہلنا، اپنے جبڑوں کو مضبوطی سے دبائے رکھنا، اپنے سر کو خدا کی راہ میں عاریہ دے دینا، اپنے پیروں کو میخ کے مانند زمین میں نصب کر دینا، اپنی نظر کو دشمن کے آخری نقطہ پر متمرکز رکھنا اور دوسری جانب چشم پوشی کرنا، جان لو کہ خدا کی طرف سے کامیابی اور فتح تمہارے نصیب ہوگی۔

۱۔ نہج البلاغہ "ترجمہ فیض الاسلام" کلام ۱۱ ص ۶۲۸

ج) قرآن مجید کی قرائت کے وقت آہستہ آہستہ بات کرنا:

اگر انسان کو کبھی قرائت قرآن مجید کی محفل میں شرکت کرنے کی توفیق حاصل ہو جائے خواہ اس کا مقصد اور محرک قرآن سے استفادہ کرنا ہو یا کسی اور محرک کی وجہ سے مثلاً مجلس ترحیم پسماندگان کو تعزیت و تسلیت کہنے کیلئے قرائت قرآن مجید کی محفل میں شرکت کی ہے تو اسے اس فرصت کو غنیمت سمجھ کر آیات میں تدبر اور ان کے مفاہیم کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ حتی اگر قرآن مجید کی ملکوتی آواز ریڈیو سے نشر ہو رہی ہے تب بھی خاموشی اور آرام سے تدبر اور اندیشہ میں غرق ہو جائے، تاکہ اس ابدی معجزہ کے مفاہیم کو اپنی روح کی تعمیر اور اسے اخلاقی رذائل سے پاک کرنے اور قابل قدر عادات، جیسے خضوع و خشوع کو ایجاد کرنے میں استفادہ کرے، چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿اللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَاباً مُتَشَابِهاً مَثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ اِلَى ذِكْرِ اللّٰهِ...﴾ (زمر/۲۳)

''اللہ نے بہترین کلام اس کتاب کی شکل میں نازل کیا ہے جس کی آیتیں آپس میں ملتی جلتی ہیں اور بار بار دہرائی گئی ہیں کہ ان سے خوف خدا رکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس کے بعد ان کے جسم اور دل یاد خدا کے لئے نرم ہو جاتے ہیں۔''

قرآن مجید کی اس نہایت عمدہ تاثیر کے باوجود اگر انسان قرآن مجید کی قرائت کے دوران آیات کے مفاہیم کی طرف توجہ نہ کرے اور اس کے لئے قرآن مجید کی آواز دوسری آوازوں سے کوئی فرق نہ رکھتی ہو، تو وہ غفلت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کی بے رحمی میں اضافہ ہوتا ہے۔

قرآن مجید کی اہمیت، اس کے احترام کے تحفظ اور قدر و منزلت کے پیش نظر خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَاَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ (اعراف/۲۰۴)

''اور جب قرآن کی تلاوت کی جائے تو خاموش ہو کر غور سے سنو کہ شاید تم پر رحمت نازل ہو جائے۔''

فطری بات ہے کہ جب خدائے متعال نے قرآن مجید کو انسان کی ہدایت اور اندرونی تبدیلیوں خدا کی طرف توجہ کیلئے وسیلہ قرار دیا ہے، اب اگر وہ قرآن مجید کی آواز کی طرف متوجہ نہ ہو اور اس ملکوتی آواز اور دوسری آوازوں کے درمیان کوئی فرق نہ قرار دے اور خدا کے موعظوں اور نصیحتوں کی طرف توجہ نہ دے تو اس نے برا کام انجام دیا ہے اور کفرانِ نعمت کا مرتکب ہوا ہے کہ اس نے ایک قیمتی فرصت کو گنوا دیا ہے، بلکہ اس کی بے رحمی میں بھی اضافہ ہوا ہے، اور ہدایت کے لئے محدود چانس اور نسبی آمادگی کو بھی کھو دیا ہے۔

قرآن مجید سے بہرہ مند ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تلاوت کے دوران ہم اپنے ہوش و حواس پر کنٹرول کر کے ایسے کان لگا کر سنیں کہ گویا قرآن مجید کی ملکوتی آواز کو خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی سن رہے ہیں، اس صورت میں قرآن مجید ہم میں اثر کرے گا اور تب اس سے بہترین صورت میں ہم استفادہ کر سکتے ہیں۔

قرآن مجید کی مجلسوں، جیسے مجلس ترحیم اور فاتحہ خوانی کی مجلسوں میں قرآن مجید کی تلاوت کا سننا ایک سنّت حسنہ ہے اور اس کی فراوان تاکید کی گئی ہے، افسوس کہ ہم اس نیک سنّت کی رعایت نہیں کرتے، مجلس ترحیم اور فاتحہ خوانی کی مجلسوں میں آپس میں گفتگو کرنے میں مشغول رہتے ہیں، حتی بلند آواز میں باتیں کرتے ہیں، یقیناً جس کی توجہ اور فکر باتیں کرنے اور دوسروں کی باتیں سننے میں مشغول ہو، قرآن مجید کی طرف توجہ کرنے سے محروم رہتا ہے، اس لحاظ سے اہل سنت ہم سے آگے ہیں، وہ قرآن مجید کی تلاوت کے لئے خصوصی جلسات منعقد کرتے ہیں اور قرآن مجید کی صوت و قرائت پر شایان شان توجہ دیتے ہیں لیکن دوسری طرف بعض لوگوں کی ان مجلسوں میں شرکت، قرآن مجید کے قاریوں کی ہنرنمائی کا مشاہدہ کرنے اور ان کی تشویق کے لئے ہوتی ہے کہ بیچ بیچ میں ''اللہ اللہ'' کہہ کر ان کی ہمت افزائی اور ترغیب و تشویق کرتے ہیں۔

درحقیقت ان کی (اہل سنت) توجہ لفظ اور قرآن مجید کی ظاہری صورت کی طرف زیادہ ہوتی ہے اور قرآن مجید کے مفہوم اور نہایت عمدہ اثرات سے عبرت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ افسوس کہ ہم قرآن کی تلاوت سننے کے لئے کم جلسات منعقد کرتے ہیں، قرآن مجید کے ہمارے عمومی جلسات وہی مجالس ترحیم ہیں کہ جو مُردوں کے لئے منعقد کرتے ہیں۔ ان مجالس میں قاری قرآن پڑھتا ہے، لیکن دوسرے لوگ اپنے کام میں مشغول ہوتے ہیں یا ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں مشغول رہتے ہیں!

کبھی لاؤڈ سپیکر کی آواز کو اتنا بلند کرتے ہیں کہ ہر سننے والے کے لئے اذیت کا سبب بن جائے، اس لحاظ سے قرآن مجید کی آواز سننے کا شوق ہی نہیں رکھتے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ تمام جوانب کی رعایت کی جانی چاہئے اور لاؤڈ سپیکر کی آواز ایک ایسی حد میں تنظیم ہونی چاہئے کہ مجلس میں حاضر لوگ مستفید ہوسکیں، مجلس کے اندر اور مجلس سے باہر والے لوگوں کے لئے اذیت و آزار کا سبب نہ ہو۔

قابل توجہ امر ہے کہ یہ طرح کے مرسوم طریقے نادرست اور ناکافی ہیں: ایک وہ روش جس کو ہم نے اختیار کیا ہے یعنی قرآن مجید کی تلاوت اور اس کے جلسہ منعقد کرنے کی طرف کم توجہ دیتے ہیں، صحیح نہیں ہے اور اہل سنت کی روش بھی کہ صرف قرآن مجید کی تلاوت اور صوت ولحن کے جلسہ و پروگرام منعقد کرتے ہیں اور اس کے مفاہیم و معنی سے سروکار نہیں رکھتے ہیں یہ بھی ناکافی ہے۔ حقیقت میں چاہئے تھا قرآن مجید کے عمومی جلسات وسیع پیمانے پر منعقد ہوں اور ان جلسوں میں صوت، لحن اور قرائت قرآن کے علاوہ اس کے معنی و مفاہیم بھی بیان کئے جائیں تا کہ لوگوں میں قرآن مجید سے عبرت حاصل کرنے کی رسم پیدا ہو۔ قرآن مجید کی آیات کی انہماک کے ساتھ حزن آمیز لحن میں تلاوت کی جائے تا کہ سننے والوں کے کے دلوں میں خضوع و خشوع پیدا ہو اور ان کے لئے متنبہ اور بیدار ہونے اور ہوش میں آنے کا وسیلہ و ذریعہ قرار پائے یہ وہ نکتہ ہے جس کی طرف خود قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے:

﴿"واذاسمعوا ماانزل الی الرسول تریٰ اعینهم تفیض من الدمع...﴾

(مائدہ/۸۳)

''اور جب اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھوں سے بیساختہ آنسو جاری ہو جاتے ہیں.....''

بیدار کرنے والے عوامل سے بے توجہی کا انجام:

حدیث کو جاری رکھتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"یَا اَبَاذَرٍّ: اِعْلَمْ اِنَّ کُلَّ شَیءٍ اِذَافَسَدَ فَالْمِلْحُ دَوَاؤُہ وَاِذَافَسَدَ الْمِلْحُ فَلَیسَ لَهُ دَوَاء"

''اے ابوذر! جان لو ہر چیز کو سڑنے سے بچانے کے لئے نمک دوا ہے، لیکن اگر نمک سڑ جائے تو اس کے لئے کوئی چیز دوا نہیں ہے۔''

شاید اس جملہ کا ربط گزشتہ مطالب سے اس لحاظ سے ہے کہ ہماری ساری مشکلات، غفلت، دنیا پرستی اور مادیات کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے ہیں، اور یہی چیزیں ہمارے دل کو فاسد کرنے کا سبب بنتی ہیں۔ اب ان بیماریوں کو اور مشکلات کے علاج و معالجہ کے لئے بعض اسباب و عوامل موجود ہیں جو انسان کی بیداری اور اس کے انجام پر متوجہ ہونے کا سبب ہیں۔ ان عوامل میں سے ایک تشییع جنازہ میں شرکت اور موت پر توجہ کرنا ہے۔ جب انسان فکر کرتا ہے کہ سفر آخرت پر نکلے ہوئے ایک شخص کے جنازہ کو اپنے ہاتھوں پر لے جا رہا ہوتا ہے، تو وہ اپنی موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے مجسم ہوتے ہوئے دیکھتا ہے اور فکر و اندیشہ میں غرق ہو جاتا ہے۔ یہ اندرونی تبدیلی اس کے لئے شرم و پشیمانی کا موجب بن کر اس میں خدا کے مقابل خضوع و خشوع کی حالت پیدا کرنے کا بھی سبب بنتی ہے۔ پھر وہ اس وقت اپنے انجام کے بارے میں خوف محسوس کرتا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام دوسروں کی موت سے عبرت حاصل کرنے کے بارے میں ابا صالح نامی اپنے ایک صحابی سے فرماتے ہیں:

"اذا انت حملت جنازة فكن كانك انت المحمول و كانك سالت ربك الرجوع الى الدنيا ففعل' فانظرما ذاتستانف. ثم قال:عجب لقوم حبس اولهم عن آخرهم' ثم نودى فيهم الرحيل وهم يلعبون"[1]

جب کسی کے جنازہ کو اپنے کندھوں پر لے جا رہے ہو، تو تصور کرو کہ تمہیں لے جایا جا رہا ہے اور تم اپنے پروردگار سے درخواست کر رہے ہو کہ وہ تمہیں دوبارہ دنیا میں بھیجدے، لہٰذا اگر اس نے مہلت دے دی ہے تو غور کرو کہ اب اپنی زندگی کو دوبارہ کیسے شروع کرو گے۔ اس کے بعد فرمایا: تعجب ہے ان لوگوں کے بارے میں جن کی پہلی نسلیں بعد والی نسلوں کو دیکھنے سے محروم ہیں (موت ان کے درمیان جدائی ڈالتی ہے) اور ان کے درمیان راحت اور موت کے لئے آہ و فریاد بلند ہوتی رہتی ہے، لیکن وہ بدستور جیسے کھیلنے میں سرگرم ہیں۔

مذکورہ مطالب کے پیش نظر، جو عامل نمک کے مانند انسان کے دل کو فاسد ہونے سے بچا سکتا ہے اور معنوی بیماریوں کی دوا ہے، اگر خود فاسد ہو جائے تو کونسی چیز اس کے فاسد ہونے کا علاج کر سکتی ہے؟!

۱۔ اصول کافی ج ۳/ص ۲۵۸/

تشییع جنازہ میں شرکت کرنا جو انسان کے لئے غور وفکر کا ذریعہ نیز موت کو یاد کرنے کا سبب ہے نیز اس چیز کا باعث ہے انسان دنیا اور اپنے آئندہ کے بارے میں غور کرے یا جنازہ کے ساتھ چلتے وقت نہ صرف یہ کہ عبرت حاصل نہ کرے بلکہ انتہائی بے شرمی سے دوسروں کی غیبت کرنے لگے تو وہ خود فاسد شدہ نمک کے مانند فاسد ہوتا ہے اور اس کے بعد انسان قساوت وشقاوت قلب میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کے اندر تبدیلی پیدا کرنے والے عوامل غیر موثر ہوتے ہیں اور ایسی صورت میں کوئی دوا اس کی اندرونی بیماریوں کا علاج نہیں کرسکتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرائت قرآن مجید انسان کی معنوی بیماریوں کے لئے شفا بخش ہے چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿يَأَيُّهَا النَّاسُ قَدْجَاءَتْكُمْ مَوعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَ شِفَاءٌ لِمَافِي الصُّدُورِ وَهُدىً وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ﴾ (یونس/۵۷)

''اے لوگو! تمہارے پاس پروردگار کی طرف سے نصیحت اور دلوں کی شفا کا سامان اور ہدایت اور صاحبان ایمان کے لئے رحمت (قرآن) آچکا ہے''

اب جو قرآن مجید شفا بخش ہے اور اس کے مفاہیم کی طرف توجہ کرنا، گراں بہا حقائق کو انسان کے اختیار میں دیتا ہے، اگر وہ خود دنیا اور کسب شہرت کے لئے وسیلہ قرار پائے تو نہ صرف اس کی قرائت شفا بخش نہیں ہے بلکہ بذات خود وہ بھی ہماری نفسیاتی بیماریوں میں اضافہ کرتا ہے اور دنیا کی طرف بیشتر توجہ کرنے اور خدا اور حقیقت قرآن سے دوری کا سبب بن جاتا ہے۔

کاہلی اور بیہودہ ہنسنے کی مذمت:

بیہودہ ہنسنے اور کاہلی کی مذمت کے سلسلے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''اعلم ان فیکم خُلقَین الضحک من غیر عجب والکسل من غیر سھو''

''جان لو! تم میں دو ناپسند صفتیں ہیں: ان میں سے ایک قابل تعجب ہنسی (بلا وجہ ہنسنا) اور دوسرے عمداً تساہلی جو سہو اونسیانا نہ ہو۔''

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مومنین کو گوشزد کررہے ہیں کہ ان میں دو ناپسند صفتیں موجود

ہیں کہ جو بیشتر غفلت اور خوف وخشیت کے کم رنگ اور ضعیف ہونے کا سبب ہے۔ مومنوں کو ان دو ناپسند صفتوں کا علاج کرنا چاہئے۔ ان دو صفتوں میں سے ایک بے جا ہنسنا ہے۔ بسا اوقات انسان تعجب خیز اور خندہ دار مطالب سے دوچار ہوتا ہے، اس صورت میں طبعی طور پر اسے ہنسی آجاتی ہے۔ اگر چہ خدا کو یاد رکھنے والے افراد خندہ آور مناظر کو دیکھ کر ہونٹوں پر صرف تبسم ظاہر کرتے ہیں اور قہقہہ لگا کر نہیں ہنستے۔ بعض بزرگوں کے سامنے جب کوئی خندہ آور داستان (لطیفہ) نقل کی جاتی تھی یا کسی تعجب آور روداد سے روبرو ہوتے تھے وہ تبسم کرتے تھے، لیکن ان کی توجہ کہیں اور ہوتی تھی اور روئداد کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کرتے تھے لہٰذا اس روداد کا خاص اثر ان پر ظاہر نہیں ہوتا تھا۔

امام جعفر صادق علیہ اسلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"ان من الجهل الضحک من غیر عجب قال و کان یقول لاتبدین عن واضحة وقدعملت الاعمال الفاضحة ولا یا من البیات من عمل السیات" [1]

"بلا وجہ ہنسنا نادانی ہے، نیز حضرتؑ نے اضافہ فرمایا: ایسے نہ ہنسا کرو کہ تمہارے دانت دکھائی دینے لگیں (خدانخواستہ) رسوا کن کردار کے مرتکب ہو جاؤ۔ اور جو برے کام انجام دیتے ہیں وہ رات کی بلاؤں سے آسودہ نہیں ہیں"

اس حدیث میں حضرت امام صادق علیہ السلام واضح طور پر فرماتے ہیں: ایسا شخص اپنے بُرے اعمال کے نتیجہ میں، تاریک مستقبل اور خطرناک انجام کا منتظر ہے ہر لحہ ممکن ہے اس پر کوئی بلا نازل ہو جائے، اس کا قہقہہ اور مستی میں ہنسنا بے جا ہے، ایسا ہنسنا کسی ایسے شخص کے لئے بجا ہے جو اپنے آئندہ سے مطمئن ہو اور اپنے انجام سے پریشان وفکرمند نہ ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء اور اولیائے الٰہی بھی ایسی حالت اور ایسا اطمینان نہیں رکھتے تھے وہ صرف خدا کے فضل پر توکل رکھتے تھے۔

دل پر زیادہ ہنسنے کے اثرات کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"کثرة الضحک تُمیت القلب وقال کثرة الضحک تُمیت الدین کما یمیث الماء الملح" [2]

۱و۲۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۶۶۴ (کتاب العشرہ)

''زیادہ ہنسنا دل کو مردہ بنا دیتا ہے، مزید فرمایا: زیادہ ہنسنا دین کو گھلا دیتا ہے چنانچہ پانی نمک کو گھلا دیتا ہے''

اس بنا پر بے جا ہنسنے سے کہ جس کے لئے کوئی عقلی دلیل نہ ہو پرہیز کرنا چاہئے۔ انسان کو اپنا منہ، زبان آنکھ، کان کنٹرول میں رکھنا چاہئے۔ اگر انسان ہنسنا چاہتا ہے، اسے دیکھنا چاہئے کہ ہنسنے کے لئے کوئی دلیل بھی موجود ہے یا نہیں، کیا کوئی ایسی بات جو ہنسے کی موجب ہے پیش آئی ہے، یا یہ کہ ہر بہانہ سے ہنستا ہے۔

قابل ذکر بات ہے کہ خوش روئی، ہمیشہ ہونٹوں پر تبسم کا ہونا ہے ایک مطلوب اور قابل قدر خصوصیت ہے۔ اجتماعی آداب میں سے یہ ہے کہ مومنین کو اجتماعات میں اور ایک دوسرے سے ملتے وقت تبسم ہونا چاہئے۔ اگر چہ ان کے دلغم واندوہ اور خوف وخشیت سے بھرے ہوں۔ تا کہ دوسروں سے ملتے وقت وہ ان کی رنجش اور ناراضگی کا سبب نہ بنیں چنانچہ ایک روایت میں آیا ہے:

''المؤمن بُشرهُ فی وجهه وحزنه فی قلبه'' [1]

''مؤمن کا چہرہ بشاش ہوتا ہے اور وہ غم کو دل میں پنہاں رکھتا ہے''

یہ پرکشش تبسم اور مسکراہٹ اس قہقہہ اور ٹھٹھے لگانے کے علاوہ ہے جو مومن کی شان کے مناسب نہیں ہے بامقصد مومن قیامت کا معتقد اور خداشناس ہوتا ہے، وہ اعمال وحرکات سے بے خبر نہیں رہتا ہے اور نفسانی خواہشات کے مطابق حرکت نہیں کرتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امت کی جو دوسری ناپسند خصوصیت کے بارے میں ذکر فرماتے ہیں، وہ کاہلی اور سستی ہے۔ کبھی انسان غفلت اور فراموشی کی وجہ سے کسی فریضہ کو انجام نہیں دیتا ہے، مثال کے طور پر کسی عبادت کو انجام دینا بھول جاتا ہے، اس صورت میں وہ گناہ کا مرتکب نہیں ہوا ہے۔ لیکن بعض اوقات توجہ دینے کے لحاظ سے فریضہ کے بارے میں سستی سے کام لیتا ہے، یہ خصوصیت ایک مومن کے لئے شائستہ نہیں ہے۔ مومن سے یہ توقع نہیں ہے کہ توجہ کے لحاظ سے فرائض کے بارے میں کوتاہی کرے۔ نماز کے وقت اور اذان کی آواز سننے سے کوتاہی کرے اور نماز جماعت میں شرکت نہ کرے، یہ بے توجہی مومن کے لئے مناسب نہیں ہے۔ اس میں فرق نہیں ہے اس کی یہ سستی اور کاہلی واجب فرائض کے

۱۔ بحار الانوار ج ۶۷ ص ۳۰۵

بارے میں ہو یا امر مستحب کے بارے میں۔

علمائے یزد میں سے ایک شخص بنام مرحوم الحاج شیخ غلام رضا یزدیؒ ایک بڑے سنجیدہ شخص تھے۔ ایک دن میں ان کے ساتھ مسجد میں داخل ہوا، جب انہوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ امام جماعت کے انتظار میں بیٹھے ہیں اور نافلہ نہیں پڑھ رہے ہیں، ناراض ہو کر فرمایا: ''شیطان پر لعنت ہو، ڈرتے ہو کہ تمہیں بہشت میں لے جائیں گے! اٹھو اور نماز نافلہ پڑھو۔ جب انسان واجب نماز سے پہلے مسجد میں موجود ہو تو بہت مناسب ہے کہ نافلہ نماز پڑھنے میں مشغول ہو جائے اور مومن کے لئے مناسب نہیں ہے کہ اس اہم امر کے بارے میں بے توجہی کرے۔ یہ مطلب تمام امور کے بارے میں بھی صادق آتا ہے۔ کبھی بیماری یا دوسری کسی مشکل کی وجہ سے انسان مطالعہ نہیں کر سکتا ہے، لیکن کبھی کاہلی سستی اور آرام طلبی کی وجہ سے مطالعہ اور تحقیق سے ہاتھ کھینچتا ہے۔ بنیادی طور پر کاہلی اور آرام طلبی ایک بڑی آفت ہے جو انسان کی بالیدگی اور ترقی میں رکاوٹ بنتی ہے، ہمیں اسے اپنے سے جدا کرنا چاہئے۔

عبادت میں تفکر کا اثر:

حدیث کو جاری رکھتے ہوئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''یا اباذر: رکعتان مقتصدتان فی تفکر خیر من قیام لیلة و القلب ساہٍ''

''اے ابوذر! دو رکعت نماز معمولی اگر تفکر کے ساتھ پڑھی جائے تو وہ غفلت کے عالم میں ایک رات عبادت میں بسر کرنے سے بہتر ہے۔''

تفکر اور غور و خوض کی اہمیت کے پیش نظر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ فرماتے ہیں کہ دو رکعت نماز جو معمولی صورت میں پڑھی جائے۔ نہ یہ کہ طولانی ہو۔ لیکن تفکر کے ساتھ ہو، انسان کے کمال کے لئے اس کا ثواب اور تاثیر اس سے زیادہ ہے کہ انسان پوری رات صبح تک حضور قلب کے بغیر عبادت میں گزارے۔ البتہ اگر انسان بڑی تیزی اور عجلت مین نماز پڑھے، تو بیشک اپنے فریضہ کو درک نہیں کر سکتا ہے اور بہتر صورت میں نماز کو ادا نہیں کر سکتا ہے۔ چنانچہ روایتوں سے استفادہ ہوتا ہے کہ، تیزی کے ساتھ پڑھی جانے والی نماز اگر تأمل کے ساتھ نہ ہو اور انسان کو اس میں تفکر و توجہ کا امکان نہ ہو تو اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسی کوا اپنی چونچ کو زمین پر مارتا ہے۔ یعنی یہ نماز تعمیری نہیں ہے، چونکہ توجہ کے بغیر انجام پاتی ہے اور اس قدر تیزی سے پڑھی جاتی ہے کہ انسان کے لئے ممکن نہیں ہوتا ہے کہ حضور الٰہی کو درک کرے اور نماز کے معنی و مفاہیم کے

بارے میں فکر کرے۔ اصل بات یہ ہے کہ دو رکعت نماز لیکن توجہ کے ساتھ بغیر توجہ کے درپے انجام دینے والی تکراری اور طولانی نماز سے بہتر ہے۔

چنانچہ مکرر کہا گیا کہ، انسان کا سفر ایک علمی اور شعوری سفر ہے۔ انسان کی ترقی اور کمال اس کے و ادراک میں اضافہ کی وجہ سے ہے دوسرے الفاظ میں انسان علم و شعور کے پاؤں سے قرب الٰہی کی راہ میں قدم رکھتا ہے۔ اس کے خدا کے نزدیک ہونے کا معنی اس کا نقل مکان کرنا نہیں ہے کہ اس کا جسم ایک جگہ سے دوسری جگہ میں منتقل ہو جائے، بلکہ اس کا خدا کے نزدیک ہونا اس کے شعور و توجہ میں اضافہ ہونا اور صفات الٰہی کی عظمت کے بارے میں اس کے ادراک کی بالیدگی ہے، کہ جس قدر اس کا ادراک و شعور زیادہ ہوگا اسی قدر وہ خدا سے نزدیک و قریب ہوگا۔ یہ سفر ایک علمی سفر ہے جو زیادہ سے زیادہ معرفت کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے اور اس کا ابتدائی مرحلہ اپنے بارے میں معرفت جس کے نتیجہ میں خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے مقابل میں جس قدر انسان کی معرفت کم ہوگی اور غفلت میں گرفتار ہوگا اسی اعتبار سے وہ تکامل و ترقی اور بالیدگی سے محروم رہے گا۔

نماز ایک تکاملی و ارتقائی وسیلہ ہے اور یہ اس لئے ہے انسان خدا سے زیادہ قریب کا احساس کرے اور درک کرے کہ خدا کے نزدیک ہو رہا ہے۔ لیکن اگر یہ نماز توجہ اور مقام الٰہی کے درک کے ساتھ نہ ہو، تو نماز گزار کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ورزش میں مشغول ہوتا ہے کیونکہ وہ نماز کے مفاہیم و معنی سے بہرہ مند نہیں ہو رہا ہے۔ البتہ بغیر توجہ نماز کی یہ قسم، سونے سے بہتر ہے، کہ انسان رات کو صبح تک سوتا رہے اور نماز سے محروم رہے، یا خدانخواستہ رات بھر گناہ اور معصیت میں مشغول رہے۔ یہی کہ انسان نماز کے لئے رات کو بیدار رہے۔ بذات خود ایک شائستہ کام ہے، لیکن نماز میں توجہ اور حضور قلب ہونا چاہئے، اس صورت میں اس کی سرعت بڑھ جاتی ہے اور جلدی ہی مقصد تک پہنچتا ہے اور اسی کو قرب الٰہی کہتے ہیں

بائیسواں درس:

حق و باطل کی وسعت

- حق و باطل اور اس سے استفادہ کے مواقع
- حق و باطل کی ظاہری شکل و صورت
- انسان مختار، صاحب انتخاب اور امتحان الٰہی
- انسان اور حق و باطل کی طرف دو اندرونی کشش
- حق اور دنیوی لذتوں کی طرف عمومی تمایل

حق و باطل کی وسعت

"یا اباذر: الحق ثقیل مر والباطل خفیف حلو ورب شهوة ساعه تورث حزناً طویلا"

"اے ابوذ! حق سنگین و تلخ ہے اور باطل سہل اور شیرین۔ بسا اوقات ایک گھنٹہ کی ہوس رانی طولانی حزن و غم کا سبب ہوتی ہے۔"

حق و باطل اور اس سے استفادہ کے مواقع:

عموم مفاہیم میں سے ایک جو اسلامی لغت میں مذکور ہے اور اس کو بہت سے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے "حق و باطل" کا مفہوم ہے۔ قرآن مجید میں "حق و باطل" کا مفہوم بعض جگہوں پر معبودوں کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔ اس صورت میں کہ خدائے متعال کو معبود حقکہا جاتا ہے اور تمام دوسرے کو معبود باطل:

﴿ذلک بأن الله هو الحق وان ما یدعون من دونه هو الباطل...﴾ (حج/۶۲)

"یہ اس لئے ہے کہ خدا ہی یقیناً حق ہے اور اس کے علاوہ جس کو بھی یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سب باطل ہیں..."

بعض اوقات حق و باطل عقائد افکار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی کردار و رفتار کے لئے بھی آیا ہے۔ من جملہ مطالب، جن کے بارے میں قرآن مجید ہمیں تعلیم دیتا ہے، یہ ہے کہ یہ کائنات حق و باطل سے آمیختہ ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دنیا حق و باطل کے دو عناصر سے مرکب ہے۔ "اللہ" حق کی بنیاد ہے اور

باطل ایک امر طفیلی ہے جو حق کے سایہ میں اور اس کی آڑ میں ظہور کرتا ہے۔ قرآن مجید کی تعلیمات کے مطابق حق و باطل کی یہ آمیختگی پائدار نہیں ہے' ایک دن آئے گا جب حق باطل سے مکمل طور پر جدا ہو جائے گا اور پائیدار رہے گا اور باطل نابود ہو جائے گا:

﴿بل نقذف بالحق علی الباطل فید مغه فاذاهو زاهق﴾ (انبیاء/۱۸)

''بلکہ ہم تو حق کو باطل پر تسلط اور غلبہ دے دیں گے تا کہ وہ باطل کو نیست و نابود کر دے اور باطل تو مٹنے والا ہی ہے''

ایک دوسری جگہ پر خدائے متعال باطل کو پانی کے اوپر جھاگ سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتا ہے۔

﴿انزل من السماء ماءً فسالت اودیة بقدرها فاحتمل السیل زبداً رابیاً ومما یوقدون علیه فی النار ابتغاء حلیة اومتاع زبد مثله کذلک یضرب اللّٰه الحق والباطل فاما الزبد فیذهب جفاءً واما ماینفع الناس فیمکث فی الارض کذلک یضرب اللّٰه الامثال﴾ (رعد/۱۷)

''اس نے آسمان سے پانی برسایا تو وادیوں میں بقدر ظرف سیلاب آ گیا اور اس بہتے ہوئے پانی پر جھاگ پیدا ہو گیا اور اس دھات سے بھی جھاگ پیدا ہو گیا جسے (سونے و چاندی کے) زیورات یا کوئی دوسرا سامان بنانے کے لئے آگ پر پگھلاتے ہیں۔ اسی طرح پروردگار حق و باطل کی مثال بیان کرتا ہے کہ باطل کی مثال پانی کے اوپر اس جھاگ کی سی ہے جو خشک ہو کر فنا ہو جاتا ہے اور حق جو لوگوں کو فائدہ پہنچانے والا ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتا ہے اور خدا اس طرح مثالیں بیان کرتا ہے۔''

باطل کی جھاگ سے تشبیہ میں ایک ظریف نکتہ ہے جو جھاگ کی حقیقت کے پیش نظر واضح ہوتا ہے۔ جھاگ درحقیقت ایک حباب ہے جو پانی کی سطح پر ظاہر ہوتا ہے۔ جب انسان صابن کے جھاگ سے بھرے ایک طشت پر نظر ڈالتا ہے۔ تو اسے تیرتے ہوئے حباب نظر آتے ہیں جو اوپر نیچے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی پہلی بار اس طشت پر نظر ڈالے تو وہی جھاگ اس کی توجہ کو اپنی طرف متوجہ کرے گا اور اس جھاگ کے نیچے موجود پانی جو اس جھاگ کی پیدائش کا سرچشمہ ہے۔ سے غافل رہتا ہے۔ خیال کرتا ہے کہ حقیقت یہی

حباب ہیں جو ظاہر ہو گئے ہیں اور اوپر نیچے ہو رہے ہیں اور ان میں گونا گوں رنگ پیدا ہوتے ہیں۔ جبکہ حباب نے اپنی حقیقت کو اسی پانی سے حاصل کیا ہے اور اس کا وجود پانی کے سایہ میں ہی ہے۔

دنیا' حق و باطل کا مرکب ہے' لیکن باطل حق کے طفیل میں موجود ہے' ممکن ہے باطل حق سے زیادہ نمایاں ہو اور اس سے زیادہ چمک دمک رکھتا ہو' لیکن قانون خلقت میں حق پانی کے مانند ہے اور باطل کی حیثیت اس کے جھاگ کی سی ہے جو پائدار نہیں ہے' وہ نابود ہو جائے گا اور باقی رہنے والا حق ہے جو لوگوں کے لئے سود بخش ہے۔

باطل' جھاگ کی طرح چند لمحوں کے لئے ظہور ظاہر ہوتا ہے اور اس کے بعد حقیقت اور حق نمایاں ہو جاتا ہے۔ البتہ ان لمحات کو جب ہم اپنے معیاروں سے موازنہ کرتے ہیں' تو فکر کرتے ہیں کہ یہ لمحہ ایک سکنڈ یا ایک منٹ کا ہوگا' لیکن جو ازل و ابد پر نظر رکھتا ہے' سو سال اور ہزار سال بھی اس کے لئے ایک لمحہ سے زیادہ نہیں ہے' اس کے معیار اور ہمارے معیار میں فرق ہے۔ جس پیمانے سے ہم زمان اور اشیا کی بقا و ثبات کے بارے میں پیمائش کرتے ہیں اس کا حق کے پیمانہ سے فرق ہے۔ جو شخص حق بین نگاہ رکھتا ہے اس کے لئے زمانوں کا طول خواہ لمحوں میں یا گھنٹوں میں یا برسوں میں یا صدیوں میں ہو' کوئی اعتبار نہیں رکھتا، جو ہم دیکھتے ہیں' وہ اس سے بالاتر ایسے افق کو دیکھتا ہے جو بہت بلند اور پائدار تر ہے اور جس معیار و پیمانے سے حساب کرتا ہے' اس کی نظر میں باطل کوئی چیز نہیں ہے اور اس میں پائداری نہیں ہے۔

حق و باطل کا ظاہری شکل و صورت:

حدیث کے اس حصہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان کا مفہوم یہ ہے کہ حق سنگین اور تلخ ہے اور باطل سہل اور شیرین ہے۔ اس جملہ کی وضاحت میں کہنا چاہئے: جو مومن سعادت اخروی کی فکر میں ہے' اسے اپنے ایمان کے اقتضا کے مطابق اپنے روحی اور معنوی تکامل و ترقی کی فکر میں ہونا چاہئے اور اسے چاہئے کہ راستے کی تمام رکاوٹوں کو ہٹا دے تا کہ مقصد تک پہنچ سکے۔ فطری بات ہے کہ جو مومن اس راہ میں ابتدائی مرحلہ پر ہو' وہ توقع رکھتا ہے اس کے لئے تمام چیزیں سہل' آسان' گوارا اور شیریں ہوں۔ اس نے مشکلات اور تلخیوں کو برداشت کرنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ نہیں کیا ہے' اس لحاظ سے ممکن ہے مشکلات کے ساتھ مقابلہ میں شکست کھا کر راہ حق سے منحرف ہو جائے یا اگر اس راہ پر حسب معمولی آگے

بڑھ رہا ہے تو اس لحاظ سے فکر مند ہے کہ خیر و حق کی راہ میں کیوں یہ مشکلات اور دشواریاں پائی جاتی ہیں؟

انسان کے لئے ہمیشہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حق کیوں تلخ اور سنگین ہے اور انسان حق کی راہ میں ناقابل برداشت مشکلات سے کیوں دوچار ہوتا ہے' لیکن باطل شیریں اور آسان ہے؟ انسان کو کیوں تلخیوں کو برداشت کرنا چاہئے اور خوشیوں اور خوشگوار لمحات کو نظر انداز کرے؟ شاید یہ سوال ذہن میں پیدا ہو جائے (نعوذ باللہ) کیا خدا بخیل ہے کہ اجازت نہیں دیتا ہے تاکہ اس کے دوست دنیا کے خوشگوار لمحات اور خوشیوں سے استفادہ کریں اور ان کے لئے محنت اور دشوار کام فریضہ کے طور پر مقرر کئے جائیں؟ اس میں کونسی مشکل تھی کہ حق کو شیریں بنا دیتا تاکہ سب لوگ حق کے پیرو بن جاتے اور گمراہ نہ ہوتے؟

جب ہم ایک مومن کی زندگی کا ایک فاسق سے موازنہ کرتے ہیں' تو دیکھتے ہیں کہ ایک مومن کو زندگی میں فراوان مشکلات برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ ایک لقمہ حلال روٹی کمانے کے لئے اسے کتنی جانفشانی کرنی پڑتی ہے۔ گھریلو زندگی میں' بیوی' بچے اور ہمسایوں کے ساتھ فراوان مشکلات رکھتا ہے۔ اس کے برعکس اس کا فاسق اور لاابالی ہمسایہ یا رشتہ دار ایک اچھی اور خوشحال زندگی بسر کر رہا ہے اور کسی قسم کی مشکلات سے دوچار نہیں ہوتا۔ اس موازنہ کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ' جو خدا مومن کو دوست رکھتا ہے، جیسا کہ بہت سی روایتوں میں مومن کے ایمان کی ستائش کی گئی ہے کس طرح اسے ان مشکلات اور سختیوں سے دوچار کرتا ہے؟ اپنے معاشی وسائل کے لئے کس قدر اسے محنت کرنی پڑتی ہے۔ جب وہ شادی کرنا چاہتا ہے' کبھی اسے برسوں تک مناسب جوڑے کی تلاش میں پھرنا پڑتا ہے۔ جہاں بھی جاتا ہے لوگ بہانہ کر کے اسے بیوی نہیں دیتے، لیکن دوسرے لوگ آسانی کے ساتھ اپنی من پسند بیوی کو منتخب کرتے ہیں، یہی موازنہ مومن اور کافر معاشرے میں پایا جاتا ہے۔ جب ہم بوسنیہ ہرزگوینہ کے مسلمانوں کا ان کی ہمسائیگی میں موجود غیر مسلمان معاشرے سے موازنہ کرتے ہیں' تو اپنے آپ سے کہتے ہیں کہ اس ملت بوسنی ہرزگوین نے کونسا جرم کیا ہے کہ انہیں یہ مشکلات ظلم و بربریت برداشت کرنی پڑتی ہیں؟ کیوں ان کی ہمسائیگی میں موجود کافر آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں، اور اس مسلمان ملت کی جان' مال اور ناموس ہر لحہ پائمال کی جائے اور ظالم و جابر قوم ان پر وحشیانہ طور پر حملے کریں؟ اگر خدائے متعال مومنوں کا حامی ہے' تو ان کی کیوں مدد نہیں کرتا ہے؟

یہ سوال مختلف صورتوں میں ہمارے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے اور ہر ایک کے پاس اس کی معرفت

کے مطابق اس کا ایک جواب ہے۔ لیکن بہر حال ہم میں سے اکثر لوگوں کے لئے کچھ ابہامات پیدا ہوتے ہیں۔ شاید جن لوگوں کا ایمان زیادہ ہے، یہ کہیں جو کچھ پیش آتا ہے مصلحت خداوندی کی بنا پر ہے۔

اس قسم کے سوالات اور من جملہ اس سوال کے جواب میں کہ کیوں حق تلخ ہے اور خدائے متعال نے اسے شیریں نہیں بنایا ہے تا کہ سب اس کو قبول کر کے گمراہ نہ ہوتے اور بد بختی سے دوچار نہ ہوتے؟ یہاں پر علمی مباحث بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور ہمارا مقصد یہ ہے کہ ان مفاہیم سے عملی نتائج حاصل کریں اور مطلب کو روشن اور واضح کریں چونکہ اگر انسان پر کوئی مطلب مکمل طور پر واضح نہ ہو تو وہ اس کے دل پر مناسب اثر نہیں ڈالتا ہے اور یا شیطان وسوسہ ڈالتا ہے اور شبہات ایجاد کر کے اس کے لئے مناسب اثر پیدا ہونے میں رکاوٹ بنتا ہے، مطلب واضح ہونے اور ابہامات دور ہونے کے بعد شبہات اور شیطانی وسوسوں کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے۔

انسان صاحب اختیار، صاحب انتخاب اور امتحان الٰہی:

دنیا میں انسان کی زندگی اس اصول پر مبنی ہے کہ وہ صحیح راستہ کا خود انتخاب کرے اور اپنے اختیار سے کمال کے مراحل کو طے کرے، انسان کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اپنے تحرک اور سفر میں خود فیصلہ کرنے والا اور آزاد ہے۔ خدا نے ملائکہ جیسی مخلوقات پیدا کی ہے کہ صرف حق کی طرف متمائل ہیں اور اگر چہ ان کا کام اختیاری ہے لیکن ان کا تمایل صرف حق اور خدا کی بندگی پر متعین ہوا ہے اور باطل کی طرف تمایل نہیں رکھتے۔ ان کے لئے حق اور خدا کی عبادت شیریں اور لذت بخش ہے۔ پس خلقت کے نظام میں ان مخلوقات کے لحاظ سے جو صرف حق کی طرف تمایل رکھتے ہیں اور صرف خدا کی عبادت میں مشغول ہوتے ہیں کسی قسم کی کمی اور نقص و عیب نہیں ہے۔ لہذا خدائے متعال نے یہ ارادہ کیا کہ ایک ایسی مخلوق کو پیدا کرے جس کا مقام فرشتوں سے بالاتر ہو، اس لئے انسان کو خلق کیا، جو باطل اور نفسانی خواہشات کی طرف تمایل رکھنے کے باوجود، اختیار کے ساتھ کمال کی راہ کو طے کرے۔ خدا کے لئے گناہ کی لذت سے منہ موڑ لے تا کہ ابدی سعادت کو حاصل کرے۔ اگر اس مخلوق نے نفسانی خواہشات پر قابو پا کر سعادت کی راہ طے کی، تو وہ یقیناً فرشتوں سے بلند تر ہوگا، کیونکہ وہ دو متضاد میلانات سے روبرو ہو کر اپنے انتخاب اور آزادی سے لذتوں کو چھوڑ کر خدا کی عبادت و بندگی کی معنوت کو حاصل کرتا ہے۔

نتیجہ یہ کہ انسان اس دنیا میں اپنے سامنے دو راستے رکھتا ہے: ایک حق کا راستہ اور دوسرا باطل کا

راستہ ہے۔ البتہ توجہ رکھنی چاہئے کہ اگر انسان نے ان دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کیا تو ضروری نہیں ہے وہ مجبوراً آخر تک اس راہ پر چلے۔ گزشتہ بیان کے پیش نظر کہ انسان ایک صاحب اختیار اور آزاد مخلوق ہے قبول کرنا چاہئے کہ چونکہ اصلی راستہ کے انتخاب میں یہ اختیار و انتخاب موجود ہے' اس پر جاری رہنے میں بھی یہ اختیار و انتخاب موجود ہے۔ اس لحاظ سے انسان ہمیشہ راستہ کا رخ بدلنے کی طاقت رکھتا ہے اور ہمیشہ حق و باطل کے دو راستوں کے بارے میں مختار و آزاد ہے۔ ان دو راستوں میں سے ایک خدا کا راستہ ہے اور دوسرا شیطان کا راستہ ہے' ایک ترقی اور تکامل کا راستہ ہے اور دوسرا تنزل اور نابودی کا راستہ ہے۔

ایک اور نکتہ' جس کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے' یہ ہے کہ دنیا امتحان کی جگہ ہے اور قدرتی بات ہے کہ امتحان اس وقت ہوتا ہے جب انسان تلخیوں اور مشکلات سے دوچار ہوتا ہے اور ان پر صبر و تحمل کر کے امتحان میں پاس ہوتا ہے۔ اگر پہلے نقطہ نظر کے مطابق انسان کے لئے ترقی اور تکامل شیرین ہوتا اور باطل تنزل تلخ' تو امتحان کا مفہوم ہی نہیں رہتا' چونکہ امتحان اس لئے ہے کہ انسان اپنی خواہشات کو چھوڑ کر خدا کے لئے کام کرے اور اس صورت میں اگر پہلے نقطہ نگاہ کے مطابق حق شیرین ہوتا تو انسان اپنی دلی چاہت کے مطابق تلخ باطل کو چھوڑ کر شیرین حق کے پیچھے دوڑتا نہ کہ خدا کے لئے' اس طرح اگر ہر باطل شیرین ہوتا تو حق کے لئے کوئی حلاوت اور خوشی باقی نہ رہتی' جو خدا کے لئے باطل سے منہ موڑتا اور حق کا راستہ انتخاب کرتا' تو وہ عام خوشیوں سے محروم ہو جاتا' پس ایسا نہیں ہے کہ راہ حق میں کسی قسم کی خوشی موجود نہ ہو۔

بہر صورت حق سنگین اور تلخ ہے اور جو آگاہی کے طور پر حق کا انتخاب کرتا ہے فطری بات ہے کہ اس صورت میں وہ راہ حق کی تمام تلخیوں اور مشکلات کو دل و جان سے خریدتا ہے' البتہ تقدیر الٰہی تمام لوگوں کے لئے یکساں نہیں ہے، کیونکہ سبھی کی ظرفیت ایک جیسی نہیں ہوتی اور سب لوگ ہر قسم کی بلا و مصیبتوں کو برداشت کرنے کی ظرفیت نہیں رکھتے ہیں، اس لحاظ سے خدائے متعال نے ظرفیت کے مطابق ہر فرد کے لئے ایک خاص تقدیر عنایت کی ہے، بعض لوگوں کے لئے جوانی میں مشکلات اور دشواریاں مقدر کی ہے اور کچھ لوگوں کے لئے بڑھاپے میں کسی کو فقر میں مبتلا کرتا ہے اور کسی کو بیماری میں۔ کسی کو اپنی بیوی کے ذریعہ مشکلات میں گرفتار ہے اور دوسرے کو اپنے دوست کے ذریعہ۔ ایسا نہیں ہے کہ مومن اپنی زندگی میں کسی بھی دشواری اور مشکل سے روبرو نہ ہو' کیونکہ اس صورت میں کمال تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔ چونکہ دنیا امتحان کی جگہ ہے' مومن کو سختیاں برداشت کر کے اپنے ایمان کو تقویت بخش کر احکام الٰہی کی پابندی اور تقدیرات الٰہی پر

رضامندی ثابت کرنا ہے۔ یقیناً یہ ایک مشکل کام ہے' لیکن چونکہ وہ مومن ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس لئے اسے ان تمام سختیوں کو دل و جان سے خریدنا چاہئے۔ لیکن کافر اس قسم کا دعویٰ نہیں کرتا ہے بلکہ اس کی خدا اور حق سے دوستی نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے اس چار دن کی دنیا میں آرام سے رہے' اس کے بعد جو ہونا چاہئے ہو جائے۔ اگر وہ کوئی نیک کام بھی انجام دے' خدا اس کا اجر اسے اسی دنیا میں دیتا ہے:

﴿من کان یرید الحیوۃ الدنیا وزینتھا نوف الیھم اعمالھم فیھا وھم فیھالا یبخسون اولئک الذین لیس لھم فی الآخرۃ الا النار و حبط ما صنعوا فیھا و باطل ما کانوا یعملون﴾ (ہود/۱۵-۱۶)

''جو شخص زندگانی دنیا کا طالب ہے اور اس کی زینت ہی چاہتا ہے ہم اس کے اعمال کا پورا پورا حساب یہیں کر دیتے ہیں اور کسی طرح کی کمی نہیں کرتے ہیں اور یہی وہ ہیں جن کے لئے آخرت میں جہنم کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور ان کے سارے اعمال جو انھوں نے دنیا میں انجام دیئے ہیں باطل و بے اثر کر دیئے جائیں گے''

اس بنا پر حق کے طالبوں کو سختیاں اور دشواریاں برداشت کرنے کے لئے آمادہ رہنا چاہئے اور جو کچھ پیش آئے اس پر راضی ہونا چاہئے' کیونکہ یہی راہ حق کے انتخاب کا تقاضا ہے۔ اگر کوئی سختیاں برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے تو وہ راہ حق کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ ترقی' معنوی تکامل اوج اور بلندیاں مشکلات کے مقابل میں صبر کے علاوہ کسی اور چیز سے حاصل نہیں ہوتے۔ حق کے تلخ اور باطل کے شیریں ہونے کا راز اس میں مضمر ہے کہ کمال کے طالب کو آزادانہ طور پر حق کا انتخاب کرنا چاہئے اور اس انتخاب کے لئے امتحان کی ضرورت ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو کسی کا امتحان نہیں لیا جاتا۔ یقیناً یہ امتحان انسان کے اعتقاد' ایمان اور حق کی طرف ان کے تمایل کی مقدار کا موازنہ کرنے کی لئے لیا جاتا ہے' اس کے علاوہ یہ امتحان اس لئے ہے کہ معلوم ہو جائے وہ کس حد تک خدا کی مرضی کو اپنی نفسانی خواہشات پر ترجیح دیتا ہے۔ لہذا فرائض سخت اور دشوار ہونا چاہئے تا کہ انسان تقویٰ کے ذریعہ خدا کی رضا اور مشکلات پر صبر و شکیبائی کی مشق سے تکامل و ترقی کی راہ کو طے کرے۔ اگر تمام فرائض راحت اور آسان ہوتے تو سب لوگ مسلمان ہوتے اور کسی کا امتیاز اور فرق معلوم نہ ہوتا۔ دشواریوں اور سختیوں سے مقابلہ کرنے اور درگزر کرنے اور خدا کی مرضی کو ترجیح دینے سے ایک انسان جناب سلمانؓ کے مانند نمایاں اور صاحب امتیاز بن جاتا ہے

اور انسانی کمال کی چوٹی تک پہنچنے میں دوسروں پر سبقت حاصل کرتا ہے اور اس طرح کمال کے بالاترین مراحل تک پہنچتا ہے۔

یہاں پر مناسب ہے کہ ایک عظیم عارف و عالم مرحوم الٰہی قمشہ ای رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کی داستان کی طرف ایک اشارہ کیا جائے۔ جو ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ اس عظیم شخصیت اور مخلص انسان نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا ہے اور اس کے عوض کوئی اجرت نہیں لی ہے۔ جبکہ اگر وہ حق تالیف اخذ کرتے تو وہ اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے آرام و آسائش کی زندگی فراہم کر سکتے تھے۔ وہ یونیورسٹی کے پروفیسر ہونے کے باوجود کبھی رکشے پر سوار ہو کر یونیورسٹی جاتے تھے۔ وہ مشہد کے ایک سفر میں جب حرم مقدس حضرت امام رضا علیہ السلام میں داخل ہوئے' تو ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے رضایت طلب کریں۔ اسی وجہ سے انھوں نے امامؑ سے مخاطب ہو کر کہا: ''آقا: آپ رضا ہیں' میں بھی آپؑ کے گھر میں آیا ہوں' خدا سے درخواست کیجئے۔ مجھے ''مقام رضا' عنایت فرمائے!'' جب حرم سے باہر آئے راستہ میں ایک گاڑی کے حادثہ میں زخمی ہوئے اور ان کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ لوگ جمع ہوئے اور ڈرائیور کو پکڑ لیا گیا۔ لیکن انھوں نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا: اس کو نہ چھیڑنا' یہ میرے لئے امام رضا علیہ السلام کا تحفہ تھا' میں نے ان سے ''مقام رضا'' کی درخواست کی تھی وہ مجھے مل گیا۔ اگر یہ حادثہ پیش نہ آتا تو معلوم نہیں ہوتا میں ''مقام رضا'' تک پہنچا یا نہیں' مجھے ثابت کرنا چاہئے جو کچھ خدا نے چاہا ہے میں اس پر راضی ہوں اور مجھے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہے۔

انسان اور اس کی حق و باطل کی طرف دو اندرونی کشش:

انسان میں مختلف جہتوں سے دو طرح کی کشش موجود ہے' ایسا موقع فراہم ہونا چاہئے تاکہ مشخص ہو جائے کہ انسانی حق و باطل کے درمیان ان دو کششوں کے تضاد اور مقابلہ میں ان میں سے کس کی طرف زیادہ تمائل رکھتا ہے۔ کبھی وہ جس حق کے کام کو انجام دیتا ہے وہ اس کی مرضی اور خواہش سے متضاد اور مخالف نہیں ہے' اس صورت میں اس کا انجام مشکل نہیں ہے۔ مشکل وہاں ہے جب دو کششوں اور جاذبوں کے درمیان تعارض اور تضاد پیدا ہو جائے' شیطان ایک چیز کا حکم دے اور خدائے متعال اس کے خلاف' نفس ایک چیز کو چاہتا ہو اور خدا دوسری چیز کو۔ یہاں پر انسان امتحان و آزمائش سے روبرو ہوتا ہے اور کام کی قدر و منزلت مشخص ہوتی ہے۔ اس صورت میں جس قدر گناہ کا جاذبہ زیادہ ہوگا اور انسان نفسانی خواہشات سے

مقابلہ کر کے اس کی مخالفت کرے' اس کا ثواب زیادہ ہے اور نفسانی خواہشات سے اس کی وہ مخالفت اس کے معنوی تکامل و ترقی میں نمایاں اثر رکھتی ہے۔

جو جوان جبلّی جذبات و تمایلات کے باوجود اس سے متناسب گناہ سے پرہیز کرتا ہے' اس کی قدر و منزلت اس بوڑھے سے زیادہ ہے جو اس گناہ کو ترک کرتا ہے۔ اس بوڑھے کے لئے اس گناہ کو ترک کرنا مشکل نہیں ہے کیونکہ وہ اس گناہ سے زیادہ تمایل نہیں رکھتا ہے۔ اس صورت میں اس جوان کا ثواب زیادہ ہے' اس کے مقابلہ میں اگر وہ بوڑھا اس گناہ کا مرتکب ہو جائے'' تو اس کا گناہ بہت زیادہ ہے' کیونکہ وہ کسی دباؤ میں نہیں تھا اور اس گناہ کے بارے میں زیادہ تمایل بھی نہیں رکھتا تھا (بہت برا ہے ایک بوڑھا مرتکب زنا ہو جائے) اگر خدانخواستہ' ایک جوان زنا جیسے کسی گناہ کے خطرہ میں پڑنے کے باوجود اپنی جبلّی خواہشات اور شہوت پر قابو پا سکے تو وہ عروج پر پہنچتا ہے اور اس گناہ سے پرہیز کرنا اس کے کمال کو اضافہ کرتا ہے۔ کیونکہ وہ فراوان اندرونی تلاش اور خدا سے شدید لگاؤ اور بلند ایمان کی بنا پر گناہ سے پرہیز کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ پسفطری بات ہے کہ اس دنیا میں گناہ شیرین ہو اور حق تلخ' تا کہ انسان کا امتحان لیا جائے اور نتیجہ کے طور پر مشخص ہو جائے کہ کون خدائے متعال کو ترجیح دیتا ہے اور کون اپنی نفسانی خواہشات کا انتخاب کرتا ہے اور کون باطل کو پسند کرتا ہے۔

البتہ بدیہی طور پر انسان کی فضیلت اور بلندی اس میں ہے کہ اس کا تکامل وارتقا اختیاری ہو' وہ پورے اختیار و آزاری سے اپنے نفسانی خواہشات سے مبارزہ کرے اور اپنے اختیار اور خدا کی محبت اور اس کی خوشنودی کے لئے نیک کام انجام دے اور گناہوں سے پرہیز کرے۔

کہا گیا ہے کہ حق تلخ ہے اور باطل شیرین' لیکن باطل کی شیرینی اور حق کی تلخی عام لوگوں کے لئے ہے' نہ سبھی کے لئے۔ عام لوگ اپنے فطری تقاضوں کے تحت اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے درپے ہوتے ہیں اور جو فرائض ان کے لئے محدودیت ایجاد کریں' وہ ان کے لئے دشوار اور سخت ہوتے ہیں۔ اس کے مقابل میں باطل' ان کے لئے سہل اور آسان ہے' کیونکہ اس کے انجام میں کسی قسم کی محدودیت اور دشواری نہیں دیکھتے۔ انسان کے لئے بہت آسان ہے' کہ بیہودہ و لغو بات کرے' لیکن اگر صحیح بات کرنا چاہے تو اسے اپنے ایک ایک کلمہ پر غور و فکر کرنا ہوگا' ایسا نہ ہو کہ بے جا بات منہ سے نکل جائے' اور ایسا نہ ہو کہ وہ بات چغلخوری' غیبت اور تہمت شمار ہو جائے اور ایسا نہ ہو کہ اس بات کے ذریعہ کسی کا مذاق اڑایا جائے کہ جس سے

اس کو اذیت پہنچے وہ ہر پہلو سے فکر کرتا ہے کہ اس کی بات کے کیا آثار اور نتائج نکلیں گے، لیکن اگر بکواس کرنا چاہے تو اپنا منہ کھولتا ہے اور جو چاہتا ہے کہہ ڈالتا ہے۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ ''پل صراط'' بال سے زیادہ باریک اور شمشیر سے زیادہ تیز ہے' وہ اس لحاظ سے ہے کہ انسان جو قدم اٹھانا چاہے اور جس راہ پر بھی چلنا چاہے' اس کو ہوش و حواس میں رہنا چاہئے کہ یہ راستہ کہاں پر منتہی ہوتا ہے اور کونسے لوازمات کی ضرورت ہے' کیا خدائے متعال راضی ہے یا نہیں' اسے ہمیشہ اپنے ہر کام اور ہر رفتار کے سلسلے میں اپنے محرک کی فکر میں رہنا چاہئے' اس بناء پر اسے اپنی زبان کے بارے میں ہوشیار رہنا چاہئے کہ ہر بات کو نہ کہے اور اپنی آنکھوں کا خیال رکھنا چاہئے کہ ہر جگہ نگاہ نہ کرے۔ یقیناً تمام جوانب کی رعایت کرنا بہت مشکل ہے اور فرائض کی انجام دہی خون جگر پینے کے مترادف ہے۔ اس کے مقابل میں اگر انسان باطل اور اپنے نفسانی خواہشات کے مطابق عمل کرنا چاہے' تو اس کے لئے بہت آسان ہے اور وہ زندگی میں خوشی اور حلاوت کا احساس کرتا ہے۔ البتہ حق کے طالب کے لئے ساری مشکلات دنیا میں ہیں اور بہشت میں اس کے لئے کسی قسم کا رنج و الم نہیں ہے۔

﴿الذی احلنا دار المقامة من فضله لا یمسنا فیها نصب و لا یمسنا فیها لغوب﴾ (فاطر/۳۵)

''اس نے ہمیں اپنے فضل و کرم سے ایسی رہنے کی جگہ پر وارد کیا ہے جہاں نہ کوئی تھکن ہمیں چھو سکتی ہے اور نہ کوئی تکلیف ہم تک پہنچ سکتی ہے۔''

بہشت میں نہ صرف دنیا میں موجودہ سختیوں اور مشکلات کی جیسی سختیاں اور مشکلات نہیں ہیں بلکہ بہشتی بھوک کا بھی احساس نہیں کرتے' جبکہ غذا کھانے کیطرف تمایل رکھتے ہیں اور اس سے کھانے کی لذت اٹھاتے ہیں۔ انسان کی دنیوی فطری زندگی سے رنج و مشقت کا چولی دامن کا ساتھ ہے' مومن و کافر دونوں سختی و مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں:

﴿لقد خلقنا الانسان فی کبد﴾ (بلد/۴)

''ہم نے انسان کو مشقت میں رہنے والا بنایا ہے۔''

یہی دنیا کی زندگی کافر و مومن دونوں کے لئے ہے' اہل حق اور اہل باطل میں فرق ہے' اہل باطل نسبی آرام و آسائش کے مالک ہیں اور زندگی سے شیرینی کا احساس کرتے ہیں' لیکن اس کے مقابلہ میں اہل

حق کے لئے زندگی تلخ ہے۔ البتہ ایسا نہیں ہے کہ اہل حق کے لئے پوری زندگی تلخ ہو بلکہ دنیا کی تلخی ان کے لئے نسبی ہے' اولیائے الٰہی کیلئے بھی خاص لذتیں ہیں۔ وہ بھی کھانے اور سونے کی لذت سے بہرہ مند ہیں' لیکن ان کی دنیوی سختیاں اور مشکلات اہل باطل کی مشکلات سے زیادہ ہیں۔

اس کے پیش نظر کہ انسان فطرت کی آغوش میں بالیدگی اور پرورش پاتا ہے' قدرتی طور پر پہلے فطری حلاوت اور خوشیاں محسوس کرتا ہے۔ دنیوی' مادی اور حسی لذتوں کو درک کرنے کے لئے اس کا ذائقہ آمادہ تر ہوتا ہے' معنوی ذائقہ پانے میں وقت لگ جاتا ہے۔ حق کے راستہ پر اختیاری سفر کرنے والے کار خیر کی عادت' زندگی کی تلخیوں کو برداشت کرنا اور مادی لذتوں سے چشم پوشی' آہستہ آہستہ اپنے ذائقہ سے حق کی حلاوت کا مزہ چکھتے ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کے بارے میں قرآن مجید نے بھی اشارہ کیا ہے:

﴿واستعینوا بالصبر و الصلوٰة و انها لکبیرة الا علی الخاشعین﴾

(بقرہ/۴۵)

''صبر اور نماز کے ذریعہ مدد مانگو' نماز بہت مشکل کام ہے سواء ان لوگوں کے جو خشوع و خضوع والے ہیں۔''

خدائے متعال فرماتا ہے: نماز خاشعین کے علاوہ عام لوگوں کے لئے ایک سنگین بوجھ ہے۔ بعض لوگ صبح سویرے نیند سے اٹھ کر ورزش میں مشغول ہوتے ہیں اور سخت و سنگین کام انجام دیتے ہیں' لیکن اگر وہ دو رکعت نماز پڑھنا چاہیں تو سنگینی کا احساس کرتے ہیں: نماز کے لئے نیند سے نہیں اٹھتے ہیں' لیکن ورزش کے لئے نیند سے اٹھتے ہیں' ممکن ہے ایک گھنٹہ تک ورزش کریں' دوڑیں اور کوہ نوردی کریں' چونکہ ان کا ذائقہ نماز کی لذت کو درک نہیں کرتا اور ورزش کی لذت اور اس کے فائدہ کو محسوس کرتا ہے' چونکہ کہا گیا ہے کہ ورزش بدن کے لئے مفید اور نشاط بخش ہے' اس لئے لوگ اس سے لذت کا احساس کرتے ہیں۔ اس کے مقابل میں ان کا ایمان اتنا قوی نہیں ہے کہ خداوند متعال کی فرمائش کے مطابق پیغمبرؐ اور ائمہ معصوم پر ایمان لا کر اعتماد کریں۔

اہل خشوع اور خدا کو پہچاننے اور اس پر ایمان لانے والوں کے لئے صرف نماز بار گراں نہیں، بلکہ آسان بھی ہے اور وہ اس سے لذت محسوس کرتے ہیں۔ چونکہ وہ معنوی بلوغ کو پہنچے ہوئے ہیں، اس لئے نماز میں خدا سے محبت کرتے ہیں اور نماز کی حلاوت کا اس قدر احساس کرتے ہیں کہ اس سے فارغ ہونا نہیں

چاہتے ان کے لئے نماز اور خدا سے مناجات سے بالاترین کوئی لذت نہیں ہے۔ اس لحاظ سے بعض بزرگ فرماتے تھے: اگر دنیا کے بادشاہوں کو معلوم ہوتا کہ نماز میں کس قدر لذت ہے تو وہ اپنی سلطنت کو چھوڑ کر، نماز کے پیچھے پڑ جاتے! انبیاء اولیائے الٰہی اور ان کے مکتب کے تربیت یافتہ افراد کے لئے حق اس قدر شیرین اور دلچسپ ہے کہ اگر اس سے عدول کریں تو احساس کرتے ہیں کہ اپنے کسی عزیز ترین شخص کو کھو دیا ہے۔ انہوں نے راہ حق اور کار خیر انجام دینے کے بارے میں اتنا اُنس وابستگی پیدا کی ہے کہ اگر کسی نیک کام کو ترک کرتے ہیں تو احساس کرتے ہیں کہ کسی ایسی چیز کو گم کر دیا ہے جس کی یاد کو اپنے دل سے نکالنا ان کے لئے ناممکن ہے۔ جو لوگ سحر خیزی کے عادی ہیں اگر وہ کسی رات کو مناجات کے لئے نہ اٹھ سکیں، تو وہ پریشان رہتے ہیں۔

حسی اور دنیوی لذتوں کی طرف عمومی تمایل:

چونکہ اکثر لوگ دنیوی اور حسی لذتوں کی طرف میلان رکھتے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ انسان کیا کرے تا کہ تکامل و ترقی کی راہ پر گامزن ہو، اپنے اندر مادی رجحان اور حیوانی لذتوں کو پا کر ان سے چشم پوش کر کے حق کے راستہ کی طرف قدم بڑھائے؟ جواب میں کہنا چاہئے کہ لذت خواہی انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ انسان کے انجام دیئے جانے والے کاموں میں محرک وہ لذت ہے جو اسے حاصل ہوتی ہے۔ ہم وہ کام انجام دیتے ہیں جسے ہم پسند کرتے ہیں اور جس کام کو پسند نہیں کرتے، اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ باطل اور گناہ میں بھی اپنے لئے ایک لذت پاتے ہیں، لیکن ان سے چشم پوشی اور اجتناب کا راستہ یہ ہے کہ گناہ کے نتائج، انجام اور گناہ کی وجہ سے پیدا ہونے والی مشکلات کے بارے میں فکر کریں یا نیک کام کی لذتوں کے بارے میں فکر کریں۔ اگر چہ نیک کام اور حق کی سختیوں کو برداشت کرنا دشوار ہے، لیکن اگر ہم ان کی جزا خوش کرنے والے انجام کو مدِ نظر رکھیں تو ہمارے لئے وہ ساری مشکلات آسان ہو جائیں گی۔ حقیقت میں لوگ سخت اور دشوار دنیوی کام انجام دینے کے بارے میں یوں موازنہ کرتے ہیں:

جو مزدور صبح سویرے ایک محرک کی بنا پر ایک سخت کام شروع کرتا ہے اور شام تک کام کرتا رہتا ہے اور پسینہ پسینہ ہو جاتا ہے، وہ برداشت کی گئی تمام سختیوں سے لذت کا احساس کرتا ہے، کیونکہ وہ اپنے کام کے نتیجہ پر نظر رکھتا ہے۔ نانوائی جو کبھی ۵۰ درجہ گرمی میں روٹی پکاتا ہے، تمام مشکلات کو برداشت کرتا ہے، کیونکہ اجرت لیتا ہے اور اس سے اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ وہ جب اپنے کام کے نتیجہ پر غور و

فکر کرتا ہے اور یہ کہ اس اجرت سے اپنی زندگی کے بعض مشکلات کو دور کرتا ہے، یہ امر باعث بنتا ہے کہ وہ زندگی سے لذت محسوس کرے، کام کی زحمت اور محنت اس کے لئے آسان ہو جاتی ہے۔ حقیقت میں ان مشکلات کو برداشت کرنا عقلمندی ہے اور سب لوگ ایسے ہی ہیں کہ جب سختیوں کو لذتوں سے موازنہ کرتے ہیں، تو ایسے کام کو انجام دیتے ہیں جس میں زیادہ لذت ہو۔ اگر وہ اپنے کام میں زیادہ اجرت اور نفع کمائیں تو بالآخر زیادہ لذت پاتے ہیں۔ حقیقت میں جو اجر و پاداش براہ راست اپنے کام سے حاصل کرتے ہیں، اس میں کوئی لذت نہیں ہوتی ہے، بلکہ وہ لذت پانے کے لئے ایک وسیلہ ہوتا ہے، انسان پیسے کے ذریعہ اپنی زندگی کے لئے گھر اور ضروری اشیاء تہیہ کرتا ہے اور ان سے لذت پاتا ہے۔ پس عقلمند انسان کام کی سختی کو برداشت کرتا ہے تا کہ سرانجام کام کی سختی سے بہتر لذت حاصل کرے۔

عاقل انسان نشہ آور چیزوں کے استعمال اور عارضی لذت سے پرہیز کرتا ہے، کیونکہ وہ ان کے نتائج کے بارے میں سوچتا ہے، وہ جانتا ہے کہ چند لمحوں کے لئے لذت پاتا ہے اور لاش کی طرح مردہ ہو کر گر جاتا ہے، اور عمر بھر کے لئے بد بخت ہو جاتا ہے۔ اگر ہم یقین کریں کہ گناہ جس قدر بھی شیریں اور لذت بخش ہو اس کا انجام کتنا بُرا ہے۔ اگر دنیا میں ہم اسکے برے انجام سے دوچار نہ بھی ہوں مگر آخرت کی مصیبت میں گرفتار ضرور ہوں گے تو جس دلیل سے ہم نشہ آور چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں اسی دلیل کی بنیاد پر گناہ کی لذتوں کو بھی نظر انداز کریں تا کہ عذاب ابدی میں مبتلا نہ ہوں اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''ورب شهوة ساعة تورث حزناً طويلا''

چند لمحوں کی لذتیں جن کا انجام طولانی مشکلات اور مصائب، ہیں، ہمارے زمانے میں ان کے فراوان نمونے پائے جاتے ہیں۔ گزشتہ زمانے میں صرف شراب تھی جو انسان کو چند لمحوں کے لئے مست و مدہوش کرتی تھی اور اس کے بعد اس کے برے اثرات رونما ہوتے تھے، لیکن آج نشہ آور چیزوں کے انواع و اقسام میں اضافہ ہوا ہے۔ بُرا دوست انسان کو دھوکہ دیتا ہے اور ہیروئن جیسی نشہ آور چیز کی لذت بیان کر کے اسے استعمال کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ پہلی بار انسان لذت کا احساس کرتا ہے، دوبارہ اسے استعمال کرتا ہے اور سرانجام اس کا عادی بن جاتا ہے اور عمر بھر کے لئے بد بخت ہوتا ہے۔ دوسرے گناہ بھی اس طرح کے ہیں۔ اگر ہم فکر کریں کہ جن گناہوں کے ہم مرتکب ہونا چاہتے ہیں ان کا کتنا برا انجام ہے، تو ہم ان سے

پرہیز کریں گے۔ بہت سے گناہ ایسے ہیں جو آخرت کے علاوہ انسان کو اسی دنیا میں مشکلات سے دوچار کر کے رکھ دیتے ہیں۔ کبھی نامحرم پر ایک نظر ڈالنا انسان کو عمر بھر کے لئے بدبخت اور بیچارہ بنا دیتا ہے اور اس کے سبب سے ایک خاندان ویران ہو جاتا ہے، یہ اس گناہ کا دنیوی انجام ہے، اخروی گرفتاریاں اپنی جگہ پر ہیں:

﴿فاذاقهم اللّٰه الخزی فی الحیوٰة الدنیا ولعذاب الآخرة اکبرلو کانوا یعلمون﴾ (زمر/۲۶)

''پھر خدا نے انہیں حیات دنیا میں ذلت کا مزہ چکھایا اور آخرت کا عذاب تو بہر حال بہت بڑا ہے اگر انہیں معلوم ہو سکے۔''

ایک دوسری جگہ پر خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿لهم عذاب فی الحیوٰة الدنیا و لعذاب الآخرة اشق...﴾ (رعد/۳۴)

''ان کے لئے زندگانی دنیا میں بھی عذاب ہے اور آخرت کا عذاب تو اور زیادہ سخت ہے.....''

پس، ہم گناہ کی لذت کو اس کے انجام سے موازنہ کرتے ہوئے یہ کوشش کریں کہ گناہ میں آلودہ نہ ہوں، خاص کر جب تک گناہ کا جاذبہ ہم میں اثر نہ کرے اور ہم گناہ کی سرحد تک نہ پہنچیں گناہ سے پرہیز کرنا آسان ہے، چونکہ گناہ کے جاذبہ نے ہم پر اثر کیا اور ہم گناہ کی سرحد تک پہنچ گئے، تو بہت مشکل ہے کہ ہم اس کو انجام دینے سے پرہیز کریں۔ ایک بزرگ شخص خدا ان پر رحمت نازل کرے کہتے تھے: اے جوانو! خدا سے دعا کرو کہ تمہاری شہوت کی دیگ ابلنے نہ پائے، کیونکہ اس صورت میں اسے خاموش کرنا مشکل ہے، جب تک انسان شہوت یا غضب کا اسیر نہیں ہے، آرام میں ہے اور فکر کر سکتا ہے اور فیصلہ کر کے محاسبہ کر سکتا ہے، اور اس کی شہوت مشتعل ہونے تک گناہ سے اجتناب کر سکتا ہے لیکن اگر پہلے سے فیصلہ نہ کرے اور فکر نہ کرے تو شہوت اور غضب کے مشتعل ہونے پر فکر کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے، کیونکہ شہوت کے مشتعل ہونے سے عقل کا چراغ بجھ جاتا ہے۔

شیطان انسان کو منحرف کرنے کے لئے شہوت اور غضب کے علاوہ دوسری طاقتیں بھی رکھتا ہے کہ من جملہ ان کے اجتماعی عوامل ہیں سے ایک یہ کہ، سماج میں ہر شخص دوسروں کے جیسا ہونا چاہتا ہے۔ یہ ایک روحانی اور نفسیاتی عامل ہے کہ انسان کے بچپنے میں پیدا ہوتی ہے۔ البتہ اس عامل کے بھی دوسرے عوامل کی طرح مثبت و منفی آثار ہیں، درحقیقت خیر و شر کی سرحد کو پہچاننا چاہئے اور اس عامل سے صحیح حد تک استفادہ

کرنا چاہئے تا کہ انسان اندھی تقلید نہ کرے۔

دوسروں کے ساتھ ہم رنگ ہونا' بہت سے مواقع پر انسان کی نجات کا سبب بنتا ہے' کتنے ہی زیادہ جوانوں نے اچھے دوستوں سے مصاحبت کی وجہ سے مسجد کی طرف رخ کیا ہے اور کتنے ہی جوان اس عامل کی وجہ سے محاذ جنگ کا رخ کر چکے ہیں۔ وہ ابتداء میں محاذ جنگ پر جانے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے تھے' لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے دوست اور محلے کے نوجوان محاذ جنگ پر جا رہے ہیں' ان میں بھی محاذ جنگ میں جانے کی رغبت پیدا ہو گئی۔ یہ اس عامل کے اچھے اثرات ہیں، اس کے برعکس جس ماحول کو فساد نے آلودہ بنایا ہو' وہاں پر یہی عامل فساد کی طرف میلان میں اضافہ کا سبب بنتا ہے' خاص کر نوجوانوں میں کیونکہ نوجوان اپنے آس پاس کے ماحول سے فوراً متاثر ہوتے ہیں' اور ماحول پر حاوی فساد اور برائی کے مقابلہ میں کوئی خاص استقامت نہیں دکھا سکتے ہیں لیکن سن رسیدہ لوگوں میں دوسروں سے متاثر ہونے کا عامل ضعیف تر ہوتا ہے۔

معاشرے کی اکثریت یا برتر افراد یا ترقی یافتہ دنیا کی ملتوں کا نمونہ نوجوان ہیں۔ جب لوگوں کی اکثریت میں کسی قسم کا میلان موجود ہو' تو نمونوں کی تقلید کرنے والا انسان اپنے آپ سے کہتا ہے: عام لوگ عقل رکھتے ہیں' پاگل تو نہیں ہیں' اسلئے ان کا کام صحیح ہے، اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض افراد اس عامل سے متاثر ہو کر فساد اور برائیوں میں پھنس جاتے ہیں' خصوصاً اگر معاشرے کی اکثریت فاسد ہو۔

تیئیسواں درس:

فقیہ کامل اور توحید کے اعتقاد کی عملی صورت

- حضرت ابراہیم علیہ السلام اور توحید افعالی پر اعتقاد
- غیر خدا پر اعتماد، توحید افعالی پر عدم اعتقاد کا نتیجہ
- شیخ انصاری اور شیطان کے پھندے سے فرار
- تواضع عزت و سربلندی کا سبب
- حضرت سجاد علیہ السلام اور نقص و فقر ذاتی کا ادراک
- پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام میں حقیقی ایمان کا نتیجہ

توحید کے اعتقاد کی عملی صورت

''یا اباذر: لا یفقه الرجل کل الفقه حتیٰ یری الناس فی جنب اللّٰه تبارک و تعالیٰ امثال الأ باعر' ثم یرجع الی نفسه فیکون هو احقر حاقرٍ لها یا اباذر! لا تصیب حقیقه الایمان حتی تری الناس کلهم حمقیٰ فی دینهم' عقلا فی دنیا هم''

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جناب ابوذرؓ کو کئے جانے والے موعظہ کے سلسلے میں ہم ایک ایسی بحث تک پہنچ گئے جو توحید افعالی سے مربوط ہے' جس کی وضاحت ضروری ہے: توحید پر اعتقاد کے چند مراتب ہیں کہ ان کا سب سے ادنی مرتبہ اسلام میں نصاب توحید ہے اور ہر شخص اس اعتقاد کی بنیاد پر اسلام کے نقطہ نظر سے موحد کہلاتا ہے' خدا کی وحدانیت پر اعتقاد اس کی ذات وصفات میں ''ربوبیت تکوینی'' اور ''ربوبیت تشریعی [1]'' کی توحید پر اعتقاد نیز اس پر اعتقاد کہ خدائے متعال تنہا معبود ہے۔ اس

۱۔ ''ربوبیت تکوینی'' میں توحید کا مفہوم یہ ہے کہ ہم کائنات کی تدبیر اور اس کے نظام کو چلانا خدا کے اختیار میں جانیں اور اعتقاد رکھیں کہ چاند سورج کی گردش' دن رات کا پیدا ہونا' انسانوں کی موت وحیات اور کھانے والوں کو رزق دینا خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہی ہے جو آسمانوں وزمین کی نگرانی کرتا ہے۔ اسی طرح جو بھی مخلوق اس وسیع وعریض کائنات کے کسی کونے میں پیدا ہو اور اس کو پروان چڑھائے نسلوں کا سلسلہ قائم ہوا کرے اور ہر موجود کا ظاہر ہونا سب کی سب اللہ کی تدبیر کے تحت انجام پاتے ہیں اور کوئی شے خدا کی ربوبیت کے دائرے سے باہر نہیں ہے، ''ربوبیت تشریعی'' انسان کی اختیاری تدبیر سے مربوط ہے۔ خدا کی تمام مخلوقات میں صرف انسان ہے کہ جس کی ترقی اور تکامل اس کے افعال اختیاری کے دائرے میں ہے۔ ربوبیت الٰہی کے تقاضا کے مطابق خداوند عالم ارادہ کے مقدمات (شوق وانگیزہ) اور اختیار نیز امور کے اسباب ووسائل کہ جو انسان کے اختیار میں قرار دیتا ہے اس کے علاوہ درست اور صحیح راستہ کی بھی رہنمائی کرتا ہے، اچھے اور برے کی انھیں ہدایت کرتا ہے اور اس کی فردی اور اجتماعی زندگی کے لئے دستور وقوانین وضع کرتا ہے۔

مرحلہ سے بالاتر وہ مراحل ہیں کہ منجملہ ان میں توحید افعالی پر اعتقاد رکھنا ہے توحید افعالی یعنی انسان ابتداء علم کے ذریعہ اور اس کے بعد شہود کے ذریعہ یقین پیدا کرے کہ کائنات کے اندر موثر حقیقی خداوند عالم ہے، اس کے علاوہ کوئی بھی مخلوق مستقل حیثیت سے اثر نہیں رکھتی (رہی یہ بحث کہ یہ اعتقاد مسئلہ اختیار و تکلیف سے مناسبت رکھتا ہے یا نہیں تو یہ کلامی و فلسفی بحثوں میں بیان ہوا ہے یہاں پر اس کی گنجائش نہیں ہے۔

جیسا کہ ذکر ہوا کہ توحید افعالی کے اعتقاد کے لئے دو مرحلے ہیں' پہلا مرحلہ: استدلال کے ذریعہ توحید افعالی کا اعتقاد' یعنی اس امر کا برہان و علم حاصل کرنا کہ کوئی بھی مخلوق ذاتی طور پر آزاد اور مستقل نہیں ہے بلکہ ہر مخلوق علت (خدا) کے ساتھ مربوط و وابستہ ہے۔ تمام تاثیر' علت اور معلول ذات مقدس پروردگار کا سرچشمہ ہیں۔ اگرچہ توحید پر اعتقاد کا یہ مرحلہ بہت اہم اور قابل قدر ہے' لیکن اس کی اہمیت توحید افعال کی شہود کے مرحلہ کے برابر نہیں ہے۔

دوسرا مرحلہ: انسان توحید افعالی پر علم حاصل کرنے کے بعد سیر و سلوک اور شہود کی راہ سے ایک عرفان تک پہنچتا ہے اور باور کرتا ہے کہ کائنات میں حقیقی موثر صرف اللہ ہے۔ اس مرحلہ میں انسان اس بات کو درک کرتا ہے کہ شدت و ضعف کے لحاظ سے اللہ کے علاوہ کوئی بھی انسان کی تقدیر کے بارے میں موثر نہیں ہے اور یہ خدائے متعال ہے جو نفوذ رکھتا ہے اور اسباب و وسائل میں ظہور پیدا کرتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور توحید افعالی پر اعتقاد:

توحید افعالی کے معتقد افراد کی بہترین مثالیں' جو اسباب و مسبات کے نظام کو مشیت الٰہی کے ارادہ سے وابستہ جانتے ہیں اور مستقل و براہ راست تاثیر کو صرف اللہ سے مربوط جانتے ہیں' اس کے علاوہ کسی کو مجاد مادی نہیں جانتے' انبیاء علیہم السلام اور دین کے پیشوا ہیں۔ یہاں پر ہم موحدوں کے نمایاں اسوہ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس نے دعوت الٰہی کی راہ میں کسی سے خوف نہ کیا' بابل کے مشرکوں اور بت پرستوں کے سامنے ہتھیار نہ ڈالے اور ان کی عدم موجودگی میں بتوں کو توڑ ڈالا' اور جب وہ لوگ شہر کی طرف واپس آئے تو بتوں کے توڑے جانے کے بارے میں آگاہ ہوئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ان سے مجادلہ و مناظرہ کیا اور واضح روشن اور قوی استدلال سے ان کے بے بنیاد اعتقادات کو باطل ثابت کیا۔ یہاں تک وہ لوگ اس کی قوی منطق کے مقابلے میں کچھ نہ بول سکے صرف ایک ہی چارہ ان کی نظروں میں آیا کہ حضرت ابراہیمؑ کو اپنے غضب کی آگ میں جلادیں:

﴿قالوا حرّقوه وانصروا الهتكم ان كنتم فاعلين﴾ (انبیاء/۶۸)

''ان لوگوں نے کہا ابراہیمؑ کو آگ میں جلا دو اور اگر کچھ کرنا چاہتے ہو تو اس طرح اپنے خداؤں کی مدد کرو۔''

اس کے بعد بہت سی لکڑیاں جمع کی گئی اور مقررہ دن پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے اندر ڈال دیا، اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام صرف ذات مقدس الٰہی کی طرف متوجہ تھے۔ یہاں تک حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: اس دن حضرت ابراہیم علیہ السلام صرف یہ فرماتے تھے:

''یا احدُ یا احدُ یا صمدُ یا صمدُ یا من لم یلد ولم یولد ولم یکن له کفواً احد''

اس کے بعد فرمایا: ''صرف خدائے متعال پر توکل کرتا ہوں''۔[1]

وہ اس قدر خدا پر اعتماد رکھتے تھے اور اپنے ایمان پر راسخ الاعتقاد تھے اور پورے وجود کے ساتھ اپنے آپ کو رب العزت کا محتاج پاتے تھے اور انہوں نے خدا کے سوا کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا یہاں تک خدا کے مقرب فرشتے کی طرف سے مدد کی پیشکش بھی قبول نہیں کی:

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''لما القی ابراهیم' علیه السلام' فی النار تلقّاه جبرئیل فی الهواء وهو یهوی فقال: یا ابراهیم الک حاجة؟ فقال اما الیک فلا''[2]

''جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا گیا، جبرئیل نے آسمان سے نازل ہوتے ہوئے انھیں دیکھا اور عرض کی: کیا کوئی حاجت ہے؟ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا: ہے لیکن تم سے نہیں؟''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بیان جو شیعہ و سنی دونوں سے نقل ہوا ہے، اس الٰہی سورما کی بزرگ روح میں توحید کے بلند مراتب کے وجود پر دلالت کرتا ہے اور یہ ایسا اعتقاد اور جذبہ ہے جس نے انہیں غیبی امداد کے لائق قرار دیا۔ اللہ نے آگ کو حکم دیا کہ سرد ہو جائے۔ کہا جاتا ہے: آگ اتنی ٹھنڈی ہو گئی کہ حضرت ابراہیمؑ سردی سے کانپ رہے تھے اور ان کے دانت بج رہے تھے اور انھوں نے اپنے دانتوں کو دبا رکھا تھا یہاں تک خدائے متعال نے دوبارہ حکم دیا: ''اے آگ ان پر سالم ہو جاؤ''! اس کشمکش کے دوران

۱۔ المیزان، ج ۱۴/ص ۳۰۷/۷

۲۔ اصول کافی (با ترجمہ) ج ۳/ص ۹۸/۸

جبرئیل نازل ہوئے اور آگ کے اندر حضرت ابراہیمؑ کے پاس بیٹھ گئے اور گفتگو کی۔

حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''حضرت علی علیہ السلام کے غلام قنبر حضرتؑ سے انتہائی محبت کرتے تھے' اور جب حضرتؑ گھر سے باہر نکلتے تھے' تو قنبر بھی ایک تلوار لئے ہوئے ان کے پیچھے ہو لیتے تھے، ایک رات حضرت علیؑ نے جب انھیں دیکھا تو فرمایا: اے قنبر! کیا کر رہے ہو؟ عرض کی: یا امیر المومنینؑ، آیا ہوں تا کہ آپ کے پیچھے پیچھے چلوں۔ حضرتؑ نے فرمایا: افسوس ہو تم پر! تم اہل آسمان یا اہل زمین سے میری حفاظت کر رہے ہو؟ عرض کی: اہل زمین سے۔ حضرتؑ نے فرمایا: اہل زمین خدا کی اجازت کے بغیر میرے ساتھ کچھ نہیں کر سکتے ہیں، تم واپس چلے جاؤ، وہ واپس چلے گئے۔

غیر خدا پر اعتماد، توحید افعالی پر عدم اعتقاد کا نتیجہ:

جو کچھ بیان ہوا وہ توحید افعالی پر اعتقاد، نقطہ نظر اور رفتار و کردار کا انعکاس تھا کہ انسان کو چاہئے صرف خدا پر تکیہ کرے اور اس کے علاوہ کسی کو خاطر میں نہ لائے، جبکہ توحید افعالی کے مرحلۂ شہود تک پہنچنے سے پہلے انسان دوسروں پر بھروسہ کرتا ہے اور سوچتا ہے ان کا محتاج اور نیاز مند ہے اور امید رکھتا ہے کہ وہ اس کی حاجت پوری کریں گے اور اس کی مشکل کو دور کریں گے۔ یا یہ کہ اسے کوئی نقصان پہنچائے گا، اس لئے وہ خوف و تشویش میں ہوتا ہے۔ حقیقت میں وہ تاثیر کے بارے میں مستقل اور آزاد اسباب و مسبات کا قائل ہے اور ان پر بھروسہ کرتا ہے۔ یقیناً یہ رویہ توحیدی تفکر کے ساتھ تناسب نہیں رکھتا یہ تصور ''بحول اللہ وقوتہ اقوم واقعد'' اور ولاحول ولاقوۃ الا باللہ'' کے ساتھ تناسب نہیں ہے۔ توحیدی معرفت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان خدا کے علاوہ کسی پر تکیہ نہ کرے اور ماسوا اللہ کسی پر اعتقاد نہ رکھے۔ اس سلسلہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''یا اباذر! لا یفقہ الرجل کل الفقہ حتی یری الناس فی جنب اللہ تبارک و تعالیٰ امثال الا باعر' ثم یرجع الی نفسہ فیکون ھو احقر حاقر لھا''

''اے ابوذر! انسان تب تک کامل فہم و ادراک تک نہیں پہنچتا یہاں تک کہ لوگوں کو عظمت الٰہی کے سامنے بے شعور اونٹوں کے مانند دیکھے، اس کے بعد اپنے آپ پر نظر ڈال کر خود کو ان سے کم تر جان لے۔''

دلچسپ بات یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں کوئی شخص کامل فقیہ نہیں ہوتا، مگر یہ کہ انسانوں کے اختیارات کسی اور کے ہاتھ میں دیکھے، اونٹوں کی طرح جن کی لگام ساربان کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور وہ اونٹوں کے گلہ کی ہدایت کرتا ہے اور وہ آزاد نہیں ہیں، حرکت کی جہت کا انتخاب اور کاموں کی تنظیم وتدبیر کسی اور کے ہاتھ میں ہے، لگام اس کے ہاتھ میں ہے۔

ابتدا میں انسان تصور کرتا ہے کہ دوسرے لوگ اپنی حرکتوں، جنگوں، کامیابیوں اور پیدا ہونے والے تحولات میں آزاد ہیں۔ لیکن جب اس کی معرفت میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے اور معرفت توحیدی تک پہنچتا ہے، تو انہیں اونٹوں کی قطار کے مانند دیکھتا ہے کہ ان کی لگام کسی اور کے ہاتھ میں ہے اور ان اسباب کے متحرک سلسلہ کو خدا جانتا ہے۔ صحیح ہے کہ کچھ اسباب ومسبات کی بنا پر یہ سلسلہ حرکت میں ہے، لیکن یہ سلسلہ متزلزل ہے۔ کوئی ہے جس نے ان اونٹوں کی لگام کو پکڑ رکھا ہے۔ البتہ یہ اس معنی میں نہیں ہے کہ انسان مجبور ہے، بلکہ بات یہ ہے کہ مطلق تاثیر اس کے اختیار میں نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ وہی سب کچھ ہیں اور فیصلہ کرنے والے ہیں: بلکہ کسی اور نظام کے تحت ہیں اور بشری ارادہ سے بالا کوئی اور ارادہ ان پر حکومت کر رہا ہے۔ پس، موحد وہ ہے جو اللہ کو فراموش نہ کرے اور کائنات کے نظام میں دست قدرت الٰہی سے آنکھ بند نہ کرے، اگر ایسا نہیں ہے تو۔ توحید کو درک نہیں کیا ہے۔ البتہ ان مطالب کا بیان اور وضاحت آسان نہیں ہے۔ اس حقیقت کے فہم وادراک میں بیان کا کوئی بنیادی رول نہیں ہے، بلکہ ہمیں خداوند متعال سے درخواست کرنی چاہئے تاکہ ان حقائق کو درک کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔

(پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان میں فقیہ، وہ اصطلاحی فقیہ نہیں ہے کہ جس کا آج مجتہد کے لئے احکام شرعی کے استنباط کے سلسلہ میں اطلاق ہوتا ہے، بلکہ یہ لغوی معنی میں ہے، یعنی وہ شخص جسے معارف دینی میں حقیقی فہم وشعور ہو)

معرفت کی اس حد تک پہنچنے کے باوجود بھی انسان کو شیطانی وسوسوں سے اپنے کو محفوظ نہیں سمجھنا چاہئے، کیونکہ شیطان کسی بھی وقت انسان کو نہیں چھوڑتا ہے۔ خاص طور پر شیطان ان لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ تلاش کرتا ہے جنھوں نے حق وکمال کی راہ میں قدم رکھا ہے۔ لیکن کمزور ایمان والے لوگ خود شیطان کے پیچھے قدم بڑھاتے ہیں اور شیطان کو انھیں منحرف کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ہے۔

شیخ انصاری اور شیطان کے پھندے سے فرار:

ایک معروف داستان ہے کہ شیخ انصاریؒ کے زمانے میں ایک شخص نے خواب میں شیطان کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں کافی تعداد میں رنگا رنگ رسیاں ہیں، ان میں سے بعض رسیاں سبز، بعض سرخ اور بعض زرد رنگ کی تھیں ان رسیوں میں سے کچھ رسیاں باریک تھیں اور کچھ موٹی۔ ان رسیوں میں ایک رسی کافی موٹی تھی جو ٹوٹ گئی تھی۔ اس شخص نے شیطان سے پوچھا: یہ رسیاں کس لئے ہیں؟ شیطان نے کہا: یہ وہ پھندے ہیں جن کے ذریعہ میں نبی آدم کو اپنے جال میں پھنسا کر دھوکہ دیتا ہوں۔ اس شخص نے ہر ایک رسی کے بارے میں سوال کیا۔ ایک رسی کے بارے سوال کیا تو شیطان نے کہا: یہ عورت ہے، یہ گھر ہے کسی سوال کے جواب میں کہا یہ زندگی، پیسہ اور مقام ہے۔ سوال کیا: میرا پھندا کونسا ہے؟ شیطان نے کہا: تجھے پھندے کی ضرورت نہیں ہے، تم تو خود میرے پیچھے آرہے ہو! یہ پھندے ان لوگوں کے لئے ہیں جو میرے پیچھے نہیں آتے ہیں، میں ان پھندوں کو ان کی گردنوں میں ڈال کر زبردستی اپنے پیچھے کھینچ لیتا ہوں پھر سوال کیا: یہ رسی جو دو ٹکڑے ہوگئی ہے وہ کس لئے ہے؟ کہا: مدتوں محنت کر کے اس رسی کو شیخ انصاری کے لئے درست کیا تھا، لیکن گزشتہ رات جب اسے ان کی گردن میں ڈالا، تو انھوں نے اسے ایک جھٹکا دیکر توڑ دیا! شیطان غم وغصہ کے مارے ایک چیخ ماری دور چلا گیا۔

وہ شخص نیند سے بیدار ہوا اور صبح تک ناراض اور پریشان تھا کہ یہ کیسا حادثہ پیش آیا۔ صبح کو جب اس نے مرحوم شیخ انصاری کے پاس جا کر خواب بیان کیا۔ شیخ سن کر رو پڑے اور کہا: گزشتہ رات میری بیوی کے وضع حمل کا وقت آپہنچا، دایہ اور ہمسایہ کی عورتوں نے کہا: جننے والی کو تیل پینا چاہئے۔ مجھے کہا: جا کر تھوڑا سا تیل خرید لایئے۔ تیل خریدنے کے لئے میرے پاس پیسے نہیں تھے، میرے پاس مال امام کے صرف دو تومان تھے جنہیں میں نے الگ رکھ رکھا تھا تا کہ کسی مستحق کو دیدوں۔ انہی پیسوں کو اٹھا کر چلا گیا تا کہ اپنی بیوی کے لئے تیل خرید لوں۔ راستے میں مجھے خیال آیا کہ اگر آج رات کسی طالب علم کی بیوی کے لئے یہی صورت حال پیش آگئی تو کیا اس کے پاس تیل خریدنے کے لئے پیسے ہیں؟ اس کے بعد اپنے آپ سے کہا: شاید نجف کے کسی گوشے میں کوئی طالب علم ہوگا جس کی بیوی آج رات وضع حمل کرنا چاہتی ہو اور اس کے پاس تیل خریدنے کے لئے پیسے نہ ہوں۔ میں واپس لوٹا اور پیسے اپنی جگہ پر رکھ دیئے اور کہا رہنے دو تیل کو! یہ ایک

پھندا تھا جسے شیطان نے میرے لئے پھیلایا تھا اور نو مہینوں سے منتظر تھا کہ ایسی ایک رات پہنچے تا کہ میں سہم امام پر تصرف کروں، لیکن خدائے متعال نے مجھے توفیق بخشی اور میں نے اس پھندے کو توڑ دیا۔

جی ہاں، شیطان اپنی پوری طاقت ایسے افراد کو منحرف کرنے پر صرف کرتا ہے، جو کمال کی راہ میں گامزن ہوتے ہیں۔ جب انسان نے کمال و معرفت کے مراحل میں قدم رکھا ہے، اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اس کا دل منور ہوا اور توحید کے کچھ جلوے اس کے لئے رونما ہوئے، یا اس کے لئے کوئی مکاشفہ ہوا، کسی چیز کو دیکھا یا کوئی آواز سنی تو فوراً شیطان حاضر ہوتا ہے اور وسوسہ کرتا ہے اور انسان کو مغرور کر ڈالتا ہے کہ تم عالی مقام پر پہنچے ہو دوسروں سے بہت فرق رکھتے ہو۔ جب انسان تلاش و کوشش کے نتیجہ میں معرفت کے اس مرحلہ میں پہنچنے میں کامیاب ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ دوسرے انسان اثر ڈالنے میں آزاد اور مستقل نہیں ہیں ان کی اتنی قدر و منزلت نہیں ہے کہ انسان تھوڑے سے پیسوں کیلئے یا اس لئے کہ اسی کے لئے کوئی کام انجام دیں، ان کے سامنے جھک جائے یا ہاتھ پھیلائے اور ان سے مدد طلب کرے، تو اچانک شیطان اسے وسوسہ میں ڈالتا ہے کہ تم نے عجیب بلند معرفت حاصل کی ہے! بڑی اہم شخصیت بن گئے ہو اس صورت میں انسان غرور میں مبتلا ہوتا ہے۔ ایسے ہی غرور کو روکنے کے لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ فرمانے کے بعد کہ: ''دوسروں کو خدا کے پاس، اونٹوں کے مانند دیکھو'' فوراً فرماتے ہیں: ''لیکن خود کو ان سے پست تر دیکھو'' خود کو بھی دوسروں کے مانند بلکہ ان سے چھوٹا دیکھو کہ تم مخلوقات کی مسلسل کڑیوں میں سے ایک کڑی ہو دوسری اور ان کڑیوں کو ہلانے والا کوئی اور ہے نہ صرف دوسروں کی حرکت بلکہ تیری حرکت بھی اس سے ہے، بقول شاعر:

ما همه شیریم ولی شیر علم — حمله مان از باد باشد دم به دم

حمله مان باد و نا پید است باد — جان فدای آنکه نا پید است باد

''ہم سب شیر ہیں لیکن وہ شیر جو پرچم پر (نقشہ) بنا ہوتا ہے، ہمارا حملہ ہوا کے ذریعہ ہوتا ہے (جب ہوا کے جھونکوں سے پرچم ہلتا ہے۔ ہمارا حملہ ہوا کے ذریعہ سے ہے لیکن ہوا دیکھائی نہیں دیتی۔ اس پر ہماری جان قربان ہو جو دکھائی نہیں دیتا''

لہٰذا اگر دین میں کوئی فقیہ بن گیا تو، پہلے یہ کہ جب تمام لوگوں کا خدائے متعال سے موازنہ کرتا ہے تو انہیں ناچیز دیکھتا ہے، دوسرے یہ کہ جب دیگر لوگوں کا اپنے سے موازنہ کرتا ہے تو سب کو اپنے سے بہتر

دیکھتا ہے اور یہ خصوصیت عجیب ہے۔ یعنی خدائے متعال انسان کو ایسی توفیق عطا کرتا ہے کہ ایک طرف تمام لوگوں کو اہمیت نہیں دیتا نیز، اپنی زندگی میں اثر ڈالنے کے لحاظ سے دوسروں کو اہمیت نہیں دیتا اور دوسری جانب سے آداب شرعی کی بھی رعایت کرتا ہے، جبکہ اس حالت میں دوسروں کے لئے کسی رول یا مقام کا قائل نہیں ہے، انہیں تواضع، ادب اور احترام کرنے سے اس میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ آداب شرعی کی رعایت کرتا ہے اور حقیقت میں اپنے آپ کو دوسروں سے چھوٹا سمجھتا ہے۔

ایک طرف سے انسانوں کی خدا کے سامنے بوجھ اٹھانے والے اونٹوں کے مانند دیکھتا ہے کہ ان کی لگام خدا کے ہاتھ میں ہے اور دوسری طرف سے خود کو ان کے درمیان ایک چھوٹے اونٹ کے مانند دیکھتا ہے۔ نہ یہ کہ ان کو اونٹ کے مانند دیکھتے وقت اپنے کو اونٹ سوار دیکھے! بلکہ خود کو چھوٹا اور دوسروں سے ذلیل تر دیکھتا ہے اور اپنی نفس کے حقیر ہونے کا اعتراف کرتا ہے، لیکن یہ مشکل ہے انسان اس نظریہ کے مطابق دوسروں کے مقابل میں خود کو اس طرح چھوٹا شمار کرے تواضع اور انکساری کے ساتھ پیش آئے۔ لیکن یہ ممکن ہے اور حقیقت بھی ہے۔ اگر انسان اس مطلب کو درک کرے اور دوسروں کے لئے کسی رول اور اثر کا قائل بھی نہ ہو اور ان کے سامنے کمال انکساری اور تواضع بھی رکھتا ہو، تو معارف دینی میں موجودہ بہت سوالات کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں پیغمبر اسلامؐ کے اس بیان سے تواضع کی حد بھی واضح ہو جاتی ہے اور تواضع اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے ذلیل وخوار کرنے کے معنی میں نہیں ہوتا ہے بلکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام مبارک میں تواضع انسان کی عظمت وعزت کو بڑھاتا ہے۔

تواضع، عزت وسربلندی کا سبب:

ایک روایت میں حسن بن جہم حضرت امام رضا علیہ اسلام سے تواضع کی حد کے بارے میں سوال کرتے ہیں، حضرتؑ جواب میں فرماتے ہیں:

''تواضع کے چند درجات ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان اپنی قدر ومنزلت کو پہچان لے اور اپنے آپ کو خوشی اور رضایت قلب کے ساتھ اپنی جگہ پر قرار دے اور جس طرح لوگوں نے اس کے ساتھ برتاؤ کیا ہے وہ بھی ان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرے (اگر اس کے ساتھ نیکی کی ہے تو وہ بھی نیکی کرے) اگر ان سے برائی دیکھے تو اسے نیکی سے پردہ پوشی کرے۔ اپنے غصہ کو پی جائے اور لوگوں کو معاف

کردے اور خدائے متعال بھی نیک انسانوں کو دوست رکھتا ہے۔[۱]

یقیناً اس قسم کا تواضع نہ صرف انسان کی پستی وخواری کا سبب نہیں بنتا ہے بلکہ اس کی عظمت اور عزت میں اضافہ کا سبب بھی بنتا ہے۔ اس بارے میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"....وان التواضع یزید صاحبہ رفعۃ فتواضعوا یرفعکم اللّٰہ..."

بعض ماہر نفسیات معتقد ہیں کہ اگر انسان اپنے آپ کو دوسروں سے چھوٹا اور حقیر سمجھے تو "احساس کم تری" کا شکار ہو کر دوسروں سے رابطہ برقرار نہیں کرسکتا۔ وہ اچھی طرح بات بھی نہیں کرسکتا ہے۔ شرم وحیا سے دوچار ہوتا ہے، خود اعتمادی کو کھو دیتا ہے۔ معاشرتی زندگی کو ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کرتا ہے۔ اس صورت میں تواضع اور خود اعتمادی کو کیسے جمع کیا جاسکتا ہے، یعنی ہم ایک طرف سے تواضع کو اپنا شیوہ بنائیں اور دوسری طرف سے اپنی روح کی حفاظت کریں، ایک طرف سے خود کو دوسروں سے حقیر سمجھیں اور دوسری طرف سے اپنی روحانی نشاط کی حفاظت کریں۔

ایسا لگتا ہے کہ انسانوں میں موجودہ بہت سی نفسیاتی بیماریوں کا سرچشمہ (بغیر اس کے کہ ہم خاندان اور موحول کے رول کو مدِ نظر نہ رکھیں) خداوند متعال پر بھروسہ نہ کرنا ہے، اگر انسان اس بنیادی اعتمادی اور اہم نقطہ کو کھودے، نفسیاتی حوادث و بحرانوں کا ایک سیلاب اسے اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور اس کی روح آفات وامراض کے حملوں کا نشانہ بن جائے گی، لیکن اگر انسان اپنے عمل اور ردعمل کو آسمانی معیاروں کے مطابق منظم کرے تو وہ بہت سی نفسیاتی بیماریوں سے نجات پائے گا، اس لحاظ سے روایتوں میں تواضع کے خدا نے قید لگائی ہے: "من تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ" اگر انسان کا تواضع دوسروں کے مقابلے میں صرف خدا کی خوشنودی کے لئے ہو اور اس کا عمل خدا کے لئے مخلصانہ ہو، تو وہ کسی قسم کی حقارت کا احساس نہیں کرے گا۔ پس وہ تواضع پسندیدہ ہے جس کا سرچشمہ خدا کے کے لئے اخلاص ہو ورنہ اگر تواضع کا سرچشمہ ضعف، ناکامی اور احساس کمتری ہو تو اس کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہے اور اس کے لئے کوئی ثواب بھی نہیں ہے۔

۱۔ "قال قلت: ما حد التواضع الذی اذا فعله العبد کان متواضعا؟ فقال: التواضع درجات منها ان یعرف المرء قدر نفسه فینزلها بقلب سلیم، لایحب ان یاتی الی احد الا مثل ما یوتی الیه ان رای سیئة درأها بالحسنة کاظم الغیظ عاف عن الناس واللّٰه یحب المحسنین" (اصول کافی "باترجمہ" ج ۳، کتاب الایمان والکفر۔ ص ۱۸۹)

اس تجزیہ کے مطابق کہنا چاہئے: اگر انسان کا تواضع دوسروں کے سامنے، صرف فرمان الٰہی کی عبودیت واطاعت پر مبنی ہو تو، نہ صرف ضعیف نفس کا سبب نہیں بنے گا بلکہ انسان کے فخر ومباہات کا سبب بھی بنے گا، یعنی انسان تواضع کو خدا کی عبادت جانتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کے سامنے خاک پر رکھنا، پیشانی کو مٹی پر رگڑنا اور سجدہ کرنا کسی مومن کے لئے احساس کمتری کا سبب نہیں بنتا، بلکہ اس کے لئے فخر وعزت فراہم کرتا ہے، اسی طرح انسان کا دوسروں کے سامنے جب خدا اور اس کے احکام پر عمل کرنے کے لئے ہو تو فخر ومباہات کا سبب بنتا ہے۔

حضرت سجاد علیہ السلام نقص اور فقر ذاتی کا ادراک:

گزشتہ مطالب کے پیش نظر ہم بہتر سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت امام سجاد علیہ السلام دعائے ابوحمزہ ثمالی میں اس مقام عصمت وطہارت نفس کے باوجود کیوں بارگاہ الٰہی میں یوں پیش آتے ہیں:

"...فمن یکون اسوء حالاً منّی ان انا نقلت علی مثل حالی الیٰ قبر لم امهده لرقدتی..."

"کون مجھ سے بدحال تر ہے اور کس کا دن مجھ سے تاریک تر ہے، اگر میں اسی حالت میں جو اس وقت رکھتا ہوں قبر میں منتقل ہو جاؤں تو اسے میں نے اپنے آرام کے لئے آمادہ نہیں کیا ہے"

(امام تکلف اور مذاق نہیں کرتے ان کی بات سنجیدہ ہے) یہ کہ امام معصوم کا حال کس طرح تمام لوگوں سے بدتر ہے، یہ ایک پیچیدہ معما ہے لیکن اگر انسان معارف توحیدی سے آشنا ہو جائے تو یہ معما اس کے لئے حل ہو جائے گا۔ جب انسان کو یہ علم ہو جائے کہ تمام ظروف خالی ہیں جو بھی جو کچھ بھی رکھتا ہے، اسے خدا نے دیا ہے، وہ اسی سے نتیجہ اخذ کرے گا کہ جو بھی نقص ہے وہ ہماری وجہ سے اور ہم میں موجودہ فقر کی وجہ سے ہے۔ یہ ہمارے گناہ انجام دینے کی وجہ سے ہے، یا اس لئے ہے کہ ہم معرفت نہیں رکھتے ہیں اور نہیں جانتے کہ کس کے سامنے ہیں، کس کی مخالفت کرتے ہیں، یا ہمارا ارادہ اس قدر ضعیف ہے کہ شہوت اور غضب کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہیں یہ سب ہماری کمزوری کی حکایت کرتے ہیں اور انسان، ضعف و کمزوری کے علاوہ اپنی کوئی چیز نہیں رکھتا ہے۔

ہمارا اپنا کیا ہے کہ خدا نے ہمیں نہیں دیا ہے؟ علم، فہم، اندیشہ، عبادت اور عبادت و عمل کی توفیق اور جو بھی ہم رکھتے ہیں وہ خدا سے ہے، یہ سب چیزیں توفیق الٰہی سے ہمیں ملی ہیں، سوال کرنا بھی اس نے ہمارے اختیار میں رکھا ہے، ورنہ ہم اپنی طرف سے کوئی چیز سوائے ان نابود ہونے والی حیثیت (ضعف و نقص) کے نہیں رکھتے اور اگر ہم خدائے متعال سے اپنے حساب کو جدا کرنا چاہیں تو ہمارے پاس صرف ایک خالی ظرف بچے گا، اگر تعبیر ظرف صحیح ہے تب، ہم اپنی طرف سے نہ ثروت رکھتے ہیں اور نہ فہم و عقل، جو کچھ ہماری طرف سے ہے وہ جہل، بے چارہ گی، کج فہمی اور کمزور ارادہ ہے کہ یہ سب نقص و کمزوریاں ہیں۔

اگر نقائص اور کمزوریاں انحراف اور لغزش کا سبب بنتی ہیں، تو جس میں نقائص اور کمزوریاں زیادہ ہوں اس میں منحرف ہونے کے زیادہ امکانات ہیں، جس میں نقص و ضعف زیادہ ہو اس میں ظرفیت و جودی زیادہ ہے: جب ظرف بڑا ہے تو، زیادہ گنجائش رکھتا ہے اور اسے پُر کرنے کے لئے زیادہ اشیا کی ضرورت پڑتی ہے، جب انسان کی ظرفیت وجودی زیادہ ہو، تو اسے بیشتر کمال عنایت ہونا چاہیے، بہر صورت وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں رکھتا ہے، ایک چڑیا، اس کے چھوٹے پن کے پیش نظر تھوڑی سی ظرفیت کی مالک ہے تو اس کی ظرفیت کی حد میں خدائے متعال نے اسے آنکھ، کان، پرواز کی طاقت اور شور مچانے کی قدرت عطا کی ہے، اگر خدائے متعال ان چیزوں کو اس سے لے لے، تو ایک چڑیا کے برابر ظرف خالی ہوگا، لیکن ایک ہاتھی جس کی ظرفیت زیادہ ہے، خدا نے اسے اس کی ظرفیت کی حد میں اعضاو جوارح اور قدرت و توانائی عطا کی ہے، اب اگر ان کو اس سے لے لے، تو ایک ہاتھی کے برابر ظرفیت خالی ہوگی۔

کیا ہماری معنوی ظرفیت حضرت امام سجاد علیہ السلام کی معنوی ظرفیت کے برابر ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے، ہماری ظرفیت کم ہے، ہمارے فہم و شعور کے مطابق ہے، اس لحاظ سے ہم اپنی ظرفیت کے مطابق مجازات ہوں گے اور جس طرح امام سجاد علیہ السلام کا حساب و کتاب ہوگا، ہرگز ہمارا اس طرح نہیں ہوگا۔ جو تکلیف پیغمبر اور امام علیہم السلام کے لئے ہے، کبھی ہمارے لئے وہی تکلیف نہیں ہے، کیونکہ ہم اسے برداشت کرنے کی توانائی نہیں رکھتے ہیں، پس ہماری ظرفیت معصوم کی نسبت بہت محدود ہے، اس لحاظ سے ہماری کمزوریاں اور ضعف بھی محدود ہیں، امامؑ جب خود پر نظر ڈالتے ہیں جو کچھ خدا نے انہیں دیا ہے اس کو نظر انداز کرتے ہوئے، تو بے شمار کمزوریاں مشاہدہ کرتے ہیں، کیونکہ خدا نے جو کچھ انہیں دیا ہے یاد ے گا اس کی نسبت زیادہ توانائی، ظرفیت اور قابلیت رکھتے ہیں۔

اس لحاظ سے جب اپنے پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں ان کی کمزوریاں دوسروں سے زیادہ ہیں، کیونکہ ان کی ظرفیت زیادہ ہے، لہذا فرماتے ہیں: ''فمن یکون اسوءَ حالاً منّی''

کیا اگر ایک نوجوان جو ابھی بالغ ہوا ہے، اور محدود معرفت رکھتا ہے، ایک اشتباہ وخطا کا مرتکب ہو جائے تو اس کا گناہ ایک دانشمند جو پچاس سال تک درس پڑھ چکا ہے حدیث وقرآن مجید کے علوم پڑھ چکا ہے، اور اسی گناہ کا مرتکب ہو جائے تو، اس کے برابر ہے؟ یقیناً اس عالم کا گناہ زیادہ ہے، کیونکہ وہ زیادہ ظرفیت وقابلیت رکھتا ہے، اس نوجوان کا گناہ بہت کم ہے کیونکہ اس کی فہم وظرفیت بہت کم ہے اور وہ عالم چونکہ زیادہ ظرفیت رکھتا ہے، اس کا گناہ زیادہ اور اس کی سزا سخت تر ہوگی، اس لحاظ سے ایک روایت میں آیا ہے:

''...یغفر للجاهل سبعون ذنباً قبل ان یغفر للعالم ذنب واحد...''[1]

''عالم کے ایک گناہ کو بخش دئے جانے سے پہلے جاہل کے ستر گناہ بخش دئے جاتے ہیں''

جاہل کے گناہ کم ہیں، کیونکہ اس کی فہم وظرفیت کم تر ہے، بہ فرض محال، اگر امام معصوم کسی گناہ کا مرتکب ہو تو اس کی سزا عام انسانوں کی سزا کے ہزاروں برابر ہے، کیونکہ ان کی ظرفیت زیادہ ہے، امام جب خود پر نظر ڈالتا ہے تو مشاہدہ کرتا ہے کہ جو کچھ اس نے بندگی، اطاعت اور شائستہ اعمال انجام دیا ہے سب خدا کی طرف سے ہے اور اس کی توفیق سے انجام پایا ہے اور اس سے ضعف کے علاوہ کوئی چیز باقی نہیں بچتی، اور چونکہ وہ اپنے ضعف کو زیادہ دیکھتا ہے، اس لئے، دیگر لوگوں سے شرمندہ تر ہے، یہ حضرت امام سجاد علیہ السلام کے بیانات کے بارے میں ایک توجیہ تھی۔

اگر انسان کے چشم ودل کھل جائیں اور حقائق کو بیشتر ملاحظہ کرے تو وہ درک کرے گا کہ خدا کے سامنے کتنا ضعیف اور کمزور ہے، احساس کرے گا کہ اسے خود پر ناز نہیں کرنا چاہیے، اسے اپنے آپ کو دیکھ کر خودخواہی کو پہچاننا چاہیے، کیا وہ نجس پانی کے ایک قطرہ سے زیادہ تھا، کہ اب اس مرحلہ پر پہنچا ہے؟ اب جبکہ رشد وتکامل اور ترقی کے مرحلہ پر پہنچا ہے، جو کچھ رکھتا ہے کیا وہ اس کا اپنا ہے تا کہ اس پر ناز کرے؟ پس حقیقت میں اگر ہم اپنے آپ پر نظر ڈالیں تو یقیناً خود کو حقیر دیکھیں گے، یہ نفاق ہے کہ انسان ظاہر میں اور زبان پر یہ کہے: میں سب سے حقیر اور چھوٹا ہوں اور دل میں خود کو دوسروں سے برتر سمجھے، ہمیں دل سے اپنے

۱۔ بحار الانوار، ج ۲/ ص ۲۷۸

آپ کو دوسروں سے حقیر اور چھوٹا سمجھنا چاہیے اور یہ توفیق الٰہی اور اس کی طرف سے عنایت کے لئے نور معرفت کے علاوہ کسی اور چیز سے حاصل نہیں ہوتا، امید رکھتا ہوں خدائے متعال ہمیں یہ معرفت اور اس سے بالاتر معرفت عنایت فرمائے گا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام میں حقیقی ایمان کا نتیجہ:

حدیث کو جاری رکھتے ہوئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

"یا اباذرؓ! لا تصیب حقیقة الایمان حتیٰ تری الناس کلهم حمقیٰ فی دینهم عقلاءِ فی دنیا هم"

''اے ابوذر! ایمان کی حقیقت تک نہیں پہنچو گے، مگر یہ کہ لوگوں کو اپنے دین میں احمق اور اپنی دنیا میں عاقل پاؤ گے''

اے ابوذر! جب حقیقت ایمان کو درک کرو گے اور دیکھو گے کہ لوگ اپنی دنیا میں ترقی کر رہے ہیں اور مختلف کام انجام دے رہے ہیں، تو جان لینا کہ وہ اپنی دنیا کے بارے میں عاقل ہیں اور فہم و شعور رکھتے ہیں، لیکن وہ اپنی آخرت کے بارے میں کافی نادان اور احمق ہیں۔ (پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثوں میں ''کلھم'' کی تعبیر آئی ہے، یعنی سب لوگ ایسے ہیں، کیونکہ جو لوگ اپنی آخرت کے بارے میں عاقل ہیں، بہت کم ہیں اور خالص ہونے کے مانند نایاب ہیں، اس لحاظ سے عام لوگوں کے مقابلے میں، جو اپنی آخرت کے بارے میں احمق ہیں قابل توجہ تعداد نہیں ہے)

عاقل وہ ہے کہ اگر اسے مفید و مفید تر کے درمیان انتخاب کرنا ہو، تو وہ مفید کا انتخاب کرے، اگر ہم دنیا کا آخرت سے موازنہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ آخرت، دنیا کی نسبت کئی گنا زیادہ فائدہ مند اور مفید تر ہے، کیونکہ مدت اور وسعت کے لحاظ سے بھی لامتناہی ہے، انسان کی دنیوی عمر ۷۰ر سے ۸۰ر سال یا حداکثر ۱۰۰ر سے زیادہ نہیں ہے، حتی اگر ہم فرض کریں کہ انسان کی عمر ہزار سال کی ہو جائے، پھر بھی آخرت کی ابدی زندگی کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے اور کیفیت کے لحاظ سے بھی دنیوی لذت، دسیوں مشکلات اور محنتوں کے بعد ہاتھ آتی ہے اس کے باوجود مشکلات اور سختیوں سے ملی ہوئی ہوتی ہے البتہ ہم نے رنج و آلام سے ایسا انس پیدا کیا ہے کہ اسی تھوڑی لذت وہ بھی رنج و الم سے مخلوط شدہ پر قناعت کرتے ہیں، کھانا کھانے سے جو لذت ہم پاتے ہیں اس کے لئے کس قدر محنت کرنا پڑتی ہے، پیسے پیدا کریں ان سے غذا خریدیں پھر اس

غذا کو چباتے وقت ہمارے جبڑوں میں تھکاوٹ پیدا ہوتی ہے، یہ سبب رنج و مشکلات اس لئے ہے کہ غذا ہمارے منہ سے نیچے اترے اور ہم تھوڑی سی لذت پائیں! پھر اس کے بعد تھکاوٹ اور سستی ہم پر طاری ہوتی ہے، لیکن اخروی لذت، رنج و تھکاوٹ کا سبب نہیں ہے، نہ اس کو آمادہ کرنے میں انسان کو محنت کرنی ہے نہ اس کو مصرف کرنے میں اور نہ استفادہ کرنے کے بعد تھک جاتا ہے:

"لا یمسُنا فیها نصب و لا یمسنا فیها لغوب" (فاطر/۳۵)

''جہاں نہ کوئی تھکن ہمیں چھو سکتی ہے اور نہ کوئی تکلیف ہم تک پہنچ سکتی ہے۔''

آخرت کیفیت کے لحاظ سے بھی دنیا سے برتر ہے اور کمیت کے لحاظ سے بھی دنیا سے بے انتہا اور برتر ہے: "والآخرة خیر وابقی" (اعلیٰ/۱۷)

''جبکہ آخرت بہتر اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔''

آخرت کی دنیا پر ناقابل تصور برتری کے پیش نظر، ان دونوں کا موازنہ کر کے عقل ان میں سے کس کو اختیار کرے گی؟ یقیناً عقل آخرت کا انتخاب کرے گی، لیکن لوگوں میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو اس قسم کا موازنہ کر کے اس پر عمل کریں، چونکہ اکثر لوگ ایمان کی حقیقت تک نہیں پہنچتے ہیں، لیکن جو حقیقت ایمان تک پہنچے ہیں وہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے کے علاوہ یہ بھی جانتے ہیں کہ لوگ اپنی دنیا کے بارے میں عاقل ہیں، لیکن آخرت کے بارے میں جاہل ہیں: انہوں نے امور کے بارے میں نفع و نقصان کی اچھی طرح تشخیص دیتے ہیں اور اپنے مادی منافع کے بارے میں آگاہ ہیں، لیکن آخرت کے بارے میں کسی قسم کی معرفت نہیں رکھتے ہیں، وہ یقین نہیں کرتے ہیں کہ آخرت بھی ہے اور وہ دنیا سے بہتر ہے۔

شاید پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان کا راز اس میں مضمر ہو کہ جب مومن اس یقین پر پہنچتا ہے کہ اکثر لوگ اپنے دین میں جاہل و احمق ہیں، تو اپنی زندگی سلسلہ میں ان کی پیروی کرنے کی کوشش نہیں کرے گا اور اپنے راستہ کو ان سے جدا کرلے گا، کوشش کرے گا کہ آخرت کے بارے میں دوسروں کی خطاؤں سے عبرت حاصل کرے اور خود حقیقت کی راہ کو طے کرے، دوسری جہت سے دنیا کے بارے میں عقلمندوں کے تجربہ سے دنیا میں استفادہ کرے گا، البتہ دینی قواعد و ضوابط کی رعایت کرتے ہوئے۔

چوبیسواں درس:

اعمال کے محاسبہ وموازنہ کی اہمیت اور خدائے متعال سے شرم

- ☐ محاسبہ، ایک ناقابل اجتناب ضرورت
- ☐ مشارطہ، مراقبہ اور محاسبہ:

  الف.....مشارطہ

  ب.....مراقبہ

  ج.....محاسبہ
- ☐ محاسبہ نفس کا فائدہ
- ☐ برے عمل کا نتیجہ، شرمندگی
- ☐ شرم وحیا کا مفہوم اور اس کی حد
- ☐ غلط رسم ورواج کے فروغ پانے کے عوامل

اعمال کے محاسبہ موازنہ کی اہمیت

خدائے متعال سے شرم

"یا اباذر؛ حاسب نفسک قبل ان تحاسب فهو اهون لحسابک غداً وزن نفسک قبل ان توزن و تجهز للعرض الاکبر یوم تعرض لا تخفی علی اللّٰه خافیة."

"یا اباذر؛ استح من اللّٰه فانی و الذی نفسی بیده لا ازال حین اذهب الی الغائط متقنعاً بثوبی ' استحیی من الملکین اللذین معی."

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصیحتوں کا یہ حصہ محاسبہ اور حیائے الٰہی سے مربوط ہے۔ روایتوں میں من جملہ نہج البلاغہ میں ''محاسبہ نفس'' پر فراواں تاکید کی گئی ہے اور علمائے اخلاق ''محاسبہ'' کو سیر و سلوک اور تہذیب نفس کے لئے ابتدائی مراحل جانتے ہیں:

"یا اباذر؛ حاسب نفسک قبل ان تحاسب فهو اهون لحسابک غداً"

''اے ابوذر! اپنے نفس کا حساب لو، اس سے پہلے تمہارے نفس کا حساب لیا جائے تا کہ کل تمہارے لئے محاسبہ آسان ہو جائے۔''

بالکل یہی مضمون ایک اور روایت میں تکرار ہوا ہے:

"حَاسِبوا اَنفُسَکُم قَبلَ اَن تُحَا سَبُوا"

''اس سے پہلے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے، تم اپنا محاسبہ خود کرلو''

جو کچھ دوسری روایتوں میں آیا ہے، اس کے علاوہ اس روایت میں ایک نکتہ کا اضافہ ہوا ہے کہ اس دنیا میں محاسبہ، تمہارے قیامت کے حساب کو سبک اور آسان کرتا ہے۔

محاسبہ، ایک ناقابل اجتناب ضرورت:

تمام کارکردگی کا محاسبہ اور جانچ پڑتال بنیادی طور پر ایک ناقابل اجتناب امر ہے اور یہ ہر ایک کے لئے قابل درک وفہم ہے، ہر ایک اپنی زندگی میں حساب وکتاب رکھتا ہے، خاص کر وہ لوگ جو اہل کسب و تجارت ہیں اور ان کا واسطہ سرمایہ، پیسے اور نفع ونقصان سے ہے، ان کے لئے حساب نہایت اہمیت رکھتا ہے، عام طور پر ہر بازاری سال میں ایک بار اپنے حساب کی جانچ کرتے ہیں، تاکہ سالانہ حساب آسان طور پر انجام پائے، اگر تاجر اپنے روزانہ، ہفتگی اور ماہانہ حساب کی جانچ پڑتال انجام نہ دے اور حساب وکتاب کو انبار کر کے رکھدے تو اس کا کام مشکل ہو جائے گا اور کبھی اس
لاپروائی اور بے توجہی کے نتیجہ میں بہت بڑی غلطیاں رونما ہو جاتی ہیں۔

بات یہ ہے کہ جس طرح تاجر وقت سے اپنے نفع نقصان کے حساب وکتاب کا خیال رکھتا ہے اور ایک پیسہ کے بارے میں کوتاہی نہیں کرتا ہے، مومن کو بھی خدائے متعال سے اپنا حساب چکانا چاہیے، اس سلسلہ میں اسے اپنے نفس کے مکر سے پرہیز کرنا چاہیے کہ نفس اسے فریب نہ دے اور گناہوں کی توجیہ کر کے دقیق محاسبہ انجام دینے میں رکاوٹ نہ ڈالے، اسے اپنی تمام کارکردگی کے مقابلے میں اپنے نفس سے اطمینان بخش جواب حاصل کرنا چاہیے اور اسے اپنی تمام کارکردگی کے مقابلے میں اپنے نفس سے اطمینان بخش جواب حاصل کرنا چاہیے اور اسے اپنے آپ کا ایسے محاسبہ کرنا چاہیے جیسے قیامت کے دن خدا کے مامور اس کا محاسبہ کریں گے۔

اصولی طور پر اگر گناہوں کا محاسبہ وقت پر انجام پائے اور گناہ جمع ہو کر انبار نہ ہو جائیں، تو محاسبہ دقیق ہوتا ہے اور انسان صحیح نتیجہ اخذ کرتا ہے اور کم تر مشکلات سے روبرو ہوتا ہے، یہ ایک رخ ہے اور دوسرا رخ یہ ہے کہ اگر ہم اپنے گناہوں کے حساب میں تاخیر کردیں، رفتہ رفتہ انہیں فراموش کردیں گے اور ہمیں یہ نہیں معلوم ہو سکے گا کہ کن کن گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں اور کتنے گناہوں کا ڈھیر لگ گیا ہے، اس کے علاوہ جب ہم اپنے گناہوں پر توجہ نہیں کرتے، تو ان کی چارہ جوئی کی بھی ہمیں فکر نہیں ہوتی اور اپنے گناہوں

۱۔ بحار الانوار: ج ۷۰، ص ۷۳

کے حجم کے بارے میں باور نہیں کرتے، اگر مجھ سے سوال کیا جائے کہ میں زندگی میں کتنے گناہوں کا مرتکب ہوا ہوں، میں اگر بڑے انصاف سے کام لوں تو کہوں گا ہزار گناہ، جبکہ اگر دقیق حساب کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شاید ایک دن، ایک ہفتہ یا ایک مہینے میں ہزار سے زیادہ گناہ کا مرتکب ہوا ہوں! جب ان سارے گناہوں کا ڈھیر لگ جائے گا تو ان کی ایک بہت بڑی تعداد بن جائے گی۔

ہم غافل ہیں اور خیال کرتے ہیں چونکہ ہم نے چوری نہیں کی ہے کسی کو قتل نہیں کیا ہے، اس لئے ہمارے گناہ اہم نہیں ہیں، شاید اگر ہمیں گناہ گار کہا جائے تو ہم اعتراض کریں گے ہیں اور کہیں گے: مگر ہم نے کونسا گناہ انجام دیا ہے؟ انسان کی فطرت فراموش کار ہے، خاص کر اس چیز کے بارے میں جو اس کے لئے نقصان دہ ہو:

علم نفسیات کے بحث میں یہ بھی ہے چونکہ انسان خطاؤں اور گناہوں کی یاد دہانی اس کے لئے شرم وحیا کا سبب بنتی ہے اس لئے وہ مائل نہیں ہے کہ ان کی طرف توجہ کرے اور کوشش کرتا ہے کہ ان خطاؤں کو فراموش کردے، آج کل ماہرین نفسیات نے، فراموش کاری، حوادث و واقعات کو ذہن کے سپرد کرنے میں، یہ کہ انسان کس طرح کی چیز کو فراموش کرتا ہے، فراموشی اور خود کو فراموش کار بنانے میں کونسے عوامل موثر ہیں اور یہ کہ حوادث اور واقعات کو ذہن کے حوالے کرنے میں کون کون سے عوامل کارفرما ہیں، بہت زیادہ بحث کی ہے، افسوس ہے کہ باوجود اس کے کہ ان موضوعات میں جانچ پڑتال ہمارے دین ودنیا کی مصلحت میں انتہائی اہم ہیں ہم نے اس بارے میں کوئی کام نہیں کیا ہے اور دوسروں سے پیچھے ہیں۔

پس، انسان جسے پسند نہیں کرتا، نہیں چاہتا اسے اپنے سے نسبت دے، نفسیاتی تحقیقات کے مطابق، انسان ہر جرم وظلم انجام دینے کے درپے ہے لیکن اپنے گناہ کی توجیہ کرتا ہے، انسان، اس عمل کو انجام دینے کی وجہ سے پیدا شدہ روحی عذاب سے اپنے آپ کو نجات دینے کے لئے گناہ کے انجام کو اپنی ذات سے جدا کرنا چاہتا ہے، دوسرے الفاظ میں اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنا چاہتا ہے، اس لئے کوشش کرتا ہے کہ یا اپنے گناہ کو فراموش کردے یا دوسرے افراد، یا ماحول، یا دنیا، یا شیطان، یا سماجی سسٹم یا کسی دوسرے عامل کے سر تھوپے، اس طرح اپنے آپ اور اپنے عمل کے دفاع کے لئے ''دفاعی میکانزم'' کا سہارا لیتا ہے اور اگر ''دفاعی میکانزم'' سے متوسل ہونا انسان میں تقویت پا گیا اور ہر گناہ کی وہ توجیہ کرنے لگا اور صحیح طور پر اپنے آپ کو مورد سوال قرار نہیں دیا' اور اپنے بارے میں عادلانہ فیصلہ نہیں کیا اور اپنے آپ کو مجرم قرار نہیں دیا

تو اس سے بالاتر جرائم کے ارتکاب کا خطرہ موجود ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے اس عمل سے اپنے آپ کو گناہ کے تاریخ سے آزاد کیا ہے اور اب اس سلسلہ میں رنج والم نہیں رکھتا ہے تا کہ گناہ کے بُرے انجام سے ڈرے، یہی وہ جگہ ہے جہاں پر گناہ کی توجیہ اور اس کا خطرہ خود گناہ سے بیشتر ہے۔

چونکہ انسان حب نفس رکھتا ہے، اس کے علاوہ لوگوں کے پاس محترم ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے پاس بھی سربلند ہونا چاہتا ہے، وہ نہیں چاہتا اپنی نظر میں شرمسار اور خود کو ناقص دیکھے۔ وہ کمال وعزت کا مالک بننا چاہتا ہے، اس لئے جو اس کے لئے نقص وتنزل کا سبب بنے اسے اپنے ذہن سے فراموش کرتا ہے، کیونکہ اس کی یاد اپنے پاس حقیر وپست ہونے کا سبب بنتی ہے اور یہ انسان کی فطری چاہت کے خلاف ہے، اس نکتہ کے پیش نظر اگر اس دوران ایسے لوگ موجود نہ ہوں جو انسان کو ان نواقص، کوتاہیوں اور انحرافات کی یاددہانی کرائیں، تو ایک بُرا انجام اس کے انتظار میں ہے جو اسے ناقابل تلافی نقصان سے دوچار کردے گا، اس لئے، نامناسب کردار کی یاددہانی اور ان کی تلافی کی تلاش کے لئے عوامل کی منصوبہ بندی کے طور پر روایتوں میں بہترین شیوہ منتخب کیا گیا ہے اور علمائے اخلاق نے ان روایتوں کے پیش نظر اپنی کتابوں جیسے: معراج السعادۃ، جامع السعادات، اور احیا العلوم میں، تہذیب وتزکیہ نفس اور سیر وسلوک کے متلاشیوں کے لئے ''مشارطہ''، ''مراقبہ'' اور ''محاسبہ'' نام کے تین مرحلے بیان کئے ہیں۔

الف)۔ مشارطہ

صبح کے وقت جب انسان نیند سے اٹھتا ہے، اسے توجہ کرنی چاہیے کہ ایک نیا سرمایہ اس کے اختیار میں قرار پایا ہے: اگر ہم نیند سے بیدار نہ ہوتے اور ہماری روح ہمیشہ کے لئے ہمارے بدن سے پرواز کر کے چلی جاتی تو کیا یہ ہماری زندگی کا خاتمہ نہ ہوتا؟

﴿اللّٰہ یتوفی الا نفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسک التی قضی علیھا الموت ویرسل الاخری الی اجلٍ مسمی ان فی ذٰلک لآیات لقوم یتفکرون﴾ (زمر/۴۲)

''اللہ ہی ہے جو روحوں کو موت کے وقت اپنی طرف بلا لیتا ہے اور جو نہیں مرتے ہیں ان کی روحوں کی بھی نیند کے وقت طلب کر لیتا ہے اور پھر جس کی موت کا فیصلہ کر لیتا ہے اس کی

روح کو روک لیتا ہے اور دوسری روحوں کو ایک مقررہ مدت کے لئے آزاد کر دیتا ہے، اس بات میں صاحبان فکر و نظر کے لئے بہت سی نشانیاں پائی جاتی ہیں"

پس، نیند سے ہم نے موت کے ایک مرحلہ کو طے کیا ہے اور مردے کے مانند کوئی عمل انجام نہیں دیا ہے، اب اگر ہم دوبارہ نیند سے اٹھے ہیں، تو ہمیں دوبارہ زندگی عنایت ہوئی ہے اور ایک نیا سرمایہ ہمارے اختیار میں قرار پایا ہے، پس ہمیں اس نئی زندگی کے لئے خدا کا شکر بجالانا چاہیے، اپنے نفس کو مخاطب قرار دے کر اسے کہدیں: اے نفس! خدائے متعال نے اس قیمتی سرمایہ کو تیرے اختیار میں قرار دیا ہے تا کہ اس کے ذریعہ آخرت کی سعادت حاصل کرو، اگر تم سے لغزش رونما ہو جائے، تو اپنے سرمایہ کو تم نے کھو دیا اور نقصان سے دوچار ہو جاؤ گے۔ ہمیں اپنے نفس سے شرط کرنی چاہیے اور اس سے عہد و پیمان لینا چاہیے کہ گناہ کے پیچھے نہ پڑے اور اس سے کوئی ایسی چیز سرزد نہ ہو جائے جو غضب الٰہی کا سبب بنے، ہمیں اس سے عہد و پیمان لینا چاہیے کہ اس گراں بہا سرمایہ کو ایک ایسی راہ میں خرچ کرے جو خدا کی خوشنودی اور انسان کی سعادت کا سبب بنے، کیونکہ خدا کی خوشنودی سے انسان کو سعادت ملتی ہے اور اگر خدا راضی نہ ہو، تو انسان سعادت تک نہیں پہنچ سکتا، ہمیں اپنے نفس سے شرط کرنی چاہیے کہ واجبات اور احکام الٰہی کو انجام دینے میں کوتاہی نہ کریں اور ہر نیک کام جو اس کے لئے ممکن ہے، اسے ترک نہ کریں۔

بہتر ہے یہ "مشارطہ" صبح کی نماز اور اس کی تعقیبات کے بعد انجام پائے اور انسان اپنے نفس سے مخاطب ہو کر کہے: اے نفس! میرے پاس ان چند دنوں کی عمر کے علاوہ کوئی سرمایہ نہیں ہے اور اگر یہ میرے ہاتھ سے چلا جائے تو میرا سرمایہ برباد ہوگا، اے نفس! خدائے رحمٰن نے آج بھی مجھے مہلت دیدی ہے، اگر میں آج مر چکا ہوتا، تو میں آرزو کرتا کہ خدائے متعال مجھے دوبارہ دنیا میں بھیجدے تا کہ کچھ زاد راہ کٹھا کرلوں پس اے نفس! تصور کرو کہ تم مر چکے تھے اور دوبارہ دنیا میں بھیجے جانے کی تمنا کرتے تھے اور تجھے پھر سے دنیا میں بھیجدیا گیا ہے، پس ایسا نہ ہو کہ آج کے دن کو ضائع کردو، کیونکہ ہر سانس جو لیتے ہو وہ ایک گراں بہا اور بے نظیر گوہر کے مانند ہے اور اس سے ایک ابدی اور ختم نہ ہونے والا خزانہ اخذ کیا جاسکتا ہے جو ہمیشہ کے لئے آرام و آسائش کا سبب بن سکتا ہے۔

ب)۔ مراقبہ:

مرحلہ مشارطہ کے بعد مرحلہ مراقبہ ہے کہ انسان اپنے ساتھ کی ہوئی شرط کے بارے میں پورے دن کے دوران چوکنا رہنا چاہیے، اور اس پر عمل کرنا چاہیے اور ہر لحہ ہوشیار رہنا چاہیے کہ گناہ کا مرتکب نہ ہو جائے، اسے نگراں رہنا چاہیے کہ صحیح راستہ پر چل رہا ہے یا انحراف ولغزش کا شکار ہو رہا ہے، دوسرے الفاظ میں یہ اسی تقویٰ کی مراقبت ہے، کیونکہ تقویٰ اقدار الٰہی کا تحفظ اور اعمال کی نگہبانی ہے ایک روایات میں آیا ہے کہ تقویٰ اس کے مانند ہے کہ انسان ایک اندھیری رات میں سانپ اور بچھو سے پُر ایک بیابان میں قدم رکھتا ہے اور ہر لحہ ممکن ہے سانپ پر قدم پڑے اور اس کے ڈسنے سے اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے، اب جس طرح وہ انتہائی دور اندیشی اور احتیاط سے کام لیتا ہے تا کہ سانپ اور بچھو سے روبرو نہ ہو اس طرح انسان کو بھی اپنی زندگی میں پوری دقت اور احتیاط کرنی چاہیے تا کہ شیطان کے خطرہ سے بچ جائے اور جہنم کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائے، پس تقویٰ یہ ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے کردار کی فکر میں رہے اور اپنے اعمال کے انجام کو مدنظر رکھے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آ کر ایک شخص نے عرض کیا:

اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھے کوئی نصیحت فرمائیں! پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا: اگر میں تجھے نصیحت کروں تو کیا تم اسے قبول کرو گے؟ ہر بار اس مرد نے جواب دیا: جی ہاں، اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

میری نصیحت تیرے لئے یہ ہے کہ اگر کسی کام کو بجالانے کا فیصلہ کیا ہے تو اس کے انجام کے بارے میں فکر کرو۔ پس اگر اس کام کا انجام اچھا ہے تو اسے بجالاؤ اگر اس کام کا انجام اچھا نہیں ہے اس سے پرہیز کرو۔[1]

نفس کی مراقبت، خدا کی معرفت اور اس یقین کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے کہ خدائے متعال انسان کے اندرونی اسرار سے واقف ہے اور کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے، اس لحاظ سے کوئی ایسا عمل نہیں ہے کہ انسان کے اس بجالانے کے وقت مراقبت کا محتاج نہ ہو، کیونکہ بندہ، یا خدا کی بندگی اور اطاعت کی

حالت میں ہے یا معصیت انجام دینے کی حالت میں، یا مباح کام انجام دینے کی حالت میں ہے، اطاعت و بندگی کے دوران اس کی مراقبت عمل کو کمال بخشنے کے لئے اخلاص و کوشش اور عمل کو آفات سے بچانے کے لئے ادب اور حفاظت کی مراعات کرنا ہے، معصیت کے دوران بندہ کی مراقبت، توبہ، ندامت، شرم اور اس معصیت کی تلافی کے لئے اہتمام کرنا ہے، انسان کے مباح کام میں مراقبت یہ ہے کہ آداب کی رعایت کرے اور ہمیشہ نعمتوں سے استفادہ کرتے وقت منعم کو مدِ نظر رکھے اور ان نعمتوں کے لئے اس کا شکر بجالائے اور بلاؤں کے مقابلہ میں صبر کرے۔

ج)۔ محاسبہ:

محاسبہ، تیسرا مرحلہ ہے کہ علمائے اخلاق نے تہذیب نفس کے لئے اس کی تأکید کی ہے۔ محاسبہ، یعنی انسان دن کے خاتمہ پر اپنے ایک روز کی رفتار کی جانچ پڑتال کرے اور دیکھ لے کہ جو فرائض الٰہی اور واجبات اس کے ذمہ تھے، ان پر عمل کیا ہے یا نہیں، اگر تحقیقات کے بعد معلول ہوا کہ اس نے اپنے الٰہی فرائض بجالائے ہیں اور اس کی روزانہ رفتار حکم شرع کے مطابق تھی، تو اسے خدا کا شکر بجالانا چاہیے کہ اس نے اسے فرائض انجام دینے کی توفیق عنایت کی ہے، چونکہ انجام فرائض انہیں توفیق الٰہی پر ہے، اس توفیق کے لئے شکر بجالانا چاہیے، اس طرح کوشش کرنی چاہیے کہ دوسرے دنوں میں بھی اس صحیح و سالم راستہ پر گامزن رہے، لیکن اگر اس نے الٰہی فرائض پر عمل نہیں کیا ہے یا انہیں ناقص انجام دیا ہے، اور لغزش و انحراف کا شکار ہوا ہے، تو مستحبات اور خاص کر نافلہ نمازیں پڑھ کر نقائص کی تلافی کرنے کی کوشش کرے اور فرائض الٰہی کو ترک کرنے اور معصیت میں آلودہ ہونے کے بارے میں اپنی ملامت کرے اور استغفار کرے تاکہ خدائے متعال اس کے گناہوں کو بخش دے، اس طرح نیک اعمال کو انجام دیکر اپنے گناہوں کی تلافی کرنے کی کوشش کرے، اس صورت میں سوتے وقت اس نے اپنا حساب چکا دیا ہے اور کوئی گناہ اس کے لئے باقی نہیں رہتا ہے، یہ وہی محاسبہ ہے جس کی اہل بیت اطہار علیہم السلام اپنے اصحاب کو نصیحت فرماتے تھے اور علمائے اخلاق نے بھی ائمہ اطہار علیہم السلام کے دستورات کی بنیاد پر دوسروں کو اس کی تاکید کی ہے۔

تہذیب نفس میں محاسبہ کی اہمیت کے پیش نظر حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لیس منا من لم یحاسب نفسه فی کل یوم فان عمل حسناً استزاد الله

وان عمل سیئاً استغفر الله منه وتاب الیه" [1]

''جو ہر روز اپنا محاسبہ نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ پس اگر نیک عمل انجام دیا ہے، تو خدا سے اعمال نیک کے زیادہ ہونے کی دعا کرے اور اگر کوئی گناہ اور برا کام انجام دیا ہے تو خدا سے توبہ اور استغفار کرے۔''

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب سے فرماتے ہیں:

''الا انبئکم باکیس الکیّسین و احمق الحمقیٰ؟ قالوا: بلی یارسول اللّٰه، قال: اکیس الکیّسین من حاسب نفسه و عمل لما بعد الموت، واحمق الحمقیٰ من اتبع نفسه هواه و تمنی علی اللّٰه الامانی.'' [2]

کیا تمھیں عاقل ترین عاقلوں اور نادان ترین نادانوں کی خبر دیدوں؟ اصحاب نے کہا: جی ہاں، یا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عاقل ترین انسان وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور اپنے مرنے کے بعد کے لئے عمل کرے اور احمق ترین انسان وہ ہے جو اپنی نفسانی خواہشات کا غلام ہو اور ہمیشہ اپنی آرزوؤں کے بارے میں خدا سے درخواست کرے۔''

محاسبہ نفس کا فائدہ:

محاسبہ نفس کے جملہ فوائد میں سے یہ ہے کہ جب انسان اپنی خطاؤں اور لغزشوں کے بارے میں آگاہ ہو جاتا ہے تو فوراً اس کی تلافی کرتا ہے اور اس کے آثار کو اپنی روح میں باقی رہنے نہیں دیتا۔ اگر انسان اپنا محاسبہ نہ کرے تو اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے کتنے گناہ کئے ہیں اگر ہم سے سوال کیا جائے کہ صبح سے شام تک کتنے نیک کام اور کتنے بُرے کام انجام دیئے ہیں اور کہاں پر خطا اور لغزش کے مرتکب ہوئے ہیں؟ ہم نہیں جانتے۔ لیکن جب ہم اپنے نفس کا محاسبہ کرنے کی ہمت کریں، اپنے ایک ایک کام کو یاد کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اعمال میں سے کس قدر صحیح تھے اور کس قدر غلط۔

جب انسان اپنے گناہوں کی طرف توجہ نہیں کرتا، تو وہ گناہ اس کی روح میں اثر ڈالتے ہیں اور ہر

۱۔ اصول کافی ''باترجمہ'' ج ۳/ص ۱۹۱/

۲۔ بحار الانوار، ج ۷۰/ص ۶۹/

گناہ کے نتیجہ میں اس کے دل میں ایک سیاہ داغ نمودار ہوتا ہے، یہاں تک گناہوں کی افزائش کی بنا پر یہ سیاہی اس کے پورے دل کو اپنے لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اور ممکن ہے اس میں کوئی نورانی نقطہ باقی نہ رہے۔ یہ مطلب بعض روایتوں کا مضمون ہے، من جملہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ایک روایت میں فرماتے ہیں:

"اذاذنب الرجل خرج فی قلبه نکتة سوداء فان تاب انمحت وان زاد زادت حتی تغلب علی قلبه فلا یفلح بعدها ابدا" [1]

''جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے، اس کے دل میں ایک سیاہ داغ پیدا ہوتا ہے۔ پس اگر وہ توبہ کرے تو یہ داغ زائل ہو جاتا ہے اور اگر اس گناہ کے بعد اور بھی گناہ انجام دے تو وہ سیاہ داغ بڑھتا ہے یہاں تک اس کے پورے دل پر پھیلتا ہے اور وہ شخص کبھی کامیاب نہیں ہوتا''

بعض اوقات انسان غافل ہوتا ہے، جس وقت متوجہ ہوتا ہے کہ اس کے گناہوں نے اس کے دل پر غلبہ کر لیا ہے، اور اس وقت کی اپنی موجودہ حالت کا پچھلے سال کے ساتھ موزانہ کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہو چکی ہے، بعض لوگ، جو ایک مدت سے علم حاصل کرنے میں مشغول ہیں، اپنے ذہن کردار اور اخلاق میں ایجاد شدہ تنزل کے پیش نظر مشاہدہ کرنے کے بعد اپنے آپ سے کہتے ہیں:

اپنی تعلیم کے ابتدائی مراحل میں ہم بلند حوصلہ اور نورانی دل کے مالک تھے، یہ کیا ہوا کہ رفتہ رفتہ ہمارے وہ حوصلے کمزور ہو گئے؟ بعض لوگ اس تنزل کو علم کے سر تھوپتے ہیں اور تصور کرتے کہ علم حاصل کرنا ان کے دل کی تاریکی کا سبب بنا ہے۔ ایسے لوگ یہ باور کرنا نہیں چاہتے ہیں کہ ان کے گناہ ان کے معنوی حوصلوں کے تنزل اور دل کے سیاہ ہونے کا سبب بنے ہیں۔ یقیناً علم حاصل کرنا انسان کے قابل قدر کاموں میں سے ہے، اگر چہ کبھی انسان کے یہی اچھے کام بہت سے عیب کے حامل ہوتے ہیں جن کا سرچشمہ انسان کی کمزوری اور لاپروائی ہوتی ہے۔

یہ ایک قسم کی خود فریبی ہے کہ جب انسان علم حاصل کرتے ہوئے تھک جاتا ہے یا امید نہیں رکھتا

۱۔ اصول کافی ''باترجمہ'' ج ۳، ص ۳۷۳

ہے کہ وہ کہیں پہنچ پائے گا، یا درس پڑھنے کو اپنی نفسانی خواہشات کے مطابق نہیں پاتا ہے، بلکہ اسے اپنے تنزل کا حامل تصور کرتا ہے اور کہتا ہے، درس پڑھنا ہی میرے دل کے سیاہ ہونے کا سبب بنا ورنہ جب میں نے درس پڑھنا شروع کیا تھا، اس وقت میرا دل پاک تھا، صحیح ہے کہ ابتدا میں ہمارا دل پاک تھا اور اب تاریک ہو گیا ہے، لیکن کلی علت ہمارا درس پڑھنا نہیں ہے بلکہ اس کا سبب صحیح طور پر درس نہ پڑھنا ہے، اس کا سبب گناہ اور تہذیب نفس اور اصلاح کے بغیر علم حاصل کرنا ہے۔

جی ہاں، جب انسان محاسبہ نہیں کرتا ہے، تو گناہ کے واقعی اور تکوینی آثار نابود نہیں ہوتے ہیں اور اس کے دل کو تاریک کر ڈالتے ہیں اور وہ متوجہ نہیں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص سفید لباس پہنتا ہے اس پر داغ لگ جاتا ہے وہ آنکھیں بند کر کے یہ نہیں دیکھتا ہے کہ اس کے لباس پر داغ لگ گیا ہے اور وہ لباس گندہ اور کثیف ہو گیا ہے، یقیناً، داغ زیادہ ہونے سے وہ لباس اس قدر آلودہ اور نفرت انگیز ہو جاتا ہے کہ ہر دیکھنے والا اس سے متنفر ہوتا ہے، لیکن خود انسان اس سے بے خبر ہوتا ہے، کیونکہ اس نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں! محاسبہ نفس سے دوری کا سب سے بڑا عیب اور نقصان یہ ہے کہ گناہ کے اثرات دل پر باقی رہتے ہیں اور انسان دن بہ دن آلودہ ہو کر اس کا دل سیاہ اور تاریک ہو جاتا ہے اور خدا سے بیشتر دور ہوتا رہتا ہے، لیکن خود متوجہ نہیں ہوتا ہے، بلکہ خیال کرتا ہے وہ ایک شائستہ اور اچھا انسان بن گیا ہے اور اپنے آپ پر ناز کرتا ہے کہ میں ایسا ہوں ویسا ہوں، جبکہ ہر روز تنزل کی منزلیں طے کرتا ہے اور اس کے نتیجہ میں شقاوت و بدبختی سے دوچار ہوتا ہے:

﴿قل هل ننبئكم بالأخسرين اعمالاً. الذين ضل سعيهم في الحيوة الدنيا وهم يحسبون انهم يحسنون صنعاً﴾ (کہف/۱۰۳و۱۰۴)

''پیغمبر! کیا ہم آپ کو ان لوگوں کے بارے میں اطلاع دیں جو اپنے اعمال میں بدترین خسارہ میں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوشش زندگانی دنیا میں بہک گئی ہے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ اچھے اعمال انجام دے رہے ہیں۔''

علامہ طباطبائی اس آیۂ مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''جو کسب معاش نفع کمانے کے لئے انجام پاتا ہے، اس میں خسارہ و نقصان اس وقت پیش آتا ہے جب کسب معاش کا مقصد حاصل نہ ہو یا سرمایہ کم ہو یا انسان کی کوشش ناکام ہو جائے۔ آیۂ شریفہ میں

کوشش کے ضائع ہونے یا سعی کے نابود ہونے کی تعبیر کی گئی ہے، جیسے کہ انسان راستہ کو گم کر کے سفر کو جاری رکھنے کے باوجود مقصد تک نہیں پہنچتا ہے۔

بعض اوقات انسان کا کسب معاش میں نقصان اٹھانا اس کے کام میں ناتجربہ کاری کی وجہ سے ہوتا ہے یا طریقہ کار سے بے خبری یا دوسرے ناخواستہ عوامل کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ نقصان اور ضرر، ممکن ہے دور ہو جائے، کیونکہ امید کی جاتی ہے کہ نقصان اٹھانے والا بیدار ہو جائے اور کام کو پھر سے شروع کرے اور کھوئی ہوئی چیزوں کو دوبارہ پا کر نقصان کی تلافی کرے۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان نقصان اٹھاتا ہے اور خود تصور کرتا ہے کہ اسے فائدہ ہوا ہے! وہ ضرر کرتا ہے لیکن معتقد ہے کہ نفع کے علاوہ اسے کچھ حاصل نہیں ہوا ہے۔ یہ بدترین نقصان و خسارہ ہے جو ناقابل تلافی ہے۔

دنیا میں انسان کا فریضہ، صرف سعادت کے لئے کوشش کرنا ہے اور اس کے علاوہ اس کی کوئی اور خواہش نہیں ہونی چاہئے۔ اگر وہ حق کی راہ میں گامزن ہو کر مقصد کو حاصل کر لے تو وہ حقیقی سعادت تک پہنچ گیا ہے، لیکن اگر وہ حق سے منحرف ہو گیا اور اپنی غلطی اور انحراف کی طرف متوجہ نہیں ہو سکا، تو اس نے اپنی سعی و کوشش میں نقصان اٹھایا ہے لیکن اسے نجات کی ایک امید ہے۔ ہاں اگر وہ حق کے راستہ سے منحرف ہو گیا اور باطل کو پا کر اس پر مصر رہا اور اگر حق کی ایک کرن اس کے لئے ظاہر ہوئی، لیکن اس کے نفس نے اس پر پردہ ڈال دیا اور اسے بزرگ بینی اور جاہلانہ تعصب میں مبتلا کر دیا تو اس قسم کا شخص عمل و کوشش میں بدترین نقصان اٹھانے والا ہے، کیونکہ اس کے نقصان و خسارہ کے برطرف ہونے کی کوئی امید نہیں ہے اور توقع نہیں ہے کہ وہ سعادت حاصل کر سکے۔ یہ وہی نکتہ ہے کہ خدائے متعال اس آیہ شریفہ میں بیان فرماتا ہے۔[1]

جیسے کہ اس سے پہلے کہا گیا، محاسبہ نفس کے فوائد میں سے یہ ہے کہ انسان اپنی خطاؤں کے بارے میں متوجہ ہوتا ہے اور اسے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ گناہ کے تکوینی آثار کو اپنی روح میں باقی رہنے نہیں دیتا تا کہ اس کے تنزل کا سبب بنے۔ اس حقیقت کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو لازم و ملزوم تعبیروں سے بیان فرمایا ہے۔

پہلے فرمایا: ''حاسب نفسک قبل ان تحاسب''

اس کے بعد فرمایا: '' فهوا هون لحسابک غداً''

۱۔ المیزان، ج ۳، ص ۴۳۰

اس سے پہلے کہ تمھارا محاسبہ کیا جائے، خود اپنے اعمال کا محاسبہ کرلو کیونکہ یہ محاسبہ تمھارے قیامت کے حساب کو آسان کردے گا۔ کیونکہ اگر تم نے خود اپنے اعمال کا محاسبہ کیا تو تم اپنی خطاؤں اور انحرافات کے علاج کے درپے رہو گے اور اس کے نتیجہ میں تمھاری قیامت کا حساب ہلکا ہوگا۔ لیکن اگر ایسا نہ کیا تو گناہوں کا انبار لگ جائے گا قیامت میں مشکل زیادہ ہوگی: تم دنیا میں اپنے گناہوں سے بے خبر ہو اور نہیں جانتے ہو کہ کس قدر پستی میں گر چکے ہو، لیکن جب قیامت کے دن اپنے نامہ اعمال کو پاؤ گے اور اپنے بے شمار گناہوں کو دیکھو گے تو اس کی حسرت تمہیں جہنم کے عذاب سے زیادہ رنج والم سے دوچار کرے گی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیث کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وزن نفسک قبل ان توزن و تجهز للعرض الاکبر یوم تعرض لا تخفی علی اللّٰه خافیة"

''اپنے آپ کو جانچ لو، اس سے پہلے کہ قیامت کے دن خدا کے حضور میں پیش کرنے کے لئے تجھے جانچا جائے، آمادہ رہنا کہ خدائے متعال سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے''

قیامت کے دن جانچ پڑتال کے بارے میں خداوند متعال فرماتا ہے:

﴿والوزن یومئذ الحق﴾ (اعراف/۸)

''اس (قیامت) دن اعمال کا وزن ایک برحق شئے ہے۔''

اعمال کا موازنہ اور ناپ تول ہمارے اعتقادیں سے ہے۔ اعمال کی پڑتال، ان کے موازنہ اور کم وزیاد سے مربوط ہے، اب اگر ہم اپنے اعمال کے بارے میں خود جانچ پڑتال کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہمارے گناہ بہت سنگین ہوگئے ہیں تو اپنے بوجھ کو ہلکا رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہم نے اپنے اعمال کا محاسبہ نہ کیا، اپنے گناہوں اور ہماری روح پر ان کے اثرات کے بارے میں توجہ نہ کی، تو ہم الٰہی میزان کے حاضر کئے جانے کے دن رسوا ہوں گے اور کف افسوس ملیں گے۔ پس، جو اپنے اعمال کا محاسبہ کرے گا، جس دن اس کے تمام مخفی وآشکار اعمال خدا کے سامنے پیش کئے جائیں گے تو وہ ہلکا ہوگا، کیونکہ اس نے اپنے گناہ اور اخلاقی کوتاہیوں کی تلافی کی ہے۔ لیکن جس نے اپنے اعمال کا محاسبہ نہیں کیا ہے، خدا کے سامنے اس کے اعمال پیش کرنے کے دن ـــــ جس دن انسان کے تمام چھوٹے بڑے اعمال آشکار ہوں گے ـــــ حسرت کھائے گا۔

قیامت کے دن حسرت سے دوچار نہ ہونے کے لئے، آج ہی سے کوشش کرنی چاہئے اور اپنے اعمال کو اپنے سامنے ہمہ وقت مجسم رکھنا چاہئے، تصور کیجئے کہ آپ کی زندگی اختتام کو پہنچ چکی ہے چونکہ کوئی مطمئن نہیں ہے کہ وہ کل تک زندہ رہے گا یا نہیں اور تمہارے اعمال خدا کے حضور میں پیش کئے جائیں گے۔ دیکھیے کہ خدائے متعال کو کیا پیش کر رہے ہیں اور اس کے مقابلے میں کیا حال رکھتے ہیں۔ جب ائمہ اطہار علیہم السلام اپنی مناجات میں ''عرض اکبر'' کے دن جس دن انسان کے اعمال خدا کو پیش کئے جاتے ہیں سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں، مناسب ہے اس دن خطرناک ومہلک ترین عذابوں کا دن ہے کہ حسرت میں مبتلا نہ ہونے کی تلافی کریں تاکہ وہ ہمارے نامہ اعمال کی کتاب سے مٹ جائیں۔

بُرے اعمال کا نتیجہ، شرمندگی:

یقیناً جب خدا کے حضور اعمال کے پیش کئے جانے کی گفتگو کی جاتی ہے تو، خدا سے شرم وحیا کی بحث بھی پیش آتی ہے۔ جب انسان کوئی بُرا کام انجام دے یا کسی ظلم کا مرتکب ہو جائے اور اسے فراموش کردے، اور اس کے یہاں کوئی فرق نہ آئے اس کے ذہن میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو یہ اس لئے ہے ہم ضعیف ہیں اور حقائق کو صحیح درک نہیں کر سکتے، مزید اس لئے کہ تدریجاً حقائق کو درک کریں، ایک محسوس امر کی مثال پیش کرتے ہیں: فرض کیجئے عرصہ سے دو آدمی آپس میں دوست تھے اور یہ عہد کر چکے تھے کہ ایک دوسرے کے ساتھ خیانت نہیں کریں گے۔ اب اگر ان دو میں سے کسی ایک نے اپنے دوست کے ساتھ ظلم کیا، اگر اس کا دوست اس کے ظلم سے بے خبر تھا یا اسے بھول گیا ہو، جب اپنے دوست سے ملتا ہے تو اس کا برتاؤ بالکل عادی ہے، لیکن اگر وہ دوست ظلم کی اور خیانت کی ویڈیو یا فوٹو گرافی بنا لے، اور ایک مدت کے بعد اسے دکھا کر کہے: تم نے میرے ساتھ عہد وپیمان کیا تھا کہ مجھ پر ظلم نہ کروگے، اس قدر دوستی کا دم بھرتے تھے، پس کیوں تم نے میرے ساتھ یہ ظلم کیا اور خیانت کی؟ یہاں پر ظالم کے لئے ایک ایسی شرم وحیا پیش آتی ہے، جو تمام عذاب اور جسمانی اذیت سے سخت ہوتی ہے۔ وہ ایک تو ایک ظلم کا مرتکب ہونے کے بعد زمانہ ظلم کو فراموش کر چکا تھا اور یقین نہیں رکھتا تھا اس کا دوست اس واقعہ سے خبردار ہوگا، اگر اس کا دوست اس ظلم کے منظر کی تصویر اسے دکھادے، تو اس کا کیا حال ہوگا؟

ہم نے دنیا کے اعمال پیش کرنے کے لئے، ظلم کی تصویروں کی نمائش کی مثال پیش کی، لیکن قیامت کے دن خود اعمال حاضر ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہماری عقل حضور اعمال کے مجسم ہونے کی کیفیت کو درک

نہیں کرسکتی ہے، لیکن ہمارے مذہبی اعتقادات کی بنا پر، اعمال کا مجسم ہونا ثابت ہو چکا ہے:

﴿....ووجد واما عملوا حاضرا﴾ (کہف/۴۹)

''اور سب لوگ اپنے اعمال کو بالکل حاضر پائیں گے''

اس آیہ شریفہ میں خدائے متعال صاف الفاظ میں عین عمل کے حاضر ہونے کو بیان فرماتا ہے اور آیت کی دوسری صورت میں تفسیر نہیں کی جاسکتی ہے۔ اس آیت کے علاوہ دیگر آیات بھی اعمال کے مجسم ہونے کو بیان کرتی ہیں، من جملہ:

﴿یوم تجد کل نفسٍ ماعملت من خیرٍ محضراً وما عملت من سوءٍ...﴾

(آل عمران/۳۰)

''اس دن کو یاد کرو جب ہر نفس اپنے نیک اعمال کو بھی حاضر پائے گا اور اعمال بد کو بھی.....''

حتی اگر قیامت کے دن، انسان کو اس کے اعمال کی تصویریں دکھائیں، تب بھی وہ انکار نہیں کرسکتا ہے۔ چہ جائے کہ اسے عین اعمال یا ان کی تصورت دکھائے جائے گی: فلاں گھڑی یا فلاں رات کو تم نے ایسا کیا ہے، اس وقت جب خدا کے حضور حاضر ہوا ہے، اس پر ایک ایسی شرم طاری ہوگی جو تمام عذاب سے سخت ہے۔

انسان کو محشر کی یاد ذہن میں تازہ کرنے کے لئے اور خدا کے سامنے اس کے اعمال پیش کئے جانے کو اپنے سامنے مجسم کرنا چاہئے، یا اگر اس دنیا میں کسی رسوائی سے روبرو ہوا ہے، تو اسے اپنے سامنے مجسم کرے، مثال کے طور پر کبھی پوشیدہ طور پر ایک بڑا کام انجام دے رہا تھا، اچانک ایک بچہ آکر اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لے۔ شاید اس قسم کی روداد ہر ایک کے لئے پیش آئی ہوگی کہ دائیں بائیں توجہ کئے بغیر کسی بُرے کام میں مشغول تھا اور اچانک معلوم ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا تھا۔ ایسے موقع پر انسان اس قدر شرمندہ ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے لئے زمین دھنس جائے اور زندہ دفن ہو جائے، اب اگر دیکھنے والا بچہ نہ ہو اور عاقل و باشعور ہو یا اس شخص پر کوئی حق رکھتا ہو اور وہ ناپسند کام اس کے حق میں خیانت حساب ہوتا ہو تو اس کی بات ہی جداگانہ ہے۔

اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے کہ جو کچھ ہمارے اختیار میں ہے وہ خدا کی طرف سے ہے ہر نامناسب عمل خدائے متعال سے خیانت ہے۔ اگر انسان صحیح طور پر سوچ لے، تو اسے معلوم ہوگا کہ صاحب

حق کے حضور میں اس کا گناہ انجام دینا اس کے ساتھ خیانت تھی۔ اسے معلوم ہوگا کہ جس کی وہ معصیت اور نافرمانی کرتا ہے، اس گناہ کو انجام دینے میں بھی اس کی ہستی اور قدرت اس کی طرف سے ہے۔ سانس لینے اور بات کرنے کی طاقت جو کچھ ہم رکھتے ہیں، اس کی طرف سے ہے۔ اس نے یہ سب نعمتیں اور توانائیاں ہمیں عطا کی ہیں تا کہ تکامل وترقی کی راہ میں اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے ان سے استفادہ کریں، کتنی شرم ناک بات ہے کہ ہم خدا کی نعمتوں کو اس کی نافرمانی، معصیت، اس سے دوری اور اس سے خیانت کے لئے استفادہ کریں!

مذکورہ بیان کے پیش نظر، اگر انسان کسی رات کو چند لمحہ اپنے نفس کے محاسبہ کے لئے مخصوص کرلے اور اپنے سامنے مجسم کرے کہ اس نے اس خدا کے سامنے گناہ انجام دیا ہے، جس کی طرف سے سب چیزیں ہیں۔ یقیناً یہ محاسبہ اور توجہ کہ خدا کے حضور میں گناہ انجام دیا ہے، گناہ میں تخفیف کا سبب بنتا ہے۔ حتی اگر توبہ نصوح بھی نہ کرے جو تمام گناہوں کو نابود کردیتی ہے، یہی شرمندگی کا احساس گناہ کے بوجھ کو تھوڑا سا کم کرتا ہے اور گناہ کے پھیلنے اور اس کے آثار کے باقی رہنے کو روکتا ہے، اور اس کے بعد انسان آسانی کے ساتھ مرتکب گناہ نہیں ہوتا ہے۔ اب اگر یہ تصور کہ وہ ہر وقت خدا کے سامنے ہے، تنبیہ وتوجہ کی حالت میں اس کے لئے ملکہ اور عادت بن جائے تو پھر وہ کبھی گناہ نہیں کرے گا۔

شرم وحیا کا مفہوم اور اس کی حد:

اعمال کا خدا کے حضور پیش ہونے اور شرم وحیا کے بارے میں مذکورہ بیانات کے ضمن میں حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیث کے دوسرے حصہ میں مسئلہ حیا کے بارے میں بیان فرماتے ہیں:

"یا اباذر؛ استح من اللّٰہ فانی والذی نفسی بیدہ لا ازال حین اذھب الی الغائط متقنعاً بثوبی استحیی من الملکین اللذین معی"

"اے ابوذر! خدائے متعال سے حیا کرو، اس خدا کی قسم جس کے اختیار میں میری جان ہے، جب میں بیت الخلا میں جاتا ہوں، اپنے ہمراہ دو فرشتوں سے شرم کی وجہ سے اپنے سر اور چہرے کو چھپاتا ہوں"

شرم وحیا کا مسئلہ انتہائی اہم ہے، افسوس کہ اس کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں ہیں، دشمنوں کے ثقافتی نفوذ کے نتیجہ میں، شرم وحیا کے بارے میں ہمارے لئے فکری مشکلات پیدا ہوگئی ہیں۔ اس لحاظ سے

مناسب ہے اس موضوع پر کچھ تحقیق انجام دی جائے۔ اگر چہ ہم چاہتے ہیں اس فرصت میں موعظوں کے بیان پر اکتفا کریں، شاید ان مباحث کو بیان کرنے کے لئے جلسہ میں آمادگی نہ ہو، لیکن اس مسئلہ کی فکری بنیاد کی طرف اشارہ کرنا ضروری جانتا ہوں:

ہم سب جانتے ہیں کہ اسلامی تہذیب میں، شرم وحیا اقدار میں شمار ہوتی ہے اور گستاخی، بے شرمی ناہمواری اقدار کے مقابل میں اس کی ضد شمار ہوتی ہے۔ پہلے جب کسی کو بُرا بھلا کہنا چاہتے تھے، تو اسے کہتے تھے: گستاخ، کیونکہ کلمہ گستاخ، گالی محسوب ہوتا تھا۔ اگر اس سے غلیظ اور عظیم گالی دینا چاہتے تو کہتے تھے: بے شرم! بے شرم بہت بڑی گالی تھی، یہ ہماری تہذیب ہے۔ لیکن آج مغربی تہذیب اور کفر کی دنیا شرم وحیا کو عیب جانتے ہیں۔

آج جس مسئلہ کا، علم نفسیات، فلسفہ اخلاق اور تعلیم وتربیت میں فراوان استفادہ ہوتا ہے وہ مسئلہ شرم اور بے حیائی ہے، کیا علم نفسیات، اخلاق اور تربیتی اصول کے نقطہ نظر سے انسان کو باشرم یا بے شرم ہونا چاہئے؟ البتہ جو ہم کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب میں انسانی تہذیب کے برخلاف بے شرمی کی ترویج کی جاتی ہے، اس معنی میں نہیں ہے کہ شرم وحیا کے بارے میں ہمارا تصور اور شیوہ مکمل طور پر صحیح ہے، اس لحاظ سے یہ موضوع قابل بحث وتحقیق ہے اور مطلب کو واضح کرنے کے لئے ہم انسان میں شرم وحیا کی بنیاد کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

انسان میں موجودہ فطرت کی بنیاد پر، اگر انسان کوئی ایسا کام انجام دے کہ اسے بُرا جانتا ہو، تو اس میں شرم نام کا ایک مخصوص ردِ عمل پیدا ہوتا ہے۔ البتہ اس روحی تأثر عمل کی پیدائش دو امر پر منحصر ہے: پہلے یہ کہ انسان اسی کام کو برا جانتا ہو، دوسرے یہ کہ اس کی فطرت پامال نہ ہوئی ہو چونکہ انسان کے فطری حالات بہت ہیں، لیکن جب اس نے اپنی فطرت کو پامال کر دیا، تو اس کے فطرت کمزور پڑ گئی اور آہستہ آہستہ نابود ہونے لگی پس، بُرے کام کے مقابل میں شرم کا احساس، ایک فطری امر ہے، لیکن برائی کی شناخت کبھی، عقل کے توسط سے انجام پاتی ہے اور بعض مواقع پر تعلیم وتربیت کے ذریعہ اور بعض مواقع پر انسان محیط (ماحول و معاشرہ) کے تابع ہوتا ہے کہ کس چیز کو بُرا اور کس چیز کو اچھا سمجھے۔

ابتدا میں ماں باپ اپنے بچے کو یاد دلاتے ہیں کہ کونسی چیز بُری ہے اور کونسی چیز اچھی، اب اگر یہ تلقین اور یاد دلانا صحیح انجام پایا ہے تو جب بچہ کسی بُرے کام کا مرتکب ہو جائے اور اسے معلوم ہو جائے کسی

دوسرے نے اسے دیکھ لیا ہے، تو وہ فطری جبلت کی بنا پر شرمندہ ہوتا ہے اور سر جھکا لیتا ہے اور کبھی پسینہ پسینہ ہو جاتا ہے۔ اس بچے کی طرف سے برے کام کے مقابل قدرتی امر ہے، کیونکہ اس نے اچھے اور بُرے کو تعلیم وتربیت سے سیکھا ہے۔

غلط رسم ورواج کے فروغ پانے کے عوامل:

اخلاقی واسلامی اقدار کے علاوہ بعض آداب ورسوم، محیط اور سماج کی چاہت کے اثر سے یا قوم پرستی اور دوسری قوم اور نسلی شرائط کی وجہ سے ہم میں رائج ہوگئی ہے کہ جن کی بنیاد پر ہم بعض چیزوں کو نیک وبد جانتے ہیں۔ یہ نظریہ شرع سے مربوط نہیں ہے بلکہ ممکن ہے مخالف شرع بھی ہو، مثلاً ہم بُرا جانتے ہیں کہ بچے بڑوں کے سامنے بات کریں، ہم اسے کہتے ہیں: چپ ہو جاؤ بُرا ہے، چونکہ اس بچے نے اچھے اور بُرے کو ماں باپ اور اپنے پاس لوگوں سے سیکھا ہے، تصور کرتا ہے فلاں کام بُرا ہے، یہی کہ وہ دیکھتا ہے دوسرے لوگ اس کے کام کے مقابل میں منفی ردِّ عمل دکھاتے ہیں، ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور ناپسند رفتار دکھاتے ہیں تو کام کی برائی کو سمجھتا ہے اور اس کو بجالاتے وقت شرم وحیا کا احساس کرتا ہے، اسی لحاظ سے بزرگوں کے سامنے بات کرنے کی جرات نہیں کرتا ہے، کلاس میں استاد سے سوال کرنے میں شرماتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے لئے یہ حالت ملکہ میں تبدیل ہو جاتی ہے اور جتنا آگے بڑھتا ہے اور اس کی عمر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے پھر بھی بات کرتے وقت اس میں شرم وحیا کی حالت پیدا ہوتی ہے: جب درس خارج میں اعتراض کرنا چاہتا ہے، اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اور اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے۔

یقیناً شرع پسند نہیں کرتی ہے کہ انسان اپنی بات نہ کہہ سکے اور اگر سوال کرنا چاہتا یا کوئی سچی بات کرنا چاہتا ہو تو اسے بیان نہ کر سکے۔ اس قسم کا غلط تصور عورتوں کے شرم وحیا میں بھی ہے: ہماری تہذیب میں عورت کا سب سے بڑا سرمایہ، شرم وحیا ہے، لیکن اس قیمتی مفہوم کے مصادیق کے بارے میں ہمارے معاشرے میں کچھ بے جا افراط موجود ہیں۔ ایک باشرم اور باحجاب لڑکی کی ایسی تربیت کرتے ہیں تا کہ کسی نامحرم مرد کے سامنے بات نہ کر سکے اور اسے سمجھاتے ہیں کہ یہ عمل شرم وحیا کا انعکاس ہے! اسلام کے نقطۂ نظر سے، ایک عورت کو دوسرے کے سامنے بولنے کی طاقت کو اپنے اندر اجاگر کرنا چاہئے، لیکن یہ امر بہت بجا اور پسندیدہ ہے کہ جہاں پر اسے بات نہیں کرنی چاہئے، وہاں پر بات نہ کرے، یا اس کی آواز اس قدر سریلی نہ ہو کہ دوسروں کے جذبات کے مشتعل ہونے کا سبب بنے، لیکن اسے یہ عادت بھی نہیں بنانی چاہئے کہ کبھی

نامحرم اس کی آواز نہ سننے پائے۔ حقیقت میں ہم مسائل اور مختلف جوانب کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکے ہیں۔

اگر دوسروں کے سامنے عورت کا بولنا ناپسند ہوتا، تو حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کیوں مسجد النبی میں وہ شعلہ بیاں تقریر کرتیں؟ یا حضرت زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا کیوں ابن زیاد کے دربار میں زبانوں کو کھولتیں؟ جنھیں، شرع کہا جاتا ہے: عورت کو ایسے بات نہیں کرنی چاہئے جو دوسروں کو مشتعل اور منحرف کرنے کا سبب بنے اور اس کے بولنے کا انداز شہوت کو ابھارنے کا سبب بنے، ورنہ شائستہ نہیں ہے کہ عورت بولنے کی جرأت نہ رکھے۔

بعض مسائل خاص کر اخلاقی و تربیتی اقدار میں ہم بعض افراط اور تفریط سے کام لیتے ہیں کہ جن کے بہت بُرے اثرات رونما ہوئے ہیں۔ یورپیوں نے جب ہمارے افراط کے بُرے اثرات دیکھے، تو انہوں نے ان منفی آثار کو روکنے کی کوشش کی اور وہ تفریط کے شکار ہو گئے اور خود اقدار کو بالائے طاق رکھدیا: ہم نے اپنے بچوں کو شرمیلا بنا دیا تا کہ بزرگوں کے سامنے بات نہ کر سکیں۔ ہم نے عورتوں کی ایسی تربیت کی کہ وہ مردوں کے سامنے بول نہ سکیں۔ انہوں نے جب دیکھا کہ یہ ایک نامناسب اور غلط کام ہے، تو کہا: بچہ کو ہر کام میں آزاد ہونا چاہئے، عورت کو آزاد ہونا چاہئے اور کسی چیز کی پروا اور شرم نہیں کرنی چاہئے، حتی اگر مردوں کے سامنے ننگی بھی ہو جائیں۔ ہمارے شرم و حیا کے اس بے جا تصور کا مغرب میں یہ ردِ عمل ہوا کہ انہوں نے حدود و قیود کو بالکل ہی ہٹا دیا:

''الجاهل اما مفرط و اما مفرط'' ''نادان اور جاہل یا افراط کرتا ہے یا تفریط''

نہ ہم نے اسلام کو صحیح پہچانا ہے اور نہ وہ صحیح راستہ پر چلے ہیں، نہ ہم نے صحیح معنوں میں اسلامی اقدار کا استفادہ کیا ہے اور نہ انہوں نے الٰہی اقدار پر توجہ کی ہے۔ البتہ ان سے توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ان کی فکری بنیاد ہی فاسد ہے۔ معلوم نہیں ہے کہ وہ خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ یورپ میں حتی کلیسا جانے والے معتقد عیسائی بھی معلوم نہیں دین پر اعتقاد رکھتے ہیں یا نہیں، وہ صرف زبان سے دین اور دینی قدروں کے ساتھ دلچسپی رکھنے کا اظہار کرتے ہیں ورنہ وہ حقیقت میں دین کے بارے میں کوئی میلان نہیں رکھتے ہیں۔ لہذا ان سے کسی قسم کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم نے کیوں اسلام کے حقائق کو نہیں پہچانا اور ان پر صحیح عمل نہیں کیا ہے، تا کہ ان کا صحیح استعمال کر کے اس سے شائستہ استفادہ کرتے اور دوسروں کی

مذمت کا نشانہ نہ بنتے۔

گزشتہ مطالب کے پیش نظر ضروری ہے کہ شرم و حیا کے حدود معین ہو جائیں، یہ کہ حیا کا مفہوم کیا ہے اور کہاں پر حیا کی جانی چاہئے اور کہاں پر شرم و حیا ناپسند اور قابل مذمت ہے؟ یقیناً احساس شرمندگی ہر موقع پر مطلوب نہیں ہے اور ہر کمزوری جو شرم کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے مطلوب نہیں ہے۔ ہمیں اچھے اور بُرے کو پہچاننا چاہئے اور دونوں کو قوی استدلال اور شرع کے مطابق ایک دوسرے سے ہماہنگی چاہئے۔ ہم کیوں بچے سے کہیں کہ بزرگوں کے سامنے بولنا بُرا ہے؟ کیا یہ حکم خدا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے؟ کیا ائمہ اطہار علیہم السلام کی سیرت یہی تھی؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ جی ہاں چیخ پکار کسی کے لئے مطلوب نہیں ہے، البتہ بچہ تدریجاً اور دوسروں کی صحیح تربیت سے سمجھ سکتا ہے کہ اسے ایسے بولنا چاہئے کہ مخاطب سن پائے اور حد سے زیادہ اس کی آواز بلند نہیں ہونا چاہئے، نہ یہ کہ بالکل بات ہی نہ کرے۔

کسی نے کہا ہے کہ عورت میں اس قدر جرأت کم ہو کہ دوسروں کے سامنے بات کرنے کی اس میں ہمت نہ ہو یا اگر عدالت میں اپنا حق ثابت کرنا چاہے یا کسی جگہ پر نہی از منکر کرنا چاہے، تو اس میں قدرت نہ ہو؟! لہٰذا، ہمیں خوب اور بد کو اسلامی معیاروں کے مطابق پہچاننا چاہئے، ہمیں جاننا چاہئے کہ اسلام کی نظر میں حقیقت میں خوب و بد کونسی چیزیں ہیں پھر حقیقی بد کے مقابل میں شرم و حیا مطلوب ہے، نہ کہ ایک سماج اور قوم و ملت یا کسی نسل یا علاقہ کے پیدا کئے گئے رسم و عادت کے سامنے شرم کرنا، یہ شرم و حیا آداب و رسوم کی پیداوار ہیں، نہ اخلاقی و معنوی اقدار کی۔ آداب و رسوم اگر اسلامی قدروں کی بنیادوں پر ہوں، تو قابل احترام ہیں اور اگر حق اور الٰہی اقدار کے خلاف ہوں تو کے مخالف ہیں۔ اس لحاظ سے، ہمیں اسلام کے احکام پر صحیح عمل اور پیروی کرنے کے لئے، ابتدا میں حقیقی خوب و بد کو پہچاننا چاہئے تا کہ جان لیں کہ کن اعمال اور رفتاروں کے سامنے شرم و حیا کرنی چاہئے۔

بیان کیا گیا کہ خوب و بد کو غریزہ فطری کی بنیاد پر پرکھنا چاہئے اور انسان کو غلط کام انجام دینے کے بعد شرم محسوس کرنا چاہئے اب اگر یہ غریزہ فطرت سے برسر پیکار ہو جائے، تو تدریجاً شرم و حیا کی یہ فطری جبلت ضعیف ہو کر انسان میں بے حیائی کی عادت رسوخ کرنے لگتی ہے۔ یہ امر شرم و حیا سے مخصوص نہیں ہے، بلکہ اگر انسان ہر فطری امر کے مقابل میں مقاومت کرے، تو وہ فطری امور رفتہ رفتہ ضعیف اور بے اثر ہونے لگتے ہیں، جب انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کے انجام کے بارے میں بے تفاوتی سے کام لیتا ہے

تو آہستہ آہستہ ان میں گناہ کا ملکہ تقویت پاتا ہے، اور اس کے بعد اگر یہ تصور بھی کر لے کہ خدا کے حضور میں گناہ انجام دے رہا ہے پھر بھی احساس شرمندگی نہیں کرتا، کیونکہ اس کی فطرت مردہ چکی ہے۔

بیشک، محاسبہ نفس کا فقدان اور مسلسل پے در پے گناہ کا مرتکب ہونا فطرت کو رفتہ رفتہ بے اثر کر دیتا ہے اور نتیجہ کے طور پر انسان ہر قسم کے گناہ کو انجام دینے میں کوئی پروا نہیں کرتا اور اس کا ضمیر اس کی سرزنش نہیں کرتا، جو انسان ہر بُرے کام کو انجام دینے پر شرمندہ ہوتا تھا، اب شرمندگی کا احساس نہیں کرتا ہے، البتہ دوسرے عوامل بھی موجود ہیں جو احساس شرمندگی کو نابود کرنے کا سبب بنتے ہیں اور روایتوں میں ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن بے شرمی اور بے حیائی کا اصل عامل، شرم و حیا کے فطری ہونے کے مقابلے میں مقاومت اور اس کی بے اعتنائی ہے۔ اس کے مقابل میں اس فطرت کی تقویت کے لئے بعض نکات کی رعایت کی جانی چاہئے کہ من جملہ ان میں ایک نکتہ یہ ہے جس کی طرف اس روایت میں اشارہ کیا گیا ہے:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس روایت میں جناب ابوذرؓ کو خدا سے شرم کرنے کی نصیحت فرماتے ہیں اور اس کے بعد فرماتے ہیں: ''جب میں بیت الخلا میں جاتا ہوں، اپنے سر اور چہرے کو چھپا لیتا ہوں، اور اپنے ہمراہ موجودہ فرشتوں سے حیا کرتا ہوں'' یہ رفتار، شرم کی جبلت کو تقویت بخشنے کے لئے ہے۔

ابوسعید خدری نے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بے انتہا شرم و حیا کے بارے میں کہا ہے:

''کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم' اشد حیاءً من العذراء فی خدرھا و کان اذا کرہ شیئاً عرفناہ فی وجھہ'' [1]

''رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجلہ عروسی کی دلہن سے زیادہ باحیا تھے، جب آپؐ کسی چیز سے رنجیدہ ہوتے تھے اس کو (زبان پر نہیں لاتے تھے) ہم آپؐ کے چہرہ سے سمجھ لیتے تھے''

معروف ہے کہ جناب سلمانؓ نے فرمایا ہے: ''میں نے عمر بھر میں اپنی شرم گاہ پر نظر نہیں ڈالی ہے''! جناب سلمانؓ بوڑھے تھے۔ وہ طولانی عمر کے مالک تھے۔ یقیناً جس کا ایسا جذبہ ہو، وہ کبھی زنا نہیں کرتا۔ لیکن اگر انسان لاپروا ہو، خوب و بد میں فرق نہ کرتا ہو، رفتہ رفتہ اس کی فطری شرم و حیا نابود جا ہوتی ہے اور گناہ کے عامل و محرک اسے معصیت و لغزش کی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ وہ ہمیشہ نابودی کے دہانے پر قرار پاتا

۱۔ بحار الانوار، ج ۱۶، ص ۲۳۰

ہے اور منتظر ہوتا ہے کہ ہوا کا ایک جھونکا آئے اور وہ گر جائے۔ لیکن اگر ابتدا سے اپنی رفتار کے بارے میں ہوشیار رہے اور فطرت کو تقویت بخشنے والے عوامل کو اپنے اندر اجاگر کرے، تو شرم وحیا کا جذبہ اس میں تقویت پائے گا اور وہ گناہ سے آلودہ نہیں ہوگا۔

پچیسواں درس:

بہشت تک پہنچے کا راستے اور حیائے الٰہی کے جلوے

- طولانی آرزوں کی مذمت اور امید سے اس کا فرق
- دنیا، وسیلہ یا ہدف و مقصد
- غنی مطلق کی طرف توجہ، غیر خدا سے بے نیازی کا سبب
- موت کی یاد اور حیائے الٰہی کے جلوے
- آرستگی، اولیائے دین کی سیرت

بہشت تک پہنچنے کا راستہ اور حیائے الٰہی کے جلوے

"یا اباذر؛ اتحب ان تدخل الجنة ؟ قلت: نعم فداک ابی قال: فاقصر من الامل واجعل الموت نصب عینیک واستح من اللّٰہ حق الحیاء قال قلت: یا رسول اللّٰہ کلنا نستحیی من اللّٰہ قال: لیس ذٰلک الحیاء ولکن الحیاء من اللّٰہ ان لاتنسی المقابر والبلیٰ' والجوف وماوعیٰ' والراس وما من حوی ومن اراد کرامة الآخرة فلیدع زینة الدنیا فاذا کنت کذٰلک' اصبت ولایة اللّٰہ"

گزشتہ درس میں ہم نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موعظہ کے ایک حصہ پر بحث وتحقیق کی جس میں خدائے متعال سے شرم وحیا کی نصیحت کی گئی تھی۔ حدیث مبارک کے اس حصہ میں بھی رسول خداؐ دوسری نصیحتوں کے ضمن میں، خدائے متعال سے شرم وحیا کے بارے میں دوبارہ یاددہانی فرماتے ہیں اور جناب ابوذرؓ سے فرماتے ہیں:

یا اباذر؛ اتحب ان تدخل الجنة ؟

''اے ابوذر! پسند کرتے ہو کہ تم بہشت میں داخل ہو؟''

جناب ابوذرؓ جواب میں عرض کرتے ہیں:

نعم فداک ابی .. ''جی ہاں، میرے باپ آپؐ پر قربان ہوں۔''

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذر سے بہشت اور ابدی سعادت کے بارے میں تین بنیادی شرائط بیان فرماتے ہیں:

۱۔ فاقصر من الامل، دور و دراز آرزوؤں کو اپنے دماغ سے نکال دو

۲۔ واجعل الموت نصب عینیک، موت کو ہمیشہ اپنے نزدیک تصور کرو

۳۔ واستح من اللّٰہ حق الحیاء۔ خدا سے اسی طرح شرم و حیا کرو جس کا وہ مستحق ہے

طولانی آرزوں کی مذمت اور امید سے اس کا فرق:

روایتوں میں جن موضوعات کے بارے میں فراوان تاکید کی گئی ہے، ان میں مومن کا طولانی آرزوؤں سے فرار کرنا بھی ہے، طولانی آرزوئیں اس امر کا سبب بنتی ہیں کہ انسان الٰہی فرائض اور معنوی مقاصد میں پیچھے رہے اور ان آرزوؤں تک پہنچنے کے لئے فرائض الٰہی سے پہلو تہی کرے، ہمیشہ اپنے حال پر نظر نہ رکھے اور فرصتوں سے استفادہ نہ کرے اور کل کی فکر میں قابل قدر فرصتوں کو کھو دے، انسان کو کمال اور آخرت کی ابدی سعادت سے محروم کرنے کے لئے ناشائستہ طولانی آرزوؤں کو شیطان ایک کار آمد سہارے کے طور پر استعمال کرتا ہے تا کہ بندگانِ خدا کو گمراہ کرے:

جب خدائے متعال نے شیطان کو اپنی بارگاہ سے نکال باہر کیا' شیطان نے کہا:

﴿...لأتخذن من عبادک نصیباً مفروضاً ولأضلنهم ولأمنینهم...﴾

(نساء/۱۱۸و۱۱۹)

''میں تیرے بندوں میں سے ایک گروہ کو اپنے ماتحت قرار دوں گا اور انہیں گمراہ کروں گا۔ امیدیں دلاؤں گا۔''

طولانی آرزوؤں کے خطرات کے بارے میں ان کے ذریعہ انسان کے شبہات سے دوچار ہونے پھر چھوٹے گناہ انجام دینے اور اس کے بعد بڑے گناہوں اور گونا گوں کلمہ کے مرتکب ہونے کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام احساس خطر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ایها الناس ان اخوف مااخاف علیکم اثنان: اتباع الهویٰ وطول الامل فاما اتباع الهویٰ فیصد عن الحق و اما طول الامل فینسی الآخرة..." [1]

اے لوگو! مجھے تم لوگوں کے بارے میں سب سے زیادہ خوف دو چیزوں سے ہے:

ایک ہوائے نفس کی پیروی اور دوسرے طولانی خواہشات، لیکن نفسانی خواہشات کی پیروی انسان کو حق کے راستہ سے روکتی ہے اور طولانی آرزوئیں انسانکے دل سے وآخرت کی یاد کو فراموش کرادیتی ہے۔

امید اور طولانی آرزوؤں میں فرق کو سمجھنے کے لئے، طولانی آرزو کے مفہوم کی وضاحت ضروری ہے، خاص کر اس کے پیش نظر کہ آرزو کے مفہوم سے امید کے معنی بھی نکلتے ہیں، اور حیات اور کوشش کا سرمایہ، خواہ مادی امور میں یا معنوی امور میں امید ہے، اگر کوئی شخص اپنی حالت کی بہتری اور نیک عمال سے نکلنے والے بہتر نتائج کی امید نہ رکھتا ہو، تو وہ نہ دنیا کے لئے کوئی کام بجالائے گا اور نہ آخرت کے لئے قرآن مجید کے فرمان کے مطابق:

﴿من کان یظن ان لن ینصره الله فی الدنیا و الآخرة فلیمدد بسبب الی السماء ثم لیقطع فلینظر هل یذهبن کیده ما یغیظ﴾ (حج/۱۵)

"جس شخص کا خیال یہ ہے کہ اللہ دنیا اور آخرتمیں اس کی مدد نہیں کرے گا اسے چاہیے کہ ایک رسی کے ذریعہ آسمان کی طرف بڑھے اور پھر اس رسی کو کاٹ دے پھر دیکھے کہ اس کی ترکیب اس چیز کو دور کرسکتی ہے یا نہیں جس کے غصہ میں وہ مبتلا تھا۔"

اس تشریح کے پیش نظر، اگر انسان خدا کی مدد کے لئے کوئی امید نہ رکھتا ہو، تو وہ ہمیشہ خشم، غضب، تزلزل اور نا اُمیدی کے دام میں گرفتار رہے گا اور ہمیشہ پریشان اور مضطرب ہوگا اور فرط نا اُمیدی کی وجہ سے اپنی یا دوسروں کی سعادت کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھائے گا، پس امید طولانی آرزو سے متفاوت ہے اور امید انسان کو حرکت میں لانے والا انجن ہے۔ خدا سے امید، اخروی ثواب اور عنایات الٰہی کی امید کا شمار فضائل اخلاقی میں ہوتا ہے۔ اسی روایت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذرؓ سے فرماتے ہیں: کیا بہشت میں جانا پسند کرتے ہو؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امید پسندیدہ اور شائستہ چیز ہے۔ جو ناپسند اور ناشائستہ ہے

۱۔ نہج البلاغۃ (ترجمہ فیض الاسلام) خطبہ ۴۲، ص ۱۲۷

وہ طولانی آرزوئیں اور دنیوی خیال اور تمنائیں ہیں جو مطلوب نہیں ہیں۔ پس مومن ایسا نہیں ہے کہ ناامید ہو بلکہ وہ دنیوی پست اور حقیر آرزوؤں کو اپنے دماغ میں جگہ نہیں دیتا، کیونکہ اس کا دماغ اس سے زیادہ محترم ہے کہ دنیا کی حقیر اور پست آرزوؤں کے بارے میں سوچے، لیکن وہ مکمل طور پر خدا اور اس کے تقرب کی امید میں ہوتا ہے۔

دنیا، وسیلہ یا ہدف و مقصد:

دنیا ذاتی طور پر مطلوب نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلوب ہونا وسیلہ کی حد تک ہے۔ یعنی انسان کو دنیا کے لئے کوشش کرنی چاہیے نہ یہ کہ اس کا مقصد دنیا ہو، دنیا کی تلاش اخروی سعادت کا وسیلہ ہونا چاہیے ورنہ تو جیہ نہیں کی جاسکتی ہے انسان کی طولانی آرزوؤں کے لئے کوشش کی بات ہی نہیں!

دنیا میں انسان کی کوشش فریضہ کو انجام دینے کے لئے ہونی چاہیے اور اس کی فعالیت، خواہ انفرادی مسائل کے بارے میں ہو یا اجتماعی مسائل کے بارے میں خدا کی خوشنودی اور اخروی سعادت حاصل کرنے کے لئے ہونی چاہیے، ورنہ اسلام کی نظر میں، اس کی تلاش و کوشش مطلوب نہیں ہوگی بلکہ قابل مذمت ہوگی، دنیا سے اُمید باندھنا آخرت کے لئے ہونا چاہیے۔

اگر انسان چاہتا ہو کہ اس کے دنیوی امور اور فعالیتیں آخرت کے لئے وسیلہ قرار پائیں، تو اسے توجہ کرنی چاہیے کہ وہ دنیوی فعالیتیں جو آخرت تک پہنچنے کے لئے وسیلہ ہیں وہ معنوی امور کے لئے رکاوٹ کا سبب نہ بنیں کیونکہ انسان کی فکر، اس کا ذہن اور قدرت تخیل کی ظرفیت محدود ہے، جب انسان کسی موضوع کے بارے میں غور و فکر کرتا ہے، تو وہ دوسرے مسائل سے باز رہتا ہے۔ جب اس کی توجہ ایک چیز پر متمرکز ہوتی ہے تو وہ دوسرے مسائل میں پیچھے رہتا ہے۔ اگر انسان شب روز اکثر دنیوی امور کی فکر میں ہو گھر، بیوی، خوراک، لباس اور اپنی اجتماعی حیثیت کے بارے میں خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ دنیا کے بارے میں ہو، اس کی فکر میں اپنے ذہن کو مشغول کرے تو آخرت کے بارے میں فکر کرنے کی اسے فرصت نہیں ہوتی حتی وہ خواب میں بھی ان امور کو دیکھتا ہے۔

اگر انسان اہل کسب و معاش ہو تو، خواب میں چیک اور بینک ڈرافٹ دیکھتا ہے۔ یا اگر معمار ہے تو خواب میں تعمیراتی وسائل اور مسائل کے بارے میں سوچتا اور غور کرتا ہے جس نے شادی نہیں کی ہو وہ خواب

میں اپنی شریک حیات کے انتخاب کی فکر میں ہوتا ہے یا اگر شادی کی ہے اور صاحب اولاد نہیں ہوا ہے تو خواب میں صاحب اولاد ہونے کی فکر میں ہوتا ہے، انسان ان فکری مشغلوں اور مصروفیتوں کی وجہ سے، آخرت، معنویات، اپنی خلقت کے مقصد کے بارے میں اور اپنے دور و دراز مستقبل کے بارے میں غور و فکر نہیں کر پاتا ہے۔

یہی روزمرہ کے امور انسان کے ذہن کو ایسا مشغول کر لیتے ہیں کہ وہ واجب فرائض کو انجام نہیں دے سکتا اور اگر وہ اپنے روزانہ کے مسائل سے فارغ ہوتا ہے تو آئندہ کے سو سال کی فکر میں پڑ جاتا ہے کہ اس کے نواسوں اور آئندہ نسل کا کیا ہوگا؟ اس کی اولاد کس طرح کے وسائل حیات فراہم کریں گی؟ ان کے لئے کس طرح بیوی کا انتخاب کرے اور بیٹیوں کے لئے کیسے شوہر کا انتظام کرے یقیناً ایسا ذہن اور ایسا دل خوشنودی خدا کیلئے معنوی مسائل، اخروی درد، روحی و معنوی بیماریوں اور اجتماعی مصلحتوں کی طرف توجہ نہیں کر سکتا۔

بصد افسوس کہ بعض اوقات حتی معنوی امور بھی دنیا کے لئے آلہ کار بن جاتے ہیں! یہ انسان کے لئے سب سے بڑا انقصان اور بدبختی ہے۔ اگر کسی اہل کسب و معاش نے اپنے کسب و معاش کو دنیوی خواہشات پورا کرنے کے لئے وسیلہ قرار دیا، تو کوئی تعجب نہیں ہے، تعجب اس بات پر ہے کہ دین کو دنیا کے لئے وسیلہ قرار دیا جاتا ہے۔ دین کو دنیوی مقاصد کے حصول کے لئے دوکان قرار دیتا ہے، ایسا شخص دین فروش ہے اور روایت کی تعبیر میں، دین کی راستہ سے رزق کھاتا ہے۔ زہے افسوس! کیا بدبختی ہے انسان کو کتنا بدبخت ہونا چاہئے کہ دینی امور کو دنیا اور دینوی آرزؤں کو پورا کرنے کے لئے وسیلہ قرار دیتا ہے۔ چنانچہ معصومؑ نے فرمایا ہے، ایسے شخص کے دین کی جزا، وہی آمدنی ہے جو دین کے ذریعہ حاصل کرتا ہے اور وہی رزق ہے جسے دین کے وسیلہ سے کھاتا ہے، وہ دین سے اس کے علاوہ کوئی اور فائدہ حاصل نہیں کرتا ہے:

"المستاکل بدینه حظه من دینه مایا کله"[1]

غنی مطلق کی طرف توجہ، غیر خدا سے بے نیازی کا سبب:

اگر مومن معرفت الٰہی اور فرائض الٰہی پر عمل کرنے کی راہ میں گامزن ہو، تو وہ پھر اپنے دنیوی امور

۱۔ بحار الانوار: ج ۷۸/، ص ۶۳/

کے بارے میں نہیں سوچتا، کیونکہ خدا اس کی کفالت کرنے والا ہے اور اس کی دنیوی ضروریات کو پورا کرتا ہے، البتہ نہ اس معنی میں کہ وہ کوئی کام انجام نہ دے، بلکہ وہ اپنے ذہن کو دنیوی امور میں مشغول نہیں کرتا ہے، حتی تاجر، کسان اور صنعت کار، جو اپنے کسب معاش کے لئے کوشش کرتے ہیں، ان کا مقصد خدا کی خوشنودی حاصل کرنا اور اپنا فرض نبھانا ہوتا ہے، نہ صرف دنیوی ضروریات کو پورا کرنا۔

مبارک ہو اس تاجر کے لئے جو دنیا کو آخرت کے لئے وسیلہ قرار دیتا ہے اور افسوس ہو اس شخص کے حال پر جو آخرت کو دنیا کے لئے وسیلہ قرار دیتا ہے، یقیناً ایسا شخص زندگی میں ناکام رہتا ہے اور ہمیشہ اس کا دل مضطرب اور بیقرار رہے گا، کیونکہ باوجود اس کے کہ خود کو دین سے وابستہ اور اس سے آشنا جانتا ہے، دینی اور الٰہی اقدار کو باور نہیں کرتا اور اپنے علم کو عمل کے مطابق قرار نہیں دیتا اور جو کچھ کہتا ہے اس پر ایمان نہیں رکھتا ہے، ایسا انسان خدا کے غیظ و غضب کا مستحق قرار پاتا ہے اور خدائے متعال اس کی دنیا کو پانے والے وسائل کو اس کے سامنے سے ہٹا لیتا ہے، اس لحاظ سے مشاہدہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے لوگ اپنی زندگی میں ہمیشہ شکست اور ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں، نہ دنیا ان کے ہاتھ آتی ہے اور نہ ہی آخرت سے بہرہ مند ہوتے ہیں، لیکن اس کے برعکس جب شخص مومن، ایمان، اعتقاد معرفت الٰہی کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے، تو خدائے متعال اس کی دنیوی زندگی کے بارے میں بھی اس کی رہنمائی فرماتا ہے اور اس کی زندگی کے مسائل کو ایسے حل کرتا ہے کہ وہ دنیا کی طرف فکر کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا اور اس سلسلہ میں تھوڑی سی بھی پریشانی نہیں رکھتا ہے، چنانچہ شب معراج خدائے متعال نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا:

"...وانه ليتقرب الى بالنافلة حتى أحبّه فاذااحببته كنت سمعه الذى يسمع به و بصره الذى يبصربه ولسانه الذى ينطق به ويده التى يبطش بها..."[1]

"بندہ نماز نافلہ (مستحبات انجام دیکر) کے وسیلہ سے مجھ سے تقرب پیدا کرتا ہے تا کہ میں اس سے محبت کروں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاؤں گا جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کی زبان بن جاتا ہوں گا جس سے وہ بات کرتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاؤں گا جس سے وہ حملہ اور دفاع کرتا ہے۔"

۱۔ اصول کافی (باترجمہ) ج ۴/ص ۵۴۸

اس روایت کی سند معتبر ہے، کافی جیسی کتابوں میں درج ہوئی ہے، اس کے مضامین دوسری روایتوں میں بھی آئے ہیں۔ اس روایت میں بیان کی گئی تعبیروں کے بارے میں من جملہ یہ کہ خدائے متعال فرماتا ہے: میں اس کے کان، آنکھ اور ہاتھ بن جاتا ہوں بعض بزرگوں، جیسے شیخ بہائیؒ نے اپنی کتاب اربعین میں نیز امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کی کئی تفسیریں بیان کی ہیں۔

امام خمینیؒ کے بیان کا مضمون کتاب چہل حدیث میں یوں ہے: جس قدر دل غیر حق کی طرف متوجہ ہو جائے اور دنیوی امور کی طرف توجہ کرے اس کی ضرورتیں اور احتیاجات روز بروز بڑھتی جائیں گی۔ لیکن معنوی اور قلبی حاجتیں واضح اور روشن ہیں، کیونکہ دنیا سے اس کی وابستگی اور دلبستگی نے اسکے دل کے تمام زاویے پُر کئے ہیں۔ لیکن خارجی ضرورتیں بھی فطری ہیں جو پھیلتی ہیں، کیونکہ کوئی شخص تنہا اپنے تمام امور کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا، اگر چہ دولت مند افراد ظاہر میں بے نیاز دکھائی دیتے ہیں، لیکن وقت گزرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دولت میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں، پس دولتمند حقیقت میں امیروں کے روپ میں فقیر اور بے نیازوں کے لباس میں حاجتمند ہیں۔

جس قدر انسان کے دل کی توجہ دنیاوی اور دنیا کو آباد کرنے کے امور کی تدبیر کی طرف زیادہ ہوتی جائے گی اتنی ہی زیادہ ذلت وخواری کی گرد اس کے اوپر بیٹھتی جائے گی اور رسوائی کی تاریکی اسے اپنی لپیٹ میں لے لیگی۔ اس کے برعکس اگر کوئی دنیا کی طرف پشت کرے اور اپنے قلب کو غنی مطلق کی طرف متوجہ کرے اور تمام مخلوقات کے ذاتی فقیر ہونے پر ایمان لائے اور جان لے کہ کوئی مخلوق اپنی طرف سے کسی چیز کی مالک نہیں ہے اور کوئی بھی طاقت، عزت وسلطنت خدا کے علاوہ کسی کے لئے نہیں ہے، تو وہ دونوں جہانوں سے بے نیاز ہے اور دل میں ایسی بے نیازی کا احساس کرتا ہے کہ اس کی نظر میں ملک سلیمان کی قدر وقیمت ایک ذرہ کے برابر نہیں ہوتی۔ اگر زمین کے تمام خزانوں کی کنجی بھی اسے دے دی جائے، اعتنا نہیں کرتا، چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ جبرئیلؑ امین خدا کی طرف سے خزانوں کی کنجی حضرت خاتم الانبیاءؐ کے لئے لے آئے تو آنحضرتؐ نے تواضع میں اسے قبول نہیں کیا اور فقر کو اپنے لئے فخر جانا [۱]۔

۱۔ "... وهبط مع جبريل ملک لم يطاء الارض قط' معه مفاتيح خزائن الارض. فقال: يامحمد' ان ربک يقرئک السلام و يقول هذه مفاتيح خزائن الارض: فان شئت فکن نبيا عبداً وان شئت فکن نبيا ملکا فاشار اليه جبريلؑ: ان تواضع يا محمد' فقال: بل اکون نبيا

←

اور حضرت علی علیہ السلام نے ابن عباس سے فرمایا: یہ تمھاری دنیا میری نظروں میں اس پیوندگی جوتی سے پست تر ہے۔ [۱]

وہ جانتے ہیں کہ دنیا کے خزانوں اور اس کے مال و دولت کی طرف توجہ کرنا اور اہل دنیا و اور اہل ثروت کی ہم نشینی دل میں کدورت اور تاریکی پیدا کرتی ہے اور انسان کے ارادہ کو سست کر دیتی ہے اور دل کو محتاج اور نیاز مند بنا کر خدا کی طرف توجہ کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے۔ لیکن جب دل کو صاحب دل اور گھر کو گھر کے مالک کے حوالہ کر دیا اور غاصب کے ہاتھ میں جانے نہیں دیا تو اس دل میں خود اس کا مالک ظہور پیدا کرتا ہے۔ البتہ غنی مطلق کا ظہور بے نیازی مطلق کو لے کر آتا ہے اور دل کو عزت و بے نیازی کے پر تلاطم دریا میں غرق کر دیتا ہے:

﴿وللّٰه العزة ولرسوله وللمؤمنين﴾ (منافقون/۸)

''ساری عزت اللہ، اس کے رسول اور صاحبان ایمان کے لئے ہے۔''

فطری بات ہے جب دل کے امور کو دل کا مالک انجام دے گا، تو انسان کو یوں ہی نہیں چھوڑتا دیگا

۱۔ عبداً ثم صعد الی السماء...''

''خدا کا ایک فرشتہ، جو کبھی زمین پر نہیں آیا تھا، جبرئیل کے ہمراہ زمین پر آیا اور اس کے ہاتھ میں زمین کے خزانوں کی کنجیاں تھیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! پروردگار نے آپ کو سلام بھیجا ہے اور فرمایا: یہ زمین کے خزانوں کی کنجیاں ہیں، اگر چاہتے ہیں تو ایک بندہ کی حیثیت سے پیغمبر رہیں یا ملک سلطنت کی حیثیت سے پیغمبر رہیں۔ اس کے بعد جبرئیل نے اشارہ کیا کہ یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! انکساری سے کام لینا۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں بندہ کی حیثیت سے پیغمبر رہوں گا۔ اس کے بعد وہ فرشتہ آسمان کی طرف واپس ہو گیا''

۱۔ ''...قال عبداللّٰه ابن العباس: دخلت علی امیر المومنین بذی قار وهو یخصف نعله: فقال لی: ماقیمة هذه النعل؟ فقلت: لا قیمه لها' فقال واللّٰه لهی احب الی من امرتکم الا ان اقیم حقاً او ادفع باطلاً...'' (امالی صدوق' مجلس ۹/ص ۳/ح ۲)

''ابن عباس نے کہا: میں ذی قار کے مقام پر امیر المومنین علیہ اسلام سے ملا، وہ اپنے جوتیوں کے ٹانکنے میں مشغول تھے، انھوں نے مجھ سے کہا: اس جوتی کی قیمت کتنی ہوگی؟ میں نے کہا: اس کی قیمت نہیں ہے! فرمایا: خدا کی قسم یہ جوتی میرے لئے آپ لوگوں پر حکومت کرنے سے زیادہ عزیز ہے: مگر یہ کہ حق کو قائم کروں اور باطل کو دور کروں'' (نہج البلاغہ (ترجمہ فیض الاسلام) خ ۳۳' ص ۱۱۱)

اور بندہ کے تمام امور میں خود دخل دیگا بلکہ خود اس کیلئے کان، آنکھ اور ہاتھ پاؤں بن جائیگا.... اس صورت میں بندہ کی محتاجی اور اس کا فقر مکمل طور سے برطرف ہو جائیگا اور وہ دونوں جہاں سے بے نیاز ہو جائے گا۔

البتہ حق کے اس ظہور میں تمام مخلوقات کا خوف اس سے دور ہو کر اس کی جگہ پر خدائے متعال کا خوف جانشین ہوگا اور حق کی عظمت و حشمت پورے دل پر سایہ فگن۔ غیر حق کے لئے کسی قسم کی عظمت، حشمت نیز تصرف کی گنجائش نہیں ہوگی اور "لا مؤثر فی الوجود الا اللہ" [1] کی حقیقت کو پالے گا۔

روایت "..... وانہ لیتقرب الیّ ....." کے لئے جو سادہ ترین تفسیر کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ خدائے متعال فرماتا ہے: جو کام انسان کے لئے اس کی آنکھ اور کان انجام دیتے ہیں، میں انجام دیتا ہوں۔ جو کام اس کے ہاتھ اس کے لئے انجام دیتے ہیں، میں انجام دیتا ہوں۔ اسے اپنی مادی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کوشش کرنی چاہیے تاکہ اپنی حاجتوں کو برطرف کر سکے، لیکن میں کام کو ایسے مرتب کرتا ہوں کہ کام خود بخود انجام پاتے رہیں تاکہ اسے ذہن پر دباؤ ڈالنے کی ضرورت نہ پڑے کہ کل کیا کروں!، جب وہ گھر سے باہر آتا ہے، خدائے متعال کے ارادہ سے اور اس کے فراہم کردہ اسباب سے، شاید بندگان خدا میں سے کسی بندہ کے توسط سے اس کا کام انجام پا جائے اسے مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور خدائے متعال اسے غیبی طور پر مدد پہنچاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ عالم غیب سے براہ راست اور بلا واسطہ اس کے کام انجام پاتے ہیں بلکہ مفہوم یہ ہے کہ تمام امور کی تدبیر اور تمام کاموں کی مہارت اس کے ہاتھ میں ہے، وہ عوامل اور وسائل کو ایسے منظم کرتا ہے کہ کام بخوبی آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ بغیر اس کے کہ انسان زیادہ فکر کرنے اور منصوبہ بندی کی ضرورت کا احساس کرے۔

مومن کو اپنے امور اور کی ترقیکے لئے شیطانی منصوبے اور خاکے کھینچنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ جب وہ یقین رکھتا ہے کہ اس کی مختصر ضرورتوں کو خدائے متعال پورا کرے گا، تو وہ طولانی آرزوں کو اپنے ذہن میں پلنے نہیں دیتا اس کا کام صرف فریضہ انجام دینے کے لئے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر انسان صرف مال و دولت کو جمع کرنے اور کسب معاش اور آمدنی کو اضافہ کرنے کی فکر میں پڑے تاکہ دنیا کی رونق اور اس کی چمک دمک میں اضافہ کرے۔ مسلسل گھر کے ڈیکوریشن کو تبدیل کرتا رہے اور نئے ماڈل کی گاڑی خریدے چونکہ یہ سلسلہ طولانی ہے، کسی جگہ پر ختم نہیں ہوتا ہے اور امام خمینیؒ کی فرمائش کے مطابق اگر تمام کرۂ

۱۔ امام خمینی "چہل حدیث" ص ۴۴۴۔۴۴۵

ارض کو بھی اس کے اختیار میں دیدیا جائے، وہ مطمئن نہیں ہوگا بلکہ وہ اس فکر میں ہوگا کہ کسی اور کرہ کو بھی اس کے اختیار میں دیا جائے!

موت کی یاد اور حیائے الٰہی کے جلوے:

جو کچھ بیان ہوا اور جس کے بارے میں ہم نے پہلے بھی یاد دہانی کی، اس کے پیش نظر، پیغمبر اسلام ﷺ نے بہشت میں داخل ہونے کے لئے تین شرطیں ذکر فرمائی ہیں:

پہلی شرط یہ ہے کہ انسان اپنی آرزوؤں کو مختصر کرے، دنیا سے دلبستگی نہ رکھے، آئندہ کے بارے میں فکرمند نہ رہے، صرف آخرت کی فکر میں رہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ ہمیشہ موت کی یاد میں رہے۔ پہلی شرط کے بعد اس شرط کا ذکر ان دونوں کے درمیان قریبی رابطہ کی دلیل ہے، کیونکہ اگر انسان اپنی طولانی آرزوؤں کو اپنی فکر کے دائرہ سے دور کرنا چاہے، تو اسے مسلسل موت کی فکر میں رہنا چاہیے، چونکہ جب انسان موت کو مدنظر رکھتا ہے تو دنیوی آرزوؤں کا انجام اور ان کا لغو و بیہودہ ہونا بھی اس کی نظروں کے سامنے مجسم ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے طولانی آرزوؤں اور موت کے بارے میں سوچنے کے درمیان قریبی رابطہ ہے۔

آرزو کرنا اور آرزو رکھنا مکمل طور پر انسان کے اختیار میں نہیں ہے، جب انسان ایک ایسے ماحول میں تربیت پائے جس پر مادیات کی تہذیب حاکم ہو، تو دیکھنے اور سننے کی چیزیں اس پر اثر ڈالتی ہیں اور اس کی آنکھیں اور کان کو دنیا کی طرف متوجہ کر کے خواہ نخواہ اس کے دل میں دنیوی آرزوئیں پیدا کرتی ہیں۔ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے کہ دنیا کی چمک دمک ہمیں فریب نہ دے اور ہم طولانی آرزوؤں کو اپنے ذہن میں نہ پالیں، اسی اہمیت کے پیش نظر پیغمبر اسلام ﷺ جناب ابوذرؓ سے تاکید فرماتے ہیں کہ موت کو ہمیشہ اپنے سامنے مجسم تصویر کرو، اگر کوئی ہمیشہ توجہ رکھے کہ اس کی زندگی کا انجام موت ہے تو وہ اس حقیقت کو درک کرلے گا کہ اس دنیا سے دلبستگی کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے، وہ چیز دلبستگی کے لئے لائق و سزاوار ہے کہ جو ختم ہونے والی نہ ہو، اس سے کوئی چیز کم نہ ہو اور وہ آخرت کی حیات طیبہ ہے۔

اگر انسان مسلسل موت کی فکر میں رہے، تو وہ طولانی آرزوؤں، حرص و طمع اور بہت سی دوسری بری عادتوں میں مبتلا نہیں ہوگا۔ پس موت کی یاد آفتوں اور معنوی و روحانی بیماریوں کے لئے ایک موثر دوا ہے۔

فطری طور پر موت کی طرف توجہ پیدا کرنا بہت آسان ہے، انسان اپنے گردونواح میں موت کی طرف توجہ کے لئے کچھ مظاہر کا اضافہ کرسکتا ہے، اپنے کمرے یا آفس میں موت کے بارے میں کچھ مطالب لکھ کر سائن بورڈ کے عنوان سے آویزاں کردے، حتی کتاب کے اندر موت کے بارے میں کچھ کلمات تحریر کردے تا کہ اس کو دیکھ کر اسے موت کی یاد آتی رہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک روایت میں فرماتے ہیں:

''اکیس الناس من کان اشدّ ذکراً للموت''[1]

''لوگوں میں چالاک ترین شخص وہ ہے جو موت کو زیادہ یاد کرے۔''

یقیناً چالاک انسان دھوکہ نہیں کھاتا اور دنیا و آخرت میں سے بہترین کو منتخب کرتا ہے۔ جب چالاک انسان جان لے کہ دنیا ختم اور نابود ہونے والی ہے تو اس کے لئے اہمیت اور قدر و قیمت کا قائل نہیں ہوتا ہے۔ بہ ہر صورت موت کو یاد رکھنے کی مشق، دنیا پرستی اور طولانی آرزوں میں مبتلا ہونے سے بچنے کی ایک مؤثر دوا ہے۔

بہشت میں داخل ہونے کی تیسری شرط خدا سے حیا ہے اس کے بارے میں گزشتہ جلسہ میں بھی دوسرے انداز سے اس کی طرف اشارہ ہوا تھا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا سے حیا کرنے کی ضرورت کے بارے میں دوبارہ یاد دہانی کراتے ہیں جس کی وجہ سے، جناب ابوذر یہ محسوس کرتے ہیں کہ حیا کا مسئلہ خاص اہمیت کا حامل ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تھوڑی ہی دیر بعد پھر سے اس پر تاکید فرمائی جس کی وجہ سے ان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مسئلہ پر اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں اور اس کے بارے میں تاکید کیوں کررہے ہیں۔ اور یہ احتمال دے رہے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی خاص مقصد رکھتے ہیں، اس لئے پوچھتے ہیں:

''یا رسول اللّٰہ کلنا نستحیی من اللہ''

''اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم سب خدائے متعال سے حیا کرتے ہیں''

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حیا کی اس حد کو کافی نہ جانتے ہوئے، خدا کی حیا کے تین جلوے بیان فرماتے ہیں۔

---

۱. بحار الانوار: ج/۶، ص/۱۳۰

"لیس ذلک الحیاء ولکن الحیاء من اللّٰہ ان لا تنسی المقابر والبلی"

''خدا سے حیا ایسی نہیں ہے جو دکھائی دے بلکہ خدا سے حیا یہ ہے کہ قبروں اور ویرانوں کو فراموش نہ کرو''

حیائے الٰہی کا پہلا عکس اور الٰہی جلوہ یہ ہے کہ انسان قبرستانوں اور ویرانوں میں تبدیل ہوئی عمارتوں کو فراموش نہ کرے۔ البتہ وہ قبریں جو شاہی محلوں کے مانند مزین کی گئی ہوں اور ان کو دیکھنا انسان کو آخرت کی یاد نہیں دلاتا، بلکہ مراد وہ قبریں ہیں جو ویران ہوگئی ہوں اور ان کی طرف لوگ توجہ کم دیتے ہو۔

اس سے پہلے بھی ہم نے یاد دہانی کرائی کہ انسان کا ذہن محدود ہے، اور اگر انسان مسائل کے ایک سلسلہ کی طرف توجہ دے تو دوسرے مسائل سے باز رہ جاتا ہے اور ان کی طرف جانے کے لئے اس کے ذہن میں ظرفیت باقی نہیں رہتی۔ اگر انسان چاہتا ہے کہ بعض مطلوب حالات اور مطلوب نفسانی تأثرات جیسے: حیا، خوف، شوق الٰہی کہ جو اسلام کی قدر و منزلت کے نظام میں شناختہ شدہ ہیں اور اخلاق میں ان کی تاکید کی گئی ہے، اپنے اندر پیدا کرے، تو اسے ان کے لئے مقدمات فراہم کرنا چاہیے، اگر انسان چاہتا ہو کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیان شدہ مطلوب حیا کے مرتبہ کو اپنے اندر پیدا کرے، تو اسے دنیا کی رعنائیوں اور آشائیوں کو ترک کرنا ہوگا۔ اسے پرانی اور ویران شدہ عمارتوں سے انس پیدا کرنا ہوگا۔ جب انسان کی توجہ ہمیشہ بڑی بڑی اور مجلل عمارتوں پر رہے گی، اس کا دھیان زیبا اور قابل توجہ کاشانوں پر ہوگا، ہر روز اس کی نظر نئے نئے ڈیکوریشنوں، رنگارنگ پردوں پر پڑے گی تو دنیا اس کی نظر میں بیشتر جلوہ پیدا کرے گی۔ اگر وہ ان فریب دینے والے دنیوی مظاہر سے اپنی توجہ کو ہٹانا چاہے تو اسے قبرستان کا رخ کرنا چاہئے اور انسانوں اور زیر خاک سوئے ہوئے مردوں کے انجام پر غور کرنا چاہئے! ویران جگہوں اور کھنڈرات میں جا کر سوچنا ہے یہ پتھر، لوہا اور سیمنٹ جو استعمال ہوئے ہیں، ان کا انجام کیا ہے؟!

غلط فہمی نہ ہو، مقصود یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے گھروں کو خام اینٹوں اور ایسی کمزور بنیادوں پر تعمیر کریں کہ بارش سے خراب ہو جائیں۔ بلکہ اسلام کا حکم یہ ہے کہ انسان ہر کام کو صحیح انجام دے، اگر گھر تعمیر کر رہا ہے تو اسے مضبوط اور پائدار صورت میں تعمیر کرے۔ بات یہ ہے دنیاوی زرق و برق انسان کے دل پر اثر نہ کرے اور وہ دنیا کا شیدائی نہ ہو نہ یہ کہ کام کو صحیح طور پر انجام نہ دے۔ انسان کا فرض ہے اپنے کام میں سنجیدہ ہو لیکن دنیا سے وابستہ نہ ہو جائے۔ جب انسان دنیا کی عیاشیوں کو دیکھتا ہے، فطری بات ہے کہ اس کا دل

ان کی طرف مجذوب ہو جاتا ہے، یہ حالت اختیاری نہیں ہے، جب دیکھتا ہے کہ اس کے ہمسایہ کے پاس گاڑی ہے اور وہ چند مدت کے بعد اس گاڑی کو ایک نئی اور اعلیٰ قسم کی گاڑی میں تبدیل کرتا ہے، اس کے دل میں بھی ہوس پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے آپ سے کہتا ہے: کیوں فلاں شخص مسلسل اپنی گاڑی بدلتا رہتا ہے اور ہم ایک فرسودہ گاڑی کے بھی مالک نہیں ہیں؟ جب وہ گاڑی خریدتا ہے تو دوسرے دن بہتر گاڑی کی آرزو کرتا ہے اور اسی طرح روز بروز، لہذا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاکید یہ ہے انسان کبھی کبھی قبرستانوں ویرانوں اور کھنڈرات کی طرف بھی جا کر جھانکے۔ علمائے اخلاق بھی اپنے شاگردوں کو نصیحت کرتے تھے کہ ہر روز قبرستان جائیں، کم از کم ہفتہ میں ایک بار مستحب ہے قبرستان جائیں تا کہ ان کے دل دنیا کی محبت اور مادی توجہات سے صاف اور فلٹر ہو جائیں کم از کم دنیا و آخرت کے درمیان ایک توازن پیدا ہو جائے۔

ایسا نہیں ہے کہ انسان دنیوی امور کا شیدائی ہو اور دنیا کی محبت اس کے دل پر سایہ کئے ہو اور اسی حالت میں چاہتا ہو کہ خدائے متعال کا خوف بھی رکھے، سحر خیز بھی ہو اور جب امام حُسین علیہ السلام کا نام سنے تو آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہو جائیں، یا جب بہشت کا نام اور اس کی نعمتوں کا ذکر ہوتا ہے، تو اس کے دل میں ان کے بارے میں ولولہ پیدا ہوتا ہے، فطری بات ہے دنیا اور اس کی طرف توجہ نے اس کے دل میں ان امور کے لئے جگہ ہی نہیں چھوڑی ہے، جو دل دنیا کی محبت سے لبریز ہو، اس میں امام حُسین علیہ السلام اور حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کی محبت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی، البتہ یہ معصومینؑ اس قدر نورانی ہیں کہ جب ہمارے مردہ دلوں میں بھی ان کی یاد آتی ہے تو، اثر کرتی ہے، لیکن ان کی یاد آلودہ دلوں پر شائستہ و کما حقہ اثر نہیں کرتی۔

''والجوف و ماوعی'' ''اور یہ کہ شکم اور جو کچھ اس میں ہے، اسے نہ بھولو''

دوسرا ردعمل اور حیائے الٰہی کا جلوہ، یہ ہے کہ انسان دیکھ لے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ اگر انسان نے جو کچھ اسے ہاتھ آیا اس سے استفادہ کیا اور لقمہ حرام کھانے میں کوئی دریغ نہیں کی تو وہ رفتہ رفتہ قساوت سے دو چار ہوتا ہے اور اس کا دل نور الٰہی سے خالی ہو جاتا ہے۔ انسان کو اپنی غذا دیکھنی چاہئے اور اسے توجہ رکھنی چاہیے کہ شبہ والی غذائیں یا خدانخواستہ حرام غذائیں، شقاوت قلب کا سبب بنتی ہیں اور اس کے بعد انسان کے دل میں عبادت کی رغبت، خوف خدا، شوق بہشت اور لقاء اللہ کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، پس خدا کی حیا کو پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے شکم اور اس میں موجود غذا کے بارے میں توجہ کرے۔

قرآن مجید انسان کو نصیحت کرتا ہے کہ اپنی غذا کے بارے میں ہوشیار رہو:

﴿فلینظر الا نسان الیٰ طعامه﴾ (عبس/۲۴)

''ذرا انسان اپنے کھانے کی طرف تو نگاہ کرے''

انسان کو تمام جوانب کی رعایت کرنی چاہیے اور اپنی غذا کو تمام پہلوؤں سے جانچ لینا چاہیے اسے ہوشیار رہنا چاہئے کہ اس کی غذا سالم، حفظان صحت کے مطابق، حلال اور پاکیزہ ہو۔ اصحاب کہف جنہوں نے برترین بندگان خدا کی حیثیت سے شرک و بت پرستی کے نظام کو چھوڑ کر عہد دقیانوسی کے کفر آمیز اعتقادات کے دام سے اپنے آپ کو آزاد کیا، قرآن مجید کی فرمائش کے مطابق غذاؤں میں سے پاکیزہ ترین اور حلال ترین غذاؤں کو منتخب کرتے تھے، قرآن مجید اصحاب کہف کے غار میں سونے کے بعد نیند سے بیدار ہونے کی روداد کو بیان کرنے کے بعد ان کی گفتگو کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿فابعثوا احدکم بورقکم هذه الی المدینة فلینظر ایها ازکیٰ طعاماً فلیاتکم برزقٍ منه﴾ (کہف/۱۹)

''اب تم اپنے سکّے دے کر کسی کو شہر کی طرف بھیجو تا کہ وہ دیکھیں کہ کون سا کھانا بہتر اور پاکیزہ تر ہے اور اس سے تمہارے لئے رزق فراہم کرے۔''

انسان کے انحراف، حق سے کنارہ گیری اور خدا و اولیائے الٰہی کے سامنے گناہ کے مرتکب ہونے میں مال حرام کے اثرات کے پیش نظر امام حسینؑ کے کلام کا اثر لشکر اہل کفر پر نہ ہوا تو فرمایا:

''وکلکم عاص لامری غیر مستمع قولی فقد ملئت بطونکم من الحرام وطبع علی قلوبکم''[1]

''تم سب گناہگار ہو اور بغاوت کر رہے ہو اور میرے حکم کی نافرمانی کر رہے ہو، میری بات پر کان نہیں دھرتے ہو، بیشک تمہارے شکم حرام غذا سے بھر گئے ہیں اور تمہارے دلوں پر مہر لگی ہے''

بیشک حرام لقمہ انسان کو اس قدر قساوت اور سنگ دل بناتا ہے، کہ یہاں تک وہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسہ پر تلوار کھینچنے میں بھی پرواہ نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا

۱۔ بحار الانوار ج/۴۵ ص/۸۸

سے شرم کرنے کے لئے یہ شرط ضروری سمجھتے ہیں کہ انسان توجہ کرے کہ وہ کونسی غذا کھاتا ہے۔

"والراس ومن حوی"[1]

یہ کہ سر اور جو کچھ اس احاطہ میں ہے، یعنی آنکھ، کان اور زبان کو کنٹرول کرو۔ تیسرا عکس العمل اور حیائے الٰہی کا جلوہ یہ ہے کہ انسان دیکھ لے کہ وہ اپنے سر میں کن فکروں اور خیالات کی پرورش کرتا ہے اور کونسی آرزوئیں اور خواہشیں رکھتا ہے۔ اگر وہ اپنے خیالات کا تصفیہ کرے، باطل افکار کو اپنے سر سے نکال باہر کرے، اور اپنا اندرونی تصفیہ کرے تو مطلوب حیا کو اپنے اندر جگہ دے سکتا ہے۔

تزئین وآرائش، اولیاء دین کی سیرت:

حدیث مبارک کو جاری رکھتے ہوئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"ومن اراد کرامة الاخرة فلیدع زینة الدنیا فاذا کنت کذلک اصبت ولایة اللّٰہ"

"جو بھی آخرت کی عظمت و بزرگی چاہتا ہے، وہ دنیا کی زینت کو چھوڑ دے، جب ایسا کرو گے تو خدائے متعال کی دوستی کے مقام تک پہنچے ہو۔"

جب انسان دنیا سے کٹ کر اس کی نسبت بے اعتنائی برتتا ہے تو وہ آخرت، اس کی پائدار نعمتوں اور قرب الٰہی پیدا کرتا ہے اور آخرت میں عزیز، محترم اور باعظمت بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر انسان کی نظر میں دنیا بڑی دکھائی دے تو اس کی نظر میں آخرت چھوٹی ہوتی ہے۔ البتہ آخرت اور موت کے بارے میں فکر کرنا اور قبرستان میں جانا مؤثر ہے، لیکن انسان کو اپنے عمل کے بارے میں بھی نئے سرے سے سوچنا چاہیے۔ دنیا کے پھندے میں نہ پھنسنے کے لئے اسے دنیوی زینتوں اور آرائشوں سے پرہیز کرنا چاہئے، اس صورت میں وہ آخرت میں عزیز اور باعظمت ہوگا۔

یہاں پر یہ اشارہ کرنا ضروری ہے کہ بعض تزئین وآرائش مستحب ہیں، اب اگر انسان انہیں استحباب اور شرعی مطلوبیت کی نیت سے انجام دے، تو نہ صرف وہ دنیا طلب نہیں ہے، بلکہ وہ آخرت طلب ہے، مستحب ہے کہ عورت اپنے شوہر کے لئے اور شوہر اپنی بیوی کے لئے زینت اور آرائش کرے، یا مستحب

۱۔ دوسرے نسخہ میں "وماحوی" ہے اور شاید یہی صحیح ہو۔

ہے کہ مؤمن جب ایک اجتماع میں جائے، تو پاک وصاف لباس پہنے اور عطر لگائے اس کے علاوہ مسواک کرنا، بالوں کی کنگھی کرنا اور بالوں میں تیل لگانا بھی مستحب ہے مؤمن ایسا صاف وشفاف ہونا چاہئے کہ لوگ اس سے ملنے کے لئے رغبت پیدا کریں اور اس سے انس پیدا کریں۔ یقیناً اگر یہ امور قصد قربت کے طور پر انجام دئے جائیں تو عبادت ہیں اور دنیوی زینت شمار نہیں ہوتے ہیں۔ دنیوی زینت اس جگہ پر ہے کہ انسان نفسانی خواہشات اور لذت پانے کے لئے زینت کرے نہ کہ خدا اور آخرت کے لئے۔ انسان کا دل چاہتا ہے کہ صاف ستھرا اور نفیس لباس پہنے، لذیذ اور متنوع کھانا کھائے اور خوشنما اور شاندار گھر کا مالک ہو، لیکن اگر زینت آخرت اور حکم خدا کی تعمیل کے لئے ہو تو مطلوب ہے۔ چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہمیشہ اپنے آپ کو صاف ستھرا اور معطر رکھتے تھے:

مکارم اخلاق میں، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توصیف میں آیا ہے کہ:

"کان ینظر فی المراۃ ویرجل جمتہ ویتمشط وربما نظر فی الماء وسوّی جمّتہ فیہ ولقد کان یتجمّل لأصحابہ فضلاً علی تجملہ لأھلہ وقال صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم ان اللّٰہ یحب من عبدہ اذاخرج الیٰ اخوانہ ان یتھیا لھم ویتجمل" [1]

"پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ آپ آئینہ دیکھتے تھے اور اپنے سر اور داڑھی میں کنگھی کرتے تھے، بعض اوقات یہ کام پانی میں دیکھ کر انجام دیتے تھے، اہل خانہ کے علاوہ اپنے اصحاب کے لئے بھی زینت کرتے تھے اور فرماتے تھے: خدائے متعال اس بندے کو دوست رکھتا ہے جو اپنے بھائیوں کو دیکھنے کے لئے گھر سے باہر جاتے وقت اپنے کو آراستہ کرے۔"

مومن کو ہمیشہ آراستہ اور ظاہراً صاف ستھرا ہونا چاہئے نہ یہ کہ بکھرے بال اور عجیب وغریب صورت بنائے ہو کہ جو دوسروں کی نفرت کا سبب بنے۔ گزشتہ زمانے میں بعض مسجدوں کے فرش میلے اور گندے ہوا کرتا تھا اور بعض لوگ گندے کپڑے اور بدبودار بدن کے ساتھ مسجد میں داخل ہوتے تھے اس کے مقابل میں فاسقوں کی جگہیں صاف ستھری ہوتی تھیں، لہٰذا مومنوں کی مجلسیں، بہترین، صاف ستھری اور

۱۔ المیزان، ج ۶/ص ۳۳۰

معطر ہونی چاہئے۔ ہمیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی سیرت کو نمونہ بنانا چاہئے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے اخراجات کا ایک بڑا حصہ عطر پر خرچ ہوتا تھا۔ ہمیں سبق حاصل کرنا چاہئے اور جاننا چاہئے کہ یہ زینتیں آرائشیں نا مطلوب نہیں ہیں، کیونکہ شرع مقدس کا حکم ہے کہ اگر قصد قربت کی نیت سے انجام دی جائیں تو یہ بذات خود عبادت شمار ہوتی ہیں اور اس کا فلسفہ یہ ہے کہ مومنین آپس میں مانوس ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مصاحبت سے لذت حاصل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے نور سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔

چھبیسواں درس:

مخلصانہ دعا اور شائستہ عمل کا نقش اور اثر

- دعا کے مفہوم کی طرف ایک اشارہ
- دعا اور درخواست میں انسانوں کے مراتب میں فرق
- بارگاہ الٰہی میں فقر و ناتوانی کے اظہار کی اہمیت
- شائستہ اعمال کے ساتھ دعا کے ہمراہ ہونے کی ضرورت
- شائستہ و صالح انسان کے وجود کی برکتیں

مخلصانہ دعا اور شائستہ عمل کا نقش اور اثر

"یا اباذر: یکفی من الدعاء مع البر ما یکفی الطعام من الملح یا اباذر؛ مثل الذی یدعو بغیر عملٍ کمثل الذی یرمی بغیر وترٍ. یا اباذر؛ ان اللّٰہ یصلح بصلاح العبد ولده وولد ولده ویحفظه فی دویرته والدور حوله مادام فیهم."

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موعظہ کا یہ حصہ دعا اور خدائے متعال سے درخواست اور دعا کی عمل صالح کے ساتھ ضرورت اور صالح انسان کا گھر اور معاشرے میں قابل اہم نقش سے مربوط ہے۔ بیشک دعا اور خدائے متعال سے درخواست، بندگی وعبودیت کا ایک مظہر ہے اور اس سلسلہ میں بہت سی آیات وروایات وارد ہوئی ہیں اور اس موضوع پر مفصل بحثیں بھی کی گئی ہیں۔

دعا کے مفہوم کی طرف ایک اشارہ

مرحوم راغب اصفہانی دعا کے بارے مین کہتے ہیں: ''دعا'' مانند ''نداء'' ہے، اس فرق کے ساتھ کہ نداء میں کبھی ''یا'' اس کے علاوہ (الفاظ) سے استفادہ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ کوئی نام نہیں آتا ہے، لیکن لفظ ''دعا'' ایسی جگہ پر استعمال ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ نام آئے، مثال کے طور پر: اے فلاں البتہ دعا و ندا کبھی کبھی ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال ہوتے ہیں۔ [1]

۱۔ راغب اصفہانی، مفردات، مادہ ''عوذ''

علامہ طباطبائیؒ فرماتے ہیں:

خدائے متعال کی دعا کی دو قسمیں ہیں: تکوینی و تشریعی۔ تکوینی کسی چیز کے کی ایجاد کے معنی میں ہے کہ خدائے متعال نے اس کا ارادہ کیا ہے، گویا اس چیز کو اپنے ارادہ کے مطابق بلاتا ہے۔ خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿یوم یدعوکم فتستجیبون بحمده...﴾ (اسراء/۵۲)

''جس دن وہ تمہیں (آخرت کی ابدی زندگی کی طرف) بلائے گا اور تم سب (قبروں سے باہر آجاؤ گے) اور اس کی تعریف کرتے ہوئے لبیک کہو گے۔''

لیکن خدا کی تشریعی دعا اس معنی میں ہے کہ قرآن مجید کی آیات سے لوگوں کو دین قبول کرنے کے لئے مکلف قرار دیتا ہے۔ لیکن بندے کی پروردگار سے دعا، اس معنی میں ہے کہ بندہ خدا کی بندگی اور خدا کے سامنے اپنی غلامی کا کے احساس دلا کر، خدا کی رحمت و عنایت کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس لحاظ سے حقیقت میں عبادت وہی دعا ہے، جسے بندہ اپنی دعا سے (خداوند متعال سے وابستگی اور ذلت کے احساس سے) غلامی کے مرحلہ میں رہ کر اپنے مولا سے ارتباط برقرار کرتا ہے، تاکہ خدائے متعال کو اس کی سرداری اور ربوبیت کا واسطہ دیکر اپنی طرف متوجہ کرے اور یہ وہی دعا ہے اور اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿وقال ربکم ادعونی استجب لکم ان الذین یستکبرون عن عبادتی سید

خلون جهنم داخرین﴾ (غافر/۶۰)

''اور تمہارے پروردگار کا ارشاد ہے کہ مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا اور یقیناً جو لوگ میری عبادت سے اکڑتے ہیں وہ عنقریب ذلت کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے۔''

اس آیت میں خدائے متعال نے پہلے تعبیر ''دعا'' سے استفادہ کیا ہے اس کے بعد تعبیر ''عبادت'' سے۔ [1]

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ درخواست کرنے والے کی دعا کے قبول ہونے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ جس چیز کی

۱۔ المیزان: ج/۱۰، ص/۳۶

بھی وہ درخواست کرے اور جس وقت بھی وہ چاہے اس کی حاجت پوری ہوگی۔ دعا کے قبول ہونے کے بارے میں اس قسم کی تفسیر دینی بیانات سے سازگار نہیں ہے۔ ممکن ہے جس چیز کے متعلق دعا کرنے والا درخواست کر رہا ہے وہ اس کی مصلحت میں نہ ہو اور درخواست کا قبول ہونا اس کے نقصان میں ہو، کیونکہ وہ اپنی مصلحت سے آگاہ نہیں ہے۔

حضرت علی علیہ السلام اپنے بیٹے سے وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"...ثم جعل فی یدیک مفاتیح خزائنه' بما اذن لک فیه من مسالته' فمتی شئت استفتحت بالدعاء ابواب نعمته واستمطرت شابیب رحمته فلا یقنطنک ابطاء اجابته فان العطیّة علی قدر النیّة وربما اخّرت عنک الاجابة لیکون ذلک اعظم لأجر السائل واجزل لعطاء الأمل وربما سالت الشئی فلاتوتاه واوتیت خیراً منه عاجلاً او آجلاً او صرف عنک لما هو خیر لک"

فلرب امر قد طلبته فیه هلاک دینک لو اوتیته فلتکن مسالتک فیما یبقی لک جماله وینفی عنک وباله فالمال لا یبقی لک ولا تبقی له.."[1]

تیرے دونوں ہاتھوں میں جس تجھے درخواست کی اجازت دی ہے، خزانوں کی کنجیاں رکھی ہیں۔ پس اگر دعا سے نعمتوں کے دروازوں کو کھولنا چاہو تو مسلسل رحمت کی بارش کے لئے دعا کرو۔ تیری درخواست کے قبول ہونے میں تاخیر تجھے نا اُمید نہ کرے، کیونکہ بخشش نیت اور مہم ارادہ کے مطابق ہوتی ہے (دعا کا قبول ہونا خلوص نیت اور پائداری پر منحصر ہے) ممکن ہے تیری درخواست کو قبول ہونے میں تاخیر ہو جائے تا کہ درخواست کرنے والے کی پاداش میں اضافہ ہو اور کامیابی کے لئے بخشش زیادتی ہو۔ ممکن ہے کسی چیز کی درخواست کرو اور وہ شی تجھے عطا نہ کی جائے اور آخرت یا دنیا میں اس سے بہتر شی تجھے دی جائے یا تمھاری مصلحت میں یہی ہو کہ تمھاری درخواست قبول نہ ہو ممکن ہے کہ ایسی چیز کی درخواست کرو کہ اگر تجھے عطا کر دی جائے تو تمھارا دین خراب ہو جائے۔ پس تجھے ایسی چیز کی درخواست کرنی چاہئے جس کی نیکی تیرے لئے باقی رہے اور اس کی ناگوار تم سے دور ہو جائے۔ مال تمھارے لئے باقی نہیں رہے گا اور تم بھی

۱۔ نہج البلاغہ (ترجمہ فیض الاسلام) نامہ ۳۱، ص ۹۲۵ و ۹۲۴

اس کے لئے نہیں رہو گے"

دعا و درخواست میں انسانوں کے مراتب میں فرق:

اس بارے میں کہ دعا میں انسان کا محرک کیا ہے اور دعا کی اتنی تاکید کیوں کی گئی ہے، مختصر یہ کہ انسان اپنی حاجت کو صرف بارگاہ الٰہی میں پیش کرے اور اس سے حاجت روائی چاہیے۔ بندگی اور اس کے مقامات کے بارے میں لوگ مختلف ہیں ان کی حاجتیں بھی مختلف ہیں، جو لوگ معرفت و ایمان کے ادنی درجہ اور خدا کی بندگی و عبودیت کے تکامل و ترقی کے راستہ کی ابتدا میں قرار دیتے ہیں، ان کی حاجتیں عام اور دنیوی ہوتی ہیں، مثال کے طور پر وسعت رزق، شائستہ فرزند، اچھی شریک حیات، اچھے گھر اور زندگی کے وسائل کو پورا کرنے کی درخواست وغیرہ۔

البتہ جو ایمان کے ادنی درجہ پر ہے اور معرفت الٰہی کے اعلی درجات پر فائز نہیں ہوا ہے، کہ خدا سے بالاتر حاجتوں کی درخواست کرے، بجا ہے کہ خدا سے ان ہی مادی حاجتوں کی درخواست کرے، حقیقت میں خدا سے اس کی درخواست اس بات کی علامت ہے کہ وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے اور اسے اپنی حاجتوں کو پورا کرنے کا قادر جانتا ہے، اس لحاظ سے وہ بندگان خدا کی طرف دست سوال دراز نہیں کرتا ہے، فطری بات ہے کہ اگر ان ہی مادی حاجتوں کو خدا سے چاہے، تو خدائے متعال اس کی حاجتوں کو پورا کرے گا، کیونکہ اس نے خود موسیٰ سے فرمایا:

"یا موسیٰ سلنی کل ما تحتاج الیہ حتی علف شاتک وملح عجینک"[1]

"اے موسیٰ! اپنی تمام حاجتوں کو مجھ سے مانگو، یہاں تک بھیڑ کے چارہ اور خمیر کے نمک کو"

انسان کا کمال اس میں ہے کہ ہر قسم کی حاجت خواہ مادی ہو یا معنوی پوری کرنے کے لئے خدائے متعال سے رجوع کرے اور اس کے علاوہ کسی سے رجوع نہ کرے اور غیر خدا کو بلا واسطہ مؤثر نہ جانے اگر غیر خدا سے رجوع کیا تو خدائے متعال اسے نا اُمید کرتا ہے:

"ان اللہ تبارک و تعالیٰ یقول: وعزتی وجلالی ومجدی وارتفاعی علی

۱۔ بحار الانوار، ج ۹۳/ص ۳۰۳

عرشی لأ قطعن امل کل مومل غیری بالیاس ولأ کسونه ثوب المذلة عند الناس ولا نحّینه من قربی ولأبعدنه من فضلی' ایومل غیری فی الشدائد والشدائد بیدی ویرجو غیری ویقرع بالفکر باب غیری؟ وبیدی مفاتیح الابواب وهی مغلقه وبابی مفتوح لمن دعانی...''[۱]

خدائے متعال فرماتا ہے: مجھے اپنی عزت وجلال، بزرگواری اور عرش پر عظمت کی قسم ہے جو کوئی میرے علاوہ کسی اور سے اُمید باندھے اس کی آرزوؤں کو نا اُمیدی میں تبدیل کردوں گا اور لوگوں کے پاس اسے ذلیل وخوار کر کے رکھدوں گا اور اسے اپنے تقریب سے دور رکھوں گا اور اپنے فضل وکرم سے محروم کردونگا۔ وہ مشکلات میں دوسروں سے اُمید رکھتا ہے جبکہ مشکلات (کا حل) میرے ہاتھوں میں ہے۔ میرے علاوہ غیروں سے امید رکھتا ہے اور اپنی فکر میں میرے علاوہ کسی اور کے گھر کا دروازہ کھٹ کھٹاتا ہے، جبکہ تمام بند دروازوں کی کنجیاں میرے پاس ہیں اور میرے چاہنے والوں کے لئے میرا دروازہ کھلا ہے۔

افسوس کہ ہماری بہت سی دعائیں اور درخواستیں حقیقی نہیں ہیں، یعنی ہم خدا سے درخواست نہیں کرتے، چونکہ حقیقی مؤثر خدائے متعال ہے اور مناسب سے کہ انسان صرف اسی سے درخواست کرے، اگر چہ انسان حاجت کے وقت اسی کے پیچھے دوڑتا ہے جو اس کی حاجت کو پورا کرے اور اگر روپیہ پیسہ چاہتا ہے تو اپنا ہاتھ اسی کے سامنے پھیلاتا ہے کہ جو اس کی مدد کرے یا کسب معاش کے پیچھے جاتا ہے تا کہ پیسے کما سکے، لیکن مومن شروع میں اپنے دل کو خدا سے وابستہ کرتا ہے اور اس سے طلب کرتا ہے چوں کہ اس نے دنیوی اسباب کو حاجتوں کو پورا کرنے کے لئے وسیلہ قرار دیا ہے، لہٰذا ان کا سہارا چاہتا ہے، نہ اس لئے کہ وہ آزاد و مستقل ہیں۔

بہر حال جس قدر انسان کا دل خدا کی طرف متوجہ ہو جائے اور بارگاہ رب العزت سے اپنی حاجت پوری کرنے کے لئے درخواست کرے، انسان کے کمال اور ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور خدا کی طرف اس کی توجہ زیادہ ہوتی ہے، ہم نہیں جانتے کہ خدا کی طرف توجہ کرنا کونسی گراں قدر کیمیا ہے، حتی کہ خدائے متعال سے مادی اور دنیوی حاجتوں کی درخواست بھی انسان کی روحانی تکامل وترقی میں کس قدر مؤثر ہے: علامہ طباطبائی اپنے استاد مرحوم آیت اللہ میرزا علی آقا قاضیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے

۱۔ اصول کافی (باترجمہ) ج ۳، ص ۱۰۷

فرمایا: بعض اوقات انسان خدا کی توجہ سے غافل ہوتا ہے اور خدائے متعال ایک مدت تک اپنے اس بندہ کو مشکلات اور سختیوں میں مبتلا کرتا ہے تا کہ ایک ''یا اللہ کہے، کیونکہ یہ ''یا اللہ'' کہنا اور خدا کی طرف توجہ کرنا روح پر زیادہ اثر ڈالتا ہے اور اس کے دل کے نورانی ہونے کا سبب بنتا ہے۔

گزشتہ بیانات کے پیش نظر واضح ہوتا ہے کہ خدا کی طرف توجہ کس قدر روح کی ارتقا کے لئے مؤثر ہے حتی انسان عادی حالات میں جب ضرورت کا زیادہ احساس نہ کرے خدا کی طرف متوجہ ہو جائے تو کس قدر اپنے کمال کی راہ میں آگے بڑھ سکتا ہے، البتہ وہ نہیں سمجھتا ہے اور صحیح طور پر سمجھنا بھی نہیں چاہئے، کیونکہ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے اور اگر ہر چیز کے آثار مکمل طور پر آشکار ہو جائیں تو امتحان کما حقہ انجام نہیں پائے گا۔ بہت سی چیزیں مخفی اور پوشیدہ رہنی چاہئے تا کہ امتحان صحیح معنوں میں انجام پائے۔

اس لئے انسان کو ہرگز خدائے متعال کو فراموش نہیں کرنا چاہئے اور اسے ہر چیز، یہاں تک اپنی مادی حاجتوں کو بھی خدا سے مانگنا چاہئے۔ اسے توجہ کرنی چاہئے کہ اس کی دعا..... حتی مادی حاجتوں کے لئے..... اور خدا کی طرف توجہ خدا کی ربوبیت اور اس کی بندگی کا اقرار ہے اور اسی قدر توجہ بھی، اپنی مادی حاجتوں کے لئے درخواست، اس کی روح کے کمال کے لئے مؤثر ہے، اگر اس کی معرفت نشو ونما پا کر اس کا ایمان قوی ہو جائے اور مادی امور کے علاوہ معنوی امور کے لئے بھی دعا کرے تو کیا بات ہے! دعا کرے کہ خدا اسے عبادت کی توفیق عنایت کرے، علم حاصل کرنے، لوگوں کی خدمت کرنے اور گناہ سے پرہیز کرنے کی توفیق مرحمت کرے۔ اس سے بھی بڑھ کر دوسروں کیلئے، دوستوں، ہمسایوں، ہم کلاسوں، مومنوں، ان کے لئے جن کا اس پر حق ہے من جملہ اپنے استادوں کے لئے دعا کرے۔

اس سے عالی ترین گروہ، وہ لوگ ہیں کہ جب دعا یا درخواست کرنا چاہتے ہیں، تو ان کی حمد و تسبیح الٰہی میں مشغولیت ان کے لئے دعا اور درخواست کرنے سے مانع ہوتی ہے جب وہ دعا کرنا چاہتے تو وہ خدا کے جلال و جمال کی صفات کی یاد میں پڑ جاتے ہیں اور پروردگار کی مدح و ثنا کرنے لگتے ہیں جس قدر اس کی ستائش کرتے ہیں سیر نہیں ہوتے ہیں، اس لئے ان کے لئے کوئی فرصت باقی نہیں بچتی تا کہ اپنے لئے کسی چیز کا مطالبہ کریں۔ جس عاشق کی نظر اس کے معشوق کے جمال پر پڑتی ہے، وہ خود کو نہیں دیکھتا ہے تا کہ اپنے معشوق سے اپنے لئے کوئی چیز مانگے۔

حتیٰ جو لوگ معرفت کے اس مرحلہ پر پہنچے ہیں، وہ پھر بھی احساس کرتے ہیں کہ خدائے متعال

چاہتا ہے کہ عبودیت و بندگی کے آثار ان کے تمام اعضاو جوارح اور اس کے وجود کے تمام زاویوں سے ظاہر ہوں، جس طرح عبودیت و بندگی کے آثار یہ ہیں کہ انسان اپنی پیشانی کو مٹی پر رکھے، ذلت اور پستی کے عنوان سے بارگاہ الٰہی میں اپنے رخ کو خاک پر قرار دے، اس کی آنکھوں سے جمال الٰہی کے شوق کے آنسو یا عظمت الٰہی کے خوف کے آنسو جاری ہو جائیں اور دل کانپ اٹھے، اس طرح تمام اعضاو جوارح کے علاوہ زبان پر ذلت کے آثار رونما ہونے چاہئے اور زبان پر جاری ہونے والے عبودیت و بندگی کے آثار میں سے ایک یہ ہے کہ بندہ اپنے مولا سے کسی چیز کی درخواست نہیں کرتا ہے۔

بارگاہ الٰہی میں فقر و ناتوانی کے اظہار کی اہمیت:

جب انسان کو معلوم ہوا کہ خدائے متعال اسے چاہتا ہے کہ اپنے پورے وجود اور اپنی پوری ظاہری اور باطنی طاقت کے ساتھ بندگی کا اظہار کرے، تو اسے جاننا چاہئے کہ وہ زبان سے بھی عاجزی، ذلت اور گدائی کا اظہار کرے اور یہ درخواست اور گدائی پروردگار کی بارگاہ میں ذلت کی علامت ہے اور جنہوں نے اس کا مزہ چکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ گدائی کس عظمت و عزت کا سبب بنتی ہے۔ جو لوگ معرفت کے عالی مقامات تک پہنچے ہیں، وہ پھر بھی احساس کرتے ہیں کہ انہیں دعا کرنی چاہئے اور آثار بندگی کو زبان پر جاری کرنا چاہئے، یہ اظہار بندگی عبادت ہے اور موضوعیت رکھتا ہے۔

خدائے متعال انسان سے چاہتا ہے کہ اس کی بارگاہ میں فقر و محتاجی کا اظہار کرے اور فطری بات ہے کہ جب انسان کے تمام اعضاو جوارح خدا کی بندگی کی راہ میں شائستہ اعمال انجام دینے کے لئے ہماہنگ ہوں اور من جملہ آثار بندگی، اظہار عجز و ناداری اور خدا سے درخواست زبان پر جاری ہو، تو انسان مطلوب نتیجہ تک پہنچتا ہے، کیونکہ انسان کے تمام قویٰ (طاقتیں) اور اعضاء و جوارح ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ جب وہ دعا کرتا ہے، گویا اپنے تام وجود سے بارگاہ رب العزت سے درخواست اور سوال کرتا ہے، تو فطری طور پر خدائے تبارک وتعالیٰ کی وسیع رحمت اسے اپنے دامن میں لے لیگی۔

﴿واذاسالک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان...﴾

(بقرہ/۱۸۶)

''اور اے پیغمبر! اگر میرے بندے تم سے میرے بارے میں سوال کریں تو میں ان سے قریب

ہوں، پکارنے والے کی آواز سنتا ہوں، جب بھی وہ پکارتا ہے۔"

دعا میں انسان خدا سے کوئی چیز مانگتا ہے اور وہ بھی اسے عطا کرتا ہے۔ لیکن جس نے خدائے متعال کی مناجات اور اس کی محبت کا مزہ چکھا ہے، اس کے لئے سب سے بڑی لذت یہ ہے کہ جب وہ "یا اللہ" کہتا ہے تو اسے جواب میں "لبیک" کہا جائے۔ لیکن اگر کسی کا دل صرف خدا کی طرف متوجہ ہو اور دوسروں پر نظر نہ رکھتا ہو، تو درخواست کرتے وقت خداوند متعال اسے عطا کرتا ہے۔ انسان کو ہر چیز خدائے متعال سے مانگنی چاہئے، اگر بھوکا ہے تو روٹی خدا سے مانگے اور اپنے تمام وجود کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں فقر ومحتاجی کا اظہار کرے اور حضرت موسیٰؑ کی طرح کہے:

﴿...رب انی لما انزلت الی من خیر فقیر﴾ (قصص/۲۴)

"پروردگارا! یقیناً میں اس خیر کا محتاج ہوں جس کو تو نے میری طرف بھیجا ہے۔"

حضرت موسیٰؑ نے اس بات کو اپنی زبان پر اس وقت جاری کیا، جب مصر سے بھاگ کر مدین روانہ ہوئے اس وقت آپ کے پاس نہ غذا تھی اور نہ سونے کے لئے گھر۔ راتوں کو بیابانوں میں بغیر کچھ بچھائے ہوئے زمین پر سوتے تھے اور بھوک کی شدت کی وجہ سے بیابان کی گھاس کھاتے تھے۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"...واللّٰہ ماسأله إلاخبزاً یاکله لأنّه کان یاکل بقلة الارض ولقد کانت خضرة البقل تری من شفیف صفاق بطنه لهزاله وتشذب لحمه"[1]

خدا کی قسم، موسیٰؑ نے خدائے متعال سے کھانے کے لئے روٹی کے علاوہ کچھ نہیں مانگا تھا کیونکہ وہ زمین کی گھاس کھاتے تھے اور بے حد نحیف ولاغر اور بدن پر گوشت کی کمی کی وجہ سے ان کے پیٹ کی نازک کھال کے نیچے سے گھاس کی سبزی دکھائی دیتی تھی۔

حضرت موسیٰؑ، مصر سے بھاگ کر مدین کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک دن مدین میں دیکھا کہ کچھ لوگ کنویں سے پانی کھینچنے میں مشغول ہیں، اور دو لڑکیوں کو دیکھا کہ ایک گوشے میں بیٹھے انتظار کر رہی ہیں تاکہ مرد چلے جائیں تو وہ اپنی بھیڑ بکریوں کے لئے کنویں سے پانی کھینچ لیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان دو لڑکیوں کے پاس گئے اور ان سے سوال کیا: کس لئے یہاں آئی ہیں؟ جب حضرت موسیٰؑ ان کے مقصود سے

۱۔ نہج البلاغہ "ترجمہ فیض اسلام" خطبہ/۱۵۹ص/۵۰۷

آگاہ ہوئے، تو ہمدردی کی بنا پر کنویں سے پانی کھینچ کر ان کی بھیڑ بکریوں کو سیراب کیا۔ اس کے بعد یہ لڑکیاں اپنی بھیڑ بکریوں کے ہمراہ دور چلی گئیں اور زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ ان دو لڑکیوں میں سے ایک نے واپس آکر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: میرے باپ نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ آپ ان کے پاس آجائیں تا کہ وہ آپ کو ہماری کمک کرنے کی اجرت دیں۔ جب موسیٰ ان لڑکیوں کے باپ، حضرت شعیبؑ کے پاس گئے تو انھوں نے اپنی بیٹیوں میں سے ایک کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عقد میں قرار دیا اور اس کے بعد حضرت موسیٰ کی مادی زندگی، بیوی بچے اور آرام آسائش کا اہتمام ہو گیا۔

جی ہاں، اگر انسان دل کی گہرائی سے خدا سے کوئی چیز مانگے وہ اسے عنایت کرتا ہے۔ پھر ضروری نہیں ہے مفصل اور طولانی دعائیں پڑھے اور دعاؤں پر زیادہ وقت صرف کرے، کافی ہے کہ اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا سے درخواست کرے تا کہ اس کی درخواست قبول ہو جائے۔ لیکن جب انسان دعا پڑھتا ہے، حتی لمبی چوڑی اور مفصل دعائیں، لیکن غیر خدا سے بھی دلی توجہ رکھتا ہے، تو وہ دعا اثر نہیں رکھتی۔ اگر انسان روحی آمادگی کے علاوہ شائستہ اعمال بھی انجام دے تو اس کی دعا جلدی اثر کرتی ہے۔

شائستہ اعمال کے ساتھ دعا کی ضرورت:

شاید ناشائستہ اعمال انجام دینے والوں کی دعا قبول نہ ہونے اور ان کے خدا سے درخواست کرنے میں کامیاب نہ ہونے کی علت یہ ہو کہ وہ خدا کی طرف مکمل توجہ نہیں رکھتے ہیں۔ کیونکہ ناپسند اعمال غیر خدا سے دلبستگی حتی کسی ایسی چیز سے دلبستگی کا سبب بن جاتے ہیں کہ جو خدا کی ناراضگی کا باعث ہیں۔ اس صورت میں کیسے ممکن ہے کہ انسان خدا کی بارگاہ میں حاضری دے؟ وہ لوگ خدائے متعال کی طرف خالصۃً اور مکمل توجہ کرتے ہیں، جن کے اعمال صالح و شائستہ اور آلودگی سے پاک ہوں۔ اسی لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"یااباذر؛ یکفی من الدعاء مع البر ما یکفی الطعام من الملح"

"اے ابوذر! شائستہ اور نیک اعمال کے ساتھ دعا کرنا ایسے کافی ہے جیسے غذا کے لئے نمک کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔"

جس طرح غذا کے لئے ایک خاص مقدار میں نمک ضروری اور کافی ہوتا ہے اور اس سے زیادہ نہیں

ہونا چاہئے، اسی طرح جو پسندیدہ اعمال بجالاتا ہے، جس مقدار میں غذا کے لئے نمک کا ہونا ضروری ہے، اسی مقدار میں اس کے لئے دعا کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور حقیقت میں انسان کی زندگی کے لئے دعا نمک کے مانند سعادت ہے، پس ضروری نہیں ہے کہ انسان مسلسل دعا و درخواست کرتا رہے اور خدا سے درخواست و دعا کرنے کے فوراً بعد خدائے متعال اس کی درخواست کا جواب بھی دے، لیکن جن کے اعمال شائستہ نہیں ہیں اور دوسروں کی خدمت نہیں کرتے ہیں وہ اگر فراوان دعا بھی کریں تو معلوم نہیں ان کے لئے فائدہ مند ہو یا نہ۔ اس مطلب کی بیشتر وضاحت کے لئے پیغمبر اسلامؐ فرماتے ہیں:

"یا اباذر: مثل الذی یدعو بغیر عملٍ کمثل الذی یرمی بغیر وترٍ"

"اے ابوذر! جو شخص عمل شائستہ کے بغیر دعا کرتا ہے، اس کی مثال اس شخص کی جیسی ہے جو کمان کے بغیر تیر چلاتا ہے"

جو دعا کرتا ہے، لیکن اپنے فرائض کو صحیح طور پر انجام نہیں دیتا وہ دعا کی اہمیت سے تو واقف ہے اور دعا میں سچا بھی ہے نیز درحقیقت خدائے متعال سے درخواست بھی کرتا ہے ہاں جو چیز اس میں ہے وہ یہ ہے کہ تمام امور میں اپنے فریضہ پر عمل نہیں کرتا ہے اور اس کی رفتار میں بندگی کے آثار نہیں پائے جاتے، کان، آنکھ وغیرہ..... کے بارے میں کوتاہی برتتا ہے اور حقیقت میں وہ نفس کی بندگی کرتا ہے۔ ایسے شخص کو بھی خدا سے ناامید نہیں ہونا چاہئے، خدائے متعال اس سے کہیں زیادہ کریم ہے کہ جو اس کے در پر آئے اور وہ، اسے نکال باہر کرے اور کوئی جواب نہ دے۔ لیکن ایسے شخص کی حالت اس انسان سے بہت ہی متفاوت ہے کہ جس کی تمام سرگرمیوں اور رفتاروں میں خدا کی بندگی کے آثار و جلوے نمایاں ہوں اور وہ تمام وجود کے ساتھ اپنے معبود کی بندگی کے راستہ پر گامزن ہو اور انجام فرائض اور خلق و خالق کی خدمت میں ایک لمحہ کے لئے بھی غفلت نہ کرتا ہو۔ ان دو شخصوں کی درخواست اور دعا کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چاہتا ہو کہ ایک تیر کو نشانہ پر چلائے مگر وہ تیر کو ہاتھ سے پھینکتا ہے، تو اس کی مسافت بہت کم ہوتی ہے اور تیر کما حقہ نشانہ پر نہیں لگتا ہے، لیکن اگر اسی تیر کو چلۂ کمان میں رکھ کر چلایا جائے تو اس کی مسافت کئی گنا زیادہ ہوگی اور تیر نشانہ پر بھی لگے گا۔ شائستہ عمل کے بغیر دعا کرنے والے کی مثال اس شخص کی جیسی ہے کہ کمان کے بغیر تیر چلاتا ہے، یقیناً اس کے تیر کی مسافت اور دوری بہت کم ہوگی۔

مذکورہ گفتگو کے پیش نظر انسان کی زندگی میں دعا کا نقش اور اثر واضح اور روشن ہو گیا کہ دعا اس نمک

کے مانند ہے جسے غذا میں ڈالا جاتا ہے، انسان کی زندگی سراسر خدا کی بندگی اور عبادت ہونی چاہئے۔ خواہ انفرادی حیثیت میں یا خاندانی روابط کے بارے میں، ہمسایوں کے بارے میں یا سماج اور خدا کے بندوں کے بارے میں، انسان کے رفتار و اعمال سے بندگی کے اثرات ظاہر ہونا چاہئے، ضمناً دعا بھی کرے۔ کیونکہ یہی دعا خدا کی بندگی کا اثر ہے جو زبان سے ظاہر ہوتا ہے (اور یقیناً وہ درخواست اور دعا اور توجہ صمیم قلب سے ہونی چاہیے۔)

دوسرا نکتہ جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان سے واضح ہے، وہ یہ ہے کہ انسان نیک اور شائستہ اعمال سے اپنے مقاصد تک بہت جلد پہنچتا ہے اور جب وعدہ کرتا ہے تو اس کی مثال اس شخص کے مانند ہوتی ہے جو کمان سے تیر چلاتا ہے اور اس کا تیر فوری طور پر نشانہ پر لگ جاتا ہے۔ وہ اس شخص کے مانند ہے جس کی غذا آمادہ ہے اور اس میں صرف تھوڑا سا نمک ملانا باقی ہے تاکہ کھانے کے لئے تیار ہو جائے۔ پس نیک اور شائستہ اعمال انسان کو اپنی خواہشات تک پہنچاتے ہیں۔

البتہ افراد کی خواہشات مختلف ہوتی ہیں وہ لوگ جو خدا کی بندگی کے اعلیٰ ترین درجہ تک جا پہنچے ہیں، ان کی خواہشات بہت بلند ہیں، ان کی خواہشات جیسے: قرب الٰہی، لوگوں سے بے نیازی اور دنیا و آخرت کی سعادت کو حاصل کرنا نیز خدا کی عنایت کردہ نعمتوں کا ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنا ہے۔ وہ معتقد ہیں کہ صرف خدائے متعال ان کی خواہشات کو پورا کرتا ہے نہ کہ کوئی اور۔ لیکن جو لوگ بندگی اور خدا کی معرفت کے ادنی درجہ پر فائز ہیں، وہ اپنے شکم، گھر اور لباس کی فکر میں ہیں اور ان کی خواہشات بھی انہیں چیزوں سے مربوط ہوتی ہیں، البتہ خدائے متعال ان کی حاجتوں کو بھی پورا کرتا ہے۔

حقیقت میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیان انسان کے اپنے نفس کی اصلاح کرنے اور فرائض انجام دینے کے لئے ایک تشویق ہے تاکہ وہ جلدی اپنے مقاصد تک پہنچ جائے اور خدائے متعال اس کی دعا کو قبول کرے، اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ اس کی دعا اپنے بارے میں ہو یا دوسروں کے بارے میں، اس کی خواہشات دنیوی ہوں یا معنوی و اخروی، پس پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسروں کو نیک اعمال انجام دینے کی تشویق فرماتے ہیں، اگرچہ نیک اعمال کے حقیقی آثار اور شائستہ پاداش اور حقیقی اعمالِ خیر آخرت میں ظاہر ہوں گے اور یہ دنیا صرف کام کرنے کی جگہ ہے اور اعمال کی پاداش آخرت میں انسان کو ملے گی۔

"ان الیوم عمل ولا حساب وغداً حساب ولا عمل..." [۱]

"بیشک آج کام کا دن ہے اور حساب کا دن نہیں ہے اور کل حساب کا دن ہے اور کسی کو کام کرنے کی مہلت نہیں ہوگی"

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے:

"الدنیا مزرعة الآخرة" [۲]

"دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔"

یہاں پر بیج بویا جاتا ہے اور آخرت میں فصل کاٹی جاتی ہے، لیکن خدائے متعال اپنی بے انتہا مہربانیوں کی بنا پر کبھی بعض اعمال کے آثار اور ان کے نمونے اسی دنیا میں نیک افراد کو عنایت فرماتا ہے تاکہ عمل خیر کی انجام دہی میں رغبت پیدا ہو اور انجام وظیفہ کے بلند عہدہ پر فائز ہوں۔ اگر چہ کمال کے عالی مقامات پر فائز ہوئے افراد اس طرح کی توفیق کے محتاج ہی نہیں ہوتے چاہے جس قدر بھی وہ ان آثار کو دیکھیں ان کے یقین میں اضافہ نہیں ہوتا ہے:

"لو کشف الغطاء لم ازددت یقینا..." [۳]

"اگر پردے ہٹادیئے جائیں تب بھی میرے یقین میں اضافہ نہیں ہوگا۔"

جن کے سامنے سے تمام پردے نہیں ہٹائے گئے ہیں، وہ ہمت افزائی کے مستحق ہیں تاکہ وہ خدا کی بندگی اور تکامل وترقی کی راہ میں آگے بڑھیں۔ ان تشویقوں میں سے ایک یہ ہے کہ خدائے متعال اسی دنیا میں خیر وبرکت کے آثار ان پر نازل فرماتا ہے اور ان کی دعاؤں کو قبول کرتا ہے:

﴿ولو ان اهل القریٰ آمنوا واتقوا لفتحنا علیهم برکاتٍ من السمآء والارض﴾ (اعراف/۹۶)

"اور اگر اہل قریہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو ہم ان کے لئے زمین اور آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔"

۱۔ نہج البلاغہ (ترجمہ شہیدی) خطبہ ۴۲، ص ۴۰

۲۔ بحار الانوار ج ۷۰، ص ۲۲۵

۳۔ بحار الانوار ج ۴۰، ص ۱۵۳

شائستہ اور صالح انسان کے وجود کی برکتیں:

مذکورہ بیانات سے بالاتر، پیغمبر اسلام ﷺ اپنے بعد والے جملہ میں نیک اور شائستہ اعمال کے لئے کچھ ایسے آثار بیان فرماتے ہیں جو نا قابل تصور ہیں اور انسان توقع نہیں رکھتا کہ اس کے نیک اعمال ایسے شائستہ آثار رکھتے ہوں گے۔

"یا اباذر؛ ان اللّٰہ یصلح بصلاح العبد ولده وولد ولده ویحفظه فی دویرته والدور حوله مادام فیهم"

"اے ابوذر! خدائے متعال شخص کے صالح ہونے پر اس کے فرزندوں اور فرزندوں کے فرزندوں کی اصلاح فرماتا ہے اور اسے اپنے گھر میں نیز اور اس کے ہمسایہ کے گھروں میں ان کے زندہ رہنے تک ان کی حفاظت کرتا ہے"

جو لوگ خدا کی بندگی کے مالک ہیں، خدائے متعال انہیں اس دنیا میں خطرات سے بچاتا ہے اور ان کے وجود کی برکت سے ان کی اولاد کو پشت در پشت تحفظ بخشتا ہے، حتیٰ اہل محلّہ اور اس شہر کے باشندوں کی بلاؤں سے حفاظت کرتا ہے جس میں صالح و شائستہ انسان زندگی گزارتے ہیں۔ اسی طرح ایسے افراد کے وجود کی شعائیں اور معنوی برکتیں گرد و نواح کے لوگوں کو بھی شامل ہوتی ہیں۔ مومنوں کی وجودی شعاعیں یکساں نہیں ہوتیں، بعض صرف اپنے اہل و عیال سے رابطہ رکھتے ہیں، کچھ اپنے ہمسایوں اور اہل محلّہ سے بھی رابطہ رکھتے ہیں اور کچھ اس سے بڑھ کر ایک شہر حتی ملک کے لوگوں سے رابطہ رکھتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ حضرت امام خمینی رحمتہ اللہ علیہ ایران کے تمام لوگوں، بلکہ دنیا کے تمام مسلمانوں بلکہ اس سے بڑھ کر تمام مستضعفان عالم سے رابطہ رکھتے تھے۔ ان کی وجودی شعاعیں ایک شہر اور ایک ملک سے بڑھ کر تمام دنیا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ خدائے متعال نے اس شائستہ و برگزیدہ انسان کی برکت سے لاکھوں انسانوں کو اپنی عنایتوں سے نوازا۔

یقیناً خداوند متعال نہ صرف صالح و شائستہ انسان کی حفاظت کرتا ہے، اسے برکتیں عطا کرتا ہے، اس کی دعائیں قبول کرتا ہے اور بلاؤں کو اس سے دور کرتا ہے بلکہ اس کے وجود کی خیر و برکت دوسروں، اس کی اولاد، محلّہ والوں حتی ملک بھر کے لوگوں تک پہنچتی ہے اور اس کے قابل قدر وجود کی برکت سے بلائیں دور

ہوتی ہیں۔ شائستہ اور صالح بندہ کا یہ قابل قدر نقش اور اثر، انسان کو اس نکتہ کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ خدا کی راہ میں قدم اٹھانے اور اس کے فرمان کی اطاعت میں نہ جانے کونسا گراں بہا کیمیا ہے کہ اس کے آثار انسان کے وجود کے حدود سے بڑھ کر دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتے ہیں۔ کیا مناسب نہیں ہے کہ انسان ان کاموں کو انجام دینے کے بجائے کہ امیدوار ہو کہ نتیجہ خیز ہوگا، لیکن معلوم نہیں کہ خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوگا یا نہیں، ان ساری دنیوی زحمتوں کی اٹھانے کے بجائے اس امید میں کہ ان کا کوئی ثمرہ ہوگا، اپنی عمر کے لمحوں کو فرائض کے انجام دینے اور حکم خدا کو بجالانے میں صرف کرے تا کہ اس کی دنیوی خواہشات بھی پوری ہو جائیں اور اخروی خواہشات بھی، خدا کی برکتیں خود اس کو بھی ملیں اور اس کے اہل وعیال، آئندہ نسل حتی ہمسایوں، شہر اور ملک کے لوگوں تک پہنچیں، اس سے بڑھ کر کونسا فائدہ مند اور مفید کام ہوسکتا ہے؟ کیا تجارت اور کسب معاش کرنے والے اپنے مطلوبہ تمام دنیوی نتائج کو اخذ کرتے ہیں؟ کبھی ان کا فائدہ ہوتا ہے اور کبھی نقصان۔ ہاں، اگر وہ کامیاب بھی ہوتے ہیں تو ان کو کیا ملتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اس دنیا میں خوشی کے کچھ دن گزارتے ہیں۔

چنانچہ کہا گیا، کہ کبھی ایک صالح وشائستہ بندے کی دعا ایک شہر کے لوگوں کو بلاؤں سے بچاتی ہے اور لوگوں کے لئے برکتیں نازل ہونے کا سبب بنتی ہے۔ یقیناً، اولیائے الٰہی اور شائستہ انسانوں کے وجود کی وجہ سے ہم سے بہت ساری بلائیں دور ہوتی ہیں اور ان کی دعاؤں کی بدولت بے شمار توفیقات ہمیں نصیب ہوتی ہے، ممکن ہے ہم انہیں نہ پہچانتے ہوں۔ ممکن ہے ہمارے آباء واجداد نے نیک کام انجام دیئے ہوں جن کی وجہ سے خدا نے اس وقت ہمیں توفیقات عنایت کی ہے۔ ممکن ہے ہمارے اساتذہ اور بزرگوں نے ہمارے حق میں دعائیں کی ہوں یا ہمسائے اور مومنین نصف شب ہمارے لئے دعا کرتے ہوں اور انہی دعاؤں کے اثر سے خدائے متعال نے اپنی توفیقات سے ہمیں نوازا ہو، اور ہم سے بلائیں دور کی ہوں۔ ہمیں کیا پتہ ہے کہ یہ برکتیں اور نعمتیں کہاں سے آئی ہیں اور کس کے ذریعہ یہ بلائیں ہم سے دور ہوئی ہیں؟ اور ہم کیا جانتے ہیں کہ ایک بندہ صالح کی نصف شب کو خدا سے اس کے حق میں کی جانے والی دعا کی کیا برکتیں ہوں گی؟ لیکن خدائے متعال نے قرآن مجید میں فرمایا ہے اور روایتوں میں بھی آیا ہے کہ خدائے متعال شائستہ انسانوں کی برکتوں سے دوسروں کو نعمتیں عطا کرتا ہے، اور لوگوں سے بعض بلاؤں کو دور کرتا ہے:

اس سلسلہ میں قرآن مجید کے سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۱ کو شاہد کے عنوان سے پیش کیا جا سکتا ہے:

﴿...ولولا دفع اللّٰہ الناس بعضھم ببعضٍ لفسدت الارض ولکن اللّٰہ ذوفضلٍ علی العالمین﴾

''اور اگر اسی طرح خدا بعض کو بعض کے ذریعہ سے نہ روکتا رہتا تو ساری زمین میں فساد پھیل جاتا لیکن خدا عالمین پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔''

یونس بن ظبیان نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کے بارے میں جو روایت نقل کی ہے حسب ذیل ہے:

''ان اللّٰہ یدفع بمن یصلّی من شیعتنا عمن لا یصلّی من شیعتنا ولو اجمعوا علی ترک الصلاۃ لھلکوا ، و ان اللّٰہ یدفع بمن یصوم منھم عمن لا یصوم من شیعتناولو اجمعوا علی ترک الصیام لھلکوا وان اللّٰہ یدفع بمن یزکی من شیعتنا عمن لایزکی منھم ولواجتمعوا علی ترک الزکاۃ لھلکوا وان اللّٰہ لیدفع بمن یحج من شیعتنا عمن لایحج منھم ولوا جتمعوا علی ترک الحج لھلکوا' ھو قول اللّٰہ تعالیٰ: ''ولولا دفع اللّٰہ الناس... ''فو اللّٰہ ما انزلت الافیکم ولا عنی بھا غیرکم'' [۱]

''خدائے متعال نماز پڑھنے والے ہمارے شیعوں کے طفیل سے نماز نہ پڑھنے والے شیعوں سے بلا کو دور کرتا ہے اور اگر سب نماز نہ پڑھیں تو ہلاک ہو جائیں گے۔ خدائے متعال ہمارے روزہ رکھنے والے شیعوں کے وجود کی برکت سے روزہ نہ رکھنے والے شیعوں سے بلا کو دور کرتا ہے اور اگر سب روزہ کو ترک کر دیں تو ہلاک ہو جائیں گے۔ خدائے متعال ہمارے زکوٰۃ دینے والے شیعوں کے طفیل سے زکوٰۃ نہ دینے والے شیعوں سے بلا کو دور کرتا ہے، اور اگر اجتماعی طور پر سب زکوٰۃ دینا ترک کر دیں تو ہلاک ہو جائیں گے۔ خدائے متعال حج کو بجالانے والے ہمارے شیعوں کے طفیل سے حج بجا نہ لانے والوں سے بلا دور کرتا ہے اور اگر سب حج کو بجالانا ترک کر دیں تو ہلاک ہو جائیں گے۔ یہ

۱۔ تفسیر عیاشی، ج ۱، ص ۱۳۵/۸

(مطلب) خدا کا فرمان ہے: ''اگر خدائے متعال بعض لوگوں کو بعض لوگوں کے وسیلہ سے نہ روکتا.....'' خدا کی قسم یہ آیت نازل نہیں ہوئی مگر آپ کے حق میں اور اس سے آپ (شیعوں) کے علاوہ کسی کا قصد نہیں ہوا ہے۔''

صالح انسانوں کا معاشرے میں نقش، ان کی وجہ سے لوگوں کو نصیب ہونے والی برکتوں اور ان کی وجہ سے خدائے متعال کا لوگوں کی بلاؤں کو دور کرنے کے پیش نظر توجہ کرنی چاہئے کہ انسانوں اور انبیاء میں برترین، یعنی خاتم الانبیاء حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، کہ صاحب علم اولین وآخرین ہیں اور تمام عالی انسانی صفات و بلند معنوی کمالات آپؐ کے وجود میں اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے وجود میں جمع ہیں اور ہر قسم کی خطا اور گناہ سے معصوم ہیں، وہ تمام برکات الٰہی کے سرچشمہ ہیں اور کائنات ان کے وجود کے طفیل سے ہے، چنانچہ ذات مقدس الٰہی نے فرمایا ہے:

"...وعزتی وجلالی لولاک لما خلقت الافلاک" [1]

مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم ہے کہ اگر تم نہ ہوتے تو افلاک کو پیدا نہیں کرتا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ ائمہ اطہار علیہم السلام کا وجود مقدس سبب بنا ہے کہ پروردگار عالم نے کائنات کو باقی رکھا ہے اور اپنی مخلوقات پر مسلسل برکتیں اور نعمتیں نازل کی ہیں حجت خدا کے وجود مقدس کی برکت سے بہت سی بلائیں دور ہوتی ہیں، کیونکہ اگر دنیا حجت خدا سے ایک لمحہ کے لئے محروم ہوتی، تو نابود ہو جاتی، چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''نحن ائمة المسلمين وحجج الله على العالمين...ولولا مافي الارض منا لساخت بأهلها' ثم قال عليه السلام: ولم تخل الارض منذ خلق الله آدم من حجة لله فيها ظاهرٍ مشهودٍ اوغائبٍ مستورٍ ولا تخلو الى ان تقوم الساعة من حجة لله فيها ولولا ذلك لم يعبدالله قال سليمان فقلت للصادق عليه السلام فكيف ينتفع الناس بالحجة الغائب المستور؟ قال عليه السلام' كما ينتفعون بالشمس اذا سترها السحاب'' [1]

''ہم مسلمانوں کے پیشوا اور عالمین پر خدا کی حجت ہیں..... اور اگر زمین ہم سے خالی ہو

۱۔ بحار الانوار، ج ۲۳ ص ۵

جائے تو وہ باشندوں کو نگل لے گی۔ اس کے بعد امام علیہ السلام نے فرمایا: جب سے پروردگار عالم نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا ہے، زمین حجت خدا سے خالی نہیں رہی ہے اور وہ حجت خدا یا ظاہر بظاہر شناختہ شدہ ہے یا غائب اور دوسروں کے لئے ناشناس، اور قیامت تک زمین حجت خدا سے خالی نہیں رہے گی اور اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا کی عبادت نہیں کی جاسکتی (یعنی کوئی باقی نہ رہتا جو خدا کی عبادت کرتا) سلیمان راوی نے سوال کیا: لوگ کیسے غائب حجت خدا سے استفادہ کر سکتے ہیں؟ امام علیہ السلام نے فرمایا: جس طرح ابر کے پیچھے پوشیدہ سورج سے استفادہ کرتے ہیں"

ستائیسواں درس:

خداوند متعال کے نزدیک
مخلص بندے کی قدر و منزلت

- انسان کی بلندی و برتری کا معیار
- آزادی و اخلاص کا اثر

الف: عامل استقلال

ب: عامل اخلاص

خداوند متعال کے نزدیک
مخلص بندے کی قدر و منزلت

یا اباذر' ان ربک عزوجل یباهی الملائکة بثلاثة نفرٍ: رجل فی ارض قفرٍ فیوذن ثم یقیم ثم یصلی' فیقول ربک للملائکة؛ انظرو الی عبدی یصلی ولایراه احد غیری فینزل سبعون الف ملک یصلون وراء ہ ویستغفرون له الی الغد من ذلک الیوم ورجل قام من اللیل فصلی وحده فسجد و نام وهو ساجد' فیقول تعالیٰ: انظروالی عبدی' روحه عندی وجسده ساجد؛ ورجل فی زحفٍ فر اصحابه وثبت هو ویقاتل حتی یقتل"

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصیحتوں کے اس حصہ کا مضمون یہ ہے کہ خدائے متعال اپنے بندوں میں سے تین گروہ کے بارے میں فرشتوں پر فخر ومباہات کرتا ہے۔ البتہ خداوند متعال کے فخر ومباہات کا کیا معنی ہے اور وہ اپنے فرشتوں پر کیسے فخر کرتا ہے، یہ صحیح طور پر ہمیں معلوم نہیں ہے۔ اس روایت کے اس حصہ سے جو کچھ استفادہ ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ بندگان خدا کے تین گروہوں کا مقام فرشتوں سے برتر ہے اور خدائے متعال ان کے بلند مقامات اپنے فرشتوں کو دکھلاتا ہے۔

انسان کی بلندی اور برتری کا معیار:

اس میں کوئی شک نہیں ہے خدائے متعال نے اپنی مخلوقات میں، انسان کو بعض امتیازات اور خصوصیات سے بہرہ مند فرمایا ہے کہ جو باقی تمام مخلوقات میں نہیں پائی جاتی ہیں۔ مادی مخلوقات میں اسے عقل وفہم اور آگاہی عطا کی ہے، یہاں تک اسے کرامت بخشی اور خشکی اور دریاؤں کو اس کے لئے مسخر کر دیا:

﴿ولقد کرّمنابنی آدم وحملنا هم فی البر و البحرورزقنا هم من الطیبات وفضّلنا هم علی کثیرٍ ممن خلقنا تفضیلاً﴾ (اسراء/۷۰)

''اور ہم نے بنی آدم کو کرامت عطا کی ہے اور انہیں خشکی اور دریاؤں میں سواریوں پر اٹھایا ہے اور انہیں پاکیزہ رزق عطا کیا ہے اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سوں پر فضیلت دی ہے۔''

اس کے علاوہ خدائے متعال نے انسان کو ایک صاحب اختیار اور انتخاب کرنے والی مخلوق پیدا کیا ہے، تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق سعادت یا شقاوت کے راستہ کا انتخاب کرے۔ اور اسے فطرت الٰہی عطا کی تاکہ اس کے ذریعے سے تمام اقدار، خوبیوں اور الٰہی، فضائل کی طرف رجحان پیدا کرے اور اسے راہ سعادت بھی دکھایا۔ لیکن نہ تو وہ تکوینی کرامت انسان کے لئے فرشتوں پر برتری کا باعث ہے اور نہ ہی انتخاب اور اختیار کا عنصر، کیونکہ ممکن ہے انسان اختیار وانتخاب کے اسی گراں بہا عامل کے ذریعہ خوش بختی اور سعادت کی راہ کے بجائے بغاوت اور شقاوت کا راستہ اختیار کرے اور حق کی ڈگر سے منحرف ہو جائے اور گمراہی میں گر کر ذلیل ترین مخلوقات میں شمار ہو جائے:

﴿ان شرّالدّوابّ عند اللّٰه الذین کفروا فهم لا یؤمنون﴾ (انفال/۵۵)

''زمین پر چلنے والوں میں بدترین افراد وہ ہیں جنہوں نے کفر اختیار کر لیا اور اب وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔''

جو چیز انسان کے مقام کو فرشتوں کے مقام سے بڑھا کر برتری اور فضیلت کا سبب بنتی ہے وہ دستورات الٰہی پر عمل کرنا، انسان کے معنوی تکامل وترقی کے لئے کوشش اور مطلوبہ کمال تک پہنچنا ہے۔ یعنی انسان اپنی الٰہی فطرت کی بنیاد پر سعادت کے راستہ کا انتخاب کرے اپنی اور نفسانی خواہشات کو کچل دے اور

اپنی مادی جبلتوں کی اصلاح کرے۔ جوانسان حیوانی اور مادی کشش کی توانائیاں رکھتا ہے، وہ انھیں کسی بھی وقت اس مادیات اور حیوانی لذتوں کی طرف کھینچ سکتی ہے، جب وہ حیوانی توانائی پر کنٹرول حاصل کرے اور حق وباطل سے روبرو ہوتے وقت حق کو انتخاب کرے اور فطرت کی بنیادوں پر عمل کرے، تو وہ مسجود ملائکہ بن جاتا ہے اور اس کا مقام ملائکہ کے مقام سے برتر ہوتا ہے، اسی لئے حدیث کے اس حصہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"یا اباذر' ان ربک عزوجل یباهی الملائکة بثلاثة نفرٍ: رجل فی ارض قفرٍ فیوذن ثم یقیم ثم یصلی' فیقول ربک للملائکة: انظرو الی عبدی یصلی ولایراه احد غیری فینزل سبعون الف ملک یصلون وراءه ویستغفرون له الی الغد من ذلک الیوم"

"اے ابوذر! تیرا پروردگار تین افراد کے بارے میں فرشتوں پر فخر کرتا ہے: پہلا شخص جس کے بارے میں خداوند متعال فرشتوں پر افتخار کرتا ہے وہ ہے کہ جو کسی بیابان میں اذان واقامت کہے اور نماز قائم کرے۔ پروردگار فرشتوں سے کہتا ہے: میرے اس بندے کو دیکھو جو اس حالت میں نماز پڑھ رہا ہے جبکہ کوئی بھی اسے نہیں دیکھ رہا ہے، اس وقت ستر ہزار فرشتے اترتے ہیں اور اس کی اقتدا کرتے ہیں اور دوسرے دن تک اس کے لئے استغفار کرتے ہیں"

دوسرا شخص جس کے لئے خدائے متعال فرشتوں پر فخر ومباہات کرتا ہے:

"ورجل قام من اللیل فصلّی وحده فسجد ونام وهو ساجد فیقول تعالی: انظرو الی عبدی' روحه عندی وجسده ساجد"

"اور وہ شخص جو رات کو نیند سے بیدار ہوتا ہے اور تنہائی میں نماز پڑھتا ہے اور سجدہ کرتا ہے اور سجدہ میں سو جاتا ہے، تو خدائے متعال فرماتا ہے: (اے فرشتو!) میرے بندے کو دیکھو اس کی روح میرے پاس ہے اور اس کا بدن سجدے میں۔"

جو شخص نصف شب کو آرام دہ اور گرم بستر سے اٹھتا ہے، میٹھی نیند کو چھوڑتا ہے اور اپنے پروردگار سے عبادات ومناجات میں مشغول ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے معبود کی مناجات میں اس قدر غرق ہو جاتا ہے کہ

سجدہ سے سر نہیں اٹھاتا یہاں تک کہ اسے نیند آتی ہے، تو خدائے متعال اپنے فرشتوں سے کہتا ہے: دیکھ لو، میرا بندہ نصف شب کو آرام و آسائش کے بستر سے اٹھا ہے اور لوگوں کی نظروں سے دور میری مناجات اور عبادت میں مشغول ہے۔ وہ اپنی عبادت میں اس قدر طول دیتا ہے کہ تھک کر سجدہ میں سو جاتا ہے۔ اس کی روح میرے پاس ہے لیکن اس کا جسم سجدہ میں پڑا ہے۔ خداوند متعال فرماتا ہے: اس کی روح میرے پاس ہے، کیونکہ نیند کی حالت میں انسان کی روح خدا کے پاس چلی جاتی ہے، اور یہ وہ نکتہ ہے جس کی طرف قرآن مجید میں اشارہ ہوا ہے:

﴿اللّٰہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسک التی قضیٰ علیھا الموت و یرسلُ الاخری الی اجلٍ مسمی﴾ (زمر/ ۴۲)

''اللہ ہی ہے جو روحوں کو موت کے وقت اپنی طرف بلا لیتا ہے اور جو نہیں مرتے ان کی روحوں کو بھی نیند کے وقت طلب کر لیتا ہے اور پھر جس کی موت کا فیصلہ کر لیتا ہے اس کی روح کو روک لیتا ہے اور دوسرے کی روحوں کو ایک مقررہ مدّت کے لئے آزاد کر دیتا ہے۔''

قرآن مجید کی نظر میں حقیقی مومن وہ ہے جو اپنے پروردگار کی بندگی اور عبادت کے لئے نصف شب کو بستر سے اٹھے اور نیند کو اپنے لئے حرام قرار دے:

﴿تتجافی جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم خوفاو طمعاً...﴾ (سجدہ/۱۶)

''ان کے پہلو بستر سے الگ رہتے ہیں اور وہ اپنے پروردگار کو خوف اور طمع کی بنیاد پر پکارتے رہتے ہیں۔''

جی ہاں، دوسروں کی نظروں سے دور نماز شب قائم کرنا اور طولانی سجدے انجام دینا اور خدا کے حضور میں تعظیم بجالانا خدا کے لئے فخر و مباہات کا سبب بن جاتا ہے۔

تیسرا شخص کہ جس کے ذریعے خدائے متعال فرشتوں پر فخر و مباہات کرتا ہے:

''ورجل فی زحف فرّاصحابہ وثبّت ھو ویقاتل حتی یقتل''

''اور وہ شخص جو میدان جہاد میں ہو، اس کے دوستوں نے فرار کی ہو اور وہ ثابت قدمی کے ساتھ جہاد کو جاری رکھے یہاں تک قتل ہو جائے۔''

خدائے متعال اس مجاہد سورما پر فخر و مباہات کرتا ہے، کہ جنگ میں شکست کھانے کے بعد دوسرے لوگ دشمنی کے مقابلہ میں تاب نہ لاتے ہوئے بھاگ گئے ہوں اور وہ اکیلا ہی دشمن کے سامنے ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہے اور زندگی کے آخری لمحہ تک لڑتا رہے، باوجود اس کے کہ دوسروں کی طرح بھاگ کر وہ بھی اپنی جان بچا سکتا تھا لیکن وہ خدا کی راہ میں شہید ہونے کو ترجیح دیتا ہے۔ جی ہاں، خدائے متعال اس شخص پر فخر کرتا ہے، جو یار و یاور کے بغیر دشمنوں کی ایک بڑی تعداد کے مقابلہ میں ڈٹ جاتا ہے، جبکہ ایسی حالت میں استقامت کرنا واجب نہیں ہے: صدر اسلام میں ابتدا میں ایک آدمی کا دس افراد کے مقابلے میں مقاومت کرنا واجب تھا اس کے بعد تخفیف دیدی گئی اور ایک آدمی کا دو افراد کے مقابلہ میں مقاومت کرنا واجب ہوا، لیکن اگر سب چلے گئے اور وہ تنہا رہ گیا، تو اس کے لئے واجب نہیں ہے۔

بیشک، دشمن کے مقابلہ میں مقاومت کرنے کی توانائی رکھنے کی صورت میں جنگ سے فرار کرنا گناہ کبیرہ ہے اور قرآن مجید نے واضح طور پر جنگ سے فرار کرنے کو منع کیا ہے اور اس عمل کو خدا کے غضب کا سبب بیان کیا ہے اور جنگ سے بھاگنے والے کی جگہ جہنم بتائی ہے:

﴿یا ایها الذین آمنوا اذالقیتم الذین کفروا زحفاً فلا تولوهم الأدبار ومن یولهم یومئذٍ دبره الا متحرفاً لقتالٍ اومتحیزاً الی فئةٍ فقد باء بغضبٍ من اللّٰه وماواه جهنم وبئس المصیر.﴾ (انفال/۱۵و۱۶)

''اے ایمان والو! جب کفار سے میدان جنگ میں ملاقات کرو تو خبردار انہیں پیٹھ نہ دکھانا۔ اور جو آج کے دن پیٹھ دکھائے گا وہ غضب الٰہی کا حق دار ہوگا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا، جو بدترین انجام ہے علاوہ ان لوگوں کے جو جنگی حکمت عملی کی بنا پر پیچھے ہٹ جائیں یا کسی دوسرے گروہ کے پناہ لینے کے لئے اپنی جگہ چھوڑ دیں''

روایت کے اس حصہ سے بہت سے درس حاصل کئے جاسکتے ہیں: خدائے متعال کا اپنے بعض بندوں کے وجود کا ملائکہ پر فخر کرنا، اس معنی میں ہے کہ وہ ایسی اقدار کے مالک ہیں جن کی خدا کے پاس بہت اہمیت ہے، اگر دوسری خصوصیات ہوتیں جو انسان کے لئے بیشتر کمال کا سبب بنتیں اور خدا کے نزدیک زیادہ اہمیت کی حامل ہوتیں، تو خدائے متعال ان کا ذکر کرتا۔ جب خدائے متعال اپنے بعض بندوں کے بلند مقامات کو فرشتوں کے سامنے تعارف کرانا چاہتا ہے اور ان پر فخر کرتا ہے، تو حقیقت میں ان کے بہترین

اقدار کو بیان کرتا ہے۔ اب دیکھنا چاہئے کہ خدا کے بندوں کے وہ تین گروہ جو ایک بیابان میں لوگوں کی نظروں سے دور، آداب و مستحبات کی رعایت کرتے ہوئے نماز پڑھتا ہے اور جو نصف شب آرام و آسائش کے وقت بستر سے اٹھ کر خدا کی عبادت و مناجات میں مشغول ہو جاتا ہے اور وہ جو میدان کارزار میں دشمنوں کی بڑی تعداد کے سامنے اکیلا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے، یہاں تک جام شہادت نوش کرتا ہے کن خصوصیات کے حامل ہیں اور کن پہلوؤں میں مشترک ہیں کہ خدائے متعال انہیں اس حد تک مقام و منزلت بخشتا ہے؟

یقیناً خدا کی راہ میں مال کے انفاق یا حسب ضرورت ایثار و قربانی یا عبادتیں اور دوسرے نیک اعمال، کہ جن کی شرع مقدس میں تاکید کی گئی ہے، سب قابل قدر و اہمیت اور انسان کے کمال کے سبب ہیں، لیکن دیکھنا چاہئے وہ تین گروہ کن خصوصیتوں کے حامل ہیں اور ان میں کون سے مشترک عناصر پائے جاتے ہیں کہ اس حد تک ان کی تاکید کی گئی ہے؟

ان تین گروہوں میں خصوصیت اور مشترک عنصر تنہا ہونا ہے پہلا شخص دوسروں کی نظروں سے دور تنہائی میں عبادت کرتا ہے اور دوسرا شخص نصف شب کو نیند سے اٹھ کر تنہائی میں مناجات کرتا ہے اور تیسرا شخص بھی دشمن کے سامنے تنہا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے۔ خدائے متعال اس شخص کے ثواب پر فخر و مباہات نہیں کرتا ہے جو محلّہ کی مسجد میں یا جامع مسجد میں نماز پڑھتا ہے بلکہ اس پر فخر کرتا ہے جو بیابان میں تنہائی میں عبادت کرتا ہے یا اس کے سب دوست محاذ جنگ سے بھاگ گئے ہیں اور وہ تن تنہا دشمن سے مقابلہ کر رہا ہے۔ ممکن ہے کسی شخص نے دسیوں حملوں اور جنگی معرکوں میں حصہ لیا ہو اور بہت سی شجاعتوں کا مظاہرہ کیا ہو متعدد فتح و کامرانیاں بھی حاصل کر چکا ہو، لیکن اس کے باوجود تاکید اس شخص پر ہے جو محاذ جنگ میں تنہا رہ گیا ہے پھر بھی اپنا فریضہ انجام دینے میں مشغول ہے۔

آزادی و اخلاص کا اثر:

الف: عامل استقلال

دو مہم عامل، استقلال یعنی دوسروں کا اثر قبول نہ کرنا اور اخلاص، ان تین اشخاص کے انفرادی اقدام کی عظیم اہمیت کا سبب واقع ہوئے ہیں:

پہلے عامل کی وضاحت، یعنی استقلال کی وضاحت میں یہ کہنا بہتر ہے کہ: اکثر لوگ دوسروں کے

الہامات اور رفتار سے متاثر ہوتے ہیں انسان کی خصوصیات میں سے ہے کہ جب وہ دیکھتا ہے کہ کچھ لوگ ایک راہ پر جارہے ہیں اور ایک رفتار انجام دے رہے ہیں، وہ بھی اسی راہ پر چلنا چاہتا ہے اور اس رفتار کی طرف میلان پیدا کرتا ہے۔ گویا دوسروں کا اقدام اور ان کی روش انسان کے لئے راستہ کے انتخاب کرنے اور اس پر چلنے کا ایک ایسا عامل ہے جو اس کی مدد کرتا ہے: جب وہ دیکھتا ہے کہ کچھ لوگ خیر و صلاح کی راہ پر گامزن ہیں، تو وہ بھی ان کی پیروی کرتا ہے۔ البتہ یہ انسان کے لئے ضعف و کمزوری کی علامت ہے اور خدائے متعال نے انسان میں یہ عنصر قرار دیا ہے تا کہ جو لوگ ضعیف ہیں، صالح افراد کی پیروی کر کے صحیح راستہ کا انتخاب کریں۔ اگر چہ ایسے افراد غلط اور برے ماحول سے بھی متاثر ہوتے ہیں اور ممکن ہے دوسروں سے وابستگی اس امر کا سبب بنے کہ انسان دوسروں کی پیروی میں باطل راستہ کو پسند کرے اور حالات اور شرائط کے بدلنے کے ساتھ وہ بھی تبدیل ہو جائے اور رسوائی سے بچنے کے لئے وہ بھی انھیں کے رنگ میں ڈھل جائے۔ خدائے متعال ایسے ضعیف انسانوں کے انجام کے بارے میں کہ جو سوچے سمجھے بغیر اہل باطل کی پیروی کرنے لگتے ہیں اور اپنے اختیار کی لگام دوسروں کے ہاتھوں میں تھما دیتے ہیں والوں کی مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿واذاقیل لھم اتبعو اماانزل اللّٰہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ آباء نا اولو کان آباوھم لا یعقلون شیئاً ولا یھتدون.'' (بقرہ/۱۷۰)

''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو تو کہتے ہیں ہم اس کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ ایسا ہی کریں گے چاہے ان کے باپ دادا بے عقل رہے ہوں اور ہدایت یافتہ نہ رہے ہوں''

البتہ احکام الٰہی اور شرعی فرائض کے بارے میں، جو شخص آگاہی اور پہچان نہ رکھتا ہو، اس پر فرض ہے کہ عالم سے پوچھ لے، خواہ وہ حکم خدا کے بارے میں جاہل ہو یا حکم خدا کے موضوع کے بارے میں (یہ دین میں فقیہ اور مجتہد کی تقلید کرنے کے معنی میں ہے) البتہ یہ شخص جو تقلید کے ذریعہ احکام خدا سے آگاہ ہوتا ہے اس شخص کے برابر نہیں ہے جو محنت و مشقت کر کے احکام دین کو خود استنباط کرتا ہے، کیونکہ مجتہد اور عالم کی معرفت استقلالی ہے اور جاہل کی معرفت تقلیدی، اور یہ دونوں یکساں نہیں ہیں اور یقیناً معرفت استقلالی برتر ہے۔

اسی طرح موضوعات کے بارے میں، خاص کر اجتماعی مسائل کے بارے میں اکثر لوگ بہ حد کافی آگاہی نہیں رکھتے ہیں اور وہ مجبور ہیں کہ ایسے افراد کی پیروی کریں کہ جو ان موضوعات کے بارے میں علم و آگاہی رکھتا ہے ان کی یہ پیروی اگر راہ حق سے انحراف کا باعث نہیں ہے تو موجب سرزنش نہیں ہوگی، لیکن ایسا شخص کہ جو عالم ہے اور جس کے ہاتھ میں چراغ ہدایت ہے کہ جس سے وہ دوسروں کی ہدایت و رہنمائی کرتا ہے، بلند ترین مقام و منزلت پر فائز ہے۔

شناخت استقلالی کے علاوہ اس سے اہم مرحلہ انسان کے لئے اس کے ارادہ اور عمل میں استقلال ہے: کبھی انسان اجتہاد یا تقلید کے ذریعہ موضوع کو پہچانتا ہے، لیکن عمل کے مقام پر اگر تنہا ہے تو معلوم نہیں ہے کہ جو کچھ جانتا ہو اس پر عمل کریگا۔ جی ہاں، اگر وہ ایک جماعت کے ساتھ ہے اور خاص کر اس جماعت کے افراد بہت زیادہ ہیں تو وہ اقدام کرتا ہے، لیکن تنہائی میں سستی کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہر ایک اپنی روزمرہ کی زندگی میں بہت ساری مثالیں رکھتا ہے: مثال کے طور پر ایک مدرسہ میں جہاں طلاب کی ایک تعداد رہائش پذیر ہے، اگر شب جمعہ دعائے کمیل کی مجلس منعقد ہو جائے، جب انسان مشاہدہ کرتا ہے کہ طلاب گروہ گروہ اس مجلس میں حاضر ہو رہے ہیں تو اس میں بھی شوق پیدا ہوتا ہے کہ اس جلسہ میں شرکت کرے۔ لیکن ایک چھٹی کی شب کو، جب سب طلاب مسافرت پر گئے ہوں، اس کے لئے مشکل ہے کہ تنہا دعائے کمیل پڑھے۔ اسی طرح دوسرے نیک کام انجام دینے میں، جب انسان دیکھتا ہے کہ دوسرے اس کام کو انجام دے رہے ہیں، وہ بھی جوش میں اس کام کو کرتا ہے، لیکن جب تنہا ہوتا ہے تو بہانے تلاش کرتا ہے، اس کے اندر اتنی کشش نہیں ہے کہ اسے فیصلہ کرنے پر مجبور کرے۔ بالآخر جس طرح بھی ممکن ہو وہ اس کام سے پہلو تہی کرتا ہے۔ یا جب رات کو دیکھتا ہے کہ کمروں کے لیمپ روشن ہیں اور دوسرے لوگ رات گئے تک مطالعہ میں مشغول ہیں، اس میں بھی مطالعہ کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے اور وہ بھی رات گئے تک مطالعہ کرتا ہے۔ لیکن جب مدرسہ میں چھٹی ہوتی ہے اور مدرسہ میں اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوتا ہے، اس کے اندر پھر وہ کشش نہیں ہوتی ہے اور مطالعہ کی رغبت نہیں رکھتا ہے۔ یہاں جو کچھ بیان ہوا وہ ہماری اجتماعی اور سیاسی رفتاروں کا ایک نمونہ تھا، اس سلسلہ میں مزید اور مثالیں بھی ممکن ہیں۔

اس سستی اور دوسروں سے وابستگی کی علت ارادہ اور ایمان کی کمزوری ہے۔ کیا جب دوسرے کسی کام کو انجام دیتے ہیں تو اس کام کی قدر و منزلت ہوتی ہے اور وہ انجام نہ دیں تو اس کی قدر و منزلت ختم ہو جاتی

ہے؟ اگر دعائے کمیل کی فضیلت اور قدر و منزلت ہے تو ہمیں اسے تنہائی اور خلوت میں پڑھنے کے لئے بھی اہمیت دینی چاہئے، نہ یہ کہ جب اس کے لئے کوئی اجتماع منعقد ہو تو ہم بھی پڑھیں۔ یہ انسان کی کمزوری کی علامت ہے کہ جب دوسروں کو دعائے کمیل پڑھتے دیکھتا ہے یا دیکھتا ہے کہ دوسرے لوگ گروہ در گروہ نماز جمعہ کی طرف جا رہے ہیں، اس میں بھی شوق پیدا ہوتا ہے، یہ انسان کے لئے قابل فخر نہیں ہے۔ اس کا عمل اسی وقت فخر کا سبب ہے کہ جب تنہا ہو کوئی اس کے ساتھ نہ ہو اور وہ جس چیز کو تشخیص دے اس پر عمل کرے اور انتظار نہ کرے دوسرے افراد اس کا ساتھ دیں گے۔

جب میں جانتا ہوں کہ خدائے متعال مجھ سے کوئی کام لینا چاہتا ہے تو مجھے اس کام کو انجام دینا چاہئے اور مجھے اس سے سروکار نہیں ہونا چاہئے کہ کوئی میرا ساتھ دیتا ہے یا نہیں، کیونکہ دوسروں کی عدم ہمراہی اور تنہا ہونے سے اس کام کی قدر و منزلت میں کسی بھی قسم کی کمی واقع نہیں ہوتی ہے اس سے انسان کے اندر قوت ارادی پیدا ہوتی ہے اور اپنے قوی اور بلندی ایمان سے اپنے فرائض پر یقین پیدا کرتا ہے۔ اسی لئے اس کام کو انجام دینے میں بلاواسطہ فیصلہ کرتا ہے، خواہ دوسرے اس کا ساتھ دیں یا نہ۔ یقیناً فیصلہ کرنے میں استقلال کافی اہمیت رکھتا ہے، کہ انسان فیصلہ کرتے وقت اس کا انتظار نہ کرے کہ دوسرے لوگ کونسا راستہ اختیار کرتے ہیں تا کہ وہ بھی اسی راستہ پر چلے۔ وہ تو خود قوی ارادہ و ایمان کا مالک ہے، اگر کسی کام کو اپنا فرض سمجھ لیا اور دیکھتا کہ اس میں خدا کی مرضی ہے تو اس کام کو انجام دیتا ہے اور دوسروں کے انتظار میں نہیں رہتا۔

جابر بن یزید جعفی، ائمہ اطہار علیہم السلام کے ہم اسرار اصحاب میں سے تھے، انہوں نے امام جعفر محمد باقر علیہ السلام سے بہت سی روایات نقل کی ہیں۔ بہت سی روایتیں جو امام محمد باقر علیہ السلام نے جابر کو نقل فرمائی تھیں، اسرار تھیں اور جابر کو اجازت نہیں تھی کہ انہیں دوسروں کے پاس نقل کریں۔ چونکہ وہ ان خالص معارف الٰہی کے جام کو تشنگان معرفت تک نہیں پہنچا سکتے تھے، اس کی وجہ سے وہ اپنے سینہ میں تنگی محسوس کرتے تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

''جو اسرار آپ نے مجھ سے بیان فرمائے ہیں اور حکم دیا ہے کہ کسی سے نہیں نقل نہ کروں، یہ میرے کندھوں پر ایک بار گراں ہے جس نے میرے سینہ میں اتنا دباؤ پیدا کر دیا ہے، کہ میں دیوانہ ہو رہا ہوں! امام علیہ السلام نے فرمایا: اے جابر! اگر تمھاری یہ کیفیت ہو رہی ہے تو بیابان میں جا کر ایک گڑھا کھود کر اپنے سر کو

اس گڑھے میں ڈال کر کہو: ''محمد بن علی علیہ السلام نے فلاں حدیث مجھے روایت کی ہے.....'' ۱

اس کے بعد جابر کنویں میں سر ڈال کر امام محمد باقر علیہ السلام کی روایتیں بیان کرتے تھے تا کہ تھوڑا سا (دل) ہلکا ہو جائے۔ من جملہ روایتوں میں سے جنہیں جابر نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے کی ہے، یہ روایت ہے کہ امام علیہ السلام نے اس سے فرمایا:

''...واعلم بانک لا تکون لنا ولیاً حتی لو اجتمع علیک اهل مصرک وقالوا: انک رجل سوء لم یحزنک ذلک ولو قالوا: انک رجل صالح لم یسرک ذلک ولکن اعرض نفسک علی کتاب اللّٰه فان کنت سالکاً سبیله' زاهداً فی تزهیده' راغباً فی ترغیبه خائفاً من تخویفه فاثبت وابشر فانه لا یضرک ماقیل فیک...'' ۲

''جان لو ہمارے محب دوستدار نہیں بن سکتے، مگر یہ کہ تمہارے شہر کے لوگ متفقہ طور پر تمہارے خلاف ہو جائیں اور کہیں: تم ایک بُرے انسان ہو، تو تم غمگین اور بے چین نہیں ہونا اور اگر وہ سب کہیں۔ تم ایک شائستہ انسان ہو، تو خوشحال نہ ہونا لیکن خود کو کتاب خدا کے حوالہ کر دو اگر دیکھو کہ تم اس کتاب کے راستہ پر چل رہے ہو جن مواقع پر یہ کتاب زہد کی دعوت دے، تو زہد کو اپنا شیوہ قرار دو اور جس چیز کی تاکید اور ترغیب دے، اس کی رغبت پیدا کرو اور جس چیز سے ڈراتی ہے، اس سے خوف کھاؤ، تم اپنی جگہ پر مستحکم اور خوش رہو پھر، لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس سے تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

امام محمد باقر علیہ السلام جابر کو اعتماد اور خدا پر توکل کی دعوت دیتے ہیں کہ اس قدر خدا پر اعتماد کرے کہ لوگوں کا مردہ باد! یا زندہ باد! کہنا تم پر کسی قسم کا اثر نہ کرے اور اپنی رفتار و گفتار کو قرآن مجید کے مطابق قرار دے۔ اب اگر اس نے دیکھا کہ اس کی رفتار حکم الٰہی کے مطابق ہے۔ تو چاہئے کہ وہ خوشحال ہو اور اس توفیق کے حاصل ہونے کے لئے خدا کا شکر بجالائے۔ اور اگر دیکھے کہ اس کی رفتار قرآن مجید کے مطابق نہیں ہے، تو بے چین ہو اس بات پر کہ خدائے متعال اس سے راضی نہیں ہے۔ پس انسان کے خوش ہونے یا ناخوش ہونے کا معیار خدائے متعال اور قرآن مجید کے احکام ہونا چاہئے، نہ لوگوں کا راضی یا ناراض ہونا۔

۱۔ بحار الانوار، ج ۲/ص ۶۹/ حدیث ۲۲

۲۔ بحار الانوار، ج ۷۸/ص ۱۶۲/ح ۱

اگر انسان فیصلہ کرتے وقت کافی علمی توانائی رکھتا ہے، تو اسے فریضہ کی تشخیص کے وقت مستقل ہونا چاہئے اور دوسروں کا تابع نہیں ہونا چاہئے۔ جو عقل خدا نے اسے دی ہے اسی سے فکر کرے اور قرآن مجید اور روایات کے مطابق اپنے فریضہ کو تشخیص دے اور اس کی پروانہ کرے کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ اس کے بعد، جو اپنا فریضہ تشخیص دیا ہو اس پر عمل پیرا رہے اور دوسروں کی ہمراہی اور مدد کے انتظار میں نہ رہے حتی اگر دشمن سے مقابلہ میں تنہا رہ جائے، اگرچہ ہمارے لئے اس صورت میں لڑنا واجب نہیں ہے، لیکن چونکہ اس نے دیکھا کہ دشمن کے سامنے ڈٹ کر مقابلہ کرنے میں خدائے متعال کی رضامندی ہے تو تن تنہا مقابلہ و مبارزہ کو جاری رکھے، خواہ اسے شہید ہونا بھی پڑے۔ یقیناً ایسی بہادری اور شجاعت کہ شخص تنہائی میں بھی اپنے مقصد اور راہ کی حفاظت میں آرام سے نہ بیٹھے اور مبارزہ کرتا رہے تو اس کا یہ عمل انتہائی گراں بہا اور خدا کے فخر و مباہات کا سبب ہوگا۔ اس مبارزہ کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"و اللّٰہ لو تظاھرت العرب علی قتالی لما ولیت عنھا ولو امکنت الفرص من رقابھا لسارعت الیھا..." [1]

"خدا کی قسم اگر عرب میرے ساتھ لڑنے میں سب مل کر مقابلے میں آئیں تو بھی میں ان کی طرف پیٹھ نہیں پھیروں گا اور فرصت ہاتھ آئے تو ان پر تابڑ توڑ حملہ کروں گا۔"

لہذا، پہلا عامل یہ ہے کہ خداوند پسند فرماتا ہے کہ مومن تشخیص اور فریضہ کی پہچان میں نیز اپنی رفتار اور علم میں مستقل ہو اور دوسروں کا منتظر نہ رہے اور دوسروں کے جیسا نہ ہو۔ البتہ جیسا کہ کہا گیا کہ اس سے یہ غلط مطلب نہ لیا جائے کہ انسان کو خودسر اور ضدی بن کر ہمیشہ دوسروں کے برخلاف عمل کرنا چاہئے، یعنی اگر اس نے دیکھا کہ دوسروں نے کوئی کام انجام دیا ہے تو اس کو قطعاً اس کے برعکس کام انجام دینا چاہئے یہ تو ایک ناپسند، ناشائستہ اور بہت احمقانہ صفت ہے، حقیقت یہ ہے کہ انسان فیصلہ کرتے وقت اور فریضہ کی تشخیص اور ان پر عمل کرنے میں آزاد ہونا چاہئے اور دوسروں کی تشویق، ہمراہی اور ہم فکری کا منتظر نہ رہے۔ پس، اگر اس نے اپنے فریضہ کو تشخیص دیا اور دیکھا کہ دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ ہیں تو بہت اچھا ہے۔

انسان کو ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ اگر کسی چیز کو فریضہ کے طور پر تشخیص دیدیا اور بعد میں سمجھ لے کہ اس نے غلطی کی تھی، پھر بھی اپنی بات پر ہٹ دھرمی کرے تو یہ اچھی بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک ناپسندیدہ

۱۔ نہج البلاغہ ترجمہ فیض الاسلام مکتوب ۳۵ ص ۹۷۱/

خصلت ہے۔ انسان کو ہمیشہ اپنے اخلاق، رفتار اور تفکر میں نظر ثانی کرنی چاہئے اور اگر اسے معلوم ہو جائے کہ اس سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے، تو اسے کمال شجاعت سے اعتراف کرنا چاہئے اور ہٹ دھرمی نہ کرے اور اپنی بات پر ضد نہیں کرنی چاہئے۔ مومن کی جب حق کی طرف ہدایت ہوتی ہے تو اسی کو انجام دیتا ہے۔

ب۔ اخلاص کا عامل:

دوسرا عامل جو خدا کے لئے ان تین گروہوں پر فخر و مباہات کرنے کا سبب بنا، اخلاص ہے۔ بیابان میں تنہائی کے عالم میں نماز پڑھنے والے کی نماز میں ریا کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اسے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے تا کہ اس کے حالات کا مشاہدہ کرے اور پھر دوسروں کے لئے اسے نقل کرے۔ یقیناً ایسے عمل کا اخلاص، اس عمل سے بیشتر ہے جو دوسروں کے سامنے انجام پاتا ہے۔

اگر انسان لوگوں کے سامنے پورے آداب کے ساتھ نماز پڑھے، تو بھی اس بات کا امکان ہے شیطان اسے وسوسہ میں مبتلا کردے، چونکہ شیطان مکار ہے انسان نے جس قدر بھی وارستہ اور تہذیب یافتہ ہو ہو ممکن ہے شیطان کے ہاتھوں شکست کھا جائے، جب وہ دوسروں کے سامنے نماز پڑھتا ہے اس کے دل میں ریا پیدا ہو جاتی ہے، اسے یہ چیز پسند ہے کہ دوسرے اس کے عمل کو دیکھ لیں یا اس کی آواز سن لیں۔ لیکن جب ایک بیابان میں تنہا ہے اور اذان و اقامت کے ساتھ کر نماز پڑھتا ہے، ممکن نہیں ہے ریا کرے۔ یا جو نصف شب کو، دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہے اور خدا کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے اور سجدہ میں اتنا طول دیتا ہے کہ اسے نیند آجاتی ہے، یہاں پر ریا کا تصور ممکن نہیں ہے، کیونکہ یہاں پر کوئی نہیں ہے جو اس کی حالت کا مشاہدہ کرے۔

جو میدان کارزار میں اکیلا رہ گیا ہے اور تن تنہا جہاد کر رہا ہے، ممکن نہیں ہے ریا کرے، کیونکہ وہاں پر اس کے دوست و احباب نہیں ہیں جو یہ کہیں: کیا شجاعت کے جوہر دکھا رہا ہے! اور اس کی شہادت کے بعد اس کی بہادری کے بارے میں لوگوں کو بتائیں۔ دشمن تو اس کی فضیلتوں کو نقل نہیں کرے گا۔ لہذا ایسے افراد کے لئے ریا کاری اور خودنمائی کے قصد کا وجود ہی نہیں ہے۔ اس بنا پر جو دوسری مشترک خصوصیت ان تین گروہوں میں پائی جاتی ہے اور خدا کے لئے فخر و مباہات کا سبب ہے وہ انتہائی خلوص ہے جو ان میں پایا جاتا ہے اور انہیں ریا اور خودنمائی میں آلودہ ہونے سے پاک و صاف کرتا ہے۔

جیسا کہ مشاہدہ کیا گیا کہ ان تین گروہوں کے عمل کی ساخت اور شکل ممکن ہے دوسرے لوگوں کے

عمل کے مانند ہی ہو، پس جو چیز ان کے اس عمل کو ممتاز بناتی ہے اور اسے ایسا گراں بہا گوہر میں تبدیل کرتی ہے کہ خدائے متعال اپنے فرشتوں پر فخر کرتا ہے وہ اخلاص ہے، جو اس عمل کو صرف خدا کے لئے انجام دینے کا سبب ہے، اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید اور روایتوں میں آیا ہے کہ اخلاص عمل کی بلندی اور اس کے قبول ہونے کا سبب ہے:

﴿ انا انزلنا الیک الکتاب بالحق فاعبد اللّٰہ مخلصاً له الدین الا للّٰہ الدین الخالص... ﴾ (زمر/۲و۳)

''ہم نے آپ کی طرف اس کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا، لہذا آپ مکمل اخلاص کے ساتھ خدا کی عبادت کریں، آگاہ ہو جاؤ خالص بندگی صرف اللہ کے لئے ہے.....''

ایک حدیث میں آیا ہے:

''من اخلص لنا اربعین صباحاً جرت ینابیع الحکمه من قلبه علی لسانه'' [۱]

''جو چالیس دن تک خدا کے لئے اخلاص سے کام لے، حکمت کے چشمے اس کے دل سے اس کی زبان پر جاری ہوتے ہیں''

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیۂ مبارکہ:

﴿لیبلوکم ایکم احسن﴾ (ملک/۲)

''تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں حسن عمل کے اعتبار سے سب سے بہتر کون ہے۔''

کے بارے میں فرمایا:

''...لیس یعنی اکثر عملاً ولکن اصوبکم عملاً وانما الاصابة خشیة اللّٰہ والنیة الصادقة والحسنة ثم قال: الابقاء علی العمل حتی یخلص اشد من العمل' والعمل الخالص الذی لا ترید ان یحمدک علیه احد الا اللّٰہ عزوجل والنیة افضل من العمل...'' [۲]

''خدا کا مقصود زیادہ عمل کرنا نہیں ہے بلکہ مقصود درست اور صحیح عمل کرنا ہے اور بیشک یہ وہی

۱۔ بحار الانوار، ج ۶۷/ص ۲۳۲/

۲۔ اصول کافی (با ترجمہ) ج ۳/ص ۲۶/

خدا کا خوف اور سچی اور نیک نیت ہے، اس کے بعد فرمایا: عمل کو خالص بنانے میں پائداری، خود عمل سے سخت تر ہے اور خالص عمل وہ ہے کہ تم اس عمل کے بارے میں خدا کے علاوہ کسی سے ستائش کے خواہاں نہ ہو اور نیت عمل سے بہتر ہے "

لہذا جو کچھ بیان ہوا اس کے پیش نظر، ممکن ہے ہمارا کوئی ایسا عمل ہو جو با فضیلت اور اس کا اجر و ثواب بہت زیادہ ہو، جیسے با جماعت نماز پڑھنا، کہ روایتوں کے مطابق اس کے ثواب کو ملائکہ بھی گن نہیں سکتے ہیں۔ لیکن معلوم نہیں ہے اس قسم کی نماز کا خلوص اس نماز کے خلوص کے برابر ہو کہ جسے ایک بندہ تنہا بیابان میں انجام دیتا ہے۔

بہر صورت شیطان وسوسہ کرتا ہے اور انسان تنہا ہوتا ہے اس کے لئے مشکل ہے عبادت میں خلوص پیدا کرنا وہ بھی آداب کے ساتھ، کیونکہ اس کا اندرونی ارادہ اور شوق اتنا قوی نہیں ہے، لیکن اگر دوسرے اس کے ہمراہ ہوں خارجی مدد اس کے ہمراہ ہو تو، عبادت کو بہتر صورت میں انجام دیسکتا ہے۔

اٹھائیسواں سبق:

عبادت و بندگی کی عظمت اور اس کے تکوینی اثرات

- انسان کے اعمال کے بارے میں زمین کی گواہی۔
- زمین اور بے جان مخلوقات کی ستائش کی کیفیت۔
- مخلوقات کا شعور و آگاہی اور ان کا اثر قبول کرنا۔
- انوار ائمہ اطہار علیہم السلام کی وسعت اور اس کے حدود۔
- گواہوں اور شاہدوں کی نظروں سے اعمال کا مخفی نہ رہنا
- بندگی میں اخلاص، شادمانی اور فخر و مباہات کا سبب
- اخلاص، بہترین عمل کا سبب۔

عبادت و بندگی کی عظمت اور اس کے تکوینی اثرات

یا اباذر: مامن رجلٍ یجعل جبهته فی بقعة من بقاع الارض الا شهدت له بها یوم القیامة وما من منزل ینزله قوم الا واصبح ذلک المنزل یصلی علیهم اویلعنهم

یا اباذر: ما من صباح ولا رواح الا وبقاع الارض تنادی بعضها بعضاً یا جارهل مربک ذاکر للّٰه تعالیٰ او عبد وضع جبهته علیک ساجد اللّٰه؟ فمن قائلة لا ومن قائله نعم ' فاذا قالت نعم اهتزت انشرحت وتری ان لها الفضل علی جارتها"

حدیث کے اس حصہ میں خدائے متعال کی عبادت و بندگی کی عظمت اور بلندی کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے اور یہ کہ انسان کا عمل خواہ پسندیدہ ہو یا ناپسندیدہ گواہوں اور شاہدوں کی نظروں سے دور نہیں رہتا، یہاں تک زمین بھی جس پر ہم عبادت یا برے کام انجام دیتے ہیں قیامت کے دن ہمارے نفع یا نقصان میں گواہی دے گی۔ ایسا نہیں ہے کہ ہمارے اعمال و کردار ردّعمل اور نتیجہ نہ ہو، بلکہ دنیوی ردعمل اور نتیجہ کے علاوہ ہمارے اعمال و کردار کا قیامت میں بھی نتیجہ ظاہر ہوگا۔ قیامت کے دن، وہ زمین جس پر ہم عبادت کرتے ہیں، اس عبادت کے انجام کے بارے میں شہادت دے گی، یا اگر اس پر ہم کوئی برا کام انجام دیں تو قیامت کے دن ہمارے خلاف شہادت دے گی اور ہم پر لعنت کرے گی۔

انسان کے اعمال کے بارے میں زمین کی گواہی:

"یا اباذر؛ ما من رجلٍ یجعل جبهته فی بقعة من بقاع الارض الا شهدت له بها یوم القیامة وما من منزل ینزله قوم الاواصبح ذالک المنزل یصلی علیهم اویلعنهم"

"اے ابوذر! کوئی شخص اپنی پیشانی کو زمین کے کسی نقطہ پر نہیں رکھتا ہے، مگر یہ کہ وہ نقطہ قیامت کے دن اس کی گواہی دے گا اور کوئی ایسی جگہ نہیں ہے کہ ایک گروہ وہاں پر قدم رکھے، مگر یہ کہ وہ جگہ ان پر درود یا لعنت بھیجے گی"

بعض بزرگ یہ کوشش کرتے تھے کہ مسجد کی مختلف جگہوں پر نماز پڑھیں اور ہمیشہ ایک ہی جگہ پر نماز نہیں پڑھتے تھے، یا اگر کسی گھر یا کسی دوسری جگہ داخل ہوتے تھے، پہلے دو رکعت نماز پڑھتے تھے تا کہ قیامت کے دن اپنے لئے زیادہ سے زیادہ گواہ بنائیں۔ یہ بذات خود ایک ہوشیاری ہے جو مؤمن کے لئے مفید و مطلوب ہے۔

اسی روایت اور دوسری روایتوں میں عبادت کے لئے جو بلندی وقدر و منزلت بیان ہوئی ہے اس کے پیش نظر ہماری اس امر کی تاکید کہ عبادت کو مختلف جگہوں پر انجام دینا چاہئے، اس معنی میں ہے کہ ہم نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے بیانات پر اعتماد کیا ہے۔

چنانچہ مذکورہ روایت کے اس حصہ اور دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے زمین، درخت اور تمام بے جان مخلوقات، کہ جنھیں ہم انہیں فاقد درک وشعور جانتے ہیں، حقیقت میں درک وشعور کے حامل ہیں اور ہمارے اعمال کو درک کرتے ہیں اور ہمارے نیک کام انجام دینے پر ہمارے لئے دعا کرتے ہیں اور ہمارے بُرے کاموں کی وجہ سے ہم پر لعنت بھیجتے ہیں، اس کے علاوہ قیامت کے دن بھی ہمارے نفع یا نقصان میں گواہی دیتے ہیں۔

زمین اور بے جان مخلوقات کی ستائش کی کیفیت:

روایت کے اس حصہ کے مضمون جس میں زمین اور بے جان مخلوقات کے شعور و درک کی تصویر کشی

کی گئی ہے نیز دوسری آیات اور روایات، جو اسی مضمون پر مشتمل ہیں، کے بارے میں بزرگ علما نے تین نظر یہ پیش کئے ہیں:

پہلا نظریہ: بعض کا خیال یہ ہے کہ یہ تعبیریں کنایہ ہیں اور ان کا حقیقی معنی مراد نہیں ہے اور ہر مورد کے لئے مناسب تاویل ذکر کرتے ہیں۔ شاید اکثر مفسرین نے اس قسم کی آیات و روایات کی تفسیر میں اسی شیوہ کو اپنایا ہے۔

دوسرا نظریہ: عرفا اور عارف مزاج فلاسفہ، جیسے صدر المتاھین اور ان کے شاگرد یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ مخلوقات واقعاً ادراک وشعور رکھتی ہیں اور خدائے تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں اور خدا سے ڈرتے ہیں، لیکن ہم اس حقیقت کو درک کرنے سے عاجز ہیں۔

شاعر کہتا ہے:

ماسمیعیم و بصیریم و ھُشیم　　باشمانا محرمان ما خامشیم

''ہم سنتے، دیکھتے اور باہوش ہیں، لیکن تم نامحرموں کے سامنے خاموش ہیں''

یہ لوگ ان آیات و روایات کے حقیقی معنی اخذ کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

درخت، زمین اور کنکریاں وغیرہ شعور رکھتی ہیں اور خدائے متعال کی تسبیح کرتے ہیں:

'تسبح له السمٰوات والارض ومن فیهن وان من شیٔ الا یسبح ﴿بحمده ولکن لا تفقهون تسبیحهم.....﴾ (اسراء/۴۴)

''ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب اس کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی شے ایسی نہیں ہے جو اس کی تسبیح نہ کرتی ہو یہ اور بات ہے کہ تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو''

مذکورہ آیت کی تفسیر میں علامہ طباطبائیؒ فرماتے ہیں:

''آیت عالم مادی کے اجزا کی تسبیح کو ثابت کرتی ہے اور یہ کہ وہ خدائے متعال کی تسبیح کرتے ہیں اور اسے (ہر) شریک سے منزہ اور پاک جانتے ہیں، تسبیح کے معنی کلام وسخن کے ذریعہ تنزیہ ہے اور کلام کی حقیقت اندرونی مقصود سے اس کے اشارہ اور رہنمائی سے پردہ اٹھانا ہے۔ چونکہ انسان کے پاس اپنے مقصد کی طرف اشارہ کرنے اور اسے پیش کرنے کے لئے کوئی تکوینی راستہ نہیں ہے لہذا مجبور ہے ایسے آواز

والے کلمہ سے استفادہ کرے جو بہت سے معنی کے لئے وضع ہوئے ہیں، اور ان کے ذریعہ اپنا مقصود واضح کرے، اس کے بعد تفہیم و تفہم کا طریقہ اسی صورت میں رائج ہوا۔ اس کے علاوہ ممکن ہے اپنا مقصود بیان کرنے کے لئے انسان ہاتھ یا سر کے اشارہ سے مدد لے اور کبھی لکھنے یا علامتوں کے ذریعہ مدد حاصل کرے۔

مختصر یہ کہ جو مقصد سے پردہ اٹھاتا ہے وہ کلام ہے اور اپنے مقصود اور منظور کو بیان کرنے کے لئے ہر چیز اور ہر مخلوق سے استفادہ کرنا، اس کا قول و کلام ہے، اگر چہ وہ مقصود باطنی آواز اور کلمہ سے ہماھنگ نہ ہو۔ اس نکتہ کی دلیل، بعض کلمات جیسے کلام، قول، امر و نہی ہیں کہ قرآن مجید میں خدائے متعال کی طرف ان کی نسبت دی گئی ہے اور یقیناً وہ ہم سے صادر ہونے والی بات اور گفتار جیسی نہیں ہیں۔

یقیناً آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں موجود ہے، ایک ایسی چیز ہے جو خدائے متعال کی وحدانیت اور یکتائی کو بیان کرتی ہے اور اسے ہر عیب و نقص سے منزہ جانتی ہے۔ وہ یہ کہ یہ ساری مخلوقات نیاز مند اور محتاج ہیں اور احتیاج اس امر کا واضح ترین گواہ ہے کہ کوئی ایسا موجود ہے جس کی طرف سب نیاز مند اور محتاج ہیں اور اس سے کوئی بھی بے نیاز نہیں ہے۔ پس مخلوقات میں ہر ایک مخلوق، اپنے احتیاج وجودی اور ذاتی نقص کی بنا پر خالق غنی کے بارے میں خبر دیتی ہے۔

بحث کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''خدائے متعال کا بیان اس بات کی دلیل ہے کہ مخلوقات کی پیدائش کے ساتھ علم و آگاہی بھی ان میں پھیلی ہے اور ان میں سے ہر ایک نے وجود و ہستی سے بہرہ مند ہونے کی حد میں، علم سے بھی استفادہ کیا ہے۔ نہ یہ کہ سب ایک ہی حد اور دائرہ میں علم رکھتے ہوں اور سبھی کا علم و اور ان کی معلومات ایک ہی قسم کا ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ'' تمام مخلوقات کا علم انسان کے جیسا ہو یا انسان تمام مخلوقات کے علم و آگاہی سے واقف ہو۔ اس بنا پر ہر مخلوق کسی نہ کسی صورت میں اپنے وجود کا علم رکھتی ہے اور اپنی ہستی اور وجود سے اپنی محتاجی اور نقصان کا کہ جس کا خدائے بے نیاز میں احاطہ ہے اظہار کرتی ہے اور یہ کہ خدائے متعال صاحب کمال ہے اور اس کے علاوہ کوئی پروردگار نہیں ہے۔ پس ہر مخلوق اپنے پروردگار کی تسبیح کرتی ہے اور اسے شریک اور ہر نقص سے پاک و منزہ جانتی ہے ''[1]

تیسرا نظریہ: اس دنیا میں موجود تمام مخلوقات کے علاوہ مادی صورت کے ساتھ ملکوتی صورت بھی

۱۔ المیزان ج ۳، ص ۱۱۴۔۱۱۶

ہے اور حقیقت میں ان کی یہی ملکوتی اور باطنی صورت درک وشعور رکھتی ہے اور وہی ملکوتی صورت قیامت کے دن ظاہر ہوگی اور شہادت دے گی، ہم اس دنیا میں اس ملکوتی صورت کو درک نہیں کرتے ہیں، اس لئے اشیا کی تسبیح کو نہیں سنتے نہیں سمجھتے ہیں اور ان میں شعور وآگاہی کے آثار کو نہیں دیکھتے، لیکن یہ صورت موجود ہے اور قیامت کے دن ظاہر ہوگی اور جن حقائق کو ادراک کرتی ہے انہیں ظاہر کر کے شہادت دے گی۔

قرآن مجید کے واضح بیان کے مطابق، قیامت کے دن حتی انسان کی کھال بھی اس کے خلاف گواہی دے گی، اس کی زبان اور ہاتھ پاؤں بھی اس کے خلاف گواہی دیں گے، اگر یہ اعضا شعور نہ رکھتے ہوں تو ان کی گواہی بے معنی ہے۔ قرآن مجید انسان کے بدن کے اعضا کی گواہی کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿وقالوا لجلودهم لم شهدتم علينا قالوا انطقنا الله الذي انطق كل شئ﴾ " (فصلت/۲۱)

''اور وہ اپنے اعضا سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیسے شہادت دی تو وہ جواب میں کہیں گے کہ ہمیں اسی خدا نے گویا بنایا ہے جس نے سب کو گویائی عطا کی ہے۔''

اگر انسان کی کھال کسی قسم کا شعور نہ رکھتی ہوتی کہ معصیت کے وقت جس کو درک کر سکے، تو کیسے ممکن ہے وہ قیامت کے دن اس کی معصیت کے بارے میں گواہی دے جبکہ اسے درک نہیں کر سکتی تھی؟ شہادت کا اس وقت معنی درست ہوں گے جب شاہد معصیت کے منظر کو درک اور احساس کرے ورنہ شہادت کا کوئی معنی نہیں ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ انسان کے اعضا اس کی معصیت کے بارے میں درک نہ رکھنے کے باوجود، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن انہیں بات کرنے پر مجبور کر دے گا، تو کہنا چاہئے کہ اس صورت میں شہادت کا کوئی معنی ومفہوم ہی نہیں ہے اور شہادت کا اطلاق ایسے مورد پر بے معنی ہے۔ اس بنا پر اعضا کا گواہی دینا درک واحساس اور عمل کے بارے میں ایک قسم کے علم کے بعد انجام پاتی ہے اس کے بغیر شہادت ہی انجام نہیں پا سکتی ہے۔

پس دوسرے اور تیسرے نظریہ کے مطابق، بنیادی طور پر تمام مخلوقات میں شعور، احساس اور ایک قسم کی آگاہی وعلم کے موجود ہونے میں کس قسم کا شک وشبہ نہیں ہے، بلکہ ان کی کیفیت میں اختلاف ہے کہ کیا یہ علم اشیا کی ملکوتی روح کے ساتھ ہے، یا یہ کہ بذات خود درک وشعور کے حامل ہیں۔ البتہ پہلے نظریہ کے قائل کہتے ہیں: جب انسان کے اعضا وجوارح قیامت کے دن ظاہر ہوں گے، جو انسان کی رفتار کے آثار ان میں باقی رہے ہیں وہ ان کی شہادت کے درجہ پر ہیں۔

مخلوقات کا شعور و آگاہی اور ان کا اثر قبول کرنا:

شاید مذکورہ تینوں نظریات میں تیسرا نظریہ بہتر ہوگا، اور ہر صورت میں آیات و روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ اشیا اور مادی مخلوقات ایک قسم کا شعور و ادراک رکھتی ہیں۔ نہ صرف ان میں تکوینی شعور موجود ہے، بلکہ اپنے سے مربوط حوادث سے متاثر ہوتی ہیں اور حوادث ان میں اثر ڈالتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر ان میں ایک نئی قوت پیدا ہوتی ہے: اگر روی زمین پر عبادت انجام دی جاتی ہے تو، وہ اس سے نیک اثر قبول کرتی ہے اور اس لحاظ سے خوش ہوتی ہے اور اپنے اوپر ناز کرتی ہے، اس کے برعکس اگر روی زمین پر کوئی معصیت انجام دی جاتی ہے تو ایک منفی اثر ان پر پڑتا ہے، اس لحاظ سے زمین ناراض ہوتی ہے اور گناہ کار پر لعنت بھیجتی ہے، البتہ ہم اس قسم کے مفاہیم کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور ان آیات و روایات کا مضمون ہمارے لئے صحیح طور پر واضح اور نمایاں نہیں ہے، لیکن ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ کائنات میں بعض نامعلوم حقائق موجود ہیں جو ہمارے درک و فہم کے حدود اور دائرہ کے باہر ہیں یا ان کے بارے میں ہماری معرفت بہت محدود ہے، چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿...وما اوتیتم من العلم الاقلیلاً﴾ (اسراء/۸۵)

''اور تمہیں بہت تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔''

کائنات میں بہت حقائق موجود ہیں جن کے بارے میں ہمیں علم نہیں ہے اور ان میں سے بعض کو ہم نے وحی کے ذریعہ پہچان لیا ہے اور یا انبیائے عظام صلوات اللہ علیہم اور ائمہ اطہار علیہم السلام نے ہمارے لئے انہیں بیان کیا ہے اور ہم بھی ان کے کہنے پر اعتماد کرتے ہیں اور ہمیں ان کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے ان حقائق کو بیان فرمایا ہے ورنہ ہماری عقل ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی اور ممکن نہیں تھا ہم اپنی ناقص عقل کے ذریعہ ان حقائق تک پہنچ سکتے:

﴿کما ارسلنا فیکم رسولا منکم یتلوا علیکم آیا تنا ویزکیکم و یعلمکم الکتاب والحمکة ویعلمکم مالم تکونوا تعلمون﴾ (بقرہ/۱۵۱)

جس طرح ہم نے تمہارے درمیان تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر ہماری آیات کی تلاوت کرتا ہے، تمہیں پاک و پاکیزہ بناتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور سب کچھ بتاتا ہے جو

تم نہیں جانتے تھے۔

مذکورہ مطالب کے پیش نظر ہمارے لئے دو نکتے واضح ہو گئے: پہلا نکتہ یہ کہ اگر ہم ہزاروں دانش و علم بھی حاصل کرلیں اور تمام بشری مخلوقات کو پالیں، پھر بھی ہماری معلومات ہماری نامعلوم چیزوں کے مقابلہ میں محدود ہیں اور قابل شمار نہیں ہیں، پس ہمیں مغرور نہیں ہونا چاہئے اور اپنے اوپر ناز نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ ممکن نہیں ہے کوئی تمام بشری معلومات کو پاسکے، بلکہ ہر شخص علوم کے ایک حصہ کو حاصل کرسکتا ہے اور علم کے بے انتہا سمندر سے ایک قطرہ اس کو نصیب ہوتا ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ہمیں یہ خیال نہیں کرنا چاہئے، کہ ہم ایک ایسی دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں کہ اگر ایک خلوت گاہ پر کوئی کام انجام دیں تو کوئی ہمیں نہیں دیکھتا ہے: اگر زمین درک نہ کرے اور نہ سمجھے، تمھارے اعمال پر مقرر کئے گئے فرشتے تو اسے درک کرتے ہیں اور ہمارے اعمال کو لکھتے ہیں اور ان کے علاوہ بھی ایسے اشخاص موجود ہیں جو اس دنیا پر تسلط رکھتے ہیں اور ان کی نظروں سے کوئی چیز مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے۔

انوار ائمہ اطہار علیہم السلام کی وسعت اور اس کے حدود:

ہم، شیعوں کے عقیدہ کی بنیاد پر، ائمہ اطہار علیہم السلام کا نور ہر جگہ حاضر ہے، اگر چہ ہم سب ان کے نور کو کما حقہ درک نہیں کرتے ہیں۔ ذخیرہ الٰہی، حضرت ولی عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ کو اگر کوئی انہیں سلام کرے تو وہ جواب دیتے ہیں، لیکن ہمارے کانوں میں ان کا کلام سننے کی توانائی نہیں ہے۔ اگر کوئی ان سے فریاد کرے، تو وہ جواب دیتے ہیں، اگر بیابان میں گم شدہ کوئی شخص انہیں پکارے تو وہ مدد کے لئے پہنچتے ہیں اور اس کی رہنمائی کرتے ہیں اور آپؑ درماندہ و عاجز، مصیبت زدہ بیمار کو شفا بخشتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے آپؑ حاضر ہیں اور سنتے ہیں، ورنہ اگر حاضر نہ ہوتے اور نہیں سنتے اور تو کیسے سمندروں کی لہروں میں گرفتار یا جنگل و بیابان میں مشکل سے دوچار شخص کی فریاد سنتے اور اس کی مدد کو پہنچتے نیز اس کو نجات دیتے؟

علامہ مجلسی رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ ان کے زمانہ میں ایک صالح شخص جو صاحب تقوی اور اہل معرفت تھا اس نے بہت سے حج کئے تھے۔ اس کے بارے مشہور تھا کہ اس نے ''طی الارض'' کیا ہے، ایک دن وہ اصفہان آیا تو میں نے اس سے ملاقات کی۔ میں نے اس سے سوال کیا:

تمھارے متعلق ''طی الارض'' کی روداد کیا ہے؟ اس نے کہا: میں ایک سال حاجیوں کے ہمراہ بیت اللہ کے لئے روانہ ہوا۔ ہم ایک ایسی جگہ پر پہنچ گئے جہاں سے مکہ مکرمہ کی مسافت سات یا نو منزل رہ گئی تھی۔ میں قافلہ سے بچھڑ گیا اور قافلہ والے میری نظروں سے غائب ہوگئے، میں نے راستہ کو گم کردیا اور حیرانی وسر گردانی کی حالت میں ادھر ادھر بھٹک رہا تھا پیاس کی شدت کی وجہ سے زندگی سے نا اُمید ہوگیا تھا، اسی حالت میں، میں نے فریاد بلند کی: ''یا ابا صالح، میری مدد کیجئے'' اچانک دور سے ایک سوار نمودار ہوا۔ جب وہ میرے نزدیک پہنچا تو میں نے ایک خوبصورت جوان کو لباس فاخرہ پہنے ہوئے بزرگوارانہ صورت میں اونٹ پر سوار دیکھا اور ان کے ساتھ پانی کا ایک برتن بھی تھا۔

میں نے انہیں سلام کیا اور انہوں نے جواب دیا اور فرمایا: کیا تم پیاسے ہو؟ میں نے عرض کی: جی ہاں، انہوں نے مجھے پانی پیش کیا اور میں نے اسے پیا، اس کے بعد فرمایا: کیا تم چاہتے ہو کہ تمھیں تمھارے قافلہ کے پاس پہنچادوں؟ میں نے عرض کی: جی ہاں، انہوں نے فرمایا: میرے اونٹ کی پشت پر سوار ہو جاؤ؟ میں سوار ہوا اور وہ مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مجھے ہر روز ''حرز یمانی'' پڑھنے کی عادت تھی میں نے اسے پڑھنا شروع کیا، پڑھنے کے بعد اس عرب جوان نے مجھ سے فرمایا: بعض کلمات کو یوں پڑھا کرو تھوڑی دیر گزرنے کے بعد انہوں نے مجھ سے فرمایا: اس جگہ کو پہنچانتے ہو؟ میں نے نظر ڈالی اور دیکھا کہ میں سرزمین ابطح یعنی مکہ کے قریب پہنچا گیا ہوں۔ اس نے فرمایا نیچے اتر جاؤ۔ جوں ہی میں اونٹ سے نیچے اترا وہ غائب ہوگئے۔ یہاں پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ خوبصورت جوان، امام زمان عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف تھے۔[1]

پس امام علیہ السلام کا نور ہر جگہ حاضر ہے اور ہمیں دیکھ رہا ہے، چونکہ اس حقیقت کو درک کرنا تمام لوگوں کے لئے مشکل ہے۔ اگر یہ حقائق لوگوں کے لئے کھلم کھلا بیان کئے جائیں تو وہ غلو میں مبتلا ہو جائیں گے، اس لئے ان کے ادنی مراتب بیان ہوئے ہیں من جملہ ہمارے نامۂ اعمال امام علیہ السلام کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ یا بعض روایتوں میں ہمارے اعمال کے خدائے متعال اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کئے جانے کی بات کہی گئی ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ جب ہفتہ کے دنوں میں من جملہ جمعرات کا ذکر آیا تو حضرت امام رضا علیہ السلام نے فرمایا:

۱۔ کفایۃ الموحدین، نوری طبرسی ج ۲/ص ۱۸۲

"...هو يوم تعرض فيه الاعمال على الله وعلىٰ رسوله' صلى الله عليه وآله وعلى الائمة..."[۱]

"جمعرات کا دن وہ دن ہے جس میں بندوں کے اعمال خدائے متعال' رسول خداؐ اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔"

یا بعض روایتوں میں آیا ہے کہ جب ملائکہ انسان کے اعمال لکھتے ہیں، اسی دن شب کو عرش پر لے جا کر خدائے متعال کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہاں پر یہ سوال کیا جائے کہ کیا خدائے متعال ہر جگہ حاضر نہیں ہے کہ اعمال کی رپورٹ کو عرش پر اس کی خدمت میں پہنچائی جائے؟ لیکن جاننا چاہئے کہ وجود کے مراتب کی خاص صورتیں ہیں اور اعمال کو پیش کرنے کا بھی ایک خاص نظام ہے جو بارگاہ ربوبیت کے متناسب ہے اور یہ خدا کے ہر جگہ پر حاضر ہونے کے منافی نہیں ہے۔

گواہوں اور شاہدوں کی نظروں سے اعمال کا مخفی نہ ہونا:

مذکورہ مطالب کے پیش نظر، ہمیں ہوشیار رہنا چاہئے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں زندگی نہیں بسر کر رہے ہیں، جو درک وشعور سے خالی ہو: اس دنیا میں دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان موجود ہیں جو ہمارے اعمال اور بیان کے گواہ ہیں اور بعض آیات وروایات کے ظاہر کی بناء پر زمین، درخت اور پرندے بھی شعور رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں، البتہ ہم غافل ہیں! اس سے بالاتر امام زمان عجل اللہ تعالےٰ فرجہ الشریف کا وجود مقدس ہمارے اعمال پر ناظر ہے، سب سے افع واعلیٰ ذات مقدس باری تعالےٰ ہمارے اعمال پر گواہ ہے:

﴿...ان الله كان على كل شئ شهيداً﴾ (نساء/۳۳)

".....بیشک اللہ ہر شے پر گواہ اور نگراں ہے"

خدائے متعال انسان کے پنہان اور آشکار اعمال کے بارے میں اپنی آگاہی اور فرشتوں کی نگرانی کے سلسلہ میں فرمایا ہے:

﴿ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس به نفسه ونحن اقرب اليه من

۱۔ بحار الانوار، ج/۲۳ ص/۳۴۶

حبل الوريد. اذيتلقى المتلقيان عن اليمين وعن الشمال قعيد. مايلفظ من قول الا لديه رقيب عتيد﴾ (ق:۱۶/۱۸)

اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ اس کا نفس کیا کیا وسوسے پیدا کرتا ہے اور ہم اس سے رگ گردن سے زیادہ قریب ہیں۔ جب کہ دو لکھنے والے فرشتے اس کے نامہ اعمال لکھنے کے لئے مامور ہیں جو داہنے اور بائیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ کوئی بات منہ سے نکالتا ہے مگر یہ کہ ایک نگہبان اس کے پاس موجود رہتا ہے (جو اس کی باتوں کو لکھ لیتا ہے)۔ ایک دوسری جگہ پر قیامت کے دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گواہی کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿فكيف اذاجئنا من كل امةٍ بشهيدٍ وجئنا بك على هولاء شهيداً﴾ (نساء/۴۱)

''اس وقت کیا ہوگا جب ہم ہر امت کو اس کے گواہ کے ساتھ بلائیں گے اور اے پیغمبر تمھیں بھی ان پر گواہ بناؤں گا''

قیامت کے دن رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر گواہوں کی شہادت کے بارے میں بیان کرنے والی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گواہ دنیا میں بندوں کے اعمال کے شاہد ہیں ورنہ اگر وہ دنیا میں لوگوں کے اعمال کے شاہد نہ ہوتے تو قیامت کے دن کیسے شہادت دیتے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی حادثہ کو دیکھے بغیر اس کے بارے میں شہادت دے؟

اگر ہم اس نکتہ کی طرف توجہ کریں کہ جس دنیا میں ہم رہتے ہیں، وہ خاموش اور شعور و درک سے خالی نہیں ہے بلکہ ایسے اشخاص موجود ہیں جو ہمیں دیکھتے ہیں اور وہ ہمارے اعمال کے شاہد اور ناظر ہیں، اگر چہ ہم ان کو نہیں دیکھ رہے ہیں، ہمیں ہوشیار رہنا چاہئے اور اپنی رفتار پر نظر ثانی کرنی چاہئے یہ شرم و حیا ہے کہ جو بعض ناپسندیدہ حرکتوں کے سرزد ہونے سے ہمارے لئے مانع ہوتی ہے۔ جب ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ ہمارے اعمال ثبت ہو کر قیامت کے دن ظاہر ہوں گے تو شرم و حیا بُرے کام کو انجام دینے سے ہمارے لئے مانع ہو جاتی ہے۔ جب انسان کسی گناہ کا مرتکب ہونا چاہتا ہے، اگر یہ توجہ کرلے کہ زمین و آسمان اور بعض صفحات (تختیاں) ہیں جن پر انسان کے اعمال کی صورت ثبت ہوتی ہے اور ایک دن ظاہر ہوگی، تو وہ اس گناہ سے پرہیز کرے گا اور خلوت میں بھی گناہ نہیں کرے گا، کیونکہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"اتقوا معاصی اللّٰہ فی الخلوات فان الشاھد ھو الحاکم"[1]

"پوشیدہ حالت میں خدا کی نافرمانی سے پرہیز کرو، کیونکہ جو شاہد اور ناظر ہے وہ حاکم بھی ہے"

اگر آپ اپنی کسی حالت کے بارے میں پسند نہیں کرتے کہ کوئی اس حالت کو دیکھ لے، تو اگر کسی نے اس حالت کی تصویر لے لی ہے تو، آپ ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ اس تصویر کو نابود کر دیں تا کہ اسے آئندہ کوئی نہ دیکھ سکے۔ یقیناً انسان ہرگز نہیں چاہتا ہے کہ کوئی اس کی ایسی تصویر کھینچے جو اس کی شرمندگی کا سبب بنے۔ وہ تصویر کھینچتے وقت اپنے آپ کو آراستہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، اچھے کپڑے پہنتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس کا قیافہ اچھا ہو زیر لب ہنستا رہے تا کہ اس کی تصویر بہتر ہو۔ اس کے لئے پسندیدہ نہیں ہے کہ اس کی تصویر اس حالت میں کھینچی جائے جو اس کے لئے شرمندگی اور رسوائی کا سبب بنے۔ اس مثال کے پیش نظر، ہمیں جاننا چاہئے۔ کہ طبیعی عوامل جیسے زمین، آسمان اور در و دیوار مسلسل ہماری تصویریں کھینچ رہے ہیں اور قیامت کے دن ان تصویروں کو ظاہر کریں گے۔ لہٰذا ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ نامناسب اور بدحالت میں ہماری تصویریں نہ کھینچی جائیں تا کہ قیامت کے دن ہماری تمام رفتار اور کردار رونما ہو کر ہماری رسوائی کا سبب نہ بنیں:

﴿یوم تجد کل نفسٍ ماعملت من خیرٍ محضراً وما عملت من سوءٍ تود لو ان بینھا وبینہ امدًابعیداً...﴾ (آل عمران/ ۳۰)

"اس دن کو یاد کرو جب ہر نفس اپنے نیک و بد اعمال کو حاضر پائے گا جن کو دیکھ کر یہ تمنا کرے گا کہ کاش ہمارے اور ان بُرے اعمال کے درمیان طویل فاصلہ ہو جاتا"

بندگی میں اخلاص، شادمانی اور فخر و مباہات کا سبب:

"یا اباذر: مامن صباح ولا رواح الا وبقاع الارض تنادی بعضھا بعضاً یا جارھل مربک ذاکر للّٰہ تعالیٰ او عبد وضع جبھتہ علیک ساجد اللّٰہ؟ فمن قائلۃ لا ومن قائلۃ نعم، فاذا قالت نعم اھتزت وانشرحت وتری ان

۱۔ نہج البلاغہ "ترجمہ شہیدی" کلمات قصار/۳۲۳ ص/۴۲۰

لها الفضل علی جارتها"

"اے ابوذر! کوئی صبح وشام ایسی نہیں ہے مگر یہ کہ زمین کا چپا چپا ایک دوسرے سے کہتا ہے: اے میرے ہمسایہ! کیا تم پر کوئی ایسا وقت گزرا جو ذکر خدا کرے، یا کوئی ایسا بندہ جو خدا کو سجدہ کرنے کے لئے تجھ پر پیشانی رکھے؟ بعض کہتے ہیں: ہاں اور بعض کہتے ہیں: نہیں، جو بھی ہاں کہے وہ اپنے اوپر ناز اور شادمانی کرتا ہے اور اپنے کو دوسروں پر برتر جانتا ہے۔"

ایک اور مطلب، جس کی طرف اس حدیث شریف میں اشارہ ہوا ہے، وہ یہ ہے، کہ جس زمین پر خدا کا بندہ عبادت کرتا ہے اور سجدہ کرنے کے لئے اپنی پیشانی اس پر رکھتا ہے، وہ اپنے اوپر ناز کرتے ہوئے مخر ومباہات کرتی ہے۔ دیکھنا چاہئے کہ اس ناز کرنے اور فخر ومباہات کا راز کیا ہے؟ اس کا راز یہ ہے کہ جو چیز بنیادی طور پر خدا کے سامنے قدر و قیمت رکھتی ہے، وہ اس کی طرف توجہ ہے اور دوسرے کام اس وقت قدر و منزلت رکھتے ہیں، جب خدا کی توجہ کے ہمراہ اور قربت الی اللہ انجام پائیں۔ کام اس وقت خدا کے لئے انجام پاتا ہے، جب انسان خدا کی یاد میں ہو ورنہ جو خدائے متعال سے غافل ہو، اس کا کام قربۃ الی اللہ انجام نہیں پاتا ہے، بلکہ وہ کام یا اپنے دل کی مرضی یا اپنے دل کو خوش کرنے کے لئے یا دیگر مادی نیتوں سے انجام دیا جاتا ہے اور اس کی خدائے متعال کے پاس کوئی قیمت نہیں ہے۔

پس خدا کی یاد، اس کی طرف توجہ اور جو چیز انسان کو ذات ابدیت سے ملحق کرتی ہے وہ اصالت اور حقیقت رکھتی ہے اور اسی طرح دوسری تمام چیزیں خدا کی یاد کے سائے میں قابل اہمیت ہیں اور خدا کی یاد کے بغیر ان کی کوئی حقیقت واہمیت نہیں ہے۔ اس لحاظ سے، انسان کا حقیقی کمال خدا کی توجہ کے سائے میں حاصل ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو، خدا کی طرف توجہ کے بغیر اور اعمال وعبادت کو قربۃً الی اللہ اور اخلاص کے بغیر انجام دینا بے روح بدن کی طرح ناچیز اور بے قیمت ہے۔ پس، ہمارے تمام اعمال خدائے متعال کے لئے انجام پانا چاہئے:

﴿قل انی امرت ان اعبد اللّٰه مخلصاً له الدین﴾ (زمر/۱۱)

"(اے پیغمبرؐ!) کہہ دیجئے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کروں اور اپنے دین کو اس کے لئے خالص قرار دوں"

اخلاص، خاص کر دین میں اخلاص پر خدائے متعال کی تاکید، اس لئے ہے کہ انسان خدا کا بندہ

ہے اور اسے خدا کی بندگی اور عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اسے اپنی زندگی کی راہ میں اور زندگی کے دوسرے تمام مراحل میں، تکامل وترقی، سعادت اور بالیدگی کی فکر میں ہونا چاہئے یہ چیز اخلاص اور خدا کے سائے کے بغیر حاصل نہیں ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے عبادت کو خدا کے لئے خالص بنانا، دین کا سب سے بڑا حکم ہے، کیونکہ انسان کے لئے خدا کے تقرب اور کمال تک پہنچنے کے لئے یہ بذات خود ایک اہم عامل ہے۔ اس لئے خدائے متعال، چنانچہ قرآن مجید میں جگہ جگہ پر مخلصین کی ستائش کی گئی ہے، حضرت موسیٰ کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿واذکر فی الکتاب موسیٰ انه کان مخلصاً و کان رسولاً نبیا﴾

(مریم/۵۱)

''اور اپنی کتاب میں موسیٰؑ کا بھی تذکرہ کرو کہ وہ میرے مخلص بندے اور رسول و نبی تھے''

(لام پر کسرہ کے ساتھ) مخلص اس معنی میں ہے جو اخلاص رکھتا ہے اور اپنے کام اخلاص سے انجام دیتا ہے۔ لیکن (لام پر فتحہ کے ساتھ) مخلص، یعنی جو خالص ہوا ہے۔ فطری بات ہے کہ ''خالص شدہ'' کو ایک خالص کرنے والے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ یقیناً خدائے متعال ہے جو مخلصین کو خالص کرتا ہے، تا کہ شیطان ان کو گمراہ نہ کر سکے:

﴿قال فبعزتک لا غوینهم اجمعین الاعبادک منهم المخلصین﴾

(ص:۸۲/۸۳)

''اس نے کہا تو پھر تیری عزت کی قسم میں سب کو گمراہ کروں گا۔ سواء تیرے ان بندوں کے جو تیری بندگی میں خالص ہیں۔''

اس آیت کی وضاحت میں قابل ذکر بات ہے کہ ''مخلصین'' نفسانی، روحانی اور معنوی توانائی کے مالک ہوتے ہیں جو شیطان کے دام میں پھنسنے سے مانع ہوتی ہے اور شیطان ان پر بُرا اثر نہیں ڈال پاتا ہے۔ البتہ خدائے متعال کے لطف وعنایت سے مخلصین اس توانائی سے بہرہ مند ہوئے ہیں، چنانچہ خدائے متعال حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿ولقد همت به وهم بها لولا ان رءا برهان ربه کذلک لنصرف عنه السوء والفحشاء انه من عبادنا المخلصین﴾ (یوسف/۲۴)

''اور یقیناً اس عورت نے ان سے برائی کا ارادہ کیا اور وہ بھی ارادہ کر بیٹھتے اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتے یہ تو ہم نے اس طرح کا انتظام کیا کہ ان سے برائی اور بدکاری کا رخ موڑ دیں کیوں کہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھے۔''

اس آیۂ شریفہ میں تاکید ہوئی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام برائی اور گناہ میں مبتلا نہیں ہوئے، باوجود اس کے کہ ان کے لئے ایسے مناسب اور وسوسہ انگیز شرائط فراہم ہو چکے تھے کہ اگر دوسرا کوئی بھی انسان ان شرائط میں قرار پاتا، تو شیطان کے جال میں پھنس جاتا۔ کیونکہ حضرت یوسف غریزہ جنسی اور خواہشات کے نقطۂ عروج پر تھے اور عزیز مصر کے گھر کا ماحول بھی آرام و آسائش سے بھرا تھا اور عزیز مصر کی بیوی نے ایسے شرائط فراہم کئے تھے کہ اگر حضرت یوسفؑ برہان الٰہی کا مشاہدہ نہ کرتے تو پھسل جاتے۔

اخلاص، بہترین عمل کا سبب:

مذکورہ مطالب کے پیش نظر، جو چیز انسان کے عمل کو قدر و منزلت بخشتی ہے اور انسان کے لئے شیطان کے آشکار و مخفی پھندوں سے نجات پانے کا سبب بنتی ہے، وہ خدائے متعال کی طرف توجہ دینا اور اخلاص ہے۔ اس لحاظ سے اگر مقدس ترین اور بڑے بڑے کام خدا کے لئے انجام نہ دئے جائیں تو ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ آیات و روایات کی تعبیر میں سب سے بہتر عمل جہاد ہے، یہاں تک خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿فضل اللّٰہ الجاھدین باموالھم و انفسھم علی القاعدین درجۃً و کلا وعد اللّٰہ الحسنیٰ و فضّل اللّٰہ المجاھدین علی القاعدین اجراً عظیماً﴾ (نساء/۹۵)

''اللہ نے اپنے مال اور جان سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھے رہنے والوں پر فضیلت و برتری عنایت کی ہے اور ہر ایک سے نیکی کا وعدہ کیا ہے اور مجاہدین کو بیٹھے رہنے والوں کے مقابلہ میں اجر عظیم عطا کیا ہے۔''

اب اگر اس عظمت اور شوکت کے باوجود جہاد خدا کی مرضی کے بغیر اور غیر الٰہی قصد سے انجام دیا جائے تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ بعض روایتوں کے مطابق، صدر اسلام کی جنگوں میں سے ایک جنگ میں ایک شخص بڑی شجاعت کے ساتھ لڑتے ہوئے قتل ہوا۔ اس شخص کی مجاہدت دلیری نے دوسروں کو

اس کی ستائش کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس لئے انہوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: وہ شخص جس بہادری اور شجاعت سے لڑا، خدا کے نزدیک عظیم مقام رکھتا ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا: وہ خدا کی راہ میں شہید نہیں ہوا ہے بلکہ وہ اپنے گدھے کی راہ میں قتل ہوا ہے۔ (جب اس کا گدھا خوف و وحشت کی وجہ سے دشمن کی فوج میں گھس پڑا تھا تو وہ شخص اپنے گدھے کو حاصل کرنے کے لئے دشمنوں سے لڑ رہا تھا!)

جی ہاں، ہر جہاد و مبارزہ اور قتل ہونا انسان کو کمال تک نہیں پہنچاتا ہے۔ بلکہ انسان کو وہ شہادت کمال تک پہنچاتی ہے جو خدا کی یاد کے ساتھ ہو، ہمارے عزیز شہداء کی طرح کہ (ایران عراق جنگ کے دوران نذر کرتے تھے کہ شہید ہو جائیں۔ بعض اوقات چالیس شب جمعہ یا شب بدھ کو مسجد جمکران جاتے تھے اور شہادت کے لئے درخواست و آرزو کرتے تھے۔ یہ شہادتیں چونکہ خدا کی یاد اور اس کی توجہ کے ساتھ ہیں، اس لئے ان کی قدر و منزلت ہے۔

اعمال و رفتار، قدر و قیمت اور عظمت یا پستی انسان کی نیت پر منحصر ہے، اگر انسان کی نیت پاک ہو اور اس کا عمل خدا کے لئے انجام پائے تو اس عمل کی قدر و قیمت ہے، اب جس قدر خدا کی یاد زیادہ ہوگی اور محبت و معرفت الٰہی میں اضافہ ہوگا اسی اعتبار سے، اس کے عمل کی قدر و قیمت بھی زیادہ ہوگی۔ اس کے مقابلہ میں اگر عمل خدا کی معرفت و محبت اور اس کی یاد اور توجہ کے بغیر انجام دیا جائے تو وہ اس جسد کے مانند ہے جو بے روح و بے خاصیت ہے۔

زمین کے حصے جب ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں، تو وہ یہ نہیں کہتے ہیں: کہ کسی نے تم پر جہاد کیا یا تم پر انفاق کیا یا نہیں، بلکہ پوچھتے ہیں کہ کسی نے تمھارے اوپر خدا کو یاد کیا ہے یا نہیں؟ پس اگر انسان کا عمل خدا کی توجہ کے ساتھ انجام پائے تو وہ عبادت شمار ہوتا ہے اور اس صورت میں اس کا جہاد کرنا، نماز پڑھنا اور انفاق کرنا سب عبادت کہلائے گا۔ علم حاصل کرنا، تدریس، بحث و گفتگو حتی تقریر سننا بھی عبادت میں شمار ہوگا لیکن اگر اخلاص نہ ہو تو نہ صرف یہ کہ اس کا عمل عبادت نہیں ہے، بلکہ دوسروں کی توجہ مبذول کرنے کا ایک وسیلہ ہے! لہٰذا جو بات بہت ہی زیادہ قابل توجہ ہے اور جس کی اہمیت کو زمین کے ٹکڑے بھی درک کر چکے ہیں وہ خدا کی طرف توجہ اور اس کے دربار میں حاضری دینا ہے۔

جب ہم قرآن مجید کی ورق گردانی کرتے ہیں، تو ہم کسی ایسے صفحہ کو نہیں پاتے جس پر خدا کے ذکر

وراس کی تسبیح کی بات نہ کہی گئی ہو۔ من جملہ خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿یا ایّها الذین آمنو اذکر وا اللّٰه ذکراً کثیراً﴾ (احزاب/۴۱)

''ایمان والو! اللہ کا ذکر بہت زیادہ کیا کرو''

ایک دوسری جگہ پر خدائے متعال، عقلمندوں کے لئے، آسمان، زمین اور شب و روز کی گردش کی تخلیق کے دلائل ذکر کرتے ہوئے عقل مندوں کا تعارف فرماتا ہے:

﴿الّذین یذکرون اللّٰه قیاماً وقعو داوعلیٰ جنوبهم ویتفکرون فی خلق السمٰوات والارض...﴾ (آل عمران/۱۹۱)

''جو لوگ اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان وزمین کی تخلیق میں غور وفکر کرتے ہیں.....''

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام نے خدائے متعال سے عرض کی:

''یا رب تمر بی حالات استحیی ان اذکرک فیها ' فقال: یا موسی' ذکری علی کل حالٍ حسن'' [1]

خداوندا! میرے لئے ایسے حالات پیش آتے ہیں، ان حالات میں تجھے یاد کرنے میں مجھے شرم آتی ہے (شاید ان کا مقصود قضائے حاجت کے وقت ہو) خدائے متعال نے جواب میں فرمایا: اے موسیٰ! میرا ذکر ہر حالت میں نیک ہے''

اس لئے حتی قضائے حاجت کرنے کے لئے بیت الخلا میں جاتے وقت بھی بعض دعائیں نقل ہوئی ہیں، تاکہ انسان اس حالت میں بھی خدا کی عبادت سے غافل نہ رہے، کیونکہ خدائے متعال راضی نہیں ہوتا ہے حتی ہماری عمر کا ایک لمحہ بھی اس کی توجہ اور عبادت کے بغیر گزرے اور انسانی کمال خدائے متعال کی عبادت و بندگی کے سایہ میں ہی ممکن ہے۔ پس ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ہر صورت اور ہر حالت میں، خواہ ضعیف انداز میں کیوں نہ ہو لیکن خدا کی طرف توجہ رکھنی چاہئے۔ خدا کی یاد اور اس کی طرف توجہ ایک ایسی اکسیر ہے جو ہر ناچیز شی پر لگا دی جائے، تو وہ گراں بہا چیز میں تبدیل ہو جاتی ہے، یہ اکسیر ہی ہے جو ہماری زندگی کو قدر و قیمت بخشتی ہے۔

۱۔ بحار الانوار، ج ۱۳/ص ۳۴۳

انتیسواں درس:

انسان کی سب سے بڑی دولت بندگی وعبادت

- دنیا کا انسان کے لئے طفیلی ہونا
- انسانِ کامل کی شرافت وکرامت
- بہشت، مومنین اور محبان اہل بیت (ع) کی جگہ
- صاحبان بہشت:

الف: انبیاء اور پیغمبر اسلامؐ کا مقام

ب: صالحین کا مقام

ج: صدیقین کا مقام

- خدا کے منتخب بندوں کے لئے عصمت کا ایک خاص درجہ
- ایمان میں صداقت کی اہمیت اور اس تک پہنچنے کا راستہ

انسان کی سب سے بڑی دولت
بندگی وعبادت

"یا اباذر؛ ما من شاب یدع لله الدنیا و لهوها و اهرم شبابه فی طاعة الله الا اعطاه الله اجر اثنین و سبعین صدیقا"

"اے ابوذر؛ جو بھی جوان خدائے متعال کے لئے دنیا اور اس کے لہو ولعب کو چھوڑ کر اپنی جوانی کو خدا کی اطاعت میں بوڑھا کرلے، اللہ تعالی بھی اسے بہتر صدیقین کے اجر وثواب عطا کرتا ہے"

دنیا کا انسان کے لئے طفیلی ہونا:

حدیث شریف کے اس حصہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، انسان کی کمال جوئی اور راہ تکامل اختیار کرنے والے کی عظمت، کی اہمیت بیان فرماتے ہیں۔ کیونکہ بعض آیات وروایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ یہ کائنات اپنی پوری وسعتوں اور عظمتوں کے ساتھ انسان کے کمال تک پہنچنے کیلئے خلق کی گئی ہے اور حقیقت میں اس دنیا کی تخلیق کا اصلی مقصد انسان ہے اور دوسرے تمام مخلوقات انسان کے طفیل میں خلق کی گئی ہیں۔ خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿هو الذی خلق السموات و الارض فی سته ایام و کان عرشه علی الماء

لیبلوکم ایکم احسن عملاً﴾ (ھود/۷)

''اور وہی وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا ہے اور اس کا تخت اقتدار پانی پر تھا تا کہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سب سے بہتر عمل کرنے والا کون ہے''

آیۂ مبارکہ کا مضمون یہ ہے کہ خدائے متعال نے آسمانوں، زمینوں اور عالم طبیعت کو اس لئے خلق کیا ہے تا کہ انسان کی خلقت کے اسباب فراہم ہو جائیں اور پھر انسان کو خلق کیا تا کہ اس کی آزمائش کرے۔ آیۂ شریفہ کا مضمون حیرت انگیز ہے اور اس کا درک کرنا ہمارے طرز تفکر اور رفتار میں کافی اثر ڈالتا ہے یہ حقیقت ہے کہ خدائے متعال نے عالم وجود کو اس عظمت کے ساتھ اس لئے خلق کیا ہے کہ اس میں انسان کو پیدا کرے تا کہ وہ اس کے امکانات سے استفادہ کر کے اپنے کمال تک پہنچے، انسان کی قدر و منزلت اور اس کی ذمہ داری کی گہرائی کی دلیل ہے۔

گزشتہ مطالب کا ذکر کرنا اس لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے وجود کی قدر و قیمت کو دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں درک کرے اور جان لے کہ وہ کیڑے اور مینڈک جیسی مخلوقات کے مانند ایک سادہ مخلوق نہیں ہے، بلکہ وہ ایک عظیم اور قدر و منزلت والی مخلوق ہے کہ جس کی زندگی کی تسہیل کے لئے بہت سے سرمایہ کو وجود بخشا، اور کائنات کو اسی آب و تاب کے ساتھ خلق کیا تا کہ ایک باشعور، با ارادہ اور صاحب اختیار مخلوق کی حیثیت سے اپنے وجود کی قدر و قیمت کو سمجھے لہٰذا پہلی فرصت میں ایک عاقل اور متفکر وجود ہونے کے ناطے ایک انسان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی اہمیت کو درک کرے، لیکن ان تمام اہمیتوں کے پیش نظر صرف اس نکتہ کا درک کرنا کافی نہیں ہے بلکہ اسے عالم ھستی میں اپنی ذمہ داری اور وظیفہ کی عظمت کو بھی درک کرنا ضروری ہے اور جاننا چاہئے کہ وہ عبث، بیہودہ، باطل اور بغیر مقصد خلق نہیں کیا گیا ہے۔

مخلوقات عالم میں انسان ایک ایسی خصوصیتوں کا حامل ہے کہ دوسری مخلوقات میں وہ خصوصیتیں نہیں پائی جاتی ہیں اور وہ عقل کی نعمت سے آراستہ ہے۔ انسان کی دوسری تمام مخلوقات پر برتری اور فضیلت کے معنی یہ ہیں کہ عقل کے علاوہ دوسری خصوصیات و صفات میں بھی انسان دوسری مخلوقات پر برتری رکھتا ہے اور دیگر موجودات میں جو بھی کمال پایا جاتا ہے، وہ انسان میں بھی بدرجہ اعلیٰ موجود ہے۔ یہ معنی انسان کا دیگر مخلوقات سے خوراک، لباس، رہائش اور ازدواج میں موازنہ کرنے سے بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسان جو اپنے اجتماعی زندگی کے نظم و تدبیر میں تبدیلیوں اور موجودہ ترقی سے

جس طرح استفادہ کرتا ہے، وہ کسی بھی دوسری مخلوق میں نظر نہیں آتا۔ اس کے علاوہ انسان اپنے مقاصد تک پہنچنے کے لئے تمام مخلوقات کو بہ روئے کار لاتا ہے لیکن اس کے مقابلہ میں تمام حیوانات ونباتات وغیرہ ایسے نہیں ہیں، بلکہ ان کے بہت معمولی، بسیط اور مخصوص قسم کے اختیارات ہیں، وہ اپنے پیدائش سے آج تک اپنی حالت سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھے ہیں اور ان میں کسی قسم کی قابل توجہ تبدیلی نہیں آئی ہے۔ جب کہ انسان نے اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں بہت زیادہ ترقی کی ہے اور اس کی ترقی کا یہ سفر جاری ہے۔

مختصر یہ کہ انسان تمام مخلوقاتِ عالم میں ان سے جس خصوصیت و برتری کا مالک ہے، وہ عقل کی خصوصیت ہے اس عمل کے ذریعہ اس نے دنیا کی تمام موجودات پر فوقیت حاصل کی ہے اسی کے ذریعہ وہ حق وباطل، خیر وشر اور نفع ونقصان میں فرق پیدا کیا ہے۔

انسان کامل کی شرافت اور کرامت:

﴿ولقد کرّمنا بنی آدم و حملنا هم فی البرّ و البحر و رزقنا هم من الطّیبات و فضّلنا هم علی کثیر ممّن خلقنا تفضیلا﴾ (اسراء/۷۰)

''اور ہم نے بنی آدم کو کرامت عطا کی ہے انھیں خشکی اور دریاؤں میں سواریوں پر اٹھایا ہے اور انھیں پاکیزہ رزق عطا کیا ہے اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سوں پر فضیلت دی ہے۔''

علامہ طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''یہ آیت منّت رکھنے کے سیاق میں ہے، البتہ وہ منّت جو سرزنش کے ساتھ آمیختہ ہے۔ گویا خداوند متعال، انسانوں سے اپنی فراوان نعمتوں اور فضل وکرم کا تذکرہ کرتا ہے کہ اس نے انھیں ان نعمتوں کو حاصل کرنے اور رزق سے اپنی زندگی کو بخوبی گزارنے کے لئے، بیابانوں اور دریاؤں میں سواریاں اور کشتیاں چلائیں، اس نکتہ کی طرف متنبہ کرتا ہے کہ انسان نے اپنے پروردگار کو فراموش کر دیا ہے، اس سے منہ موڑ لیا اور اس سے کوئی چیز نہ مانگی اور دریا سے نجات پانے کے بعد پھر سے اپنی گزشتہ روش پر گامزن ہو، باوجودیکہ وہ ہمیشہ اس کی نعمتوں میں غرق تھا۔

خدائے متعال اس آیت میں اپنی کرامتوں اور فضل کا ایک خلاصہ بیان فرماتا ہے، تاکہ انسان یہ سمجھ لے کہ اس کا پروردگار اسے کس قدر عنایت کرتا ہے اور انتہائی افسوس ہے کہ انسان اس عنایت کا بھی دوسری نعمتوں کے مانند کفران کرتا ہے۔ [1]

۱۔ المیزان دار الکتب لاسلامیہ، طبع سوم ج ۱۳، ص ۱۶۵

اس لئے بجا ہے کہ انسان اپنے وجود کے گوہر اور صدف کی قدر و منزلت کو جان لے اور اسے حقیر اور پست دنیا کے عوض فروخت نہ کرے۔

چشم دل باز کن تا کہ جان بینی — آنچہ نادیدنی است آن بینی
گر بہ اقلیم عشق روی آری — ہمہ آفاق گلستان بینی
بر ہمہ اہل آن زمین بہ مراد — گردش دور آسمان بینی
آنچہ بینی دلت ہمان خواہد — وآنچہ خواہد دلت ہمان بینی [1]

(دل کی آنکھیں کھولو تا کہ روح ''ہستی'' کو دیکھ لو، جو دیکھنے کے قابل نہیں ہے اسے دیکھ لو گر ملک عشق کی طرف توجہ کرو گے تو تمام آفاق کو گلستان پاؤ گے، تمام اہل زمین، گردش افلاک کو اپنے مقصد کے مطابق خیال کریں گے جسے دیکھو گے تمہارا دل اسی کو چاہے گا اور تمہارے دل اور آرزو کے مطابق تمام چیزیں نظر آئیں گی)

انسان کو انسانی کمالات تک پہنچنے کے لئے بعض خاص شرائط اور سہولتوں کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ دنیا جو عالم طبیعت کے ای پر شکوہ نظام کا حصہ ہے اپنے تمام تر تبدیلیوں اور ترقیوں کے ساتھ انسان کے اختیار میں ہونی چاہئے۔ ہم کسی حد تک جانتے ہیں کہ اگر عالم طبیعت میں وہ تحولات اور متواتر نظم نہ ہوتا تو یا انسان کی اختیاری زندگی متحقق نہ ہوتی یا ناقص صورت میں متحقق ہوتی۔

ہم اجمالی طور پر جانتے ہیں کہ کائنات کا ایک ہماہنگ نظام ہے اور اس کے اجزا وعوامل ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ ان عوامل کا ایک نمونہ مختلف سیاروں میں پایا جانے والا قوۂ جاذبہ ہے یہاں تک کہ اگر اس معین اور دقیق جاذبہ میں کسی قسم کا خلل ایجاد ہو جائے اور ایک سیارہ اپنے مدار سے ہٹ جائے تو تمام سیاروں کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور ایک خلاف توقع المیہ پیش آئے گا۔

جیسا کہ اشارہ ہوا، عالم اس عظمت کے ساتھ انسان کی خلقت اور اس کے کمال تک پہنچنے کا ایک مقدمہ ہے۔ اور جن کمالات تک انسان پہنچنا چاہتا ہے، اور یہ بات شائستہ ہے ایک عالم اتنی وسعت وعظمت کے ساتھ اس کی حیثیت انسان کے لئے طفیلی۔ اگر چہ تمام انسانوں میں سے بہت کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ان کمالات کی انتہا تک پہنچتے ہیں اور بقیہ افراد تو ان کے وجود کے سایہ میں کسی حد تک بہرہ مند ہوتے

۱۔ ہاتف اصفہانی کے اشعار

ہیں اوران کے وجود کا دارومدار ان نیک اور منتخب شخصیات کے وجو کے تابع ہے۔مثال کے طور پر پچاس کلو میٹر وسیع وعریض علاقہ پر پوری گہرائی سے چند دانے ہیرے حاصل کرنے کے لئے وسیع پیمانے پر کھدائی کی جائے تو یہاں پر اصلی مقصد ہیروں کے چند دانے حاصل کرنا ہے، اگر چہ اس کھدائی کے دوران پتھر کے کوئلہ کا بھی استخراج ہوتا ہے لیکن اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی ہے۔لہٰذا ہیروں کی کھدائی کے لئے کہ جو معدن کے استخراج کا اصلی مقصد ہے دوسرے مواد بھی موجود ہوتے ہیں کہ جن کو دوسرے درجے کی اہمیت حاصل ہے ان کے علاوہ کچھ بے فائدہ چیزیں بھی ملتی ہیں جنھیں ضایعات کے طور پر دور پھینکا جاتا ہے۔

اس دنیا کی خلقت کا مقصد کچھ انوار پاک ہیں کہ ان میں برجستہ ترین و مشخص ترین انوار مقدس چہاردہ معصومین علیہم السلام ہیں، اوران کے بعد تمام انبیاء اور وہ افراد ہیں جو اپنے کمال کے درجات کے مطابق ان میں ملحق ہوتے ہیں۔(تقریبا ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء اور اولیائے خدا ہیں۔ان میں سے بعض انبیاء دوسرے انبیاء سے برتر ہیں ہم انکی تعداد سے بے خبر ہیں)

پس کمالات انسانی کا آخری درجہ اور مرتبہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے اہل بیت علیہم السلام کی ذات میں منحصر ہے اوران کمالات کے ادنی مراتب ان لوگوں میں پائے جاتے ہیں جو دوسروں کے بعد بہشت میں داخل ہوں گے۔ان افراد کے علاوہ، دوسرے لوگ جن کے دل ایمان کے نور سے خالی ہیں، انھیں ضائعات کے مانند قہر الٰہی کی آگ میں جلا دیا جائے گا:

﴿ولقد ذرانا لجهنّم كثيرا من الجن و الانس لهم قلوب لا يفقهون بها و لهم اعين لا يبصرون بها و لهم آذان لا يسمعون بها...﴾ (اعراف/ ۱۷۹)

''اور یقیناً ہم نے انسان وجنات کی ایک کثیر تعداد کو گویا جہنّم کے لئے پیدا کیا ہے کہ ان کے پاس دل ہیں مگر سمجھتے نہیں اور آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں ہیں اور کان ہیں مگر سنتے نہیں ہیں...''

جہنم میں اس دنیا کے ضائعات ہیں اور خلقت عالم کا اصلی مقصد، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا اور ائمہ معصومین علیہم السلام ہیں کہ عالم اپنی پوری وسعت اور عظمت کے ساتھ فضیلت وکمال کے لحاظ سے ان میں سے کسی کے ساتھ قابل موازنہ نہیں ہے؛ بلکہ ان کے ایک دن کی قیمت پورے اس کائنات کے برابر ہے۔اس عالم کے اصلی وارث وہ انسان ہیں جو سعادت پا کر خدا کا تقرب

حاصل کر چکے ہیں:

﴿انّ المتقین فی جناتٍ و نهرٍ فی مقعد صدقٍ عند ملیکٍ مقتدر﴾

(قمر/۵۴و۵۵)

''بیشک صاحبان تقوی باغات اور نہروں کے درمیان ہوں گے۔ اس پاکیزہ مقام پر جو صاحب اقتدار بادشاہ کی بارگاہ میں ہے''

بہشت مومنین اور محبان اہل بیت کی جگہ:

ہمارا اعتقاد ہے کہ باایمان مرنے والے بہشت میں جائیں گے؟ حتی اگر ان کا ایمان سب سے ادنی درجہ کا بھی ہو اور وہ ایمان مرتے وقت کفر میں تبدیل نہ ہوا ہو۔ (وہ عالم برزخ کے بعد بہشت میں داخل ہوتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ کمال ایمان، اعتقاد اور محبت اہل بیت علیہم السلام کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے چنانچہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''...الا و من مات علی حبّ آل محمدٍ مات مومناً مستکمل الایمان، الا و من مات علی حبّ آل محمدٍ بشّره ملک الموت بالجنة...[1]

''بیشک جو آل محمدؐ کی محبت میں مرجائے، وہ مؤمن اور ایمانِ کامل کے ساتھ مرا ہے۔ بیشک جو آل محمدؐ کی محبت میں مرجائے، ملک الموت اسے بہشت کی بشارت دیتے ہیں۔''

اس لحاظ سے جو شیعہ محبّ اہل بیت علیہم السلام ہے اور خدائے متعال اور اولیائے خدا کے حکم کے مقابلہ میں خاضع اور فرمانبردار ہے، اسے موت کی کوئی پروا نہیں ہے، کیونکہ موت مومن کے سامنے رضائے الٰہی تک پہنچنے کا ایک پل ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے عاشورا کے دن اپنے اصحاب سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''اے شریف زادو! صبر و تحمل سے کام لو کہ موت صرف ایک پل ہے جو تمہیں سختیوں اور مشکلات سے عبور کرا کے وسیع باغوں اور ابدی نعمتوں میں پہنچاتی ہے اور حقیقت میں تم میں سے کون راضی نہیں ہے جو زندان سے محل کی طرف روانہ ہو جائے؟'' [2]

۱۔ بحار الانوار، ج ۲۳، ص ۲۳۳

۲۔ شیخ صدوق، معانی الاخبار، ص ۲۸۹

حضرت علی علیہ السلام متقین کے لقاءاللہ کے شوق کے بارے میں فرماتے ہیں:

''اگر ان کے لئے (متقین) موت معین اور مقدر نہ کی گئی ہوتی تو ثواب کے شوق اور عذاب کے ڈر سے ان کی جان ان کے بدن میں ایک لمحہ کے لئے بھی باقی نہ رہتی''

ان کی نظروں میں پروردگار عالم عظیم ہے اس لحاظ سے دوسرے ان کی نظروں میں چھوٹے ہیں ''۱

ایک شخص نے جناب ابوذرؓ سے پوچھا: ہم کیوں موت سے بیزار ہیں؟ جناب ابوذرؓ نے جواب میں فرمایا:

''لانّکم عمّرتم الدنیا وخرّبتم الآخرہ فتکرھون ان تنتقلوا من عمران الی خراب..'' ۲

''چونکہ تم لوگوں نے اپنی دنیا کو آباد کیا ہے اور اپنی آخرت کو ویران کیا ہے۔ اس لئے آبادی سے ویرانی کی طرف منتقل ہونے کے لئے راضی نہیں ہو۔''

افراد اپنے ایمان واعمال کے مراتب کے مطابق بہشت سے بہرہ مند ہوتے ہیں: کچھ لوگ مرنے کے بعد برزخی بہشت میں داخل ہوتے ہیں اور اس کے بعد قیامت کے دن بہشت میں جاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ گناہ گار تھے، مگر یہ کہ ان کے وجود میں ایمان کا ایک ضعیف روشن تھا، وہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہونے کے بعد اور ممکن ہے برسوں تک عذاب برداشت کریں اور گناہوں سے پاک ہونے کے بعد بہشت میں داخل ہوں گے۔ ان کی مثال اس سونے کی سی ہے جسے بھٹی میں ڈال دیا جاتا ہے تا کہ آلودہ اور غیر خالص مادہ اس سے دور ہو جائے اور خالص سونے میں تبدیل ہو جائے۔ یقیناً یہ لوگ بہشت کے مالک نہیں ہیں، بلکہ یہ ایسے مہمان ہیں جو بہشت کے اصلی مالکوں کی شفاعت اور خدائے متعال کے لطف وکرم سے بہشت میں پہنچے ہیں.

۱۔ صاحبان بہشت:

بہشت کے اصلی مالکوں کا خدائے متعال نے یوں تعارف کرایا ہے:

۱۔ نہج البلاغہ (ترجمہ فیض الاسلام)، ج ۱۸۴، ص ۶۱۲

۲۔ فیض کاشانی، محجۃ البیضاء، ج ۸، ص ۲۵۸

﴿ومن یطع اللہ و الرّسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیّین و الصّدیقین و الشّھداء و الصّالحین و حسن اولئک رفیقا﴾ (نساء/۶۹)

''اور جو بھی اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ رہے گا، جن پر خدا نے نعمتیں نازل کی ہیں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین اور یہی بہترین رفقاء ہیں۔''

یہ آیۂ مبارکہ بہشت کے اصلی مالک کی حیثیت سے چار گروہ کا تعارف کراتی ہے اور دوسرے افراد ان کی پیروی اور شفاعت سے بہشت میں داخل ہوتے ہیں اور حقیقت میں وہ لوگ میزبان اور صاحب خانہ ہیں اور دوسرے مہمان۔ صاحبانِ بہشت، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین وہ لوگ ہیں جن پر خدائے متعال نے اپنی نعمتیں تمام کی ہیں اور ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم ہر روز نماز میں خدا سے دعا کریں کہ ہمیں ان کی راہ کی طرف ہدایت فرمائے:

﴿اھدنا الصّراط المستقیم صراط الّذین انعمت علیھم﴾

قابل ذکر بات یہ ہے کہ مذکورہ آیۂ مبارکہ میں، شہداء سے مراد قیامت کے دن بندوں کے اعمال پر گواہی دینے والے ہیں کہ ان کا مقام دیگر شہداء سے بلند ہے۔ چنانچہ علامہ طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''شہادت کا مقصود (بعض آیتوں میں) لوگوں کے اعمال پر شہادت ہے اور اس سے مراد ان اعمال کے حقائق کو دیکھنا اور برداشت کرنا ہے جنھیں لوگ دنیا میں انجام دیتے ہیں، خواہ وہ حقیقت سعادت ہو یا شقاوت۔ پس قیامت کے دن شاہد اس چیز کی شہادت دیتا ہے جسے اس نے دیکھا ہے جس دن خدائے متعال ہر چیز سے گواہی لیتا ہے، حتی بدن کے اعضا سے بھی شہادت لیتا ہے، جس دن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

﴿... یا رب ان قومی اتّخذوا ھذاالقرآن مھجورا﴾ (فرقان/۳۰)

''پروردگارا: میری قوم نے قرآن مجید کو چھوڑ دیا ہے''

واضح رہے کہ اس قسم کا عظیم مرتبہ پوری امت کی شان میں نہیں ہوسکتا ہے، چوں کہ یہ ایک خاص فضیلت ہے جو خدا کے اولیائے طاہرین کے لائق ہے کم ترین مقام جو یہ گواہ (اعمال کے شاہد) رکھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ وہ خدا کی ولایت کے تحت اور اس کی نعمت کے سایہ میں پلتے ہیں اور اصحاب صراط مستقیم ہیں۔ [1]

۱۔ المیزان (دارالکتاب الاسلامیہ، طبع سوم) ج ۱، ص ۳۲۴۔۳۲۵

پس ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خدا کے برترین بندے اور وہ جن کے حق میں خدائے متعال نے اپنی نعمتیں تمام کیں اور انھیں صاحبان بہشت قرار دیا، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔ دوسرے بندے ان چار گروہوں کی پیروی اور وابستگی کی وجہ سے بہشت میں داخل ہوں گے البتہ جو لوگ خدا کے نیک و صالح بندوں سے رابطہ کی وجہ سے سعادت و بہشت تک پہنچتے ہیں وہ مراتب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے متفاوت ہیں اور سب ایک مرتبہ میں نہیں ہیں، یہاں تک کہ خود وہ چار گروہ مراتب کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں اور بعض کو بعض دوسروں پر فوقیت و برتری حاصل ہے۔

الف: انبیاء اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام:

فرمان الٰہی کے مطابق انبیاء دوسرے لوگوں پر برتری رکھتے ہیں۔

﴿ان اللّٰہ اصطفی آدم و نوحا و آل ابراھیم و آل عمران علی العالمین﴾

(آل عمران/۳۳)

''اللہ نے آدم، نوح اور آل ابراھیم اور آل عمران کو دنیا کے لوگوں پر برتری بخشی ہے''

اس کے علاوہ بعض پیغمبر دوسرے پیغمبروں پر برتری رکھتے ہیں:

﴿تلک الرسل فضّلنا بعضھم علی بعض:﴾ (بقرہ/۲۵۳)

''ان رسولوں میں سے بعض کو ہم نے بعض پر برتری دی ہے''

ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء میں سے صرف ۳۱۳/افراد مقام رسالت کے حامل تھے۔ اور ان میں سب رسول صاحب شریعت نہیں تھے، بلکہ صرف پانچ رسول صاحب شریعت تھے کہ جن سے یہ افراد مراد ہیں: نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام، اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم۔ یہ اولوالعزم انبیاء دیگر تمام رسولوں سے برتر ہیں اور ہمارے اعتقاد کے مطابق حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سب سے افضل و برتر ہیں چنانچہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے:

''یا علی ان اللّٰہ تبارک وتعالی فضّل انبیائہ المرسلین علی ملائکتہ المقربین و فضّلنی علی جمیع النبیین والمرسلین والفضل بعدی لک یا علی وللأئمة من بعدک وان الملائکة لخدّامنا وخدام محبینا...''[۱]

۱۔ بحار الانوار، ج۱، ص۳۴۵

''اے علیؑ! خدائے متعال نے اپنے پیغمبروں کو اپنے مقرب فرشتوں پر برتری عنایت کی ہے اور مجھے تمام انبیاء اور پیغمبروں پر فوقیت و برتری دی ہے اور میرے بعد برتری کے مستحق تم اور تمھارے بعد آنے والے ائمہ ہیں، بیشک فرشتے ہمارے اور ہمارے دوستوں کے خدمت گزار ہیں''

ثابت ہوا کہ انسان کی خلقت کا اصلی مقصد خدا کے منتخب بندے ہیں اور چونکہ عام افراد انسانی کمالات میں ایک دوسرے سے متفاوت ہیں، انبیاء و صالحین اور خدا کے دوستوں میں بھی کمالات انسانی کے لحاظ سے فرق ہے اور ان کے مراتب اور درجات میں اختلاف ہمارے لئے قابل درک نہیں ہے او رصرف خدا ان سے آگاہ ہے۔

انبیائے الٰہی اور اولیائے خدا حتی ایک پلک جھپکانے کے برابر بھی شرک و گناہ میں آلودہ نہیں ہوئے ہیں، یہاں شرک بہ معنی حقیقی ہے یعنی غیر خدا کی طرف لو لگانا بت پرستوں کے شرک کی تو بات ہی نہیں ہے، ان کا مقصود و مطلوب خدائے متعال ہوتا ہے اور اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصود و مطلوب نہیں ہوتا۔ اگر وہ کبھی غیر خدا کی طرف توجہ کرتے ہیں تو فریضہ اور خدا کی اطاعت کے طور پر ہے کہ ان سے خدا نے یہ چاہا ہے کہ اس کے دوسرے بندوں سے غافل نہ رہیں اور اپنے اصلی مقصد تک پہنچنے کے لئے اپنے مادی وسائل سے فائدہ اٹھائیں ورنہ ان کا مقصد صرف خدا ہے اور بس۔

ہم انبیائے کرام کے اعلیٰ مدارج اور بلند مراتب کے بارے میں صرف ایک ضعیف تصور رکھتے ہیں اور ان کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتے، بلکہ اگر ہم ان کے مقام کی کیفیت کے بارے میں فکر کریں تو ہماری عقل حیران ہو جاتی ہے۔ ان کے مقام و منزلت کے بارے میں صرف وہ اور ان کا خدا واقف ہے اور دوسرے ان کے انسانی مرتبہ اور مقام و منزلت کی معرفت حاصل کرنے سے عاجز ہیں:

﴿فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرّه اعینٍ جزاء بما کانوا یعملون﴾

(سجدہ/۱۷)

''پس کسی نفس کو نہیں معلوم ہے کہ اس کے لئے کیا کیا خنکی چشم کا سامان چھپا کر رکھا گیا ہے جو ان کے اعمال کی جزا ہے۔''

ب۔صالحین کا مقام:

منجملہ انسانی عالی مراتب، جن کی طرف اشارہ ہوا، صالحین کا مرتبہ ہے کہ ان کے بلند مرتبہ اور عظمت ومنزلت کے بارے میں خدائے متعال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی فرماتا ہے:

﴿رب هب لی حکما و الحقنی بالصالحین﴾ (شعراء/۸۳)

''خدایا! مجھے علم وحکمت عطا فرما اور مجھے صالحین کے ساتھ ملحق کردے۔''

ایک دوسری جگہ پر فرماتا ہے:

﴿ووهبنا له اسحاق و یعقوب نافلة و کلا جعلنا صالحین﴾ (انبیاء/۷۲)

''اور پھر ابراہیم کو اسحاق اور ان کے بعد یعقوب عطا کئے اور سب کو صالح اور نیک کردار قرار دیا''.

ج۔صدیقین کا مقام:

ایک اور بلند انسانی مرتبہ، صدیقین کا مرتبہ ہے کلمۂ ''صدیقین'' جیسے کہ خود کلمہ دلالت کرتا ہے کہ ''صدق'' کا مبالغہ ہے، یعنی وہ جو بہت زیادہ سچے ہیں۔ حقیقت میں صدق صرف زبانی نہیں ہے: اس کے مصادیق میں سے ایک انسان کی گفتگو ہے جو وہ بولتا ہے، اس کا دوسرا مصداق عمل ہے، کہ اگر عمل بات اور دعوی کے مطابق ہے، تو صادق ہے۔ چونکہ انسان کا عمل اس کے اندرونی اعتقاد کی حکایت کرتا ہے اور انسان اس حکایت میں اس وقت صادق ہے جب وہ مافی الضمیر کو مکمل طور پر حکایت کرے اور اس میں سے کوئی چیز باقی نہ رکھے، ایسا عمل صحیح اور صادق ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر مافی الضمیر کی حکایت نہ کرے یا صحیح اور مکمل طور پر حکایت نہ کرے، تو وہ عمل غیر صادق ہے۔

سچ بات بھی وہ بات ہے جو واقع اور خارج کے ساتھ مطابقت رکھے، چونکہ بات کرنا بھی ایک فعل ہے، قہری وفطری طور پر جو اپنے فعل میں صادق ہے وہ اس وقت تک بات نہیں کرے گا جب تک کہ اس کے سچ ہونے کے بارے میں علم نہ ہو جائے اور یہ بھی جانتا ہو کہ وہ بات کہنا مناسب اور بجا ہے اور اس کا کہنا حق ہے۔ اس بنا پر ایسی بات خود اور بولنے کی صداقت کی حکایت بھی ہے اور کہنے والے کی صداقت کی حکایت بھی۔

پس صدیق وہ ہے جو کبھی اور کسی صورت میں جھوٹ نہیں بولتا ہے اور جس کام کے حق ہونے کے

بارے میں نہیں جانتا ہے اسے انجام نہیں دیتا ہے خواہ، وہ کام کتنا ہی اس کے نفسانی خواہشات کے مطابق کیوں نہ ہو، اسی طرح جس بات کے سچ ہونے کے بارے میں نہیں جانتا، اسے نہیں کہتا ہے اور جو کام عبودیت کے ساتھ سازگار نہیں ہے، اسے انجام نہیں دیتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام اپنی توصیف میں فرماتے ہیں:

"...وانی لمن قوم لا تاخذهم فی الله لومة لائم، سیماهم سیما الصدیقین وکلامهم کلام الابرار" [1]

"میں ان لوگوں میں سے ہوں جو راہ خدا میں سرزنش وملامت کرنے والوں سے باز نہیں آتے ہیں۔ ان کی نشانیاں سچوں کی نشانیاں ہیں اور ان کی باتیں سچے کردار والوں کی باتیں ہیں"

صدیقین کا مقام ایک ایسا مقام ہے کہ جب خداوند متعال اپنے بعض پیغمبروں کے مقام کی توصیف کرنا چاہتا ہے تو فرماتا ہے:

﴿واذکر فی الکتاب ابراهیم انّه کان صدّیقا نبیّا﴾ (مریم/۴۱)

"اور کتاب خدا میں ابراہیم کا تذکرہ کرو کہ وہ ایک صدیق پیغمبر تھے۔"

یا حضرت عیسی علیہ السلام کی والدہ حضرت مریمؑ کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿و امّه صدّیقه﴾ (مائدہ/۷۵)

البتہ ہمیں کوئی طمع نہیں ہے کہ صدیقین یا صالحین کے جیسے مقام تک پہنچ جائیں، لیکن انسان کی کوشش کسی بھی حالت میں پست نہیں ہونی چاہئے۔ اس اپنی استعدادوں اور توانائیوں کے مطابق کوشش کرنی چاہئے اور برتر مراتب تک پہنچنے کے لئے سعی کرے۔ اسے ان مراحل تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہئے، جن تک غیر معصوم انسان پہنچ سکتے ہیں، علماء کے درمیان ایسے بزرگ بھی گزرے ہیں جو انسانی مراحل کے اعلی مقام تک پہنچے تھے، ہم نے ان میں سے بعض کو دیکھا ہے اور ان سے واقف ہیں اور کتنے ایسے بزرگوار ہیں جو تکامل کے اس مرحلے تک پہنچے ہیں جو خاصان خدا سے مخصوص ہے اور ہم ان کے بارے میں خبر نہیں رکھتے ہیں۔ یقیناً ایسے بلند وبالا مقامات عالی ہمت اور پیہم کوششوں کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں جیسے شاعر

۱۔ نہج البلاغہ "ترجمہ شہیدی" خطبہ ۱۹۲، ص ۲۲۴

کہتا ہیں:

ہمت بلندوار کہ مردان روز گار　　از ہمت بلند بہ جائی رسیدہ اند

(اپنی ہمت کو بلند کرو کہ مردان روزگار بلند ہمت سے ہی عالی مقامات تک پہنچے ہیں)

ایک دوسرا شاعر کہتا ہے:

ہمت اگر سلسلہ جنبان شود　　مور تواند کہ سلیمان شود

اگر ہمت اور حوصلہ کو بہ روئے کار لایا جائے تو ایک چونٹی بھی سلیمان ہوسکتی ہے۔

خدا کے منتخب بندوں کے لئے عصمت کا ایک خاص درجہ:

خدائے متعال نے انسان کی تکامل وترقی اور بالیدگی کی راہ میں کوئی رکاوٹ قرار نہیں دی ہے۔ اگر انسان ہمت کرے تو وہ مقام صالحین جیسے بلند مقامات تک پہنچ سکتا ہے، اگر چہ وہ معصوم نہیں ہوسکتا صدیقین اور صالحین کا مقام معصومین کے مقام سے پست تر ہے۔ اس لحاظ سے ہر انسان ان مقامات تک پہنچ سکتا ہے۔ ہر انسان اپنی پوری عمر میں گناہ نہیں کرسکتا ہے اور حقیقت میں جو شخص چاہتا ہے کہ گناہ میں آلودہ نہ ہو اور اپنی نفسانی خواہشات پر کنٹرول رکھے اور صرف خدا کی خوشنودی کیلئے اپنے آپ کو وقف کردے، تو وہ عمل میں معصوم ہے، اگر چہ معصوم کی اصطلاح اس پر صادق نہیں آتی ہے۔ اس مطلب کی وضاحت میں کہنا چاہئے:

لغت میں ((عصمت)) روکنے اور رکاوٹ بننے کے معنی میں ہے اور اصطلاح میں ایک نفسانی ملکہ کو کہتے ہیں جو انسان کو گناہ حتی خطا واشتباہ سے محفوظ رکھے۔ اب کیا یہ ملکہ مانع ہے اور اسی لئے اسے ملکہ ''عصمت'' کہتے ہیں، یا یہ کہ خدائے متعال اس انسان کو گناہ، خطا واشتباہ سے روکتا ہے جس میں یہ ملکہ پایا جاتا ہے فی الجملہ دونوں معنی صحیح ہیں، خواہ ہم یہ کہیں کہ معصوم وہ ہے جو ایسا ملکہ رکھتا ہے اور وہ ملکہ اسے خطا اور گناہ سے محفوظ رکھے، یا یہ کہیں کہ معصوم وہ شخص ہے کہ اللہ تعالی اسے گناہ اور اشتباہ سے روکتا ہے، تو ہم نے خطا نہیں کی ہے کیونکہ خدائے متعال بھی اسی ملکہ کے ذریعہ اس کا تحفظ کرتا ہے۔ پس معصوم وہ ہے جو خطا وگناہ سے پاک ہو یا صرف گناہ سے محفوظ ہو۔

عصمت کی قسمیں:

۱۔ گناہ سے عصمت: یعنی معصوم وہ ہے جو اختیار و قصد سے کسی گناہ کا مرتکب نہ ہو جائے۔

۲۔ خطا و اشتباہ سے عصمت: یعنی معصوم وہ ہے جو گناہ کو ترک کرنے کے علاوہ خطا و اشتباہ سے بھی پرہیز کرے، عصمت کی پہلی قسم، مقام عمل میں عصمت ہے، لیکن عصمت کی دوسری قسم، عمل اور غیر عمل دونوں کو شامل ہے، یعنی مقام ادراک اور تشخیص میں بھی معصوم ہے، چونکہ دوسری قسم کا معصوم وہ ہے کہ نہ صرف مقام عمل میں گناہ نہیں کرتا ہے، بلکہ تشخیص میں بھی خطا سے دوچار نہیں ہوتا ہے۔ یعنی صحیح سمجھ بھی سکتے ہیں صحیح بیان بھی کرتے ہیں اور صحیح عمل بھی کرتے ہیں۔

علامہ طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ انبیاء اور ائمہ معصومین کی عصمت کے بارے میں فرماتے ہیں:

قرآن مجید صراحت کے ساتھ فرماتا ہے کہ خدائے متعال نے انھیں اپنے لئے منتخب کیا ہے اور اپنے لئے خالص قرار دیا ہے، جیسے کہ فرماتا ہے:

﴿ و من ء آبائهم و ذريا تهم و اخوانهم و اجتبيناهم و هديناهم الى صراط مستقيم﴾ (انعام/۸۷)

''اور پھر ان کے باپ دادا، اولاد اور برادری میں سے اور خود انھیں بھی منتخب کیا اور سب کو سیدھے راستہ کی ہدایت کردی''

خدائے متعال نے انھیں علم میں سے وہ مرحلہ عطا کیا ہے جو عصمت کا ملکہ ہے اور وہ انھیں گناہ کے ارتکاب اور جرائم سے روکتا ہے۔ اس ملکہ کے ہوتے ہوئے ان سے گناہ کا (حتی گناہ صغیرہ) سرزد ہونا محال ہوتا ہے۔ اگر چہ عصمت، اور عدالت کے دونوں ملکہ گناہ کے مرتکب ہونے سے مانع ہوتے ہیں، لیکن ان میں یہ فرق ہے کہ عصمت کے ملکہ ساتھ گناہ کا سرزد ہونا ممتنع ہوتا ہے، لیکن عدالت کے ملکہ ساتھ گناہ کا سرزد ممتنع نہیں ہوتا ہے۔

مزید فرماتا ہے:

''عصمت'' کا ملکہ سے نہ صرف یہ کہ اس کا اثر کو نہیں بدلتا ہے بلکہ اس کا اثر قطعی اور دائمی

ہے، اسی کے ساتھ طبیعت انسانی کو کہ وہی اپنے ارادی افعال میں مختار ہونا ہے تغیر دیئے بغیر اسے عصمت کے لئے مجبور ومضطرب نہیں کیا جاسکتا۔ اسے کیسے مجبور کرسکتا ہے، جبکہ علم خود اختیارات کا مقدمہ ہے اور علم کا قوی ہونا ارادہ کے قوی ہونے کا سبب ہوتا ہے، مثلاً جو تندرستی کا طالب ہے، اگر یقین پیدا کرلے کہ فلاں چیز زہر قاتل فوری ہے، بلکہ یقین اسے مجبور کردیتا ہے کہ اپنے کو ارادہ واختیار کے ساتھ اس زہریلے سیال مادہ کو پینے سے روک لے۔ [1]

مذکورہ مطالب کے پیش نظر، حتی بعض افراد جیسے حضرت ابوالفضل العباس علیہ السلام اور حضرت علی اکبر علیہ السلام اور بہت سے امام زادے دوسری قسم کی عصمت جو بعض انبیاء، ائمہ معصومین اور حضرت زہرا سلام اللہ علیہا سے مخصوص ہے کے مالک نہیں ہیں، جبکہ وہ اپنی پوری زندگی میں مرتکب گناہ نہیں ہوئے ہیں۔ البتہ اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے کہ ان بزرگوں کا مقام دوسرے لوگوں سے بدرجہا بلند ہے اور وہ ایک قسم کے مقام عصمت کے مالک ہیں، البتہ جو عصمت بعض انبیاء اور ائمہ کے لئے مخصوص ہے، اس کے یہ مالک نہیں ہیں۔

نتیجہ نکلا کہ انسان گناہ سے عملی عصمت کا مالک ہوسکتا ہے اور عملاً گناہ نہ کرے اور اگر بلند ہمت رکھتا ہے اور تزکیہ نفس اور نفسانی خواہشات کو کچل کر خدائے متعال سے اپنے رابطہ کو مستحکم کرلے تو وہ صدیقین کے مقام تک پہنچ سکتا ہے۔ لہذا ہمیں معنوی کمالات تک پہنچنے کے لئے اپنے قدم آگے بڑھانا چاہئے اور خود کو صدیق یا صالح بننے کی تلقین کرنا چاہئے۔ بیشک اگر انسان کوشش کرے اور ضروری ظرفیت اور کماحقہ تمام شائستگی کو کسب کرے، تو خدائے متعال ایسے مقامات عطا کرنے میں بخل نہیں کرتا ہے۔ بنیادی طور پر خود خدائے متعال نے انسان کی ہمت افزائی کی ہے کہ وہ بلند مقام تک پہنچے اور اسلام نے مومن کو بلند ہمتی کی دعوت دی ہے اور خدائے متعال چاہتا ہے کہ مومن کے حوصلے بلند ہوں اور وہ تھوڑے پر مطمئن اور قانع نہ ہوجائے، انبیاء کے مقام پر نظر رکھے اور کوشش کرے کہ ان کی پیروی۔

اگر ہم انبیاء کے درجہ اور مقام عصمت تک نہیں پہنچ سکتے، لیکن صدیق اور صالح بن سکتے ہیں، کیونکہ انبیاء اور ائمہ معصومین کی خصوصی عصمت کے لئے ان دونوں چیزوں کی شرط نہیں ہے۔ چنانچہ ہم نے اس سے پہلے بھی کہا ''صدیق یعنی'' سچ بولنے اور راست گفتاری میں مبالغہ ہے، یعنی جو اپنی زندگی میں جھوٹ کو اپنے

---

(۱) المیزان (دار الکتب الاسلامیہ، طبع سوم) ج ۱۱، ص ۱۷۷۔۱۸۹

نزدیک آنے کی اجازت نہ دے، نہ اپنے گفتار میں، نہ کردار میں اور نہ اپنی سوچ میں حتی غلط فکر اور برا تصور بھی نہیں کرتا ہے۔

ایمان میں صداقت کی اہمیت اور اس تک پہنچنے کا راستہ:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سچائی وصداقت کی قدر و قیمت کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ان الصدق یھدی الی البر والبر یھدی الی الجنة و ان الرجل لیصدق حتی یکتب عنداللہ صدیقا'' [1]

''صدق، نیکی کے لئے راہنما ہے اور نیکی بہشت کے لئے، اور مرد سچ نہیں کہتا ہے مگر یہ کہ خدا کے نزدیک صدیق کی حیثیت سے پہچانا جائے''

شاید ہم بولنے فکر کرنے اور رفتار و کردار میں صداقت پیدا کرنے کو مشکل نہ سمجھیں اور اپنی جگہ یہ تصور کریں کہ ایسا ممکن ہے کہ ہم جھوٹ نہ بولیں، بری فکر کو اپنے ذہن میں پلنے نہ دیں اور ناشائستہ رفتار سے پرہیز کریں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کام بہت مشکل ہے۔ ہم سب دعوی کرتے ہیں کہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمیشہ خدا کو حاضر و ناظر جانتے ہیں، لیکن کیا ہماری رفتار و گفتار ہمارے ایسے دعوی کی تائید کرتی ہیں؟

ہم بعض اوقات تنہائی میں ایسے کام انجام دیتے ہیں کہ اگر ایک چھوٹا بچہ ہمارے پاس ہوتا تو ہم شرم کے مارے ڈوب مرتے اور وہ کام انجام نہ دیتے، اب ہم کیسے اعتقاد رکھتے ہیں کہ خدا حاضر و ناظر ہے جبکہ ہم برے کام انجام دیتے ہیں! حقیقت میں ہم خدائے متعال کو ایک بچے سے بھی کم تر جانتے ہیں اور اپنے اعتقاد میں صادق نہیں ہیں بلکہ ہمارے اعتقاد میں جھوٹ اور کذب کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ ہم اعتقاد رکھتے ہیں کہ اگر انسان اپنی عمر کو خدا کی اطاعت میں صرف کرے، تو خدائے متعال اس کی عمر کے ہر لمحہ کے مقابلہ میں اسے ایسی جزا دیتا ہے کہ اس کی قیمت پوری دنیا اور جو کچھ اس میں موجود ہے، کے برابر ہے، لیکن کیا ہم اس اعتقاد اور باور میں صادق ہیں؟ کیا ہماری رفتار اس اعتقاد کی تصدیق کرتی ہے؟

اگر کسی کے پاس سونے سے بھری ایک چھوٹی سی تھیلی ہو، کیا وہ اسے بیہودہ طور پر کنویں میں ڈال

---

[1] فیض کاشانی، المحجة البیضاء، ج ۸، ص ۱۴

دے گا؟ کیا کوئی عاقل انسان ایسا کرسکتا ہے؟ یا یہ کہ اگر سونے کا ایک سکہ بھی اس کے پاس ہوتو اسے ایک محفوظ جگہ پر چھپائے رکھتا ہے تاکہ گم نہ ہوجائے یا چوری نہ ہوجائے؟ پس انسان کبھی اپنے مادی سرمایہ اور دولت کو بیہودہ طور پر ضائع نہیں کرتا ہے ، کیونکہ اس کام کو وہ معقول تصور نہیں کرتا ہے۔ اب ہم اگر یقین کرتے ہیں کہ ہماری عمر کا ہر لمحہ ہیرے سے گراں قیمت ہے کیا ہم حاضر ہیں اسے مفت میں کھودیں؟ کیا ہم اس فکر میں ہیں کہ گناہ نہ کریں، کیا ہم اپنی عمر کو بیہودگی اور لغو کے عالم میں ضائع نہیں کرتے؟

اگر ہم حقیقت میں اعتقاد رکھتے کہ ہماری عمر کے ہر لمحہ کے بدلے میں پوری دنیا سے زیادہ جزا ملنے والا ہے، تو ہم ہرگز اسے مفت میں ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، کیونکہ ہم مال دنیا کو مفت میں ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں۔ اگر ہم سو روپیہ کھودیں تو پریشانی کے عالم میں ہمارے ہوش اڑ جاتے ہیں حتی ہم نماز پڑھتے وقت بھی انھیں پانے کی فکر میں ہوتے ہیں

(عام طور پر بعض لوگ نماز میں اپنی گم شدہ چیزوں کے تصور میں کھوئے رہتے ہیں اور جو چیز بھول گئے ہیں نماز میں وہ انھیں یاد آتی ہے)

اگر انسان محنت اور کوشش کے نتیجہ میں کوئی دولت کمائے ،تو وہ کبھی حاضر نہیں ہوتا ہے کہ اسے آسانی کے ساتھ کسی کو بخش دے اور وہ اس کی قدر کو جانتا ہے، کیونکہ اس نے اسے حاصل کرنے میں کافی محنت کی ہے، لیکن یہ ممکن ہے کہ معمولی سے نقصان کا احساس کئے بغیر انسان اپنی عمر کے بہت سے گھنٹوں کو باطل راستہ پر صرف کرے۔ دوسرے الفاظ میں ممکن ہے انسان مال خرچ کرنے میں بخیل ہو لیکن اپنی عمر کو صرف کرنے میں بخیل نہ ہو، باوجودیکہ مال کی قیمت کا عمر کی قیمت سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ پس ہم آخرت اور اخروی ثواب کے بارے میں جو ہماری عمر کے ہر لمحہ کے لئے موجود ہے۔ اس دعوے اور ایمان میں صادق نہیں ہیں، ورنہ اگر ہم سچا ایمان رکھتے ،تو اپنی عمر کو بیہودہ طور پر نہ گزارتے ، اسے گناہ کی راہ میں صرف کرنے کی بات ہی نہیں۔ حقیقت میں ہماری زندگی ان جھوٹے دعووں کے ساتھ آمیختہ ہے۔ اگر خدا نخواستہ ہماری رفتار اور گفتار میں بھی جھوٹ سرایت کرجائے تو یہ ہمارے لئے بدتر مصیبت ہوگی۔

خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے:

﴿ وما یؤمن اکثر هم با لله الا و هم مشر کو ن﴾ (یوسف/۱۰۶)

''خدا پر ایمان کا ادعوی کرنے والے اکثر مشرک ہیں''

شائد خدائے متعال اس آیت کے ذریعہ ہمیں یہ نکتہ سمجھنا چاہتا ہے کہ بہت سے مومنوں کا ایمان شرک کے ساتھ آمیختہ ہے اور خالص نہیں ہے، اگر کسی کا صرف ایک معبود ہوتا اور وہ مشرک نہ ہوتا تو اس کے اندر لالچ، مقام پرستی خلاصہ یہ کہ دنیا پرستی کے لئے کوئی جگہ نہ ہوتی۔ ان رجحانات کا وجود اور باطل سے دل لگی اس بات کی علامت ہے کہ اس کے کئی معبود ہیں نہ کہ ایک معبود:

﴿افرءیت من اتخذالٰھہ ھواہ واضلّہ اللّٰہ علی علم وختم علی سمعہ وقلبہ وجعل علی بصرہ غشاوۃ فمن یھدیہ من بعداللہ افلا تذکرون﴾ (جاثیہ/۲۳)

کیا آپ نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش ہی کو خدا بنالیا ہے اور خدا نے ایسی حالت کو دیکھ کر اسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے اور اس کے کان اور دل پر مہر لگادی ہے اور اس کی آنکھ پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور خدا کے بعد کون ہدایت کرسکتا ہے کیا تم اتنا بھی غور نہیں کرتے ہو؟

جی ہاں، جن لوگوں میں نفسانی خواہشات ہیں اور انہوں نے ان نفسانی خواہشات کو اپنا معبود قرار دیا ہے وہ مشرک ہیں۔ حقیقت میں چونکہ ان کا ایمان نفسانی خواہشات کے ساتھ آلودہ ہے اور خالص نہیں ہے، اس لئے وہ شرک میں آلودہ ہیں، البتہ شرک میں آلودہ ہوئے ایمان سب ایک حد میں نہیں ہوتے۔ بعض اوقات ۹۹ فی صد ایمان ۵ فی صد شرک سے آلودہ ہوتا ہے اور کبھی شرک یہاں تک بڑھتا ہے کہ خدا پر ایمان ہی مکمل طور پر نابود ہوجاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہم گناہ میں آلودہ ہیں۔ لیکن کیا وہ شخص جس نے سالہا سال تک اپنی عمر کو گناہ اور بیہودگیوں میں صرف کیا ہے، فیصلہ کرسکتا ہے کہ گناہ سے پرہیز کرے اور اپنے ایمان واعتقاد میں صادق ہوجائے اور حقیقت میں وہ صدیق بن سکتا ہے یا نہیں؟ یقیناً یہ امر ممکن ہے، حتی ساٹھ سال عمر کے گزرنے کے بعد بھی انسان مصمم ارادہ کرسکتا ہے کہ صدیق بن جائے، اس شرط پر کہ اپنے گذشتہ کے بارے میں توبہ کرے اور مصمم ارادہ کرے کہ اپنی باقی عمر کو خدا کی اطاعت میں گزارے، اور ایسی رفتار کرے جسے خدا پسند کرتا ہے۔ اس کا سونا، بیداری، اٹھنا، بیٹھنا، معاشرت کرنا گھر میں برتاؤ اور لوگوں کے ساتھ برتاؤ سب خدا کے لئے ہو۔ یہ امر ممکن ہے، لیکن مختصر وقت میں حاصل نہیں ہوسکتا اور مختصر زمانے میں انسان صدیق نہیں بن سکتا ہے۔

''صدق'' ایک ایسا ملکہ ہے جو انسان میں طولانی اور مسلسل سعی وکوشش کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے

۔جو ساٹھ سال گناہ کرنے کے بعد صدیق بننے کا مصمم ارادہ کرے، اسے اس قدر کوشش کرنی چاہئے کہ ملکہ ''صدق'' اس معنی میں اس میں پیدا ہو جائے، جسے ہم نے دقیق طور پر بیان کیا۔ اب ممکن ہے کوئی شخص دو سال تک مسلسل مشق اور ریاضت کے نتیجہ میں وہ ملکہ حاصل کر لے، اس صورت جب وہ صدیق بن جاتا ہے، تو اس کا مرتبہ اس شخص کے مرتبہ سے دگنا ہے جس نے مقام صدق تک پہنچنے کے لئے ایک سال کوشش کی ہے اور اس کا اجر وثواب بھی اس سے زیادہ ہوگا۔ اسی طرح اگر اس مقام تک پہنچنے کے لئے مزید برسوں تک کوشش کرے تو اس کا مرتبہ بلند تر ہوگا۔ کتنا بہتر ہوتا انسان بالغ ہونے کے وقت سے ہی خدا کا بندہ ہونے کے لئے مصمم ارادہ کرتا! حقیقی معنوں میں خدا کی راہ کے علاوہ کسی اور راہ پر قدم نہ رکھتا اور خدا کی فکر کے علاوہ کسی اور فکر کو اپنے دماغ میں جگہ نہ دیتا حتی گناہ کا خیال تک نہ کرتا۔

ہمارے لئے یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ انسان ایک ایسے مقام تک پہنچ جائے کہ حتی گناہ کا تصور بھی نہ کرے، لیکن ہمارے علماء میں ایسے افراد گزرے ہیں جو اس مقام تک پہنچے تھے۔

نقل کیا گیا ہے کہ مرحوم سید رضی اور سید مرتضی رحمۃ اللہ علیہما نماز جماعت پڑھنا چاہتے تھے۔ سید مرتضی جو بڑے بھائی تھے اشارتاً سید رضی کو یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ اس کی عدالت میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے اس لئے انھوں نے کہا: ہم میں سے جس نے آج تک گناہ نہیں کیا ہے وہ نماز جماعت کی امامت کرے۔ وہ اپنے بھائی کو سمجھانا چاہتے تھے کہ انھوں نے بالغ ہونے سے اس وقت تک کوئی گناہ نہیں کیا ہے! سید رضی نے جواب میں کہا: ہم میں سے اس کو نماز جماعت کی امامت کرنی چاہئے جس نے گناہ کا خیال بھی نہیں کیا ہو، یعنی میں نے گناہ کی فکر تک کو بھی ذہن میں جگہ نہیں دی ہے

ایک بزرگ شخص نقل کرتا تھا کہ تقریباً ساٹھ سال پہلے، خاندان قاچار کا ایک شخص جو ایک زمانے میں عراق میں ایران کا قونصلر (سفیر) تھا۔ جو بلند قامت تھا اور وقار کے ساتھ راہ چلتا تھا۔

وہ چلتے وقت اس قدر وقار اور سر بلندی کے ساتھ قدم بڑھاتا تھا کہ بعض اسے متکبر سمجھتے تھے لیکن میں احساس کرتا تھا کہ اس کا ایک اور راز تھا وہ یہ کہ تواضع وانکساری میں اس متانت کا مظاہرہ کرتا تھا۔ میں اسے نہیں جانتا تھا، یہاں تک اس نے مرتے وقت دو مراجع کو اپنا وصی قرار دینا چاہا۔ اس نے سکرات الموت اور احتضار کی حالت میں ان دو مراجع کے محضر میں کہا تھا: خداوندا! تو شاہد ہے کہ میں نے بالغ ہونے کے دن سے آج تک جان بوجھ کر اور عمداً کوئی گناہ نہیں کیا ہے! جب کہ اس حال میں کہ سب اپنے گناہوں کا

اعتراف کرتے ہیں، لیکن وہ شخص دو مراجع کے محضر میں کہتا ہے کہ بالغ ہونے سے اس وقت تک میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ وہ بزرگ عالم کہتے تھے: میں نے جب وہ روداد سنی تو مجھے یہ فکر لاحق ہوئی کہ میں اس راز اور حقیقت سے آگاہ ہو جاؤں کہ تو میں نے اس کے دعوی کو سچا پایا۔ شاید وہ بزرگ عالم اس کے باطن کو دیکھ رہے تھے، کیونکہ بعض اولیائے الٰہی افراد کے باطن کے بارے میں خبر رکھتے ہیں۔

ایسا شخص جو جوانی کی ابتدا سے گناہ کا مرتکب نہ ہوا اور صرف خدا پر نظر رکھتا ہو فرائض اور تکالیف الٰہی کو انجام دینے کی فکر میں ہو، یقیناً وہ صدیقین کے مقام سے دور نہیں رہے گا۔

تیسواں درس:

ذکر کی اہمیت، تربیت ساز معاشرت اور انتخاب دوست کا معیار

- گوشہ نشینی کے فوائد
- معاشرت اور دوسروں کے ساتھ زندگی گزارنے کے فوائد
- الفت و برادری، خدا کی ایک مہربانی
- دوست کے انتخاب کا معیار
- غافلوں کے اجتماع میں ذکر خدا کرنے کی عظمت
- گفتگو کرنے کے بارے میں انسان کی ذمہ داری
- مومن کے ساتھ کھانا کھانے کے محاسن اور فاسق کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز

ذکر کی اہمیت، تربیت ساز معاشرت اور انتخاب دوست کا معیار

"یا اباذر: الذاکر فی الغافلین کالمقاتل فی الفارّین؛ یااباذر؛ الجلیس الصالح خیر من الوحدة والوحدة خیر من جلیس السوء واملاء الخیر خیر من السکوت و السکوت خیر من املاء الشر"

"یا ابا ذر: لا تصاحب الا مؤمنا ولا یا کل طعامک الا تقی ولا تاکل طعام الفاسقین؛ یااباذر؛ اطعم طعامک من تحبه فی الله وکل طعام من یحبک فی الله عزوجل"

حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جناب ابوذرؓ سے نصیحتوں کا یہ حصہ ایک دوسرے سے میل جول اور نشست و برخاست سے مربوط ہے، علمائے اخلاق نے اپنی کتابوں میں جن مسائل کا ذکر کیا ہے اور ان میں کم و بیش اختلاف ہے، وہ یہ ہے کہ اسلامی اخلاق کی نظر میں میل جول اور اجتماعی ہونا بہتر ہے یا تنہائی و گوشہ نشینی؟ دوسروں سے میل جول کی اہمیت کے سلسلے میں بعض روایتیں نقل ہوئی ہے کہ من جملہ حضرت محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے احتضار اور جان کنی کے عالم میں، اپنے بیٹوں حسن و حسین علیہما السلام اور محمد حنفیہ نیز اپنے چھوٹے فرزندوں کو اپنے پاس بلا کر انھیں وصیت کی اور وصیت کے آخر میں فرمایا:

''میرے فرزندو! لوگوں کے ساتھ ایسی معاشرت کرو کہ اگر تم ان سے دور ہو گئے تو وہ تمھیں دوبارہ دیکھنے کے لئے مشتاق رہیں اور مر جاؤ تو تم پر روئیں ''[۱]

علمائے اخلاق نے تنہائی اور گوشہ نشینی کے کچھ فوائد بیان کئے ہیں کہ ان کا ذکر لوگوں کے ساتھ میل جول اور نشست و برخاست کرنا مطلوب دکھایا ہے، اس کے مقابلہ میں دوسروں کے ساتھ معاشرت کے بھی کچھ فوائد بیان کئے ہیں اور گوشہ نشینی کے کچھ نقصانات بھی ذکر کئے ہیں۔

گوشہ نشینی کے فوائد:

گوشہ نشینی کے درج ذیل فائدے بیان کئے گئے ہیں:

الف۔ اجتماعی زندگی سے گوشہ نشینی اختیار کرنا، عبادت کے لئے فراغت پیدا کرنے، دنیوی و اخروی امور میں تفکر کرنے، خدا کے ساتھ مناجات سے انس پیدا کرنے، اسرار الٰہی کو درک کرنے اور خدا متعال کی حیرت انگیز مخلوقات پر غور و خوض کرنے کا سبب ہے اور لوگوں کے ساتھ میل جول انسان کو بلند توفیقات سے محروم کر دیتا ہے بیان کیا گیا ہے کہ: گوشہ نشینی کے اہم تربیتی رول کی وجہ سے ہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی رسالت کے آغاز پر تنہا کوہ حرا میں تشریف لے جاتے تھے اور اپنے پروردگار سے مناجات میں مشغول ہوتے تھے اور معاشرے سے دوری اختیار فرماتے تھے، یہاں تک آپؐ کے قلب مبارک میں نور نبوت و رسالت روشن ہوا اور اس کے بعد لوگ آپ کو خدائے متعال سے جدا نہ کر سکے۔

آپؐ اگر چہ جسم و بدن کے ساتھ لوگوں میں ہوا کرتے تھے، لیکن آپ کا دل خدا کے ساتھ ہوتا تھا اور تنہائی میں خدا کی یاد اور ذکر کیا کرتے تھے۔ نبوت و رسالت کی طاقت اور قرب الٰہی پر فائز ہونے کی طاقت کے بغیر انسان لوگوں کے ساتھ ظاہری میل جول اور خداوند متعال سے مخفی توجہ کو آپس میں جمع نہیں کر سکتا ہے۔

ب۔ لوگوں سے کنارہ کشی کرنے سے انسان بہت سے گناہوں سے بچ جاتا ہے، خاص کر ان گناہوں سے جو غالباً لوگوں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے ہی سرزد ہوتے ہیں، مثال کے طور پر:

۱) غیبت۔ ۲) ریا کیونکہ انسان لوگوں کے ساتھ معاشرت کی وجہ سے ہی ریا اور نفاق میں مبتلا ہوتا

۱۔ بحار الانوار: ج ۷۲، ص ۲۴۷

ہے وہ اگر لوگوں کے ساتھ نرمی نہ کرے اور انھیں بُرے کاموں اور نامناسب باتوں سے روکنا چاہے تو اسے تکلیف پہنچاتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں خاموشی اختیار کرے تو ریا میں مبتلا ہوتا ہے۔

۳)۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں خاموشی ۴۔ پست اخلاق اور ناپسند اعمال سے انسان کی طبیعت اور فطرت کو پاک نہ کرنا جس کی وجہ سے انسان دنیا کی طمع میں مبتلا ہوتا ہے، جو لوگوں سے میل جول کی وجہ سے ہی انسان میں پیدا ہوتی ہے۔

فطری و طبعی بات ہے کہ جب انسان نے اپنی اصلاح نہ کی ہو اور ایک ایسے مرحلہ تک نہ پہنچا ہو جہاں پر وہ اپنے نفس کو لگام دے سکے اور اسے لغزشوں سے بچا سکے تو وہ اجتماع میں گناہ کا مرتکب ہوتا ہے، کیونکہ لوگوں سے گفتگو کرنا اور میل جول بذات خود گناہ سے آلودہ ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

ج)۔ اختلاف اور ٹکراؤ سے بچنا، دین کا تحفظ اور اپنے نفس کو معاشرتی لغزشوں سے روکنا: کیونکہ اجتماعات، تعصبات، عداوت اور دشمنیوں سے خالی نہیں ہیں، اس لحاظ سے جو اجتماعات سے بچتا ہے، وہ ان انحرافات سے محفوظ ہے۔

د)۔ لوگوں کی طرف سے پہنچنے والے نقصانات سے نجات: کبھی دوسرے لوگ غیبت کر کے انسان کو اذیت و آزار پہنچاتے ہیں اور کبھی بدظن ہو کے، کبھی تہمت سے اور کبھی ناروا باتوں اور طمع و لالچ سے آزار پہنچاتے ہیں۔ اس لحاظ سے جب انسان لوگوں سے دوری اختیار کرتا ہے تو ان امور سے آزاد ہوتا ہے۔ اگر لوگوں سے میل جول کرے اور ان کے ساتھ نشست و برخاست رکھے اور خود کو ان کے کاموں میں شریک قرار دے، تو حسادت اور دشمنیوں کے شر سے محفوظ نہیں ہے۔ ہر لمحہ اسے فتنے ضربہ لگانے کے درپے ہیں تاکہ اسے اپنے مقام و منزلت سے گرا دیں۔

ھ)۔ گوشہ نشینی اور تنہائی لوگوں کی طرف سے انسان کے لئے طمع نہ کرے اور انسان کی طرف سے لوگوں کے لئے طمع نہ کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ انسان کی آسائش اس میں ہے کہ لوگوں کی طمع اس سے کم ہو جائے، انسان کبھی لوگوں کی رضامندی حاصل نہیں کر سکتا ہے، کیونکہ امیدیں اور توقعات حد سے زیادہ ہوتی ہیں، اس لحاظ سے نفس کی اصلاح کرنا لوگوں کی رضامندی حاصل کرنے سے بہتر ہے۔

جو انسان دوسروں کے حقوق جیسے لوگوں کے تشییع جنازہ میں شرکت کرنا، بیماروں کی عیادت اور شادی وغیرہ میں شرکت کرنا ادا کرنے کی تلاش میں ہوتا ہے، اگر ان تمام امور کو انجام دینا چاہے اس کا

وقت ضائع ہوتا ہے اور دوسرے فرائض انجام دینے سے پیچھے رہتا ہے، اگر ان امور سے بعض کو انجام دے تو بعض دوسرے امور رہ جاتے ہیں، اگر دوسروں کی خواہشات کے مقابلہ میں کوئی عذر پیش کرے تو اس کے عذر کو قبول نہیں کرتے اس لحاظ سے وہ دوسروں کا مقروض رہتا ہے اور یہ بذات خود کدورت اور دشمنی کا سبب بنتا ہے۔ لیکن جو مکمل طور پر ان امور سے دوری اختیار کرتا ہے، اس کے لئے کم تر مشکلات اور دردسر پیدا ہوتا ہے۔

و)۔ جو تنہائی اور گوشہ نشینی اختیار کرتا ہے، وہ مغرور، ہٹ دھرم اور احمق انسانوں جن کو دیکھنا انسان کیلئے رنجش کا سبب بن جاتا ہے کو دیکھنے سے بچتا ہے۔ اعمش سے پوچھا گیا کہ: تیری آنکھ میں کیوں تکلیف ہوئی ہے؟ اس نے کہا: کیونکہ میں نے مغرور متکبروں پر نگاہ کی۔ اس لئے دنیوی نقطہ نظر سے، احمقوں، متکبروں مغروروں کو دیکھنا انسان کی روح پر بُرا اثر ڈالتا ہے اور اخروی جہت سے، جب انسان ان کو دیکھنے سے رنجیدہ ہوتا ہے، تو ان کی غیبت میں تاخیر نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ جب انسان دوسروں کی غیبت، اپنے اوپر تہمت اور دوسروں کے حسد اور چغلخوری سے اذیت و آزار محسوس کرتا ہے، تو ان کی تلافی میں کوتاہی نہیں کرتا اور یہ سب انسان کے لئے اس کے دین میں خرابی پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے اور انسان گوشہ نشینی کے ذریعہ ان مصیبتوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

معاشرت اور دوسروں کے ساتھ زندگی گزارنے کے فوائد:

بہت سے مقاصد اور دینی اور دنیوی ضرورتیں دوسروں کی مدد سے حاصل ہوتی ہیں اور یہ چیزیں دوسروں کی معاشرت اور میل جول کے بغیر حاصل نہیں ہوتیں۔ پس جو کچھ دوسروں سے معاشرت کی بنا پر ہاتھ آتا ہے، وہ گوشہ نشینی اور اختیار کرنے سے ہاتھ سے چلا جاتا ہے اور فطری بات ہے کہ ان منافع کے ہاتھ سے چلا جانا، گوشہ نشینی اور تنہائی کے نقصانات اور آفات ہیں۔ مذکورہ بیان کے پیش نظر دوسروں سے معاشرت کے چند فوائد کو حسب ذیل عبارت میں ذکر کیا جا سکتا ہے:

الف)۔ سیکھنا اور دوسروں کو سکھانا (تعلیم و تعلم) جس کی اہمیت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے، اور یہ بڑی عبادتوں میں سے ہے، جو دوسروں سے معاشرت اور میل جول کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔ گوشہ نشینی و رتنہائی اختیار کرنے والا (تعلیم و تعلم) علم کے سیکھنے اور سکھانے اور اس کے نشر و اشاعت سے محروم رہتا

ہے۔ یقیناً اگر انسان گوشہ نشینی کی وجہ سے دینی اور دنیوی علوم سیکھنے سے محروم رہا اور اس نے دینی احکام نہ سیکھے تو وہ ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہوگا۔

ب)۔ دوسروں سے فائدہ اٹھانا اور دوسروں کو فائدہ پہنچانا: فطری بات ہے کہ لوگوں سے استفادہ کرنا، ان کے ساتھ کسب و تجارت اور کام کرنے سے حاصل ہوتا ہے اور یہ امر ممکن نہیں ہے مگر یہ کہ لوگوں سے معاشرت کی جائے اور جو دوسروں سے استفادہ کرنا چاہتا ہے، اسے گوشہ نشینی کو ترک کرنا ہوگا اور لوگوں سے روابط اور میل جول برقرار کرنے کی کوشش کرنا ہوگی۔ لیکن اس کی یہ کوشش اور کام خدا کی راہ میں انجام پانا چاہئے۔

لیکن دوسروں کا فائدہ اٹھانا اس معنی میں ہے کہ انسان اپنے مال، جسم اور فکر سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرے۔ حقیقت میں لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اقدام کرنا ثواب کا کام ہے اور یہ لوگوں سے معاشرت اور میل جول کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ جو لوگوں کے بوجھ کو ہلکا کرتا ہے اور ان کے مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس نے ایک بڑی فضیلت حاصل کی ہے اور یہ امر گوشہ نشینی سے حاصل نہیں ہوسکتا ہے۔ انسان گوشہ نشینی میں صرف اپنی انفرادی عبادت جیسے نوافل، مستحبات اور شخصی کام انجام دے سکتا ہے۔

ج)۔ تربیت کرنا اور ادب و تربیت قبول کرنا: ادب و تربیت قبول کرنا، یعنی لوگوں کی نامناسب عادات کا علاج اور انھیں برداشت کرنے کی کوشش کرنا اور لوگوں کے ناشائستہ اخلاق اور ان کی اذیتوں کو برداشت کرنے کی کوشش کرنا، تاکہ اپنے نفس اور شہوانی خواہشات کو کچل سکے۔ یہ امر صرف لوگوں سے معاشرت اور ان کے ساتھ نشست برخاست سے حاصل ہوسکتا ہے۔ جو تزکیہ نفس اور اصلاح نہ کرسکا وہ حدود شرعی کی رعایت سے اپنی شہوت کو کنٹرول نہیں کرسکتا ہے، تو اس کے لئے لوگوں کے ساتھ تعمیری معاشرت تنہائی اور گوشہ نشینی سے بہتر ہے۔

دوسروں کی تادیب و تربیت کا معنی یہ ہے کہ انھیں ناپسند کاموں کے بارے میں ڈرایا جائے اور روکا جائے، چونکہ معلم اپنے شاگردوں سے ایسا ہی کرتا ہے۔ گوشہ نشینی اور لوگوں سے معاشرت کے نتائج کا آپس میں موازنہ نہیں کرنا چاہئے اور جاننا چاہئے کہ لوگوں سے میل جول انسان کے اخلاقی سدھار میں کس قدر بہتر رول ادا کرتا ہے، اس کے بعد بہترین پہلو کو اختیار کرنا چاہئے۔

د)۔ دوسروں سے رفاقت اور انس: یہ امر مجالس میں شرکت اور دوسروں سے معاشرت وانس سے حاصل ہوتا ہے۔ البتہ ایسی رفاقت ومجانست سے دوری اختیار کرنا چاہئے جو حرام کام میں ملوث ہونے کا سبب ہو، بلکہ انس ودوستی خدا کی مرضی اور احکام شرع کے مطابق ہونی چاہئے۔ انسان کو میل جول کی کوشش کرنی چاہئے تا کہ لوگوں سے نشست وبرخاست اس کے کمال وعلم کے عروج کا سبب بنے۔ نہ یہ کہ وقت کے ضائع ہونے اور مادی ومعنوی استعدادوں کو کھودینے کا سبب بنے۔ کیونکہ انسان کے دوست وساتھی اس کے سعادت وکمال یا شقاوت وبدبختی حاصل کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے دوست کو منتخب کرنے میں انتہائی سنجیدگی اور احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''المرء علی دین خلیله فلینظر احد کم من یخا لل'' [1]

''انسان اپنے دوست کے دین پر ہے، پس تم سے ہر ایک کو دیکھنا چاہئے کہ کس سے دوستی کررہے ہو''

حضرت لقمان علما اور دانشمندوں سے ہم نشینی کی اہمیت کے سلسلہ میں اپنے بیٹے سے کہتے ہیں:

''یابنیّ جالس العلماء فزاحمهم برکبتیک فان القلوب تحی با لحکمة کما تحی الارض المیتة بوابل المطر'' [2]

میرے بیٹے: علما کی ہمنشینی اختیار کرو اور ان کے آگے زانوئے ادب تہہ کرو، بیشک دل حکمت سے اسی طرح زندہ ہوتے ہیں، جس طرح مردہ زمین بارش کے قطروں سے زندہ ہوجاتی ہے۔

سعدی نے عابد وعالم کی ہم نشینی کے فرق کے بارے میں کہا ہے:

صاحب دلی به مدرسه آمد ز خانقاه — بشکست عهد صحبت اهل طریق را
گفتم میان عالم و عابد چه فرق بود — تا اختیار کردی ازآن این فریق را
گفت آن گلیم خویش بدر می برد ز موج — وین جهد می کند که بگیرد غریق را

(ایک عارف خانقاہ کو چھوڑ کر مدرسہ میں آ گیا۔ تا کہ اہل طریقت کی ہم نشینی کے عہد وپیمان کو توڑ

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۴ ص ۱۹۴

۲۔ بحار الانوار، ج ۱ ص ۲۰۴

دے میں نے اس سے پوچھا کہ عابد اور عالم میں کیا فرق ہے اور تم نے عبادت کو چھوڑ کر علم کے راستہ کو کیوں اپنایا؟ اس نے جواب میں کہا: عابد دریا کی لہروں سے اپنی گلیم کو حاصل کرنے کی فکر میں ہوتا ہے اور عالم ڈوبنے والے کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔)

ھ)۔ لوگوں سے معاشرت کا فائدہ، ثواب حاصل کرنا اور دوسروں کو ثواب پہنچانا ہے۔ لوگوں کے مردوں کے تشییع جنازہ میں شرکت کرنے، بیماروں کی عیادت کو جانے، رشتہ داروں اور جانے پہچانے لوگوں کے گھر جانے اور ان کے غم وشادی میں شریک ہونے سے ثواب حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ ان امور کو انجام دینا برادری کے مستحکم ہونے اور مسلمانوں کے دلوں میں مسرت وشادمانی داخل ہونے کا سبب بنتا ہے اور یہ بذات خود فراوان ثواب رکھتا ہے۔ لیکن دوسروں کو ثواب پہنچانے کا معنی یہ ہے کہ، انسان اپنے گھر کے دروازہ کو دوسروں کے لئے کھلا رکھے تا کہ مشکلات اور مصیبتوں میں لوگ آجائیں اور اسے تسلیت وتعزیت پیش کریں اور خوشیوں اور نعمتوں سے بہرہ مند ہونے پر اسے مبارکباد پیش کریں، کہ اس کام سے لوگ ثواب پاتے ہیں۔ چنانچہ اگر ایک عالم اپنے گھر کے دروازہ کو دوسروں کے لئے کھلا رکھے، تو یہ اس امر کا سبب بن جاتا ہے کہ لوگ اس کی زیارت سے ثواب پائیں۔

و)۔ تواضع وانکساری: دوسروں کے ساتھ معاشرت اور میل جول سے، انسان میں تواضع اور انکساری کی بلند عادت پیدا ہوتی ہے، اور حقیقت میں یہ ایک ایسا بلند مقام ہے جو انسان کو گوشہ نشینی اور تنہائی میں حاصل نہیں ہوتا ہے، کیونکہ بعض اوقات بذات خود تکبر گوشہ نشینی کا سبب بنتا ہے۔ نقل کیا گیا ہے کہ ایک فلسفی نے حکمت کے موضوع پر تین سو ساٹھ مقالے لکھے تا کہ خدا کے نزدیک ایک بلند مقام حاصل کرے خدائے متعال نے اس زمانے کے پیغمبر کو وحی کی کہ اس فلسفی سے کہو: تم نے زمین کو نفاق وپریشانی سے بھر دیا ہے، میں تمھاری پریشانی پھیلانے والے کاموں کو پسند نہیں کرتا ہوں۔ اس کے بعد اس حکیم نے گوشہ نشینی اختیار کی اور لوگوں سے دور ہو گیا اور کہا: شاید اب خدائے متعال مجھ سے خوش ہو گیا ہے۔

خداوند متعال نے اپنے پیغمبروں کو وحی کی کہ اس سے کہہ دو: میں تجھ سے خوش نہیں ہوں گا مگر یہ کہ تم لوگوں کے ساتھ معاشرت رکھو اور انکی آزار واذیت کو برداشت کرو۔ اسکے بعد وہ حکیم لوگوں سے جاملا اور کوچہ بازار میں ان کے ساتھ معاشرت اور میل جول کرنے لگا، ان کے ساتھ نشست برخاست کرتا تھا، یہاں تک خدائے متعال نے وحی بھیجی: میں تم سے خوش اور راضی ہوا۔

ز)۔کسب تجارت: لوگوں کے ساتھ معاشرت، ہم نشینی اور ہمراہی سے تجربے حاصل ہوتے ہیں، چونکہ انسان لوگوں کے حالات، افکار اور اعمال کے بارے میں آگاہ ہوتا ہے۔ان کی زندگی میں موجودہ کردار اور اتار چڑھاؤ سے آگاہ ہونے کے بعد، صحیح زندگی گزارنے کے لئے توشہ راہ مہیا کرتے ہیں۔یقیناً دینی اور دنیوی مصلحتوں کو سمجھنے کے لئے صرف فطری عقل کافی نہیں ہے اور تجربہ اس کی مدد کرتا ہے اسکے مقابلہ میں جو تجربہ سے استفادہ نہ کرتے ہوئے گوشہ نشینی اختیار کرتا ہے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

مذکورہ بیانات کے پیش نظر واضح ہوگیا کہ نہ مکمل طور پر تنہائی اور گوشہ نشینی سے انکار کیا جاسکتا ہے اور نہ لوگوں سے معاشرت اور میل جول کو مکمل طور پر مطلوب سمجھا جاسکتا ہے، بلکہ ہر فرد کے حالات وجذبات اور اس کے ہم نشین کے حالات وجذبات اور ان کی دوستی ومعاشرت کے محرک کے پیش نظر حکم فرق کرتا ہے۔مختصر یہ کہ لوگوں سے دوری اختیار کرنا، عداوت ودشمنی کا سبب بن جاتا ہے اور ان سے میل جول میں افراط، بدکرداری کا سبب بن جاتا ہے، لہذا انسان کو ہر حالت میں گوشہ نشینی اور لوگوں سے معاشرت کے درمیان اعتدال کی رعایت کی جانی چاہئے۔

الفت وبرادری، خدا کی ایک مہربانی:

بیشک خدائے متعال نے، کوہ وبیابان، جنگل ودریا سے لے کر انسان وحیوانات تک جو کچھ خلق کیا ہے، ان سب کو نعمت قرار دیا ہے۔اہل فن کی تعبیر میں، یہ عالم ایک ہم آہنگ نظام کا حامل ہے جس کے اجزا ایک دوسرے سے مرتبط اور ہم آہنگ ہیں، حقیقت میں عالم پر ایک بہترین نظام حاکم ہے اور ہر چیز اپنی جگہ پر قرار پائی ہے اور تمام مخلوقات، آپس میں منظم ربط کے پیش نظر ایک دوسرے کو بہرہ مند کرتے ہیں۔ اس اصول کے مطابق، خدائے متعال نے انسانوں کی زندگی کے لئے جو مقصد مدنظر رکھا ہے، جسے انسانی کمال سے تعبیر کیا گیا ہے، لوگوں کو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کے لئے مفید واقع ہونا چاہئے اور ایک دوسرے سے استفادہ کرنا چاہئے دوسری طرف سے اگرچہ خدائے متعال نے بنیادی طور پر انسان کو ایک دوسرے کے لئے نعمت قرار دیا ہے کہ بہترین نظام کے راستے میں کمال کی طرف قدم بڑھائیں، لیکن چونکہ انسان صاحب اختیار ہے، اس لئے وہ خدا کی نعمتوں کو شقاوت اور بدبختیوں میں تبدیل کرسکتا ہے، جیسا کہ خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿الم تر الی الّذین بدلوا نعمة اللّٰه کفراً واحلّوا قومهم دار البوار﴾(ابراہیم/۲۸)

''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا، جنھوں نے اللہ کی نعمت کو کفران نعمت سے تبدیل کر دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کی منزل تک پہنچا دیا''

مذکورہ مطالب کے پیش نظر، انسان خود کو دوسروں کے لئے نعمت بھی قرار دے سکتا ہے تا کہ دوسرے اس سے استفادہ کر سکیں، اور انکے لئے مشکلات اور بدبختی کا سبب بن سکتا ہے۔ اخوت و، برادری اور معاشرتی زندگی خدائے متعال کی ایسی عظیم نعمتیں ہیں کہ خدائے متعال نے ان پر خاص نظر عنایت کی ہے، یہاں تک کہ فرماتا ہے:

﴿...واذ کروا نعمة اللّٰه علیکم اذ کنتم اعداء فالّف بین قلو بکم فا صبحتم بنعمته اخوا نا...﴾ (آل عمران/۱۰۳)

''...اور اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ تم لوگ آپس میں دشمن تھے اس نے تمھارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے''

پس لوگوں کے درمیان الفت اور برادری کا رابطہ ایک نعمت الٰہی ہے، اس کی قدر کرنی چاہئے اور مزید اس الفت کو مستحکم کرنے کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔ ایک مسلمان کو ہر حالت میں اپنے مسلمان بھائی کا یار و غمخوار ہونا چاہئے نہ یہ کہ اس کے لئے رنجیدگی کا سبب بنے اور اس پر ظلم کرے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں،

''المسلم اخوا لمسلم هو عینه و مر آته و دلیله لا یخو نه ولا یظلمه و لا یکذ به ولا یغتابه'' [1]

''مسلمان، مسلمان کا بھائی، اس کی آنکھ، آئینہ اور اس کا رہنما ہے وہ اس کے ساتھ خیانت نہیں کرتا ہے اور اس پر ظلم نہیں کرتا ہے اور اس سے جھوٹ نہیں بولتا ہے اور اس کی غیبت نہیں کرتا ہے''

لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ سب انسانوں کے ساتھ معاشرت اور ہم نشینی مفید ہے اور اس کے بر عکس یہ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ تمام انسانوں کے ساتھ معاشرت بالکل مضر ہے اور انسان کو کسی سے میل جول نہیں رکھنا چاہئے، بلکہ ایک معیار مد نظر رکھنا چاہئے، جس کے پیش نظر مطلوب اور تعمیری معاشرتوں کو نا

۱۔ اصول کافی، ج ۲/ص ۱۶۶/

مطلوب اور مضر معاشرتوں سے جدا کر کے پہنچاننا چاہئے۔ انسان کو جاننا چاہئے کہ کیسے افراد سے معاشرت اس کو الٰہی اور معنوی مقاصد تک پہنچنے میں مدد کر سکتی ہے، اسے اپنی معنوی اور روحی تکامل و ترقی کے لئے اور فرائض کو انجام دینے کے لئے کن افراد سے معاشرت کرنی چاہئے، یا کن افراد سے معاشرت کرے تا کہ ان پر تعمیری اثر ڈال سکے، کیونکہ دوسروں پر تعمیری اثر ڈالنا بھی انسان کے لئے تکامل و ترقی کا سبب بنتا ہے۔ اگر انسان دوسروں کی خدمت کرنا اپنا فرض قرار دے خواہ خدمت مادی ہو یا معنوی البتہ معنوی مدد کی قدر و قیمت زیادہ ہے اور فرائض کو انجام دینے کیلئے دوسروں کی ہدایت اور انھیں خیر و سعادت کی طرف رہنمائی کرے تو وہ خود تکامل و ترقی پاتا ہے کیونکہ فریضہ انجام دے کر اس نے خدا کی عبادت کی ہے جس کے نتیجہ میں وہ پر خود کامل تر ہوا ہے۔

حقیقت میں اس دنیا میں ہم دوسروں کی جو بھی خدمت انجام دیں، اگر وہ صحیح نیت اور شرعی صورت میں ہو، تو وہ خدمت دراصل خود ہماری طرف پلٹتی ہے، یعنی ہم نے خدائے متعال کی عبادت کی ہے اور اس کا ثواب ہماری طرف پلٹتا ہے۔ پس اگر معاشرت و ہمنشینی سبب ہو کہ انسان دوسروں کے ساتھ نیکی کرے یا دوسروں سے معنوی خیر حاصل کرے اور ان سے معاشرت کر کے ہدف و مقصد کی طرف اچھی طرح متوجہ ہو تو ،اس کے علم اور قلبی توجہات میں اضافہ ہوگا اور وہ اپنی زندگی کے لئے بہتر راستہ کا انتخاب کرے گا تو یقیناً یہ معاشرت اس کے لئے گراں قیمت ہے۔

اس کے مقابل میں، ایسے افراد سے معاشرت کرنا مطلوب نہیں ہے جو نہ صرف انسان کو خدا کی یاد نہیں دلاتے بلکہ اس سے غافل کرتے ہیں اور اپنی گفتار اور عمل سے انحطاط و انحراف کی طرف دعوت دیتے ہیں ۔اس لحاظ سے ہر انسان کو اپنا دوست قرار نہیں دینا چاہئے۔ دوستی اور رفاقت کے لئے دوست کی بلند اور قابل قدر خصلتیں معیار ہیں، البتہ رفیق اور دوست میں پائی جانے والی عمدہ ممتاز خصلتیں دوسروں کے ساتھ ہم نشینی و مصاحبت سے ان کی طرف مفید اور اچھے پیغامات پہنچتے ہیں۔ اگر چہ بعض اوقات دوستی اور رفاقتوں سے دینوی فوائد، جیسے مال اور مقام سے استفادہ مدنظر ہوتا ہے، لیکن اہم ترین فوائد، دینی فوائد ہیں، جیسے ہم نشین کے علم و عمل سے استفادہ کرنا کسی کی طرف سے خدا کی عبادت و بندگی میں رکاوٹ ڈالنے کی غرض سے ایجاد کئے گئے آزار اور مزاحمت سے محفوظ رہنے کی سعی کرنا۔ یا اس کے مال سے استفادہ کرے تا کہ اپنے وقت اور عمر کو دینوی امور میں ضائع کرنے سے محفوظ رکھے اور فرائض الٰہی کو بہتر صورت میں انجام دے۔

دوست کے انتخاب کا معیار:

مناسب دوست کے انتخاب میں مشکلات اور نیک و بد دوستوں کے مثبت و منفی اثرات کے پیش نظر اسلامی منابع و مصادر میں دوست بنانے کے معیاروں کے سلسلے میں چند باب مختص کئے گئے ہیں اور اولیائے دین نے مناسب دوست کے اوصاف اور ان کی خصوصیتیں بیان کی ہیں من جملہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ: بہترین ہم نشین کون ہیں؟ تو آپؐ نے جواب میں فرمایا:

"من ذکّرتکم با اللہ رؤیته و زادکم فی علمکم منطقه و ذکّرکم با لا خرة عمله" [1]

"جس کا دیدار تمھیں خدا کی یاد دلائے اور اس کا کلام تمھارے علم میں اضافہ کرے اور اس کا عمل تجھے قیامت کی طرف متوجہ کرے"

یا جب حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام سے ان کے اصحاب سوال کرتے ہیں کہ: ہم کس کے ساتھ معاشرت کریں؟ تو انہوں نے جواب میں فرمایا:

"اس شخص سے ہم نشینی اختیار کرو، جس کا دیدار تجھے خدا کی یاد دلائے اور اس کا عمل تجھے آخرت کا مشتاق بنائے اور اس کا علم تمھاری عقل و منطق میں اضافہ کرے۔ مزید فرمایا: اہل دنیا سے دوری اختیار کر کے خدا کے نزدیک ہو جاؤ اور گناہگاروں سے دشمنی کرتے ہوئے، خدا کے دوست بن جاؤ" [2] اور قرآن مجید ایک نقصان اٹھائے ہوئے فرد کی زبانی کہ جس نے راہ حق اور خدا کے پیغمبروں سے انحراف کر کے، خود اور دوسروں پر ظلم کیا ہے، خشم اور غضب الٰہی کی آگ میں پھنس گیا ہے اور بے انتہا پشیمانی واندوہ کے عالم میں حسرت سے کہہ رہا تھا:

﴿ یاویلتٰی لیتنی لم أتخذفلانا خلیلالقداضلنی عن الذکر بعد اذ جاء نی ﴾
(رقان/۲۸و۲۹)

"ہائے افسوس: کاش میں نے فلاں شخص کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس کی دوستی نے مجھے پیروی قرآن اور رسول حق کی اطاعت سے محروم کر دیا اور مجھے گمراہ کر دیا۔۔۔"

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۱، ص ۱۱۸۶

۲۔ بحار الانوار ج ۷۱ ص ۱۸۹ ح ۱۸

اس قسم کی آیتیں، اس پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان کے گمراہ ہونے کے عوامل میں نا مناسب دوست اور گمراہوں کے ساتھ رفاقت ہے، اس لئے تاکید کی گئی ہے کہ مومن ناسالم افراد اور آلودہ اجتماعات سے پرہیز کرے۔ البتہ تمام افراد یکساں نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ ایسے خود ساختہ اور مصمم ارادے کے مالک ہیں کہ ہر شرائط میں دوسروں سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ ان پر ہی اثر ڈالتے ہیں، لیکن کچھ لوگ ارادہ میں سستی اور ایمان کی کمزوری کی وجہ سے، جس سے بھی میل جول کرتے ہیں انھیں کے رنگ میں ڈھل جاتے ہیں اور انکے اخلاق اور رفتار سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس لئے انسان کو ہوشیار رہنا چاہئے کہ وہ کس سے معاشرت کرتا ہے اور کون اس پر اثر ڈال رہا ہے جو لوگ مضبوط اور قوی دل کے مالک ہیں، اگرچہ دوسروں سے متاثر ہو کر ان کے رنگ میں نہیں ڈھل سکتے، پھر بھی انھیں دیکھنا چاہئے کہ کس سے بہتر استفادہ کر سکتے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ وہ معاشرت میں ترجیحات کو مدنظر رکھیں۔

لہٰذا جن شرائط میں بھی ہم ایسے لوگوں اور ایسی جماعت میں ہوں کہ ان کی معاشرت ہمیں زیادہ سے زیادہ خدا اور آخرت کی یاد دلائے، ہمارے علم میں اضافہ کا باعث ہو، کار خیر کو انجام دینے اور دوسروں کی خدمت کرنے میں ہمارے لئے تشویق کا سبب ہو اور ان کی مدد سے زندگی کے صحیح راستہ پر آرام سے ہم چل سکتے ہیں بڑھا سکیں، تو یقیناً ایسی معاشرت مناسب اور تعمیری ہے، اگر ایسا نہیں ہے تو معاشرت معکوس اور نا مطلوب ہے، لہٰذا مطلق طور پر نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ہر معاشرت مطلوب ہے اور انسان کو ہر اجتماع میں داخل ہونا چاہئے اور ہر ایک سے معاشرت کرنی چاہئے، اس بہانہ سے کہ خوش اخلاقی اور خوش رفتاری اچھی ہے حقیقت میں ایسے تصور سے انسان اپنے آپ کو دھوکہ دیتا ہے۔

ہر کسی کے ساتھ معاشرت انسان کے فائدے میں نہیں ہے۔ ممکن ہے انسان ابتدا میں پاک نیت سے ایک اجتماع میں داخل ہو جائے اور اس کے بعد اسے معلوم ہو جائے کہ ان کے ساتھ معاشرت اس کے نقصان میں ہے، کیونکہ وہ غیبت کرنے والے اور جھوٹ بولنے والے ہیں، بیہودہ گفتگو کرتے ہیں اور اسے دنیا پرستی کیطرف دعوت دیتے ہیں۔ یا ان کی رفتار ایسی ہے کہ انسان کو دنیا کی طرف کھینچتی ہے اور آخرت سے غافل کرتی ہے اس حالت میں انسان کو نیکی، خوش اخلاقی اور نیک رفتاری کے بہانہ سے اس جماعت کے ساتھ میل جول نہیں کرنا چاہئے، مگر یہ کہ ایسی قدرت اور ہمت رکھتا ہو کہ ان پر اثر انداز ہو، اگرچہ جانتا ہے کہ انکی رفتار ناپسند ہے، لیکن مطمئن ہے کہ نصیحت اور موعظہ سے انکی ہدایت کر سکتا ہے۔ ایسی

معاشرت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دوسروں کی راہنمائی کے طور پر، جس کو شرع مقدس میں خاص اہمیت دی گئی ہے مطلوب ہوسکتی ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک روایت میں فرماتے ہیں:

"انظروا من تحادثون، فانه ليس من احد ينزل به الموت الا مثل له اصحابه الى الله فان كانوا خيارا فخيارا و ان كانوا شرارا فشرارا..."[1]

"دیکھو کہ کس کے ساتھ بات کر رہے ہو، کیونکہ جب کسی کو موت آتی ہے تو خدا کے حضور اس کے دوست اس کے سامنے مجسم ہوتے ہیں۔ اگر وہ نیک ہیں تو وہ بھی نیک افراد کے زمرہ میں قرار پاتا ہے اگر وہ بُرے ہیں تو وہ بھی بروں کے ساتھ قرار پاتا ہے"

پس اگر سوال کیا جائے کہ اخلاق اسلامی کی نظر میں معاشرت اور میل جول مطلوب ہے یا گوشہ نشینی جواب میں کہا جاتا ہے: ایسا نہیں ہے کہ معاشرت تمام مواقع پر مطلوب ہے اور گوشہ نشینی اور تنہائی نا مطلوب، بلکہ اس شخص سے دوری اور گوشہ نشینی اختیار کرنا بہت بجا اور لازم ہے جو انسان کو گناہ کے انجام دینے پر اکساتا ہے اور اسے صحیح راہ سے منحرف کرتا ہے اور اس کے ایمان کو کمزور کر کے اسے شک وشبہ میں ڈالتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں، معاشرت کو ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کرنا انسان کو اجتماعی مسائل اور خدا کی طرف سے اجتماعی زندگی کے سایہ میں قرار دی گئی نعمتوں سے محروم کرتا ہے اور اسے دوسروں کے متعلق انجام دینے والے فرائض سے روکتا ہے۔ حقیقت میں گوشہ نشینی کا منفی اثر یہ ہے کہ بہت سے واجبات اور تکالیف کو ترک کرنے کا سبب ہے انسان اجتماعی زندگی کے سائے میں حاصل ہونے والے علم ودانش اور کمالات سے محروم ہو جاتا ہے۔ صحیح وسالم اخلاقی طریقہ کار اور آداب اور دوسروں کی مادی اور معنوی مدد جو اس کے لئے دنیا و آخرت میں مفید ہے سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ اگر سب لوگ گوشہ نشینی اختیار کریں اور دوسروں سے معاشرت نہ کریں، تو اسلام کے اجتماعی احکام معطل اور ترک ہو جائیں گے۔ اس لئے گوشہ نشینی اور دوسروں سے معاشرت، دونوں میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر مطلوب اور پسندیدہ ہے۔

خود بخود تنہائی میں بسر کرنا اچھا اور مطلوب نہیں ہے، مگر یہ کہ یہ کام ایک عبادت کو ریا سے بچانے کے لئے ہو اور روزانہ کی مشکلات اور لوگوں سے معاشرت اس میں رکاوٹ بنے، تو اس صورت میں عبادت کو تنہائی اور رات میں انجام دینا چاہئے، کیونکہ شب خدا کی عبادت اور مناجات الٰہی کے لئے مناسب

۱۔ اصول کافی، ج ۴ ص ۴۵

ہے، تاکہ انسان روزمرہ کی فعالیتوں سے فارغ ہوکر اپنے بارے میں فکر کرے اور اپنے دل کو خدا کی مناجات سے جلا بخشے۔ خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿ان ناشئة اليل هي اشد وطأ واقوم قيلا ان لک في النهار سَبحاً طويلا﴾ (مزمل/۶و۷)

''بیشک رات کا اٹھنا (نماز شب کے لئے) نفس کی پامالی کے لئے بہترین ذریعہ اور ذکر کا بہترین وقت ہے۔ یقیناً آپکے لئے دن میں بہت سی مصروفیت ہیں''

انسان کو دن میں تسبیح ہاتھ میں لئے ہوئے ایک گوشے میں بیٹھ کر ذکر میں مشغول نہیں ہونا چاہئے بلکہ اسے لوگوں کے اجتماعات میں داخل ہونا چاہئے اور ان کے ساتھ فرائض انجام دینا چاہئے لوگوں کے اجتماعات میں شرکت کئے بغیر اور لوگوں سے میل جول رکھے بغیر صرف ایک کمرے یا مسجد میں بیٹھ کر تعلیم و تعلم اور وعظ و نصیحت کا فریضہ انجام نہیں دیا جاسکتا ہے اور نہ محتاجوں اور فقرا کی مدد کی جاسکتی ہے اور نہ خیر کی دعوت دی جاسکتی ہے اور نہ انسان دیگر ایسے اجتماعی فرائض کو انجام دے سکتا ہے کہ جو اس پر انجام دینا ضروری ہیں۔ انسان کے سیاسی پہلوؤں میں فرائض کو انجام دینے کی بات ہی نہیں جو اس سے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر دوسرے ممالک میں زندگی گزارنے والے دنیا کے مسلمانوں کی مدد کے طور پر انجام دینے چاہئے۔ دوسری طرف سے انسان کو یہ تصور نہیں کرنا چاہئے کہ چونکہ یہ برکتیں اور نیکیاں اجتماع میں پائی جاتی ہیں، لہذا ہر اجتماع اور ہر ایک سے ہر حالت میں معاشرت مطلوب ہے، یہ بذات خود انسان کی لغزش اور انحراف کا سبب بن جاتا ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا انسان کو الہی مصلحتوں اور معاشرت کے شرعی پہلوؤں کی رعایت کی کوشش کرنی چاہئے، تاکہ اپنے اصلی مقصد یعنی سعادت تک پہنچنے سے پیچھے نہ رہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام صالح نامی اپنے ایک صحابی سے فرماتے ہیں:

''اتبع من يبكيک وهولک ناصح ولا تتبع من يضحکک وهولک غاشّ وستردون على الله جميعا فتعلمون'' [1]

''اس کی پیروی کرو جو تجھے رلائے اور تیری نصحت کرے، اور اس کی پیروی نہ کرو جو تجھے ہنسائے اور دھوکہ دے تم جلدی ہی خدا کے پاس پہنچ جاؤ گے اور اپنے کردار سے آگاہ ہو جاؤ گے۔''

---

[1] اصول کافی، ج ۴، ص ۴۵۱

غافلوں کے اجتماع میں ذکر خدا کی عظمت:

اگر انسان ناخواستہ طور پر غافلوں کے اجتماع میں پھنس جائے، جو نہ خدا کا پاس ولحاظ رکھتے ہیں اور نہ قیامت کا، تو اس سے کیا کرنا چاہئے تا کہ وہ گناہ میں آلودہ نہ ہو۔ اگر وہ اس اجتماع سے باہر نکلنا چاہے تو وہ مناسب ردعمل نہیں دکھائیں گے بلکہ ممکن ہے وہ تصور کریں کہ شخص اپنے آپ کو دوسروں سے منزہ اور برتر جانتا ہے۔ اسلامی آداب کا تقاضا یہ ہے کہ انسان نہ دل میں اپنے کو دوسروں سے برتر تصور کرے اور نہ اس کا عمل ایسا ہونا چاہئے جس سے یہ مطلب اخذ کیا جائے چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جناب ابوذرؓ کو اپنی ایک نصیحت میں جس پر اس سے پہلے بحث ہوئی فرماتے ہیں:

انسان تب تک مکمل فقہ تک نہیں پہنچتا، جب تک لوگوں کو خدا کی عظمت کے سامنے درک وفہم سے فاقد اونٹوں کے مانند نہ دیکھے، اس کے بعد اپنے آپ پر نظر ڈال کر خود کو ان سے پست نہ سمجھے۔

حتی انسان اپنے آپ کو ایک فاسق سے بھی برتر نہ جانے، ممکن ہے وہ فاسق توبہ کر چکا ہوگا اور اس کے گناہ بخش دئے گئے ہوں، جبکہ وہ مومن اپنی عبادت پر ناز کرتے ہوئے غرور وتکبر میں مبتلا ہو گیا ہو جو اس کی ہلاکت کا سبب ہو، لہذا بعض اوقات ایسے شرائط پیش آتے ہیں کہ انسان اپنے آپ کو ایک جماعت سے جدا نہ کرے تا کہ وہ منفی ردعمل نہ دکھائیں اور اس پر بدگمانی نہ کریں۔ اس کے علاوہ بعض اوقات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک سماج اور معاشرے کے اندر انجام دینا چاہئے جو گناہ اور معصیت میں مشغول ہوں، تا کہ ان کو گناہ سے ڈرائے، ان کے درمیان رہنا نہی از منکر کے لئے ایک وسیلہ ہے۔ لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہے، یعنی ممکن ہے ایک جماعت اہل خیر ونیک راستہ پر نہیں ہے اور غافل ہے اور بیہودہ باتیں کرتی ہے لیکن کسی معصیت وحرام کی مرتکب نہیں ہوتی ہے کہ اسے ڈرانا واجب ہو، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسی جماعت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"یا ابا ذر 'الذاکر فی الغافلین کا لمقاتل فی الفارّین"

اے ابوذر: جو غافلوں کے درمیان خدا کو یاد کرے، اس کی مثال اس شخص کے مانند ہے جو جنگ سے فرار کرنے والوں میں جہاد کو جاری رکھے۔

جبکہ غافلوں کے اجتماع میں موجود انسان ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتا ہے، وہ کوشش کرتا

ہے کہ اپنے دل میں خدا کی یاد کو تقویت بخشے تا کہ وہ اس شخص کے جیسا ہو کہ جب دوسرے میدان جنگ سے فرار کرتے ہیں تو وہ تن تنہا دشمن کے مقابلہ میں مبارزہ کرتا ہے اس سے پہلے ذکر کیا گیا کہ خدائے متعال ایسے شخص کے بارے میں اپنے فرشتوں پر فخر و مباہات کرتا ہے جو دوسروں کے جنگ سے بھاگنے کے باوجود تن تنہا جہاد کو جاری رکھتا ہے۔ اسی طرح خدائے متعال اس شخص پر بھی فخر کرتا ہے جو ایک ایسے معاشرے میں ہو جو خدا سے غافل ہیں اور دنیا کے پست امور کی طرف توجہ کرتے ہیں اور ایسے کام انجام دیتے ہیں جو خدا پسند نہیں کرتا لیکن وہ مومن اپنے دل میں خدائے متعال کی طرف توجہ رکھتا ہے، تو خدائے متعال اس پر فخر و مباہات کرتا ہے۔

گفتگو کرنے کے بارے میں انسان کی ذمہ داری:

اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"یا اباذر الجلیس الصالح خیر من الوحدة و الوحدة خیر من جلیس السوء و املاء الخیر خیر من السکوت و السکوت خیر من املاء الشر"

"اے ابوذر!: نیک انسان سے ہم نشینی تنہائی سے بہتر ہے اور تنہائی برے کی ہم نشینی سے بہتر ہے اور نیک گفتگو خاموشی سے بہتر ہے اور خاموشی بُرے کلام سے بہتر ہے"

فطری بات ہے کہ جب انسان دوسروں سے میل جول رکھتا ہے تو گفتگو کرنے کے امکانات فراہم ہوتے ہیں، کیا اس حالت میں بات کرنا بہتر ہے یا خاموشی؟ چنانچہ ہم نے معاشرت اور گوشہ نشینی کے اصولوں کی بحث میں کہا کہ اس کے معیار متفاوت ہیں کبھی معاشرت مطلوب ہے تو کبھی گوشہ نشینی۔ اسی طرح بات کرنے اور خاموشی اختیار کرنے کے بارے میں بھی کوئی ثابت اور معین معیار نہیں ہے، دیکھنا چاہئے کہ بات کس غرض سے کہی جاتی ہے۔ بات کرنا اس وقت مطلوب اور اچھا ہے کہ خدا کیلئے اور دوسروں کے فائدے کے لئے کہی جائے اور خدا کی توجہ اور احکام و مسائل الٰہی بیان کرنے کی غرض سے ہو

بہر صورت نیک بات، وہ ہے جو ہدایت اور دوسروں کو مطلوب کمال کی طرف رجحان پیدا کرنے کی غرض سے کی جائے، خواہ وہ بات معنوی اور اخروی تکامل و ترقی سے براہ راست مربوط ہو یا تکامل معنوی اور سعادت اخروی کے لئے ایک مقدمہ ہو، اگر چہ دنیوی امور سے ہی مربوط ہو۔ بات کرنے والے کا مقصد

یہ ہے کہ مخاطب کو مادی وسائل کے ذریعہ آگاہ کر کے کمال و ترقی تک پہنچنے کے راستہ کو ہموار کرے، کیونکہ انسانیت اور کمال کے راستہ میں مادی وسائل سے استفادہ کرنا ناگزیر ہے۔ لیکن جب اپنی بات سے انسان نہ خود استفادہ کر سکتا ہو اور نہ دوسرے تو اس حالت میں خاموشی بہتر ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ روایتوں میں (املاء) کی تعبیر استعمال ہوئی ہے نہ ((تکلم)) یعنی بات کرنا۔ اس تعبیر میں ایک عنایت ہے: عربی اور فارسی میں ((املاء)) اس معنی میں ہے کہ کوئی کسی چیز کو کہے اور دوسرا اسے لکھے۔ ہر بات جو انسان بولتا ہے وہ املاء نہیں ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ اس لئے نہیں بولتا ہے کہ دوسرے اسے لکھیں، پس پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیوں نہیں یہ فرمایا: خیر کے متعلق گفتگو خاموشی سے بہتر ہے اور خاموشی بُری بات سے بہتر ہے؟ ''املاء'' کی تعبیر استعمال کرنے کے لئے دو نکتے بیان کئے جا سکتے ہیں:

پہلا نکتہ: جب انسان بات کرتا ہے، تو اس کی بات سننے والے کے ذہن میں محفوظ ہو جاتی ہے اور اسکے ذہن کے حافظہ میں واقع ہوتی ہے۔ پس دیکھنا چاہئے کہ کونسی بات سننے والے کے ذہن میں محفوظ ہوتی ہے اور اسکے ذہن پر کونسا اثر ڈالتی ہے، اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ بات کرنا صرف یہ نہیں کہ منہ سے کوئی آواز نکلے، بلکہ اس بات کا کوئی نہ کوئی اثر ہوتا ہے، گویا جب انسان بات کرتا ہے تو دوسرے اسے لکھتے ہیں۔ پس انسان کو ہوشیار رہنا چاہئے کہ وہ دوسروں کی روح پر کونسا اثر ڈالتا ہے اور سننے والے کے ذہن اور دل کی تختی پر کونسی چیز نقش ہوتی ہے، اگر وہ بات نیک ہے تو اس کا بولنا مناسب ہے اور وہ اپنا اچھا اثر ڈالتی ہے، لیکن اگر بات نیک نہیں ہے، تو کیوں انسان اس امر کا سبب بنے کہ نامناسب بات کا اثر دوسروں کے ذہن میں باقی رہے؟

دوسرا نکتہ: جو کچھ انسان کہتا ہے، اس کے لکھنے کے لئے دو فرشتے مامور ہیں، اس لحاظ سے انسان کی بات ((املاء)) کہی جاتی ہے، جیسے خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿ما یلفظ من قول الا لدیه رقیب عتید﴾ (ق/۱۸)

اور کوئی بات منہ سے نہیں نکلتی ہے مگر یہ کہ ایک نگہبان اس کے پاس موجود رہتا ہے۔

ایک اور جگہ پر خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿وان علیکم لحافظین، کراما کاتبین یعلمون ما تفعلون﴾ (انفطار/۱۰-۱۲)

''اور یقیناً تمہارے سروں پر نگہبان مقرر ہیں. جو باعزت لکھنے والے ہیں. وہ تمہارے اعمال کو خوب جانتے ہیں''

مومن کے ساتھ کھانا کھانے کے محاسن اور فاسق کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز:

حدیث کو جاری رکھتے ہوئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''یا اباذر ؛لا تصاحب الا مؤ منا ولا یاکل طعامک الا تقی ولا تا کل طعام الفاسقین''

''اے ابوذر! باایمان افراد کے علاوہ کسی سے ہم نشینی نہ کرو، تمھارا کھانا پرہیز گار کے علاوہ کوئی نہ کھائے اور تم بھی فاسق لوگوں کا کھانا نہ کھاؤ''

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روایت کے اس حصہ میں سب سے پہلے معاشرت کے مسئلہ کو پیش کیا ہے اور اس کے بعد اس سے مربوط بعض مسائل کی طرف اشارہ فرمایا ہے، ان مسائل اور معاشرت کے آثار میں آپس کی گفتگو تھی ،اب دوسروں کے ساتھ غذا کھانے کے مسئلہ کو بیان فرماتے ہیں۔ کیونکہ دوسروں سے معاشرت کے نتیجہ میں بعض اوقات انسان مجبور ہوتا ہے تا کہ اپنے ہم نشینوں کے ساتھ کھانا کھائے۔ آپ فرماتے ہیں کہ مومن کے علاوہ کسی کی ہمنشینی اختیار نہ کرو اور ہر ایک کا کھانا نہ کھاؤ اور ہر کسی کو اپنا مہمان نہ بناؤ اور صرف مومن کے ساتھ کھانا کھاؤ۔

فاسق کی غذا کھانے کا پہلا نتیجہ اس کا احسان مند ہونا ہے اور جب انسان فاسق کا مہمان ہوتا ہے اور اس کا کھانا کھاتا ہے تو وہ فاسق بھی اس سے توقع رکھتا ہے اگر وہ غیر شرعی چیز کی درخواست کرے اور توقع وامید رکھے کہ فلاں حکم پر دستخط کرے، فلاں ناحق اور غیر شرعی سفارش کو انجام دے اور بعض اوقات انسان اس کی خواہشات کو پورا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اس کے برخلاف اگر انسان فاسقوں کے ساتھ معاشرت نہ کرے اور ان کا کھانا نہ کھائے تو ان کا احسان مند نہیں ہوگا اور وہ اس سے کوئی امید بھی نہیں رکھے گا۔ اگر اس سے کسی ناحق چیز کی درخواست بھی کرے تو وہ پوری جرأت کے ساتھ اس سے مسترد کر دے گا، کیونکہ اس درخواست کو منظور کرنا وہ اپنے فرائض کے حدود میں نہیں جانتا ہے۔ دوسری طرف سے یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ فاسق کی غذ

احلال ہے کیوں کہ، وہ تو اسلام کے احکام کا پابند نہیں ہے، معلوم نہیں ہے اس نے مال کہاں سے حاصل کیا ہے، معلوم نہیں وہ اپنے مال میں خمس وزکواۃ کا پابند ہے کہ نہیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اس نے یہ مال رشوت کے ذریعہ حاصل کیا ہے یا کسی اور ذرائع سے۔ انسان مومن پر تو اعتماد کر سکتا ہے کہ اس سے اپنے مال کو حلال راہ سے حاصل کیا ہوگا، لیکن فاسق پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے، ممکن ہے انسان اسکی غذا کھائے اور بعد میں معلوم ہو کہ اس کا مال حلال نہیں تھا۔

مذکورہ مطالب کے علاوہ بعض روایتوں سے یہ بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے کہ مشکوک غذا انسان کی روح پر اثر کرتی ہے اور اس کا طبیعی اثر ہوتا ہے، اگر انسان بے خبری میں بھی مشکوک غذا کو کھائے تو اس غذا کے طبعی اثرات مرتب ہوں گے اس سلسلہ میں بعض بزرگوں سے عجیب وغریب داستانیں نقل ہوئی ہیں: ایک بزرگ سے نقل ہے کہ انھوں نے اپنے بیوی سے کہا تھا: میں احساس کر رہا ہوں کہ مردار حیوان کا گوشت کھا رہا ہوں! ان کی بیوی تعجب کرتی تھی کہ اسکا شوہر یہ کیا باتیں کر رہا ہے لیکن تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ پانی کے مخصوص برتن میں ایک جانور (گزشتہ زمانے میں نجف اشرف میں پانی رکھنے کا ایک مخصوص ظرف ہوتا تھا) پڑا تھا اور وہ اسی نجس پانی کو پیتے تھے! اور وہ بزرگ عالم اس نجس پانی کے طبیعی اثر کو محسوس کر رہے تھے۔

بعض بزرگوں کے حالات میں پایا جاتا تھا کہ وہ ہر ایک کی دعوت کو قبول نہیں کرتے تھے اور ہر جگہ نہیں جاتے تھے اور ہر غذا کو نہیں کھاتے تھے۔ کربلائی کاظم نامی ایک شخص کی ایک معروف داستان ہے کہ وہ خدا کی خاص عنایت سے معجزانہ طور پر حافظ قرآن ہوئے تھے۔ طلبگی کے ابتدائی دنوں میں جب ہم مدرسۂ حجتیہ میں سکونت پذیر تھے، وہ ہمارے مدرسے میں آئے تھے اور طلاب ان سے امتحان لیتے تھے کہ واقعا وہ حافظ قرآن مجید ہیں یا نہیں. وہ ایک عجیب قسم کے حافظ تھے، یہاں تک قرآن مجید کی آیات کو برعکس آخر سے اول تک پڑھتے تھے اور قرآن مجید کے نقطوں کی تعداد کو بھی جانتے تھے۔ وہ ہر ایک کے گھر نہیں جاتے تھے۔ بعض لوگوں کی دعوت کو قبول کرتے تھے اور بعض کی دعوت کو قبول نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے کہا تھا: جب بعض دعوتوں پر جاتا ہوں، اس کے بعد دل میں کدورت اور تاریکی کا احساس کرتا ہوں اور اس دعوت سے پہلے جن انوار کو دیکھتا تھا، اب انھیں نہیں دیکھتا ہوں (یقیناً یہ مذکورہ باتیں ہمارا ادراک ہے، لیکن یہ حقیقت ہے)

مرحوم آیت اللہ حاج آقا مرتضی حائری رضوان اللہ تعالے علیہ نے نقل کیا ہے: میں نے کتاب جواہر کربلائی کاظم کے سامنے رکھی، چونکہ وہ ان پڑھ تھے اس لئے نہیں پڑھ سکتے تھے اور ''الف'' کو ''ب'' سے تشخیص نہیں دے سکتے تھے، لیکن قرآن مجید کی آیتوں پر انگلی رکھ کر کہتے تھے: یہ قرآن مجید کی آیت ہے! آقا حائری نے ان سے کہا تھا: تم تو ان پڑھ ہو، قرآن مجید کی آیت کو کیسے تشخیص دیتے ہو؟ اس نے کہا: یہ آیتیں نورانی ہیں اور میں انھیں نور سے تشخیص دیتا ہوں کہ یہ قرآن مجید کی آیتیں ہیں! جی ہاں ایسی حقیقتیں موجود ہیں، چونکہ ہم درک نہیں کرتے ہیں، ہمیں انکار نہیں کرنا چاہئے۔

ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ایسے لوگوں سے معاشرت کریں، ایسے لوگوں کے ہمراہ کھانا کھائیں، ایسے لوگوں کے مال سے استفادہ کریں اور ایسے افراد کا تحفہ قبول کریں جو اہل ایمان وتقوی ہوں۔ اسی طرح جب خدائے متعال کسی کو کوئی مال عطا کرے، تو اسے کوشش کرنی چاہئے کہ اس نعمت سے بخوا حسن استفادہ کرے۔ اگر اس مال سے کھانا تیار کرے تو ایسے افراد کو کھلا ئیجو با ایمان و با تقوی ہوں تا کہ اس کا عمل خدا کے نزدیک پسندیدہ قرار پائے اس کے علاوہ اس کی دعوت اور اسکا کھانا کھلانا ان دونوں کے درمیان رابطۂ الہی کے برقرار ہونے کا سبب ہو نہ یہ کہ وہ دعوت پست مادی ہوس رانیوں کے لئے ہو:

" یا اباذر: اطعم طعامک من تحبه فی اللّٰه و کل طعام من یحبک فی اللّٰه عزو جل "

''اے ابوذر! اپنی غذا اس کو کھلاؤ کہ جسے خدا کی راہ میں دوست رکھتے ہو تم بھی اس کا کھانا کھاؤ جو تجھے خدا کی راہ میں دوست رکھتا ہے''

انسان کو اپنی غذا اس کو دینی چاہئے اور اسکی غذا کھانی چاہئے جس کے ساتھ دوستی اور مودت کا رابطہ برقرار ہو اور وہ دوستی الہی اصولوں پر مبنی ہو۔ جب کوئی کسی انسان کو غذا دیتا ہے، معلوم ہے کہ وہ اسے دوست رکھتا ہے، لیکن دیکھنا چاہئے کہ اسے خدا کے لئے دوست رکھتا ہے یا دوسرے مقاصد کے لئے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تاکید فرماتے ہیں کہ دعوت پر جانا اور دعوت کرنا خدا کے لئے ہوتا کہ خدا کی نعمتوں سے پورا پورا استفادہ کیا جا سکے اور خدا کے مومن بندوں کے درمیان الہی رابطہ مستحکم ہو۔ کیونکہ ایک دوسرے کو کھانا کھلانے سے مومن بندوں کے درمیان محبت مستحکم اور پائیدار ہوتی ہے اور الہی محبت سے مومن بندے نشو ونما پاتے ہیں، اس کے مقابلہ میں اگر محبت غیر الہی اور شیطانی ہو تو اس کا اثر انسان کے لئے

انحطاط و پستی کا سبب ہے۔

احکام ظاہری حلال و حرام کی سفارش کے علاوہ۔۔۔ جو ضروری فقہی احکام ہیں۔ اولیائے الٰہی بعض دوسرے سنجیدہ اور ظریف مسائل کی رعایت کرنے کی بھی تاکید کرتے تھے۔ کیونکہ صرف واجبات انجام دینا اور محرمات کو ترک کرنا انسان کے تکامل و ترقی اور نشو ونما کے لئے کافی نہیں ہے اور ان فرائض کو انجام دینا جو ابھی ابتدائی قدم ہے (کہ البتہ ہم میں سے بہت سے لوگ اسی ابتدائی مرحلہ میں رک گئے ہیں) مومن کی ہمت بلند ہونی چاہئے اور وہ یہ خیال نہ کرے کہ واجبات و محرمات الٰہی کی رعایت سے انتہائی مقصد تک پہنچ سکتا ہے، بلکہ اسے جاننا چاہئے کہ دوسرا قدم آداب شرعی اور مستحبات کی رعایت کرنا ہے، ان میں سے بعض من جملہ آداب معاشرت، آداب گفتگو، کھانا کھانا اور حسن اخلاق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ دوسرے مستحبات کی رعایت اور مشکوک چیزوں سے پرہیز نیز دوسرے شرعی آداب وغیرہ۔

اس مرحلہ کو طے کرنے اور دوسرا قدم اٹھانے کے بعد، بھی انسان کو تکامل و ترقی تک پہنچنے کے لئے ایک طولانی راستہ طے کرنا ہے۔ اسے اپنی قلبی رجحانات کی تحقیق کرنی چاہئے اور دیکھ لے کہ اس کا دل کس چیز کی طرف مائل ہے۔ اس کے رفتاری مقاصد کیا ہیں؟ حتی اگر وہ ایک نیک یا مستحب کام انجام دیتا ہے، اسے بھی دیکھ لے کہ کیا غرض رکھتا ہے۔ بالآخر دل اور نفس کی تحقیق اور جانچ کرنا انسان کے تکامل و ترقی کے مراحل میں سے ہے، ہم جو ابھی اپنے ظاہری اعمال کی تصحیح و تطہیر نہیں کر چکے ہیں، ابھی اس مرحلہ تک نہیں پہنچے ہیں۔ اس کا انتہائی اور آخری مرحلہ یہ ہے کہ اولیائے الٰہی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی توجہ صرف خدائے متعال پر متمرکز ہو، ان کے دل خدا کی محبت کے مظہر بن جائیں، ان کی امیدیں صرف خدا سے ہو، اور اسی سے ڈریں نہ غیر خدا سے۔ وہ ایسی زندگی گزاریں کہ گویا اس دنیا میں خدا کے علاوہ کسی سے سروکار نہیں رکھتے ہیں جبکہ اسی حالت میں سب کے ساتھ معاشرت کرتے ہیں اور دوسروں سے گفتگو کرتے ہیں اور اجتماعی زندگی بسر کرتے ہیں، انکے دل خدا سے اس طرح لو لگائے ہیں کہ گویا خدا کے سوا کسی سے کوئی سروکار نہیں رکھتے ہیں۔

حدیث معراج میں، جو اور قرب الٰہی میں پہنچے ہوئے مومن کی روح کی زبانی خدائے متعال فرماتا ہے:

"ثم یقال لها: کیف ترکت الدنیا؟ فتقول: الهی وعزتک وجلالک لا

علم لی بالدنیا .انا منذ خلقتنی خائفه منک" [1]

اس مومن کی روح سے کہا جاتا ہے ،تم نے کیسے دنیا کو ترک کیا ؟ وہ جواب میں کہتی ہے: خداوندا! تیری عزت وجلال کی قسم کہ میں دنیا کے بارے میں علم وآگاہی نہیں رکھتی ہوں جس دن تو نے مجھے پیدا کیا اس دن سے تیرے مقام سے خائف ہوں۔

وہ مومن دنیا کی کوئی خبر نہیں رکھتا ہے، کیونکہ اس کی توجہ صرف خدا کی طرف ہے اور جو امور خدا سے مربوط نہ ہوں وہ ان سے بے خبر ہے۔ دنیا کے گوشہ وکنار میں خدائے متعال ایسے بندے رکھتا ہے۔ اگر ہم بھی ہمت کریں، اپنے ارادہ کو مستحکم کریں، اپنے نفس کی اصلاح کریں اور اپنے آپ کو طاہر قرار دیں، تو ہم بھی اس مقام تک پہنچ سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے انجام دیئے گئے کاموں پر مغرور نہیں ہونا چاہئے اور ظاہر کو نہیں دیکھنا چاہئے کوشش کرنا چاہئے اپنی روح اور دل پر نگاہ رکھیں۔

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۷، ص ۲۷

اکتیسواں درس:

زبان، وسیلہ ہدایت یا وسیلہ گمراہی

- ترقی اور بالیدگی کے لئے زبان اور دیگر عضاء و جوارح سے استفادہ کرنا
- زبان سے بہرہ مند ہونے اور اس کی آفات سے بچنے کا طریقہ
- مذاق اور مزاح میں مشغول کرنے والی اور افراطی باتوں سے پرہیز
- ہدایت کے طریقوں کا یکساں نہ ہونا
- بولنے اور دیگر رفتار کے ردعمل اور نتائج پر ایک نظر
- محققانہ باتوں کو نقل کرنے کی ضرورت اور افواہوں سے پرہیز

زبان، وسیلہ ہدایت یا وسیلہ گمراہی

"یا اَباذَرٍّ؛ ان اللّٰہ عزّوجل عند لسان کل قائل فلیتّق اللّٰہ امرء ولیعلم ما یقول. یا اباذر؛ اترک فضول الکلام و حسبک من الکلام ما تبلغ به حاجتک یا اباذر؛ کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما یسمع. یا اباذر؛ ما من شی ء احق بطول السجن من اللسان"

رسول خدا صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث شریف کا یہ حصہ زبان اور اس کے کنٹرول کے بارے میں ہے۔ البتہ گزشتہ درس میں بھی زبان کے کنٹرول کی ضرورت کے بارے میں تھوڑی سی بحث ہوئی اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ بیانات اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان اپنی گفتگو میں بیشتر احتیاط کرے۔ اس امر کے پیش نظر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری احادیث کی کتابوں میں بات کرنے کے طریقہ اور بولنے کے آداب اور اس کی آفتوں کی بارے میں کئی باب مخصوص کئے گئے ہیں۔ اس سے پہلے ذکر کیا گیا کہ کونسی بات کرنا ضروری ہے اور کونسی بات ناپسندیدہ ہے کہ جس کو بولنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ چونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصیحتوں کے سلسلہ میں ہم اس مرحلہ تک پہنچے ہیں، اس لئے ہم اسی مناسبت سے اس موضوع کی وضاحت کرتے ہیں۔ پہلے اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ زبان، خدا کی نعمتوں میں سے ایک قیمتی نعمت ہے، اس کے بعد زبان کی بعض آفتوں اور نقصانات کی طرف اشارہ کریں گے۔

ترقی و بالیدگی کے لئے زبان اور دیگر اعضاء و جوارح سے استفادہ:

خدائے متعال نے جن تمام نعمتوں کو انسان کے وجود میں قرار دیا ہے خواہ وہ اس کے ظاہری اعضاء و جوارح ہوں، جیسے: آنکھ، کان، ہاتھ پاؤں وغیرہ خواہ اس کے داخلی اعضاء ہوں خواہ انسان کی غیر مادی خصوصیات کہ جو روحانی پہلو رکھتے ہیں، جیسے تفکر و تخیل کی صلاحیت کہ جو دماغ سے مربوط ہے اور انسان کے روحی جذبات، مختصر جو کچھ انسان کے بدن اور روح سے مربوط ہے یہ تمام کی تمام چیزیں انسان کے تکامل و ترقی کے لئے وسائل ہیں نہ کہ مقصد اور نہ ہی ان کی چاہت اور ان کا ماحصل انسان کا آخری مقصد ہے، چیزوں کو ہمیں اس نگاہ سے دیکھنا چاہئے جو انسان کے کمال اور اخروی ثواب کا سبب بنے، اس طرح دوسرے تمام اعضاء، من جملہ زبان۔

انسان کو ایسی بات کرنی چاہئے جو اس کی بلندی اور خدائے متعال کی خوشنودی کا سبب بنے۔ خدا کی تمام نعمتوں کو، خدا کا تقرب حاصل کرنے اور کمال تک پہنچنے کا ذریعہ قرار دینا چاہئے اور یہ نعمتیں تماشا نہیں ہیں کہ انسان ہر نیت و غرض سے ان کا استعمال کرے۔ انھیں زبان جیسی نعمت سے حاصل ہونے والی خواہشات اور نتائج کو اپنا اصلی مقصد نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ اس کا اصلی مقصد ان چیزوں سے بلند تر ہے اور انسان کا بات کرنا اصل مقصد نہیں ہے۔ اس لحاظ سے زبان کو خیر کمال کی راہ میں استعمال کرنا چاہئے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"زکاۃ اللسان النصح للمسلمین و التیقظ للغافلین و کثرۃ التسبیح و الذکر..." [1]

"زبان کی زکوۃ مسلمانوں کو نصیحت اور غافلوں کو بیدار کرنا اور فراوان تسبیح و ذکر ہے۔"

بات کرنا وسیلہ ہے اور چونکہ خدائے متعال نے انسان کی خلقت کا مقصد کمال اور اپنا تقرب قرار دیا ہے، لہذا اس نیک مقصد تک پہنچنے کے لئے زبان سے فائدہ اٹھانا چاہئے، نہ کہ اس کے ذریعہ اپنے لئے بدبختی کے وسائل فراہم کئے جائیں۔ سوچ اور سمجھ کے بات کرنی چاہئے اور بیہودہ باتوں سے وانسان کی اجتماعی و معنوی منزلت کے انحطاط کا باعث ہے پرہیز کرنا چاہئے، کیونکہ انسان کا بولنا اس کی شخصیت و

۱۔ بحار الانوار، ج ۹۶، ص ۷

منزلت کا مظہر ہے۔ پس اگر انسان نے اپنی بات کے نتائج کے بارے میں سوچے سمجھے بغیر بات کی تو اس نے اپنی بے مایہ ماہیت کو فاش کر دیا، چنانچہ حضرت امام علیؑ فرماتے ہیں:

''تکلّموا تعرفوا فانّ المرء مخبوء تحت لسانه'' [۱]

''بات کرو تا کہ پہچانے جاؤ، بیشک انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوا ہے۔''

دوسری جگہ پر بیہودہ بات کرنے اور اس کے نتیجہ کے بارے میں فکر نہ کرنے کو منافقوں کے صفات جانتے ہوئے فرماتے ہیں:

''و انّ المنافق یتکلّم بما علی لسانه لایدری ماذاله و ما ذا علیه'' [۲]

''منافق کی زبان پر جو آتا ہے اسے بولتا ہے اور وہ نہیں جانتا ہے کہ اس کے نفع میں کیا ہے اور نقصان میں کیا ہے۔''

اس کے برعکس مومن:

''اذا اراد ان یتکلم بکلام تدبره فی نفسه، فان کان خیراً ابداه و ان کان شرّاً واراه'' [۳]

''جب چاہتا ہے کوئی بات بولے اس کے بارے میں صحیح طور پر غور و فکر کرتا ہے، اگر اچھی ہے تو اسے اظہار کرتا ہے اور اگر بری ہے تو اسے چھپاتا ہے۔''

اگر چہ ہم اجمالاً جانتے ہیں کہ زبان کے وسیلہ سے خدائے متعال کے تقرب کی کوشش کرنی چاہئے ،لیکن بات اس تقرب کی کیفیت میں ہے اس کی وضاحت میں یہ کہنا بہتر ہے: ہماری بات اور گفتگو کبھی عبادت کے زمرے میں ہے، کہ انسان نماز اور عبادت کے دوران کچھ کلمات زبان پر جاری کرتا ہے، ہمارا یہ بولنا واجب اور مستحب عبادتوں میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن دوسرے مواقع پر، زبان ایک وسیلہ ہے اپنے مافی الضمیر کو سمجھانے کے لئے اس کے ذریعہ سے انسان اپنی نیت اور ارادے سے دوسروں کو آگاہ کرتا ہے، اس سلسلہ میں بھی انسان کو الٰہی مقصد ملحوظ رکھنا چاہئے کہ کونسی بات خدا کو پسند اور اس کا تقرب حاصل کرنے کا

۱۔ نہج البلاغہ (ترجمہ شہیدی) کلمات قصار ۳۹۲، ص ۴۳۲

۲۔ نہج البلاغہ (ترجمہ شہیدی) خطبہ ۱۷۶، ص ۱۸۴

۳۔ نہج البلاغہ (ترجمہ شہیدی) خطبہ ۱۷۶، ص ۱۸۴

سبب ہے اور اس میں اخروی ثواب ہیں، اس صورت میں انسان اپنی زبان کو حرکت دینے اور بات کرنے سے رضائے الٰہی تک پہنچتا ہے۔

بعض مواقع پر، بات کے مطلوب اور پسندیدہ ہونے کے سلسلے میں شرعی راہ سے معلومات حاصل کرنی چاہئے ورنہ انسان مطلوب کے حدود اور مشخصات کو نہیں پا سکتا ہے۔

بہت سے مواقع پر انسان اپنی عقل کے ذریعہ بات کے نیک ہونے کو تشخیص دیتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بات پسندیدہ ہے، واجب یا مستحب ہے۔ اس صورت میں اگر انسان قصد قربت رکھتا ہو، تو اس کی بات عبادت شمار ہوگی، مثال کے طور پر وہ اپنی بات کے ذریعہ کسی مظلوم سے ظلم کو دور کرنا چاہتا ہے یا اپنی بات سے کسی مظلوم کا حق ظالم سے واپس لینا چاہتا ہے۔ یہ موارد "مستقلات عقلیہ" میں سے ہیں کہ عقل ان کو درک کرنے میں آزاد ہے اور اسے حکم شرعی کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہمیں کوئی شرعی حکم بھی نہیں ملتا، تب بھی ہم اس بات کو درک کرتے ہیں کہ مظلوم سے ظلم کو دور کرنا واجب ہے اور اگر ہم اپنی بات سے کسی مظلوم سے ظلم کو دور کر سکیں، تو وہ بات واجب اور رضائے الٰہی کا سبب ہے، اگر وہ بات واجب کی حد تک بھی نہ پہنچے تو کم از کم اس کے نیک ہونے کو ہم درک کرتے ہیں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ یتیم کے سر پر دستِ شفقت پھیرنا اور اسے خوش کرنا اور اپنی بات سے مصیبت سے دوچار ہوئے مومن کے غم واندوہ کو دور کرنا، پسندیدہ ہے۔ ایسی صورت میں اگر انسان قصد قربت کرے تو اس کا عمل عبادت ہے۔ ان مواقع کے مقابلہ میں بعض جگہوں پر ہم فعل کے جائز ہونے کے حدود تشخیص نہیں دے سکتے ہیں، ایسے مواقع پر شرعی احکام کے مانند، شارع کو ہمارے لئے حکم بیان کرنا چاہئے۔ اگر چہ ہماری عقل بعض کلی چیزوں کو درک کرتی ہے، لیکن ان کی خصوصیات شرائط اور حدود کو شارع مقدس معین کرتا ہے، کہ وہ منابع فقہی سے استنباط کے بعد ہمارے اختیار میں قرار دے، لہذا ایسے مواقع پر حکم شرع کا انتظار کرنا چاہئے۔ بعض مسائل ایسے ہیں جن کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ خدا کو پسند نہیں ہیں، ان کا انجام دینا صحیح نہیں ہے، اور اگر انسان انھیں انجام دے تو اس نے گناہ کیا ہے، اسے سزا ملے گی، چونکہ وہ خدا کو پسند نہیں ہیں اس لئے قصد قربت سے وہ عبادت نہیں بن سکتے۔ ایسے موارد کے بارے میں انسان کی عقل مستقل طور پر تشخیص دیتی ہے اور شارع مقدس کی طرف سے حکم حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر زبان کے ذریعہ دوسروں کو تکلیف دینا، جھوٹ، تہمت اور دو مومنوں کے درمیان

زبان کے ذریعہ اختلاف پیدا کرنا یہ سب امور عقلی کی بنا پر قابل مذمت ہیں۔

مذکورہ باتوں سے ہم نے نتیجہ حاصل کیا کہ بعض باتوں کے پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہونے کو ہم واضح طور پر درک کرتے ہیں اور بعض دوسرے موارد ایسے ہیں کہ جہاں پر پسندیدہ یا ناپسندیدہ باتوں کے حدود و شرائط کو ہمارے لئے شارع مقدس بیان کرتا ہے۔

زبان سے بہرہ مند ہونے اور اس کے آفات سے بچنے کا طریقہ:

یاد رکھنا چاہئے کہ زبان، خدائے متعال کی سب سے بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت اور اس کی لطیف ترین مخلوقات ہے۔ اگر چہ اس کا حجم چھوٹا ہے لیکن اس کی اطاعت و جرم بڑے ہیں۔ چونکہ کفر و ایمان زبان کے ذریعہ سے ظاہر ہوتے ہیں اور یہ دونوں انسان کی اطاعت و عصیان کی سرحد ہیں۔ اس لئے زبان پر کنٹرول کرنے کے لئے کوشش کی جانی چاہئے، کیونکہ زبان کو کھلی ڈھیل دینا انسان کے لئے فروان نقصانات کا سبب بن جاتا ہے۔ انسان زبان کے شر سے تب محفوظ رہتا ہے۔ جب اسے شرعی احکام اور قوانین کے ذریعہ کنٹرول کرے اور اسے دنیا و آخرت کے فائدہ کے علاوہ کسی اور چیز کے لئے آزاد نہ رکھے اور جہاں پر بات کرنے سے دنیوی و اخروی خطرات کے ایجاد ہونے کا خوف ہو، اسے کنٹرول کرے۔ انسان کو فریب دینے اور غافل کرنے کے لئے شیطان کا سب سے بڑا وسیلہ انسان کی زبان ہے۔ اسی لئے روایتوں میں خاموش رہنے کی تاکید کی گئی ہے، چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"من صمت نجا" [1]

"جس نے خاموشی اختیار کی اس نے نجات پائی"

ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

"لا یستقیم ایمان عبدٍ حتی یستقیم قلبه و لا یستقم قلبه حتی یستقیم لسانه" [2]

"کسی بندے کا ایمان تب تک مستحکم نہیں ہوتا جب تک اس کا دل مستحکم نہ ہو جائے اور اس کا

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۷، ص ۹۰، ح ۲،

۲۔ بحار الانوار، ج ۷۱، ص ۲۸۶

دل اس وقت تک مستحکم نہیں ہوتا ہے جب تک نہ اس کی زبان استوار نہ ہوجائے''

اوحدی شاعر نے خاموشی کی توصیف میں یہ شعر کہے ہیں:

غنچہ کو در کشد زبان دوسہ روز　　هم بزاید گلی جهان افروز

گر چہ پرسند کم جواب دهد　　به نفس بوی مشک ناب دهد

راه مردان به خود فروشی نیست　　در جهان بهتر از خموشی نیست

(غنچہ دو تین دن کے لئے اپنی زبان بند رکھتا ہے تا کہ عالم کو منور کرنے والے پھول اور خوشبو کو جنم دے جب اس سے پوچھتے ہیں تو کم جواب دیتا ہے بلکہ نفس کو خاص مشک کی خوشبو دیتا ہے خودفروشی مردوں کا شیوہ ہے دنیا میں خاموشی سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے)

زبان کو جھوٹ، تہمت اور غیبت وغیرہ جیسی آفتوں سے محفوظ رکھنا چاہئے اور نیک اور شائستہ گفتگو کرنی چاہئے تا کہ مخاطب یا کسی دوسرے کو کوئی اذیت نہ پہنچے۔ پس ایسے موقع پر گفتگو کرنی چاہئے جہاں اس کی ضرورت ہو اور اس سے کوئی مقصد نکلے، ممکن ہے کبھی انسان ایسی بات کہے جس کے نتیجہ میں اس کے لئے بہشت میں ایک محل تعمیر کیا جائے۔ پس جو اپنی بات سے خزانے حاصل کرسکتا ہے اگر اس کے بجائے خس وخاشاک حاصل کرے تو اس نے بہت بڑا نقصان کیا ہے۔ یہ مثال اس کے لئے ہے جو ذکر الٰہی ترک کر کے مباح کاموں میں لگ جائے جس کا اس کے لئے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر چہ اس نے گناہ نہیں کیا ہے، لیکن اس لحاظ سے کہ اس نے ایک بڑے فائدے کو جو ذکر خدا کے ذریعہ اسے حاصل ہو رہا تھا کھو دیا ہے اس لئے وہ خسارے میں ہے چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام اولیائے الٰہی کی توصیف میں فرماتے ہیں:

''انَّ اولیاء اللّٰہ سکتوا فکان سکوتهم ذکراً و نظروا فکان نظرهم عبرةً و نطقوا فکان نطقهم حکمةً و مشوا فکان مشیهم بین الناس برکة'' [1]

''اولیائے الٰہی نے خاموشی اختیار کی ان کی خاموشی ذکر تھی، ان کا نگاہ اٹھا کر دیکھا ان کا دیکھنا عبرت تھا اور انھوں نے گفتگو کی ان کی گفتگو حکمت تھی۔ وہ لوگوں کے درمیان پیادہ روی کی اور ان کا چلنا برکت تھا''

۱۔ اصول کافی، ج ۳، ص ۳۳۳، ح ۲۵

انسان کی سعادت وشقاوت اس سے بڑھ کر معاشرے کی تعمیر یا ایک سماج کے اقدار کی بیخ کنی کرنے میں زبان کا جو نقش رہا ہے اس کے پیش نظر خدائے متعال اور اولیائے الٰہی کی طرف سے اس کے متعلق بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے کہ انسان اپنی زبان کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرے۔ اور اجتماعی واسلامی آداب نیز رفتار سے آگاہی حاصل کرے، اولیائے دین کی رفتار وکردار کے طریقوں کو اپنے لئے نمونہ قرار دے اپنی زبان کو خودسازی اور معاشرے کی اصلاح کے لئے استعمال کرے۔ اس لحاظ سے زبان کو کنٹرول کرنے اور اس سے صحیح استفادہ کرنے کا بہترین طریقہ انبیاء واولیای الٰہی کی بات کرنے کے آداب کو مدنظر رکھنا ہے۔

معاشرت کے درمیان انبیاء لوگوں کو بات کرنے کے بہترین آداب کے طریقہ پیش کئے کہ نمونے کے طور پر ان کفار کے ساتھ انجام شدہ استدلالی مناظر پیش کئے جاسکتے ہیں، جو قرآن مجید میں بھی نقل ہوئے ہیں، اس طرح جو باتیں وہ مومنوں کے ساتھ کرتے تھے اور جو مختصر سیرت ان کی نقل ہوئی ہے۔ اگر ہم پیغمبروں کی کفار اور ہٹ دھرم افراد کے ساتھ کی گئی گفتگو کی جانچ پڑتال کریں تو ہم اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ملے گی کہ جو کفار کے لئے خوشی کا باعث نہ ہو اور بے ادبی اور بی احترامی پر مبنی ہو۔ جی ہاں، خدا کے پیغمبر کفار کی طرف سے اس قدر مخالفت، گالم گلوچ، طعنہ زنی، بے احترامی اور مذاق اڑانے کے باوجود جواب ہیں بہترین بیان اور خیر خواہانہ نصیحتوں کے علاوہ کچھ نہیں کہتے تھے اور ان سے جدا ہوتے وقت سلام کئے بغیر جدا نہیں ہوتے تھے:

﴿وَ عبادُ الرَّحمٰن الّذین یَمشُونَ عَلی الارضِ هوناً وَ اِذا خاطَبَهُم الجاهلونَ قالوا سلاماً﴾ (فرقان/۶۳)

''اور اللہ کے بندے وہی ہیں جو زمین پر آہستہ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے خطاب کرتے ہیں، تو وہ انھیں سلام کرتے ہیں''

جی ہاں، مشرکین جو خدا کے پیغمبروں کے خلاف اس قدر زخم زبان، تہمتیں اور بے احترامیاں روا رکھنے کے باوجود قرآن مجید کے نقل کے مطابق کسی ایک پیغمبر نے بھی ان اذیت وآزاروں کے مقابلہ میں سختی یا بدزبانی سے جواب نہیں دیا ہے، بلکہ اس کے برعکس نیک گفتار، دل کو موہ لینے والی منطق اور نیک اخلاق سے پیش آتے تھے۔ جی ہاں یہ بزرگوار ایسی تعلیم وتربیت گاہ کے پروردہ تھے کہ جنھیں بہترین کلام

کرنے اور زیباترین ادب کی تعلیم دی جاتی تھی اور انہیں تعلیمات الٰہی میں سے ایک دستور ہے کہ جسے خدا نے متعال حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کو دیتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿اذهبا الى فرعون انّه طغى فقولا له قولاً لّينا لعلّه يتذكّرا و يخشى﴾

(طٰہٰ/۴۳و۴۴)

''تم دونوں فرعون کی طرف جاؤ کہ وہ سرکش ہوگیا ہے۔اس سے نرمی سے بات کرو شاید وہ نصیحت قبول کرے یا خوف خدا پیدا ہو''

انبیاء کی بات کرنے کے آداب میں یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو لوگوں میں سے جانتے تھے اور ان کے ہر گروہ اور طبقہ سے ان کے فہم کے مطابق گفتگو کرتے تھے اور یہ حقیقت ان کی مختلف لوگوں کے ساتھ کی گئی گفتگو ــــ جو تاریخ اور روایتوں میں نقل ہوئی ہے ــــ سے بخوبی معلوم ہوتا ہے. چنانچہ شیعہ اور سنی دونوں کی طرف سے روایت کی گئی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''انّا معاشر الانبياء امرنا ان نكلّمَ الناس على قدر عقولهم'' [1]

''ہم پیغمبروں کا بنیادی کام یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ ان کی عقل کے مطابق بات کریں'' [2]

مزاح میں مشغول کرنے والی اور افراطی باتوں سے پرہیز:

آفات زبان اور زیان آور بحث ومباحثہ کے سلسلہ میں بہت سی روایتیں نقل ہوئی ہیں اور ہمارے فقہانے فقہ میں حرام باتوں کے بارے میں کئی باب مخصوص کئے ہیں، جیسے جھوٹ، غیبت، مذاق اڑانا، مومن کو اذیت کرنا، ایسی بیہودہ اور مشغول کرنے والی باتیں، جن کو ''لھوالحدیث'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ انسان کو خدا سے دور کرتی ہے اور انسانی طبیعت کو معنویت اور خدا کے نور سے خالی کردیتی ہے۔(اخلاق کی کتابوں میں اس پر مفصل بحث کی گئی ہے) بعض مواقع پر کسی عمل کے مذموم اور حرام ہونا انسان کے لئے واضح ہوتا ہے، اس لئے انسان اس گفتگو یا عمل کے حکم کے بارے میں شک نہیں کرتا۔لیکن بعض مواقع پر کچھ باتیں بظاہر مباح لگتی ہیں حتی انسان تصور کرتا ہے کہ یہ پسندیدہ ہیں لیکن حقیقت میں وہ باتیں ناشائستہ اور حرام ہوتی ہیں۔ایسے مواقع پر شیطان ہمیں دھوکہ دیتا ہے اور ہم مشکوک باتوں کو آگاہانہ یا نیم آگاہانہ طور پر زبان

۱۔ بحارالانوار، ج۱، ص۸۵/، ح۷/

۲۔المیزان (دارالکتب الاسلامیہ، طبع سوم) ج۶/، ص۳۱۵/۔۳۱۷

پر لاکر گناہ میں آلودہ ہوتے ہیں، اگر چہ کبھی انسان کافی توجہ نہ کرنے کی وجہ سے خود اپنے کو دھوکہ دیتا ہے۔ اگر انسان مشکوک مواقع کے بارے میں صحیح فکر اور دقت کرے، تو حقیقت کو درک کرسکتا ہے، لیکن چونکہ وہ خواہشات سے مغلوب عمل کرتا ہے، اپنی کام میں دقت نہیں کرتا ہے اور اپنے عمل کو انجام دینے کے لئے ایک نہ ایک بہانہ تلاش کرتا ہے۔ مثلاً ایک شوخ مزاج انسان جب ایک مجلس کو سرگرم کرنا چاہتا ہے اور اپنی باتوں سے دوسروں کہ شاد و مسرور کرنا چاہتا ہے۔ تو بہانہ جوئی کرتا ہے کہ مثلاً آج شب عید ہے اور میں دوسروں کو شاد کرنا چاہتا ہوں۔ اسی بہانہ سے اوقات کو ضائع کرنے والی ایسی باتیں کرتا ہے کہ ان کا کوئی معنوی حتی دنیوی فائدہ نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اپنی عمر ضائع کرنے، دوسروں کو تکلیف پہنچانے اور برے اثرات کے علاوہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہوتا ہے۔

کلمہ ''لھو'' کا معنی ہر وہ چیز ہے جو انسان کو ضروری اور اہم کاموں سے روکے اور ''لھوالحدیث'' مشغول کرنے والی بات ہے کہ انسان کو حق سے منصرف کرکے اپنی طرف مشغول کرلے، مثال کے طور پر خرافاتی حکایتیں اور وہ داستانیں جو انسان کو فسق و فجور کی طرف کھینچتی ہیں۔ اس طرح مبتذل ترانے اور موسیقی وغیرہ ''لھوالحدیث'' کے مصداق ہیں۔

تفسیر مجمع البیان میں آیا ہے کہ یہ آیت نصر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ چونکہ وہ ایک تاجر تھا ایران سفر کرتا تھا اور وہاں پر ایرانی اخبار اور افسانوں کو ان کے منابع سے حاصل کرتا تھا او رپھر انھیں قریش سے بیان کرتا تھا اور ان سے کہتا تھا: محمد تمھیں عاد و ثمود کی داستانیں سناتے ہیں اور میں رستم، اسفندیار اور کسری کی داستانیں سناتا ہوں، لوگ بھی اس کی داستانوں کو کان لگا کے سنتے تھے اور قرآن مجید کی آیتوں کو نہیں سنتے تھے۔ [1]

اس امر کی طرف دھیان رکھنا چاہئے کہ ایک بے چین اور افسردہ مومن بھائی کو خوش کرنے کے لئے صرف یہ وسیلہ نہیں ہے کہ اسے بیہودہ اور ہنسانے والی باتوں سے سرگرم کیا جائے، بلکہ افسردہ اور غمگین فرد کے مزاج کے مطابق خدا کی رحمتوں سے متعلق کسی روایت کو منتخب کرکے اسے بیان کیا جاسکتا ہے تا کہ اس کے اندر خوشی اور مسرت پیدا ہو اور اس کی بے چینی اور افسردگی دور ہو جائے، نہ یہ کہ ہم اسے بعض خرافات اور بیہودہ باتوں سے خوش کریں. اس بنا پر دوسروں کے دلوں میں مسرت پیدا کرنے اور انھیں خوش کرنے کا کوئی

۱۔ المیزان (دار الکتب الاسلامیہ، طبع سوم) ج ۱۶، ص ۲۲۰، ۲۲۳

منکر و مخالف نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی مکرر طور پر دینی کتابوں میں تاکید کی گئی ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ انسان کا بیان اور اس کی بات میں مثبت مادی و معنوی نتیجہ ہونا چاہئے تاکہ نہ دوسروں کا وقت ضائع ہو اور نہ زبان جیسی نعمت الٰہی کا پست اور بے اہمیت طریقہ سے استعمال کیا جائے۔

امام محمد باقر علیہ السلام نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"من سرّ مومناً فقد سرّنی و من سرّنی فقد سرّ اللّٰہ" [1]

"جو شخص کسی مومن کو خوش و مسرور کرے، اس نے مجھے خوش کیا ہے اور جس نے مجھے خوش کیا اس نے بیشک خدائے متعال کو خوش کیا ہے۔"

ایک اور روایت میں حضرت امام سجاد علیہ السلام نقل فرماتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"انّ احبّ الاعمال الی اللّٰہ عزّ و جل ادخال السرور علی المومنین" [2]

"خدائے متعال کے پاس سب سے بہترین عمل مومنوں میں مسرّت و شادمانی پیدا کرنا ہے۔"

کبھی مومن امور دنیوی یا اخروی کی وجہ سے غمگین ہوتا ہے، غم و حزن اس کی فعالیت اور سرگرمی میں روکاوٹ کا باعث ہوتے ہیں اور اس کی توانائیوں کو مفلوج کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اس بنا پر وہ اپنی قابلیتوں اور توانائیوں سے استفادہ نہیں کرسکتا ہے، کیونکہ وہ نشاط و آرام سے محروم ہوتا ہے. اگر وہ مطالعہ کرے تو کسی چیز کو حفظ نہیں کرسکتا ہے یا نماز کے وقت حضور قلب نہیں رکھتا ہے۔ بہر صورت کسی کام میں اسے دلچسپی نہیں ہوتی اور کسی کام کو انجام دینے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھاتا اس صورت میں اسے اس غم واندوہ سے نکالنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اس کو خوش کرنا چاہئے تاکہ وہ عبادت اور دیگر سرگرمیوں کو انجام دے سکے۔ اُسے خوش کرنا ایک پسندیدہ عمل ہے اور اگر خدائے متعال کے لئے ہو تو عبادت بھی ہے.

کبھی انسان خود اپنے آپ کو دھوکہ دیتا ہے اور ایک مومن کو خوش کرنے کے لئے، بے فائدہ کہانیاں نقل کرنے اور لغو و بیہودہ باتیں، مذاق اور مضحکہ خیز کلمات کا سہارا لیتا ہے، گویا راستے کو انہی پر منحصر

۱۔ وصول کافی، ج ۲، ص ۱۷۱

۲۔

جانتا ہے۔اس سے غافل کہ اس سلسلے میں کوئی منطقی، موزوں اور قابل قدر بات کہہ سکے اور دلیل واستدلال سے اس مومن کو اس کے غم وآلام سے نجات دلا سکے۔اس مومن کی رہنمائی کی جاسکتی ہے اور اسے یاددہانی کرائی جاسکتی ہے کہ یہ اضطراب اور غم واندوہ تمھارے ذہن کو نقصان پہنچانے اور بیکار کرنے کے علاوہ تمھارے درد کا علاج نہیں کر سکتے ہیں اس سے تجھے کوئی فائدہ نہیں مل سکتا ہے۔

شوخ طبیعت اور لطیفہ باز انسان جب دیکھتا ہے کہ اس کا دوست مضطرب ورنجیدہ ہے تو وہ لطیفے اور ہنسانے والی باتیں کہنا شروع کرتا ہے تا کہ اپنے دوست کو خوش کر سکے، البتہ وہ اس سے غافل ہے کہ مزاح بہت کم پسندیدہ ہے اور اس میں افراط قابل مذمت ہے۔مزاح میں افراط اس امر کا سبب ہے کہ انسان متواتر اپنے اور دوسروں کو کھلونا بنالیتا ہے اور اس میں افراط کے علاوہ حد سے زیادہ ہنسی کا موجب ہوتا ہے اور حد سے زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے اور انسان کی عظمت اور وقار کو زائل کرتا ہے۔اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی مزاح وشوخی کم کرتے تھے، چنانچہ فرمایا ہے:

''انّی لاامزح و لا اقول الّا حقاً'' [1]

''میں بھی مزاح کرتا ہوں، لیکن مزاح (مذاق) میں سچی باتیں کہتا ہوں''

یا زیادہ ہنسنے سے پرہیز کرنے کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

''واللّٰہ لو تعلمون ما اعلم لضحکتم قلیلاً و لبکیتم کثیراً'' [2]

''خدا کی قسم! اگر تم لوگ اس چیز سے آگاہ ہوتے جس سے میں آگاہ ہوں تو زیادہ روتے اور کم ہنستے۔''

مذکورہ مطالب کے پیش نظر کوشش کرنی چاہئے کہ مذاق ومسخرہ حد سے تجاوز نہ کرے۔کیونکہ کبھی مذاق ومسخرہ میں اعتدال سے تجاوز کرنا ـــــ ادخال السرور کے بہانے ـــــ اذیت، آزار، گستاخی، تہمت وغیبت کا مرتکب جاتا ہے۔اس بہانہ سے کہ مومن کو خوش کرنا مستحب ہے، انسان شیطان کے دھوکے میں آتا ہے اور غیبت جیسے گناہ کبیرہ میں آلودہ ہوتا ہے، یعنی اپنے دوست کو بھی مجبور کرتا ہے کہ وہ غیبت کو سن کر گناہ میں آلودہ ہو جائے۔

۱۔ بحار الانوار، ج ۱۶، ص ۲۹۸

۲۔ بحار الانوار، ج ۵۸/، ص ۱۰۷/

بہر حال، بہت سے مواقع پر شیطان انسان کو دھوکہ دیتا ہے وہ اپنے خیال میں نیک عمل انجام دیتا ہے، لیکن درحقیقت وہ مرتکب گناہ ہوتا ہے۔ اب اگر انسان صحیح طور پر غور وفکر کرے تو اسے اپنی غلطی کا علم ہوگا، اگر چہ بعض اوقات انسان اس قدر آگاہی وبصیرت نہیں رکھتا ہے، حتی اگر غور بھی کرتا ہے تب بھی اپنی غلطی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا؛ اس صورت میں دوسروں کی ذمہ داری ہے کہ اسے آگاہ کریں کہ یہ ناپسندیدہ عمل ہے اور ایک مطلوب فعل جیسے دوسروں کو خوش کرنا دوسرے انداز میں کہ جو صحیح اور مطلوب طریقہ ہے انجام دیا جاسکتا ہے۔

ہدایت کے طریقوں کا یکساں نہ ہونا:

افراد کو آگاہ کرنے اور انھیں ناپسندیدہ اعمال کے بارے میں متوجہ کرانے کے لئے یکساں طریقہ سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جو لوگ واجبات اور محرمات سے خاص آگاہی نہیں رکھتے ہیں اور دینی منابع، جیسے قرآن مجید اور روایات تک جن کی رسائی نہیں ہے، انھیں جھوٹ، چغل خوری اور غیبت کے دنیوی نقصانات سے آگاہ کرنا چاہئے، یعنی غیبت کرنا مردار کا گوشت کھانے کے برابر ہے وغیرہ لیکن جو ہمیشہ کتاب وسنت سے سروکار رکھتے ہیں ان کے لئے مناسب نہیں ہے کہ ہم انھیں ان گناہوں کے نقصانات کی طرف اشارہ کریں، کیونکہ وہ خود آگاہ ہیں بلکہ انھیں ان موارد سے آگاہ کرنا چاہئے جن کے بارے میں وہ غفلت سے دوچار ہوئے ہیں۔ انھیں اس بات سے آگاہ کرنا چاہئے، کہ اگر چہ بعض باتیں صحیح ہیں اور نیک نیتی سے کہی جاتی ہیں لیکن درست نہیں ہے اور اس میں خدا کی مرضی نہیں ہے اور ایسی باتیں سبب بنتی ہیں کہ انسان نقصان اٹھائے۔

جی ہاں، بعض مواقع پر کام ایک دوسرے کے دورخی ہوتے ہیں اور یہ انسان کی نیت اور غرض پر منحصر ہے کہ انھیں پسندیدہ ھویت بخشے یا ناپسندیدہ کبھی اگر کسی کام کو نیک نیتی سے انجام دیا جائے تو وہ کام نیک محسوب ہوتا ہے اور اگر اسی کام کو بُری نیت سے انجام دیا جائے تو وہ کام بُرا اور پست ہوتا ہے، کیوں کہ اسلام میں ہر کام کی اہمیت انجام دینے والے کی نیت پر منحصر ہے۔ ممکن ہے انسان لاعلمی اور غفلت کے عالم میں ایک بُرے کام کو نیک نیتی سے انجام دے اور ممکن ہے اس کی نیت کی بنا پر اسے ثواب ملے، اگر اسے ثواب نہ بھی ملے تو کم از کم معذور ہے۔ لیکن اگر ایک اچھے کام کو بُری نیت سے انجام دے تو اس کا کوئی ثواب نہیں ہے، اور وہ عبادت بھی نہیں ہے، ممکن ہے سزا بھی ہو، کیونکہ اس کا عمل حسن اخلاق پر مبنی نہیں تھا۔ بولنے

اور بات کرنے میں ایسی مثالیں زیادہ پائی جاسکتی ہیں۔

کبھی کسی شخص کی بارے میں بات چھڑ جاتی ہے اور انسان اس کی نیکیوں کو بیان کرنا چاہتا ہے اور کبھی اس کی خوشنودی کے لئے، چاپلوسی، مبالغہ اور بے جا تعریفیں کرتا ہے۔ اگر اس سے پوچھا جاتا ہے: تم کیوں اس قدر چاپلوسی، مبالغہ آرائی اور تملق سے کام لیتے ہو؟ تو وہ جواب میں کہتا ہے: میں دوسروں کا ذکر خیر کر کے تواضع اور انکساری دکھانا چاہتا ہوں! البتہ انسان کی عالی اور ممتاز خصوصیات میں سے ہے کہ دوسروں کی خوبیوں کو شمار کرے اور کوشش کرے دوسروں کی نیکیوں کا ذکر کرے، روایتوں میں بھی اس نکتہ کی طرف تاکید کی گئی ہے۔ ایسا کر کے ہم ایک مومن کو عزت بخشتے ہیں اور اس کی آبرو بڑھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی نیک صفات کے حوالے سے تشویق کرتے ہیں۔ لیکن دیکھنا چاہئے کہ ہم کس نیت سے دوسروں کی ستائش کرتے ہیں؟ کیا ہم مومن کو عزت بخشنے کے لئے، خدا کی مرضی حاصل کرنے کے لئے اور معاشرت میں نیکی کی ترویج کے لئے دوسروں کی ستائش کرتے ہیں؟ یا اس کے سامنے یا اس کی عدم موجودگی میں اس کی ستائش کرتے ہیں کہ وہ ہم سے خوش ہو اور ہم اس سے ناجائز فائدہ اٹھائیں! اور وہ بھی ہماری اسی طرح تعریف کرے حقیقت میں یہاں پر ہماری مثال: ''من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو'' کے مانند ہے۔ میں اپنے دوست کی عدم موجودگی میں اس کی تعریف کرتا ہوں اور وہ بھی میری عدم موجودگی میں میری ستائش کرتا ہے۔ یہ ایسے مواقع میں جہاں پر شیطان پڑھے لکھے لوگوں کو بھی اپنے شیشے میں اتار لیتا ہے۔

عوام اور عام افراد کو جو حکم الٰہی سے آگاہ نہیں ہیں شیطان جھوٹ، غیبت اور معروف گناہوں کو انجام دینے پر اکساتا ہے، لیکن علما کو دوسرے طریقوں سے دھوکہ دیتا ہے۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر کسی کی عدم موجودگی میں اس کی تعریف کریں تا کہ وہ بھی مقابلہ میں ان کی ستائش کرے، تو انہوں نے اچھا کام انجام دیا ہے، حقیقت میں یہ اچھا کام نہیں ہے بلکہ یہ ان کے نفس کے مکر و فریب کا نتیجہ ہے۔

لہذا انسان کو ہوشیار رہنا چاہئے، اگر وہ کسی کام کو انجام دینا چاہتا ہے، تو اسے پہلے اپنے دل میں پوری طرح غور و خوض کرنا چاہئے کہ اس کام کو انجام دینے کے لئے کونسا مقصد مدنظر رکھتا ہے۔ ہر کام کو انجام دینے سے پہلے اس پر تھوڑا غور کرے اس کے بعد اس کام کو انجام دے، ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی زبان کو آزاد رکھے اور کسی قسم کی فکر کئے بغیر بات کہے، کیونکہ احمق کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی زبان کو کنٹرول نہیں کرتا ہے اور جو چاہتا ہے کہہ دیتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام گفتگو کرنے کے حوالے سے عاقل اور احمق کے درمیان فرق کے بارے میں فرماتے ہیں:

''لسان العاقل وراء قلبه و قلب الاحمق وراء لسانه'' [1]

''عقلمند کی زبان اس کے دل کے پیچھے ہے اور بیوقوف کا دل اس کی زبان کے پیچھے ہے۔''

مرحوم سید رضی رحمۃ اللہ علیہ اس عظیم المرتب بیان کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

''یہ تعجب آور بات ہے کہ امام علیہ السلام کا مقصود یہ ہے کہ عقلمند شخص، اپنی زبان کو کھلی ڈھیل نہیں دیتا بلکہ اپنے دل میں غور وخوض کرنے کے بعد اظہار کرتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں بیوقوف کی زبان پر جو آتا ہے اسے بولتا ہے اور غور وفکر کرنے سے پہلے بات کہنے کو ترجیح دیتا ہے۔ پس گویا عقلمند کی زبان اس کے دل کے تابع ہے اور بیوقوف کا دل اس کی زبان کے تابع ہے''

پس ہمیں بات کرتے وقت غور وخوض کرنا چاہئے کہ ہم کس لئے بات کرنا چاہتے ہیں اور ہماری غرض کیا ہے تاکہ خدا کی عنایت سے زبان کی آفتوں اور نفسانی خواہشات اور شیطانی حیلوں سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔ لیکن اگر ہم غور وفکر نہ کریں اور اپنی کام میں ضروری دقت نہ کریں اور تامل کئے بغیر بے حساب بات کریں، تو ہم آہستہ آہستہ شیطان کے پھندے میں پھنس جائیں گے اور غیر شعوری طور پر اس کے مکر وفریب میں گرفتار ہوں گے۔ البتہ یہ لغزشیں اور یہ انحرافات جو غفلت، جلد بازی، امور کی انجام دہی میں غور وفکر نہ کرنے اور صحیح محرک (مقاصد) کے نہ ہونے کی وجہ سے ہیں اور یہ چیز صرف بات کرنے اور گفتگو کی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ انسان اپنے بدن کے دوسرے تمام اعضا اور توانائیوں سے استفادہ کرنے میں بھی اپنی لغزشوں اور انحرافات سے دوچار ہوتا ہے۔ البتہ اس وقت ہماری بحث کا موضوع ان آفتوں کے بارے میں ہے جو انسان کو زبان کی وجہ سے پیش آتی ہیں اور دوسرے خطرات کی نسبت بیشتر نقصان پہنچانے والی ہے۔ ہمیں بات کرتے وقت خدا کی مرضی اور اس کی خوشنودی کو حاصل کرنے کی فکر میں ہونا چاہئے نہ یہ کہ اپنی نیت اور ناپاک عزائم کو عملی جامہ پہنانے کی فکر میں رہیں۔

پہلے مرحلہ میں ہماری گفتگو خدا کے نزدیک پسندیدہ اور مطلوب ہونی چاہئے اور دوسرے درجہ میں اس بات کے کہنے میں ہمارے اغراض اور مقاصد صحیح ہونے چاہئے، یعنی فعل بھی نیک ہونا چاہئے اور فاعل

۱۔ نہج البلاغہ (ترجمہ شہیدی، کلمات قصار ۴۰، ص ۳۶۷)

بھی۔ بات کا قالب بھی صحیح ہو اور اس بات کا ہدف اور مقصد بھی، بات کی صورت بھی صحیح ہو اور اس کا مفہوم و معنی بھی۔

حضرت امام خمینی رضوان اللہ تعالی علیہ اور دوسرے بزرگ بارہا فرمایا کرتے تھے: شیطان ہرگز عالم کو شراب نوشی اور زشت اعمال جو اس کی شایان شان نہیں ہے انجام دینے پر مجبور نہیں کرتا کیونکہ اس صورت میں عالم کے لئے آبرو باقی نہیں رہے گی اور وہ ہرگز ایسا خطرہ اور نقصان اٹھانے کے لئے آمادہ نہیں ہوگا۔ لیکن شیطان علما اور اہل علم کو ایسی لغزشوں اور انحرافات سے دوچار کرتا ہے کہ جو حقیقت میں شراب نوشی سے بھی بدتر ہیں۔ وہ عالم کو ایسا کام انجام دینے پر مجبور کرتا ہے کہ ظاہر میں وہ کام برا نہیں لگتا ہے اور کوئی اسے مذمت نہیں کرتا ہے کہ تم نے کیوں ایسا کیا، لیکن اس کام کا ضرر اور گناہ بہت ہوتا ہے اور ممکن ہے خود انسان بھی متوجہ نہ ہو کہ وہ کیسے اتنے بڑے گناہ کا مرتکب ہوگیا اور کس قدر اپنی حیثیت سے گر گیا ہے! اس لئے بہتر ہے ہم مزید غور فکر سے کام لیں اور اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پانے کی کوشش کریں اور اپنی زبان کو لگام دیں، تا کہ ہر بات کو زبان پر جاری نہ کریں اور سوچ سمجھ کر گفتگو کریں۔ جب تک بات کرنے کہ ضرورت نہ ہو زبان نہ کھولیں، چنانچہ سعدی کہتا ہے:

ندهد مرد هوشمند جواب مگر آنگه کزاو سوال کنند

''عقلمند تب تک بات نہیں کرتا جب تک اس سے سوال نہ کیا جائے''

بولنے اور دیگر رفتار کے ردعمل اور نتائج پر ایک نظر:

ہمیں توجہ رکھنا چاہئے کہ جب ہم گفتگو کرنے میں محو ہوتے ہیں، تو پھر زبان پر قابو پانا مشکل ہے، اس لئے زبان کھولنے سے پہلے جو ہم کہنا چاہتے ہیں اس کے بارے میں غور کرلیں تا کہ حد سے تجاوز نہ کریں۔ ہم اگر اپنی زبان پر قابو نہیں رکھتے تو جب ایک مجلس میں ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی ہیں، لوگ دوسروں کی باتیں سن کر ہنستے ہیں اور بات کرنے والے کی ہمت افزائی کرتے ہیں، تو انسان کے لئے ایسے ماحول میں خاموش بیٹھنا مشکل ہے۔ لہٰذا باتوں باتوں میں انسان مذاق و مسخرہ کرنے پر اتر تا ہے اور ہر طریقہ سے، حتی غیبت کے ذریعہ دوسروں کو ہنسانے کی کوشش کرتا ہے۔ حقیقت میں ایسی حالت میں زبان کنٹرول میں نہیں رہتی ہے بلکہ سرکش گھوڑے کے مانند ہے، کہ جو لگام توڑ کر بھاگ جاتا ہے تو اسے پھر سے قابو میں

لانا دشوار ہوتا ہے۔ لہذا انسان کو ابتدا سے ہی اپنی زبان کو کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے اور جو بھی مطالب یا گفتگو پیش کرنا چاہے پہلے اس کے بارے میں فکر کرے کہ وہ بات مناسب وسزاوار ہے یا نہیں اس کے علاوہ گفتگو میں حد سے تجاوز کرنے اور افراط سے بھی پرہیز کرے۔

انبیاء اور اولیائے الٰہی انسانوں کی تربیت کی غرض سے انھیں یاددہانی کراتے تھے کہ ان کے کام کا ایک حساب وکتاب ہے، ایسا نہیں ہے کہ وہ اپنی گفتار وکردار میں جوابدہ نہیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک گھنٹہ گفتگو کرنے کے بعد ہم فکر کریں کہ کہیں کوئی اتفاق تو پیش نہیں آیا! بلکہ ہر کلمہ جو انسان کے منہ سے نکلتا ہے وہ ثبت ہوتا ہے اور اس کے بارے میں اس سے سوال ہوتا ہے کہ تم نے کیوں ایسا کہا اور کیوں فلاں نیت سے کہا۔ اس مطلب کو مدنظر رکھنا انسان کے لئے سبب بنتا ہے کہ انسان کسی حد تک اپنی آپ کو کنٹرول کرے و رنہ انسان کا نفس قوی ہے اور آسانی کے ساتھ قابو میں نہیں آتا ہے۔

مومن کے نفس کو کنٹرول کرنے کی من جملہ راہوں میں سے ایک راہ یہ بھی ہے کہ وہ اس امر کی طرف متوجہ رہے کہ خدائے متعال حاضر وناظر ہے اور وہ اس کی باتوں کو سنتا ہے اور قیامت کے دن اس کے بارے میں سوال کرے گا، اس نکتہ کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے کلامِ مبارک میں یوں بیان فرمایا ہے:

"یا اباذر؛ ان اللّٰہ عزّو جلّ عند لسان کلّ قائلٍ فلیتّقِ اللّٰہ امرء و لیعلم ما یقول"

"اے ابوذر! خدائے متعال ہر بولنے والے کی زبان کے پاس ہے، پس بات کرنے والے کو خدا سے ڈرنا چاہئے اور وہ جان لے کہ کیا کہتا ہے"

اگر انسان اس حقیقت کو مدنظر رکھے کہ اس کی گفتگو کے دوران خدائے متعال حاضر وناظر ہے اور اس کی کوئی بات خدا سے پوشیدہ نہیں ہے، تو وہ احتیاط سے کام لے گا ہر بات کو زبان پر جاری نہیں کرے گا۔ اس کے علاوہ تقوائے الٰہی اس امر کا سبب بن جاتا ہے کہ انسان خدائے متعال سے ڈرے، نتیجہ کے طور پر اپنی رفتار کو کنٹرول کرتا ہے اور اس کی اجازت نہیں دیتا کہ سوچے سمجھے بغیر کوئی بات اس کی زبان پر جاری ہو جائے۔

اس طرح اولیائے الٰہی کی تربیت کے طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے پیروکار

افراد کو نفسانی خواہشات پر کنٹرول کی تاکید کرتے ہوئے انھیں فضول اور بے جا باتوں سے پرہیز کرنے کی تشویق کرتے ہیں اور احتیاج اور ضرورت کے مطابق بات کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ زبان پر کم کلمات جاری کریں۔ اگر دو جملوں سے کسی کو کوئی مطلب سمجھا سکتے ہیں تو تیسرا جملہ کہنے سے پرہیز کریں۔ یہاں تک اگر کسی واجب حکم، جیسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں تو کوشش کریں کہ اپنے مقصود کی حد میں بات کریں اور اضافی بات کرنے سے پرہیز کریں۔ اس سلسلہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''یا اباذر؛ اترک فضول الکلام وحسبک من الکلام ماتبلغ به حاجتک''

''اے ابوذر! زیادہ بات کرنے سے پرہیز کرو، اتنی ہی بات کرو جس سے تمھاری حاجت پوری ہو جائے''

بعض اوقات جب انسان کسی مجلس میں باتیں کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے، تو غیر شعوری طور پر فضول اور بیہودہ باتیں اس کی زبان پر جاری ہوتی ہیں نہ ان سے اس کا کوئی دنیوی فائدہ ہوتا ہے اور نہ اخروی۔ اپنی زندگی کے ناقابل تلافی سرمایہ کو فضول باتوں میں ضائع کرتا ہے! لہٰذا مناسب ہے انسان اندازہ کے مطابق بات کرے اور فضول اور اضافی باتوں سے پرہیز کرے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

''طوبی لمن طاب خلقه وطهرت سجیّته وصلحت سریرته وحسنت علانیته علانیه وانفق الفضل من ماله وامسک الفضل من کلامه'' [1]

''کتنے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کے اخلاق اچھے، صفات پاکیزہ، باطن شائستہ اور ان کا ظاہر نیک ہے اور وہ اپنے اضافی مال کو انفاق کرتے ہیں اور زیادہ باتیں نہیں کرتے۔''

ایک بزرگ کا کہنا ہے: مومن وہ ہے، جو بات کرتے وقت پہلے فکر کرتا ہے، لہٰذا اگر بات کرنے میں مصلحت ہے تو بات کرتا ہے ورنہ بات نہیں کرتا ہے۔ لیکن فاسق و فاجر، بات کرتے وقت اپنی زبان کو مکمل طور پر کھلی ڈھیل دیتا ہے۔

۱۔ بحار الانوار، ج ۶۹/ ص ۴۰۰

جی ہاں، زبان کے نقصانات اور آفتوں کے بارے میں بہت سی باتیں قابل بیان ہیں من جملہ زبان انسان کی شخصیت اور اجتماعی حیثیت کو خراب کرتی ہے آخرت میں اس کی پشیمانی کا سبب بنتی ہے، کیونکہ جب انسان قابو سے باہر ہو کر باتیں کرتا ہے، خواستہ یا نخواستہ وقت ضائع کرنے کے علاوہ زیادہ اور بیہودہ باتیں کرنے کی وجہ سے گناہوں میں بھی مبتلا ہوتا ہے، لہذا اس طرح اپنے قیمتی وقت کے سرمایہ کو بھی ضائع کرتا ہے اور خدا کے غضب وخشم سے بھی دوچار ہوتا ہے۔

محققانہ باتوں کو نقل کرنے کی ضرورت اور افواہوں سے پرہیز:

حدیث کو جاری رکھتے ہوئے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"یا اباذر؛ کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل مایسمع"

"اے ابوذر! جھوٹا ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ انسان جو سنے اسے نقل کرے"

زبان کی آفتوں میں سے ایک آفت یہ ہے کہ انسان جو کچھ سنے اس کی حقیقت کی بارے میں تحقیق وتفحص کے بغیر بلا فاصلہ اسے دوسروں کے لئے نقل کرے۔ اگر چہ وہ جھوٹ بولنے کا مقصد نہیں رکھتا ہے، اور جو کچھ سنا ہے اسے کسی قسم کی کمی بیشی کے بغیر نقل کرتا ہے، لیکن اس کی بات جھوٹ شمار ہوتی ہے، کیونکہ جو کچھ وہ کہتا ہے اس کے سچ ہونے کے بارے میں اطمینان نہیں رکھتا ہے۔ اس لئے انسان کو جھوٹ بُری اور ناپسند باتوں سے بھی پرہیز کرنا چاہئے اور ساتھ ہی ایسی باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے جن کی سچائی کی بارے میں یقین نہیں رکھتا ہے، بلکہ ہمیں ہر بات کی بارے میں پہلے تحقیق کرنی چاہئے اگر اس کی سچائی کی بارے میں اطمینان پیدا ہوا تو اسے نقل کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں شاعر کہتا ہے:

تا نیک ندانی کہ سخن عین صوابست　　باید کہ بہ گفتن دھن ازھم نگشائی

گر راست سخن گویی و در بند بمانی　　بہ زانکہ دروغت دھد از بندرھائی

"جب تک تجھے یقین نہ ہو جائے کہ تیری بات صحیح ہے، اسے کہنے کے لئے اپنا منہ نہ کھولو۔ اگر سچ کہہ کر تجھے قید وبند میں ڈالا جائے تو وہ اس سے بہتر ہے کہ جھوٹ تجھے قید سے رہائی بخشے"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اگر انسان جو کچھ سنتا ہے اسے نقل کرے تو وہ جھوٹ بولنے والوں میں شمار ہوتا ہے، لیکن کبھی ہم بھی جو کچھ سنتے ہیں اس پر دقت نہیں کرتے ہیں بلکہ ممکن ہے اس

میں کمی یا بیشی کر کے دوسروں کے لئے نقل کرتے ہیں جبکہ ہمیں بات کرتے وقت دقت کرنی چاہئے اور ہر چیز کو نقل نہیں کرنا چاہے، جب انسان جو کچھ سنتا ہے اسے نقل نہیں کرنا چاہئے پس چہ جائے کہ، کوئی بات نقل کرنے میں مبالغہ کرے اور دوسرے کی بات کو گھڑ کر پیش کرے!!۔

جھوٹ کے بارے میں جو تصور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش کیا ہے، اس کے پیش نظر یقیناً افواہ جھوٹ کا واضح مظہر ہے۔ افواہ شیطان کے کارآمد حربوں میں سے ایک حربہ تھا کہ جب بھی اولیائے دین، بشر کی ہدایت اور سالم معاشرے کے تشکیل کی لئے قدم اٹھاتے تھے، تو خدا اور دین کے دشمن تمام شیطانی وسائل کے ساتھ من جملہ جھوٹ، تہمت اور افواہ سے ان کا مقابلہ کرتے تھے تا کہ الٰہی قائدین کے گرد جمع ہوئے لوگوں کو متفرق کر کے اپنے شیطانی مقاصد تک پہنچ جائیں۔

تاریخی تحقیق سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ صدر اسلام میں بھی دشمن، مسلمانوں کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت اور دین کی راہ میں پائداری سے روکنے کے لئے ان کے دلوں میں خوف و وحشت ایجاد کرتے تھے اور اس سلسلہ میں افواہ کا سہارا لیتے تھے، چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿واذاجاء هم أمر من الأمن أو الخوف اذاعوابه ولو ردّوه الى الرّسول والى أولى الامر منهم لعلمه الّذين يستنبطونه منهم...﴾ (نساء/۸۳)

''اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی خبر آتی ہے تو اسے فوراً نشر کر دیتے ہیں (تا کہ دشمن آگاہ ہو جائیں) حالانکہ اگر رسول اور صاحبان امر کی طرف پلٹا دیتے تو ان سے استفادہ کرنے والی حقیقت حال کا علم ہوتا...''

یہ آیہ مبارکہ بدر صغری کی داستان بیان کرتی ہے کہ جنگ احد کی روداد کے بعد مسلمانوں کی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی نافرمانی کے نتیجہ میں شکست سے روبرو ہونے کے بعد آخر میں اللہ تعالی نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کی تا کہ وہ اپنے مختصر سپاہیوں کے ذریعہ دشمنوں پر فتح پا سکیں اور اسلام کو قطعی نابودی سے نجات دیں، منافقین دشمن کی طاقت کو بیان کرنے اور جنگ احد میں ان کی فتح یابی کا ذکر کر کے مسلمانوں اور پیغمبرؐ کے اصحاب کے دلوں میں شک وشبہ پیدا کرنا چاہتے تھے اور اپنی افواہ سے مومنوں کو گمراہ کرنا چاہتے تھے، ان کا مقصد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

اس آیہ مبارکہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خوف وامن کے بارے میں جو کچھ منافقین کو پہنچتا تھا وہ

اسے نشر کر دیتے تھے، سے مراد وہ افواہ ہیں جو کفار اور ان کے چیلوں کے ذریعہ ایجاد کی جاتی تھیں تا کہ مومنین میں نفاق اور اختلاف پیدا کریں، ضعیف الایمان مومنین بھی انھیں نشر کرتے تھے اور اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ ان خبروں کا پھیلنا مسلمانوں میں سستی اور عدم استحکام ایجاد ہونے کا سبب بنے گا۔

پیغمبر اسلام ﷺ جنگ احد میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد ہمیشہ لوگوں کو کفار سے جہاد کرنے کی دعوت دیتے تھے اور کچھ لوگ اس کوشش میں تھے کہ مومنوں کو جہاد میں شرکت کرنے اور پیغمبر خدا ﷺ کی مدد کرنے سے لوگوں کو روکیں اور اس غرض سے افواہ پھیلاتے تھے کہ مشرکین تمھارے خلاف لشکر جمع کر رہے ہیں، خدائے متعال مسلمانوں کو اطمینان دلاتا ہے کہ یہ ڈرانا اور افواہ شیطان کی طرف سے ہے اور یہ شیطان کی باتیں ہیں جو اس کے دوستوں کے منہ سے باہر آتی ہیں، اور اس کے بعد مومنوں پر واجب کرتا ہے کہ ان افواہ پھیلانے والوں سے نہ ڈرو اگر خدائے متعال پر ایمان رکھتے ہو تو صرف اسی سے ڈرو ۔[1]

آج کل کی دنیا میں، خاص کر انقلابی ممالک بالاخص ہمارے ملک (ایران) میں، جو اکیلے ہی دنیا کی تمام بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں کھڑا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اپنی آزادی کو تحفظ بخشے اور اپنے تمام وجود سے اسلامی اور انقلابی قدروں کی حفاظت کرے، افواہ پھیلانے والوں کا رواج ہے ۔ منافقین او رانقلاب دشمن عناصر، لوگوں کے آپسی اتحاد میں رخنہ اندازی کرتے ہیں اور انھیں انقلاب کے مقاصد اور نتائج سے میں بدظن کرنے کے لئے، افواہ ہیں گڑھتے ہیں اور کر انھیں نشر کرتے ہیں۔

افسوس ہے کہ جب ناآگاہ لوگ ان افواہوں کو سنتے ہیں تو مخالف اغراض کے لئے ان افواہوں کو دست بہ دست پھیلاتے ہیں۔ شاید وہ ان افواہوں کو نقل کرنے میں کوئی برا مقصد نہ رکھتے ہوں کوئی شخص کسی دوست کے پاس بیٹھ کر مختلف گفتگو کی بعد ایک افواہ کو بھی نقل کر دے۔

انسان اگر افواہ کو نقل کرنے میں کوئی بُرا ارادہ حتی خودنمائی کا مقصد بھی نہ رکھتا ہو، پھر بھی اسے سوچنا چاہئے کہ اس خبر کو نقل کرنے میں کوئی فائدہ بھی ہے یا نہیں، اس کے علاوہ اسے سوچنا چاہئے کہ کیا اس افواہ کی کوئی بنیاد بھی تھی یا نہیں؟ شاید جس نے اس افواہ کو میرے لئے نقل کیا ہے، اس نے غلطی کی ہوگی یا کسی دوسرے نے وہ جھوٹی خبر اسے پہنچادی ہوگی لہذا ہمیں خبر کو پیش کرنے سے پہلے اس کی حقیقت کے بارے میں تحقیق کرنا چاہے اور ہمیں دقت اور غور وخوض کے بعد خبر کو نقل کرنا چاہئے تا کہ اگر کوئی ہماری بات کو سنے ہم

۱۔ المیزان (دار الکتب الاسلامیہ طبع سوم) ج ۵/ص ۱۸/

پر اطمینان کرے اور کہے کہ فلاں کی بات میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں پایا جاتا ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے وہ۔ صحیح ہے اور وہ سوچے سمجھے بغیر بات نہیں کرتا ہے۔

انسان کو صحیح اور سوچ سمجھ کر بات کرنی چاہئے تا کہ لوگ اس پر اعتماد کریں اور وہ لوگوں کے اعتماد کے سائے میں معاشرے میں بلند مقام حاصل کرے۔ اگر کوئی معاشرے میں بلند مقام پانے کی فکر میں ہے اسے کوشش کرنا چاہئے کہ اس مقام کو معاشرہ میں اعتماد کے ذریعہ حاصل کرے اور اپنی ایسی حیثیت بنائے کہ لوگ اس کی رفتار و گفتار پر پوری طرح اعتماد کریں اور کہیں: فلاں بیہودہ باتیں نہیں کرتا ہے اس کی باتیں سچی اور صحیح ہوتی ہیں، ایسی حیثیت دنیوی اور اخروی لحاظ سے فائدہ مند ہے، کیونکہ دنیوی پہلو سے صداقت اور راست گوئی کے عنوان سے مشخص ہے اور اخروی لحاظ سے بھی خدا کی خوشنودی اور بہشت کے بلند درجات کی صورت میں اس کا نفع ہوگا۔

لہٰذا ہمیں کسی بھی بہانہ سے سنی سنائی باتوں کو نقل نہیں کرنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ غور و خوض نہ کرنے کی وجہ سے ہم جو کچھ سنتے ہیں اس میں کچھ تصرف بھی کرتے ہیں یا ان میں کمی کرتے ہیں یا اس میں کچھ بڑھا دیتے ہیں، ہر صحیح اور درست مطلب کو بیان کرنا بھی صحیح نہیں ہے، ممکن ہے ایک سچی بات کو نقل کرنے میں مصلحت نہ ہو، ممکن ہے اس سے کسی کی آبرو خطرہ میں پڑ جائے جو حرام اور ناپسندیدہ ہے اور خدائے متعال کے غضب کا سبب بنے، اس کے علاوہ بعض افواہیں ضعیف النفس اور سست ایمان افراد حکومت اور حکومت کے اراکین سے بدظن کرنے کا سبب واقع ہو لہٰذا بعض خبروں کو نقل کرتے وقت مصلحتوں کو مدنظر رکھنا چاہئے۔ ہمیں فکر کرنی چاہئے کہ اس کا نقل کرنا کوئی فائدہ رکھتا ہے یا نہیں؟ مخاطب خبر کو برداشت اور قبول کرنے کی ظرفیت رکھتا ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ کیا وہ خبر کو دوسروں کے لئے نقل کرنے میں احتیاط اور دقت سے کام لیتا ہے یا ہر جگہ ضرورت اور بے ضرورت نقل کرتا ہے اور خبر کو کسی قسم کی کمی و بیشی کے ساتھ نقل کرتا ہے یا اسے کئی گنا بڑھا کر ہر ایک کے لئے نقل کرتا ہے اور اس خبر کے نشر ہونے کے نتیجہ میں حکومت کمزور ہوگی، لوگوں کا حکومت کے بارے میں اعتماد ضعیف ہو جائے گا۔

حدیث کو جاری رکھتے ہوئے پیغمبر اسلامؐ فرماتے ہیں:

''یا اباذر؛ ما من شی ءٍ احقُّ بطول السجن من اللّسان''

''اے ابوذر! قید کی جانے والی اشیاء میں زبان سے زیادہ سزاوار کوئی چیز نہیں ہے''

یہ بیان پیغمبر خداؐ کی طرف سے ایک دستور تربیت ہے جو انسان کو بات کرنے میں زیادہ سے زیادہ دقّت اور احتیاط کرنے اور زبان کو قید میں رکھنے کی تاکید کرتا ہے تاکہ وہ بے جا بات نہ کرے۔ بعض علمائے اخلاق فرماتے تھے: خدائے متعال نے زبان کے سامنے دانتوں کو اور دانتوں کے سامنے ہونٹوں کو قرار دیا ہے، حقیقت میں ہونٹوں اور دانتوں کو خلق کرنا ایک اشارہ ہے کہ ہم ان کے پیچھے اپنی زبان کو قید کئے رہیں۔

بتیسواں درس

خدا کی عظمت وجلالت کے نمونے

- پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار کی ناشناختہ عظمت ومنزلت
- خدائے متعال کی اطاعت اور پیغمبرؐ وائمہ اطہارؑ کی اطاعت کے درمیان رابطہ
- مومنوں کی عزت واحترام کی ضرورت

الف۔ سن رسیدہ مسلمان کا احترام

ب۔ قرآن مجید کو حمل کرنے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں کا احترام

ج۔ باانصاف اور عادل حاکم کا احترام

- معاشرے میں حکومت اور قانون کی ضرورت
- صالح اور شائستہ حاکم کے شرائط
- ولی فقیہ، صالح اور شائستہ ترین فرد

خدا کی عظمت وجلالت کے نمونے

"یا اباذر؛ من اجلال اللّٰہ تعالی اکرام ذی الشیبة المسلم و اکرام حملة القرآن العاملین و اکرام السلطان المقسط. یا اباذر؛ لایزال العبد یزداد من اللّٰہ بعدا ما ساء خلقه"

''اے ابوذر! خدائے متعال کی عظمت وجلالت، سن رسیدہ مسلمانوں، قرآن حمل کرنے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں نیز انصاف پسند عادل وحاکم کے احترام میں مضمر ہے۔''

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیث کے اس حصہ میں یاددہانی فرماتے ہیں کہ خدا کے بعض بندوں کا احترام کرنا خدا کا احترام کرنے کے برابر ہے۔ دانا لوگ اپنی عقل کے ذوق کے مطابق کچھ مقاصد کے پیش نظر بسا اوقات ایک چیز کو دوسری چیز کی منزلت پر یا ایک کام کو دوسرے کام کی منزلت پر یا کسی ایک شخص کو ایک دوسرے شخص کی منزلت کے طور پر بیان کرتے ہیں چنانچہ عام گفتگو کے دوران بھی کہا جاتا ہے: یہ کام اس کام کے مانند ہے یہ شخص اس شخص کے جیسا ہے۔ یہ تشبیہ اس شباہت اور مشترک صورت کی بنیاد پر ہوتی ہے جو ''مشبہ'' اور ''مشبہ بہ'' کے درمیان پائی جاتی ہے۔

اس تشبیہ کی دلیل یہ ہے کہ جو خصوصیت کسی شخص یا چیز میں پوشیدہ ہوتی ہے وہی خصوصیت کسی دوسرے شخص یا چیز میں نمایاں ہوتی ہے، پوشیدہ خصوصیت کو آشکار کرنے اور دوسروں کی توجہ اس کی طرف مبذول کرانے کے لئے اسے کسی ایسے بافضیلت شخص یا قابل اہمیت کسی کی طرف نسبت دیتے ہوئے بیان کرتے ہیں جس کی خصوصیت بلند تر یا مرتبہ کلی حاصل ہے۔ ہم معروف تشبیہات میں دیکھتے ہیں کہ ایک بہادر انسان کو شیر سے تشبیہ دی جاتی ہے جبکہ شجاعت کا جو مرتبہ شیر میں پایا جاتا ہے، وہ انسان میں نہیں ہے، لیکن

اس لحاظ سے کہ شیر کی نمایاں خصوصیت شجاعت ہے لہذا اس شخص کو شیر سے تشبیہ دی جاتی ہے تا کہ اس کی پوشیدہ شجاعت کو پہچنوایا جائے اور اس کی بہادری اور شجاعت مکمل طور پر دوسروں کے لئے نمایاں ہو جائے اور نظریں اس پر متوجہ ہو جائیں اور یہ دوسروں کی نظریں اس پر متوجہ ہونا بذات خود کچھ مقاصد کی حامل ہیں۔

ہم قرآن مجید کی آیتوں اور روایتوں میں بہت سی ایسی تعبیریں پاتے ہیں کہ بعض افراد کی فضیلت خدائے متعال کی منزلت کے طور پر بیان کی گئی ہے یا بعض لوگوں کے کام خدا سے انجام پانے والے کاموں کے مانند بیان ہوئے ہیں، چنانچہ حاجتمندوں کو قرض دینے سے مربوط آیتوں میں، خدا کو قرض دینے کی صورت میں بیان کیا گیا ہے، منجملہ:

﴿من ذاالذی یقرض اللہ قرضاً حسناً فیضاعفه له و له اجرٌ کریم﴾

(الحدید/۱۱)

''کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے کہ وہ اس کو دوگنا کر دے اور اس کے لئے باعزت اجر بھی ہو''

یہ تشبیہ و تنزل اس حالت میں ہے کہ خدائے متعال بے نہایت حد تک تمام کمالات بلکہ بعض بزرگوں کے بقول غیر متناہی اور بے نہایت سے بالاتر کمالات کا مالک ہے۔ جو خدا کو پہچانتا ہے اور اس پر ایمان رکھتا ہے اسے معلوم ہے کہ خدائے متعال غیر متناہی حد تک تصور کئے جانے والے تمام کمالات کا مالک ہے۔

پیغمبر اسلامؐ اور ائمہ اطہارؑ کی ناشناختہ عظمت و منزلت:

خدائے متعال کے علاوہ مخلوقات میں بھی اگر چہ ان کے کمالات محدود ہیں، لیکن بعض اوقات یہی کمالات اور ان کی مقدار دوسروں کے لئے مجہول اور ناشناختہ ہے۔ خدا کے بزرگ ترین اور کامل ترین مخلوقات میں چہاردہ معصومین علیہم السلام کی قدر و منزلت اور ان کے کمالات کی وسعت دوسروں کے لئے ناشناختہ ہے، اس لئے عام انسان انھیں دوسرے لوگوں کی حد میں جانتے ہیں۔ حتی بعض انسان جو پیغمبرؐ پر ایمان لائے تھے، خیال کرتے تھے کہ آپؐ دوسرے لوگوں کے مانند ایک انسان ہیں، صرف اتنا فرق جانتے تھے کہ آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی: لیکن وہ نہیں جانتے تھے اور اس بات کو نہیں سمجھتے تھے آپؐ کا مقام دوسروں کے مقام سے کس قدر بلند و برتر ہے:

بامعرفت افراد کے لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت اور آپؐ کے مقام ومنزلت کی بلندی کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہیں رہا ہے کہ آپؐ انبیائے الٰہی میں برترین، بلندترین اور کامل ترین مقام ومنزلت کے مالک ہیں اور بہترین شریعت آپؐ کی شریعت ہے۔ خدائے متعال نے آپ کو پیغمبر مبعوث فرمایا اور آپؐ پر قرآن مجید نازل کیا کہ عدل وانصاف کے مطابق فیصلہ کریں اور خدا کے حکم سے قیام کریں اور لوگوں کی صحیح راستہ کی طرف ہدایت فرمائیں۔ لوگوں کی عقل وشعور کی مطابق استدلال وبرہان کے ذریعہ انھیں خدائے متعال اور دنیوی واخروی مصلحتوں سے آگاہ کریں اور ان کے دین کو مکمل فرمائیں۔ اس سلسلہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر شخص کی عقل کے لحاظ سے اس کے لئے دلیل و برہان پیش کرتے تھے اور ان سے بات کرتے تھے تاکہ امت حقیقت سے آگاہ ہوجائے۔ آپؐ اپنے دعوی کے ساتھ حجت وبرہان بھی پیش کرتے تھے:

﴿لیھلک من ھلک عن بینة و یحیی من حیّ عن بیّنة...﴾
(انفال/۴۱)

''جو ہلاک ہو وہ دلیل کے ساتھ اور جو زندہ رہے وہ بھی دلیل کے ساتھ...''

حضرت علی علیہ السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں فرماتے ہیں:

''اختارہ من شجرة الانبیاء ومشکاة الضّیاء وذؤابة العلیاء وسرّة البطحاء ومصابیح الظّلمة و ینابیع الحکمة'' [1]

پروردگار عالم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیغمبروں (آل ابراہیمؑ) کے شجرہ نسب سے، کہ جو روشن چراغوں (کہ جن سے ہدایت اور کامیابی کا نور چمکتا تھا) نیز مشہور اور بلند مرتبہ خاندانوں (کہ جو دوسروں سے اشرف وافضل تھے) اور سرزمین بطحاء (قابل فخر اور عظمت والی سرزمین ہے) اور، تاریکی کے چراغوں سے (آپؐ کے آباء واجداد سرگرداں لوگوں کے لئے ہدایت ورہنمائی کے چراغ تھے) اور حکمت کے سرچشموں (کہ سب دین وشریعت والے تھے اور دوسرے ان سے علم وحکمت سیکھتے تھے) سے منتخب فرمایا ہے۔

۱۔ نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خ ر/۱۰۷، ص ر/۳۲۱

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

آپ کی قیام گاہ بہترین قیام گاہ اور آپ کی پرورش کی جگہ بہترین جگہ ہے۔ کرامت وعظمت کے ٹھکانے اور سلامتی کی آرام گاہ ہیں، نیک لوگوں کے دل آپؐ کے شیدائی بن گئے اور ان کی آنکھیں آپ کی طرف خیرہ ہوگئیں، خدائے متعال نے آنحضرتؐ کی برکت سے پرانے اور دیرینہ کینوں کو نابود کر کے دشمنی کی آگ کو خاموش کر دیا اور مومنین کے درمیان الفت ودوستی ایجاد کی اور اپنے رشتہ داروں (حمزہ اور ابولہب کے مانند) میں دوری ڈال دی، آپؐ کے ظہور و پیدائش کی برکت سے مومنین کی ذلت و بیچارگی عزت و سرفرازی میں اور کفار کی بزرگی بدبختی میں تبدیل ہوگئی۔ [1]

خدا کے کلام کی بنیاد پر اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار صلوات اللہ علیہم سے جو روایتیں ہم تک پہنچی ہیں، ان سے خلاصہ کے طور پر ہم سمجھتے ہیں کہ چودہ مقدس نور ایسے مقامات کے مالک ہیں کہ اگر تمام انسانوں کی عقلیں جمع کی جائیں تب بھی وہ ان مقامات میں سے ایک کو بھی درک نہیں کر سکتے، وہاں تک پہنچنے کی بات ہی نہیں! یہ معرفت وشناخت ہمیں خدائے متعال کی عنایت سے اور قرآن مجید کی آیات اور روایتوں کے ذریعہ حاصل ہوئی ہے۔ اس لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بلند مقام اور عالی مرتبہ کے پیش نظر آپؐ خدا کی طرف سے بہترین رہنما ہیں۔ اور آپؐ نے اپنے بعد دو بڑی میراث، خدا کی کتاب اور اپنی عترت چھوڑی اور لوگوں کو تاکید کی کہ ان سے منسلک رہیں تا کہ منحرف نہ ہو جائیں، جیسے کہ فرمایا:

"انّی تارک فیکم الثقلین کتاب اللّٰہ وعترتی اھل بیتی ما ان تمسکتم بھمالن تضلّوا ابدا وانّھما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض " [2]

"میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، کتاب خدا اور میری عترت جو میرے اہل بیت علیہم السلام ہیں یہ دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں۔"

۱۔ نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خ ۹۴، ص ۲۸۳

۲۔ بحار الانوار، ج ۲۳، ص ۱۳۳

خدائے متعال کی اطاعت اور پیغمبرؐ وائمہ اطہارؑ کی اطاعت کے درمیان رابطہ:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بلند مقام کو بیان کرنے والی آیتوں میں یہ آیہ شریفہ بھی ہے کہ خداوند متعال نے فرمایا:

﴿من یطع الرّسول فقد اطاع اللہ﴾ (نساء/۸۰)

''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

اس آیہ شریفہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کی وسعت کے بارے میں کوئی حد بیان نہیں ہوئی ہے، اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی حکم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیں اگر انسان اس کی اطاعت کرے تو اس نے خداوند متعال کی اطاعت کی ہے۔ یہ آیت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت کی ایک دلیل شمار ہوتی ہے، کیونکہ یہ آیت اور اس جیسی دوسری آیات ہمیں پیغمبر خداؐ کی بغیر چون وچرا اطاعت کرنے کی تاکید کرتی ہیں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ آپؐ خدائے متعال کے حکم کے خلاف اور اس کی مرضی کے خلاف حکم نہیں دیتے ہیں، ورنہ اگر خدائے متعال ایک طرف سے اپنی اطاعت کرنے کا حکم دیتا اور دوسری طرف کسی ایسے کی اطاعت کرنے کا حکم کرتا جو خدا کے حکم کے خلاف ہے، تو اس میں تناقض وتضاد پیش آتا۔

یہی برتری اور عظمت جو پیغمبر اسلامؐ کے لئے ثابت ہے، آپ کے بعد ائمہ معصومین علیہم السلام کے لئے بھی ثابت ہے اور ان کے مقام ومنزلت اور عظمت کے پیش نظر ہی خدائے متعال نے ان کے لئے ''اولی الامر'' کا عنوان اطلاق کیا ہے:

﴿یا ایھا الّذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرّسول و اولی الامر منکم...﴾

(نساء/۵۹)

''ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور صاحبان امر (اوصیاء پیغمبرؐ) کی اطاعت کرو۔''

جابر بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں: اس آیت کے نازل ہونے کے بعد میں نے رسول خدا صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! ہم خدا اور اس کے پیغمبرؐ کو پہچانتے ہیں، یہ اولی الامر کون ہیں کہ خدائے متعال نے ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے؟

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا:

''اے جابر! وہ میرے جانشین اور میرے بعد مسلمانوں کے پیشوا ہیں۔''

اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایک کر کے ائمہ کا نام ذکر کیا، جب بارہویں امام عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف پر پہنچے تو اس کے بعد فرمایا:

(ان میں سے بارہواں) وہ ہے جس کی کنیت اور نام میری کنیت اور نام پر ہے، وہ زمین پر حجت خدا ہے، خدا کے بندوں میں باقیماندہ حجت ہے، وہ حسین (علیہ السلام) کی نسل ہے۔ یہ وہی ہے جس کے ہاتھوں خداوند متعال مشرق سے مغرب تک دنیا کو فتح کرے گا۔[1]

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت خدا کی اطاعت کے ہم پلہ ہونے کے سلسلہ میں ائمہ اطہار علیہم السلام میں ذات مقدس حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا بھی شامل ہے، چونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح ہر وہ کمال جو خدا کی مخلوقات میں ممکن ہے وہ بہ تمام معنی ان سب میں موجود ہے۔ خدائے متعال کی اطاعت کو ائمہ اطہار علیہم السلام کی اطاعت سے تشبیہ، اور یکسانیت کو بہتر انداز میں درک کرنے کے لئے مناسب ہے ہم زیارت جامعہ کبیرہ میں غور وخوض کریں تا کہ ہم سمجھ سکیں کہ ان کے بلند مقام ومنزلت اور ان کی محبت اور اطاعت کے ضروری ہونے کے بارے میں کیا فرمایا گیا ہے۔ ہم اسی زیارت میں پڑھتے ہیں:

''من اطاعکم فقد اطاع اللّٰہ و من عصاکم فقد عصی اللّٰہ و من احبکم فقداحب اللّٰہ و من ابغضکم فقد ابغض اللّٰہ ...''

جس نے آپ لوگوں کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جو آپ لوگوں کی نافرمانی کرے اس نے خدا کی نافرمانی کی ہے اور جو آپ لوگوں سے محبت کرے اس نے خدا سے محبت کی ہے اور جو آپ لوگوں سے دشمنی اور عداوت روا رکھے اس نے خدا سے دشمنی کی ہے۔

یہی معنی مکمل طور پر ایام ماہ رجب کی دعا میں وارد ہوئے ہیں:

۱۔ بحار الانوار، ج ۲۶، ص ۲۵۰

"اللّٰھم انّی اسألک بمعانی جمیع مایدعوک بہ ولاۃ امرک"

''خداوندا! میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں ان تمام معانی سے جن معنی میں تیرے صاحبان امر تجھے پکارتے ہیں''

یہاں تک فرماتا ہے:

"لا فرق بینک و بینھم الا انّھم عبادک و خلقک"

''تجھ میں اور ان (آیات) میں کوئی فرق نہیں ہے، اس کے سوا کہ وہ تیرے بندے اور مخلوق ہیں۔''

ان میں کمالات الٰہی کے نمونے موجود ہیں، صرف فرق اس میں یہ ہے کہ ان کے تمام کمالات خدائے متعال سے ہیں اور خدائے متعال نے وہ کمالات انھیں عنایت کئے ہیں اور البتہ یہ فرق اور تفاوت بے نہایت سے بالاتر ہے، اگر چہ اہل بیت اطہار علیہم السلام تمام کمالات اور عظمتوں کے مالک ہیں، لیکن وہ کمالات بنیادی طور پر خدائے متعال سے ہیں اور وہ خود کوئی چیز نہیں رکھتے ہیں۔ جب ان کا خدا کی دوسری مخلوقات سے موازنہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام مخلوقات ان کے نیازمند ہیں، نہ صرف کوئی ان کی برابری نہیں کرسکتا ہے، بلکہ ان کے اور دوسروں کے درمیان بے نہایت تفاوت ہے۔ لیکن جب ان کا خدائے متعال سے موازنہ کیا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے اور خدائے متعال کے درمیان کسی بھی قسم کی نسبت نہیں پائی جاتی، کیونکہ وہ بالکل محتاج وفقیر ہیں، اور جس کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا سے ہے۔

بہر صورت پیغمبر واہل بیت علیہم السلام کا مقام خدا کے مقام سے تنزیل وتشبیہ مکمل طور پر بجا ہے اور ہم ان کے مقام کو درک کرنے سے عاجز ہیں اور ہم یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ان کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے اور ان کی محبت خدا کی محبت ہے اور ان سے دشمنی اور نافرمانی خدا سے دشمنی اور نافرمانی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کی شان میں فرماتے ہیں:

"فاطمة بضعة منّی من سرّھا فقد سرّنی و من ساء ھا فقد ساء نی، فاطمة اعزّ الناس علی" [1]

''فاطمہؑ میرے بدن کا ٹکڑا ہے، جس نے انھیں مسرور کیا اس نے مجھے مسرور کیا، جس نے

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۵/ص ۴۶۸/

اسے اذیت پہنچائی اس نے مجھے اذیت پہنچائی۔ فاطمہؑ لوگوں میں میرے لئے عزیز ترین ہے۔''

کہا گیا کہ پیغمبر اسلام اور اہل بیت علیہم السلام کا مقام خدا کے مقام کے مانند بیان ہوا ہے، اسی طرح بعض افعال جو بعض لوگوں کے بارے میں انجام پاتے ہیں، دوسرے افراد کے ذریعہ انجام پانے والے افعال کے برابر بیان کئے گئے ہیں، چنانچہ اہل بیت عصمت وطہارت علیہم السلام کا ذکر خدائے متعال کے ذکر کے عنوان سے بیان ہوا ہے، خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے:

﴿فاذکرونی اذکر کم﴾ (بقرہ/۱۵۲)

''تم ہم کو یاد کرو تا کہ ہم تمھیں یاد رکھیں''

بیشک خدائے متعال تمام لوگوں کی یاد میں ہے اور کسی چیز اور شخص سے غافل نہیں ہے۔ لیکن آیہ شریفہ میں یاد سے مقصود شرف بخشنا اور وہ یاد ہے جو عنایت وانعام الٰہی کی ساتھ ہو۔ اگر کوئی چاہے کہ خدا اس کی یاد میں ہو اور اس سے اپنی نعمت کو فروگزار نہ کرے تو اسے اس کی یاد میں رہنا چاہئے۔

اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ روایت میں اہل بیت کی یاد خدا کی یاد سے تنزیلی تشبیہ دی گئی ہے:

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''ان ذکرنا من ذکر اللّٰہ و ذکر عدونا من ذکر الشّیطان'' [1]

''ہماری یاد خدا کی یاد ہے اور ہمارے دشمن کی یاد شیطان کی یاد ہے''

اہل بیت علیہم السلام کی یاد کو خدا کی یاد سے تنزیل وتشبیہ دی گئی ہے اس جہت سے ہے کہ وہ خدا کے خلفاء ہیں اور اپنے لئے خدا کے علاوہ کسی شان ومنزلت کے قائل نہیں ہیں، جب ہم پیغمبرؐ اور کسی امام کا نام سنتے ہیں تو کیا اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہمارے ذہن میں آتی ہے کہ وہ خدا کے نمائندہ ہیں؟ اس بنا پر ان کا نام سننا خدا کی طرف توجہ مبذول کرنا ہے، اس لئے کہ ان کی یاد خدا کی یاد ہے۔

خدائے متعال نے اپنے مقام جبروت کو تنزیل وتشبیہ اور نمایاں کرنے کے لئے، اہل بیتؑ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے بلند مرتبہ پر فائز کیا لہٰذا وہ خدا کے لئے مکمل نمونے ہیں اور ہر لحاظ سے حق کو مکمل طور پر منعکس کرنے کے آئینہ دار ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آئینہ اپنی کسی چیز کو نہیں

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۵، ص ۳۶۸

دکھاتا بلکہ جو چیز اس کے سامنے آتی ہے اس کی جلوہ نمائی کا ایک وسیلہ ہے اور اس تصویر کو واضح طور پر منعکس کرتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت عصمت وطہارتؑ بھی اپنی طرف سے کوئی چیز نہیں رکھتے ہیں اور جو کچھ ان کی پاس ہے خدائے متعال سے ہے اور وہ خدائے متعال کو اچھی طرح سے منعکس کرتے ہیں۔

اس کے پیش نظر کہ ائمہ علیہم السلام حق کو مکمل طور پر نمایاں اور منعکس کرنے والے آئینہ ہیں اور تمام معنی میں ربوبیت کے جمال کا محور قرار پائے ہیں، یہاں تک اپنے وجود کے تمام رخ سے حق تعالی کے صفات کو نمایاں کر رہے ہیں، امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"کلّ علم لایخرج من هذا البیت فهو باطل و اشار الی بیته و قال: علیه السلام، لبعض اصحابه: اذا اردت العلم الصحیح فخذ عن اهل البیت فأننا رویناه و اوتیناه و اوتینا شرح الحکمة و فصل الخطاب، ان الله اصطفانا و آتاناما لم یؤت احداً من العالمین" [1]

''جو بھی علم اس گھر سے نشر نہیں ہوگا، وہ باطل ہے یہ فرماتے ہوئے اپنے بیت الشرف کی طرف اشارہ کیا اور مزید اپنے ایک صحابی سے فرمایا: اگر صحیح علم کی تلاش میں ہو تو اہل بیتؑ سے حاصل کرنا۔ بیشک ہم نے اس علم کو بیان کیا ہے۔ اور (آیات الٰہی میں پوشیدہ) حکمتوں کی شرح اور عدلیہ اور صحیح وعادلانہ فیصلوں کا علم ہمیں عطا کیا گیا ہے اور خدا نے ہمیں منتخب کیا ہے اور جو کچھ ہمیں عطا کیا ہے کسی اور کو نہیں دیا ہے''

مومنوں کی عزت واحترام کی ضرورت:

معصومین کے مقام کے علاوہ جب ہم ادنی درجے کے افراد پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں معلوم ہوتا ہے جو بھی ان سے بیشتر شباہت رکھتا ہے، یعنی خدا کی بندگی میں راسخ اور پختہ تر ہے اس نے اپنے وجود سے انانیت کے جذبے کو دور کر کے خود کو خدائے متعال کی عبودیت میں محو کر دیا۔ مختصر یہ کہ جس قدر انسان اپنی خود پسندی کو چھوڑ کر خدا کا بندہ بن جائے اور جس حد تک اپنے آپ کو مستقل تصور نہ کرے، وہ اسی اعتبار سے خدا

۱۔ بحار الانوار، ج ۲۶، ص ۱۵۸

کی منزلت کی لیاقت رکھتا ہے، یہاں تک امام صادق علیہ السلام مومن کی زیارت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"من زار اخاہ فی اللّٰہ. قال اللّٰہ عز وجلّ: ایای زرت و ثوابک علیّ و لست ارضی لک ثواباً دون الجنة" [1]

"جو خدا کے لئے اپنے مومن بھائی کی زیارت کرے، خدا نے فرمایا ہے: تم نے میری زیارت کی ہے اور اس کی پاداش میرے ذمہ ہے اور میں تمھارے لئے بہشت سے کم تر پاداش پر راضی نہیں ہوتا ہوں۔"

ایک روایت میں آیا ہے کہ اگر ایک مؤمن خدا کی لئے اور کسی دنیوی غرض و درخواست کے بغیر ایک مومن بھائی کے گھر جائے تو خدائے متعال ایک فرشتہ کو بھیجتا ہے تا کہ اس سے سوال کرے: تم کیوں یہاں آئے ہو اور کیا کام ہے؟ وہ مومن جواب میں کہتا ہے: خدا کے بندوں میں سے ایک بندہ اور اپنے مومن بھائی کے گھر آیا ہے تا کہ اس سے ملاقات کرے: فرشتہ پوچھتا ہے: کیا تم نے اس کو کوئی کام سپرد کیا تھا اور اب اس کی ضرورت ہے؟ جواب میں کہتا ہے: نہیں۔ فرشتہ پوچھتا ہے: پس اس کی ساتھ تمھارا کیا کام ہے اور کیوں یہاں آئے ہو؟ وہ مومن جواب میں کہتا ہے: میں اسے خدا کے لئے دوست رکھتا ہوں، اس لئے اس کی زیارت کے لئے آیا ہوں۔ پھر وہ فرشتہ خدا کی طرف سے اسے پیغام دیتا ہے کہ: اے بندہ! تم میری ملاقات کے لئے آئے ہو اور میرے مہمان ہو اور تمھاری مہمان نوازی میرے ذمہ ہے۔

جی ہاں، جب ایک مومن خدا کی بندگی کرنے کا فیصلہ کرتا ہے، خود پسندی اور انانیت کو چھوڑتا ہے تو وہ ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے کہ جہاں پر اس کی زیارت خدا کی زیارت شمار ہوتی ہے۔ آیات و روایات پر تحقیق اور غور و خوض کرنے کے بعد ہمیں اس مضمون کی بہت سی آیتیں اور روایتیں ملتی ہیں کہ جن میں مومن کی زیارت اور اس کے احترام کو خدا کی زیارت اور اس کے احترام کے برابر بیان کیا گیا ہے۔ من جملہ اس روایت میں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذرؓ کو نصیحت کے طور پر خدا کے بندوں میں سے تین گروہ کے احترام کو خدا کے احترام کے مانند بیان کرتے ہیں۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ (نعوذ باللہ) اگر خدائے متعال کو دیکھتا اور اس کا احترام کرتا، تو انسان کس بلند مقام پر پہنچ جاتا! البتہ ہمیں بندگی و عبادت کے

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۴/ص ۳۴۵/

مرحلہ میں خدائے متعال کو اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھنا چاہئے، تب اس کی عبادت کریں، چنانچہ مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے:

"لم اکن بالذی اعبد ربا لم اره" [1]

"میں ایسا نہیں ہوں کہ بغیر دیکھے خدا کی عبادت کروں"

مخلصانہ عبادت کرنے والا انسان کبھی خدا کی عبادت و بندگی کے دوران خدائی عظمت کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے، خدا کے بندوں کے ان تین گروہوں کا احترام کرنے والے کو بھی خدا کے احترام کے رتبوں میں قرار دیا گیا ہے:

الف: سن رسیدہ مسلمان کا احترام:

پہلا گروہ: وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی عمر اسلام اور اس کے بلند احکام کی پابندی میں گزاری ہو اور ان کی داڑھی اسلام کی راہ میں سفید ہو چکی ہو۔ اس گروہ کا احترام اور اس کی قدر کرنا گویا خدا کا احترام ہے۔ پس ہم نے ایک سن رسیدہ مسلمان کو دیکھا اور اس کے مسلمان ہونے اور ایک طولانی عمر اسلام کی راہ میں گزارنے کے ناطے اس کا احترام کیا تو ہم نے خدا کا احترام کیا ہے۔

ہمارے لئے اس امر پر غور کرنے کا مقام ہے کہ خدا کے بندوں میں اس شائستہ اور مومن گروہ میں کیا خصوصیت ہے کہ انہوں نے یہ عظمت پائی ہے کہ ان کا احترام کرنا خدا کے احترام کے برابر ہے۔ شاید اس بوڑھے اور ریش سفید مسلمان کے لئے یہ تنزیل وتشبیہ اور موازنہ اس لئے کہ جب انسان اسے دیکھتا ہے تو اس کے چہرہ پر ایک طولانی مدت بندگی کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کا نورانی قیافہ، سفید ریش، خاص کر اگر پیشانی پر سجدہ کا نشان بھی ہو، یہ سب اس کی ایک عمر خدا کی بندگی کی حکایت کرتے ہیں:

﴿...سیماهم فی وجوههم من اثر السّجود...﴾ (فتح/ ۲۹)

"ان کے چہرہ پر سجدہ کے نشانات پائے جاتے ہیں..."

خدا کی بندگی کی ایک عمر کو دیکھنا، ایک عمر خدائی کو دیکھنے کے برابر ہے، کیونکہ بندگی کا خدائی کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یعنی جب ہم ایک عابد بندے کو دیکھتے ہیں کہ اس نے ایک عمر عبادت میں

۱۔ بحار الانوار، ج ۴، ص ۲۷

گزاری ہے، تو ہم ایک عمر خدائی اور اس کے حکیمانہ تدبیر و رہنمائی کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں، اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ عبودیت و ربوبیت دوسرے تمام لازم و ملزومات مفاہیم کے مانند دو لازم و ملزوم مفہوم ہیں، جیسے باپ بیٹے، جب انسان باپ کو باپ کی حیثیت سے دیکھتا ہے تو لازمی طور پر اسے بیٹے کی یاد بھی آتی ہے۔ اسی طرح جب کسی کو بیٹے کے طور پر تصور میں لاتا ہے تو باپ کی یاد بھی آتی ہے۔

جب انسان ایک دل باختہ بندہ کی بندگی کی عمر کو دیکھتا ہے تو اسے خدائی عمر کی ایک یاد ذہن میں آتی ہے اور یہ وہی ربوبیت الٰہی اور عبودیت الٰہی کے درمیان ایک نسبت اور رابطہ ہے۔ اس لحاظ سے اس قسم کی تنزیل و تشبیہ کے بارے میں بجا ہے کہ کہا جائے: جب اس کا احترام کروگے تو گویا خدائے متعال کا احترام کیا ہے۔ نزول اور موازنہ کا معیار دونوں طرف وجہ مشترک کا موجود ہونا ہے، اب اس سے بہتر وجہ مشترک کیا ہو سکتی ہے کہ ایک دوسرے کو نمایاں کرنے والا ہو، ایک تصویر کی مانند کہ جب تصویر پر نظر ڈالتے ہیں تو صاحب تصویر کی یاد آتی ہے۔ اس بوڑھے مسلمان نے ایک عمر عبودیت و بندگی کو اپنے قیافہ میں مجسم کیا ہے اور جب آپ اس کی بندگی کے آثار پر نظر ڈالتے ہیں تو خدا کی ربوبیت کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں۔

پس مذکورہ مطالب کے پیش نظر، اسلام میں سن رسیدہ اور بوڑھے افراد کا احترام اس قسم کی عظمت رکھتا ہے۔ البتہ سن رسیدہ خواتین کا احترام بھی اس زمرے میں آتا ہے، لیکن معاشرے میں معمولاً مرد، عمر رسیدہ مردوں سے اور عورتیں بوڑھی عورتوں سے ملاقات کرتی ہیں اور ان کے درمیان احترام میں کوئی فرق نہیں ہے، مجموعی طور پر سن رسیدہ مسلمان افراد کا احترام خدا کے احترام کے برابر ہے۔

یہاں پر مناسب ہے کہ اس نکتہ کی طرف ایک اشارہ کریں کہ بعض قدریں، جن کا اسلامی معاشرہ میں اعتبار ہے، غیر اسلامی معاشرے میں بھی ان کو محترم جانتے ہیں لیکن معیار مختلف ہیں۔ بزرگوں کا احترام ایک ایسی قدر ہے جو کم و بیش ہر معاشرے میں رائج ہے، لیکن جس معاشرے میں اسلامی اور الٰہی نظریہ نہیں ہے، وہاں پر اسی قدر آداب و رسوم کا حصہ مانا جاتا ہے، وہاں پر سن رسیدہ افراد کے احترام کا کوئی ثابت اور صحیح معیار نہیں پایا جا سکتا ہے۔ لیکن اسلام کے قابل قدر نظام میں اس قسم کی قدریں دوسروں کے نزدیک محترم قرار دی گئی ہیں، لیکن معقول معیار اور ثابت و پائدار بنیاد کے ساتھ۔ تمام معاشروں میں سن رسیدہ افراد کا احترام کیا جاتا ہے، اسلامی نظام میں ایک مسلمان عمر رسیدہ کا احترام خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس کا احترام اس لئے کیا جاتا ہے کہ وہ ایک عمر خدا کی عبودیت میں بسر کر چکا ہے، لیکن یہ خصوصیت دوسروں کے وہاں

بیان نہیں ہوئی ہے۔ پس توجہ کرنی چاہئے کہ اگر آیات و روایات میں ایسے اقدار کی بات کی گئی ہو جنھیں دوسرے نظاموں میں بھی قابل احترام جانتے ہوں، تو یہ اس معنی و مفہوم میں نہیں ہے اسلام میں شناختہ شدہ قدریں وہی ہیں جو دوسرے معاشروں میں اعتبار رکھتی ہیں، بلکہ ممکن ہے ان قدروں کا معیار اسلام میں بہت مختلف ہو، اسلام کے نزدیک ان قدروں کا معیار بہت بلند ہے۔

مذکورہ بیان شدہ مطالب کے پیش نظر ہمیں معلوم ہوا کہ سن رسیدہ لوگوں کا احترام کیا جانا چاہئے او رہر چھوٹے کو اپنے سے بڑے کا اس لحاظ سے کہ وہ بندہ ہے اور اس نے ایک عمر عبادت میں گزاری ہے احترام کرنا چاہئے، لیکن ایک مسلمان سن رسیدہ کا احترام خاص اہمیت رکھتا ہے اور خدا کے احترام کے برابر ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مسلمان سن رسیدہ کے احترام کے اخروی نتائج اور ردعمل کے بارے میں فرماتے ہیں:

"من وقّر ذاشيبةٍ فی الاسلام آمنه الله من فزعٍ يوم القيامة" [1]

"جو کسی مسلمان بوڑھے کا احترام اور عزت کرے گا، خدائے متعال اسے روز قیامت کے خوف سے نجات دے گا"

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام مسلمانوں کے ساتھ اس کی عمر کے مختلف مراحل میں برتاؤ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"اوصيكم ان تتخذوا صغير المسلمين و لداً و اوسطهم اخاً و كبيرهم اباً. فارحم ولدک وصل اخاک وبرّ اباک" [2]

"میں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ مسلمان بچوں کو اپنا فرزند، جوانوں کو اپنا بھائی اور سن رسیدہ کو اپنا باپ قرار دو اور (جس طرح اپنے گھر میں برتاؤ کرتے ہو) مسلمانوں کے فرزندوں سے مہربانی، دینی بھائیوں سے برادری اور بزرگوں سے نیکی سے پیش آؤ"

چونکہ دین اسلام، دین مودت اور محبت ہے اور اسلام مہر و محبت کو ایجاد کرنے والا دین ہے جو اپنے

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۶، ص ۲۲۰۲۔

۲۔ مرتضی فرید، الحدیث، ج ۱، ص ۳۰۶

پیروں کو برادری ومحبت کی دعوت دیتا ہے اوران سے صمیمیت اور یکجہتی پیدا کر کے رنجش اور کینہ کو دور کرنے کا مطالبہ کرتا ہے اور تقاضا کرتا ہے کہ محبت آمیز باتوں سے رحمت الٰہی کے سایہ کو اپنے سر پر جاری رکھیں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"من اکرم اخاہ المسلم بکلمة یلطفه بها و فرّج عنه کربته، لم یزل فی ظل اللّٰه الممدود علیه الرحمة ما کان فی ذلک" [1]

"جو اپنے مسلمان بھائی کا اپنی محبت آمیز باتوں کے ذریعہ احترام کرے اور اس کے غم کو دور کرے، تو جب تک یہ عادت وخصلت اس میں موجود ہے وہ ہمیشہ خدا کے سایۂ رحمت میں ہوگا۔"

پس ہمیں ان بزرگوں کا احترام کرنا چاہئے، جنھوں نے ایک عمر اسلام میں گزاری ہے اوران کی ڈاڑھی سفید ہوچکی ہے، حتی اگر ان کی معلومات ہماری معلومات کے برابر بھی نہ ہوں۔ کیونکہ ہم نہیں جانتے ہیں کہ ہماری عمران کی عمر کے برابر پہنچے گی یا نہیں، یا اگر ہم ان کی عمر تک پہنچے بھی معلوم نہیں اپنے دین کا تحفظ کرسکیں یا نہیں۔ کتنے ہی جوان گزرے ہیں کہ جوانی میں ہی ہدایت کی نعمت سے محروم ہوگئے اور کفر وعناد کے عالم میں اس دنیا سے گئے ہیں، اس کے مقابلہ میں یہ انسان کہ جس نے دین کی حفاظت کرتے ہوئے ایک عمر گزاری ہے اور اسلام کو اپنے وجود میں تحفظ بخشا ہے، حقیقتاً احترام کا مستحق ہے، اگر چہ وہ علمی مفاہیم کے بہت سے اصولوں سے واقف نہیں ہے اوراس کا علم ہمارے برابر نہیں ہے۔ یہ گروہ اس قدر عظمت وشرافت کا حامل ہے کہ جس نے اسلام میں ایک عمر گزاری ہے۔

ب۔ قرآن مجید کے حاملین اوراس پر عمل کرنے والوں کا احترام:

دوسرا گروہ: قرآن مجید کے حاملین اوراس پر عمل کرنے والوں کا ہے۔ پہلے درجہ پر ان کا احترام خدائے متعال کا احترام ہے کہ جو حافظ قرآن بھی ہیں اور قرآن مجید پر عمل کرنے والے بھی ہیں اوراس گروہ کے بعد ان کا احترام بھی خدائے متعال کا احترام ہے جو حافظِ قرآن نہیں ہیں لیکن علوم قرآن کے عالم اوراس پر عمل کرنے والے ہیں، اسی طرح اگر قرآن مجید پر عمل کرنے والے نہیں تھے صرف قرآن مجید کے حامل

۱۔ بحار الانوار، ج ۱۶، ص ۸۴

تھے، پھر بھی وہ احترام کا ایک درجہ رکھتے ہیں۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

"اشراف امتی حملة القرآن و اصحاب اللّیل" [1]

"میری امت کے بزرگ وبرتر افراد قرآن مجید کے حامل (حافظ) اور شب زندہ دار ہیں"

اس روایت میں قرآن مجید کے حاملین کے لئے ایک خاص شرافت ثابت ہوتی ہے، لیکن ابوذر کی حدیث کے اس حصہ میں، اصل شرافت کے اثبات کے علاوہ یہ بھی بیان ہوا ہے کہ ان کا احترام خدا کا احترام ہے البتہ اس شرط کے ساتھ کہ قرآن مجید پر عمل کرنے والے ہوں اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ قرآن مجید کے حامل اور اس پر عمل کرنے والے ظاہر و باطن، گفتار و کردار میں ارادہ الٰہی کا جلوہ کلام الٰہی کے مظہر ہیں، انہوں نے قرآن مجید کے الفاظ اور حروف کو بھی حفظ کیا ہے اور ان کے ذہنوں میں قرآن کے مفاہیم بھی محفوظ ہیں اور اصطلاح میں ان کے قوہ متخیلہ نے الفاظ کی صورت کو درک کیا ہے، ان کے قوہ عاقلہ نے اس کے مفاہیم کو اور قوہ عاملہ نے قرآن مجید کے حقائق کو عمل کی دنیا میں جلوہ گر کیا ہے، یعنی ان کا وجود سرتا پا خدائی اور قرآنی ہو چکا ہے۔ جب ہم ان کے حافظہ پر نظر ڈالتے ہیں کہ وہ حافظ قرآن مجید ہیں، جب ان کے علوم پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ علوم قرآن مجید کے حامل اور اس کے مفاہیم کو حاصل کر چکے ہیں اور جب ہم ان کے عمل پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ قرآن مجید کے مطابق عمل کرتے ہیں، اس لحاظ سے ان کا وجود قرآن مجید کا آئینہ ہے، یعنی ان کا وجود کمال خدا کا آئینہ ہے اور خدائے متعال نے اپنے کلام سے ان کے وجود میں ظہور کیا ہے،

لہذا ان کا احترام خداوند متعال کا احترام ہے۔

قرآن مجید کے بلند مقام کے بارے میں پیغمبر اسلام فرماتے ہیں:

"القرآن هدی من الضلالة و تبیان من العمی و استقالة من العثرة و نور من الظلمة و ضیاء من الاحداث و عثمة من الهلکة و رشد من الغواية وبیان من الفتن و بلاغ من الدنیا الی الآخرة و فیه کمال دینکم و ما عدل

۱۔ بحار الانوار، ج ۸۷، ص ۱۳۸

احد عن القرآن الّا الی النار" [1]

"قرآن مجید گمراہی کے لئے ایک رہنما اور نابینا کے لئے بینائی اور نجات بخش ہے، لغزشوں کو بخشنے کا سبب اور ہر تاریکی کے لئے نور اور روشنی ہے، حوادث میں نجات دلانے والا ہے، ہر ہلاکت سے بچانے والا اور ہر گمراہی میں رہنمائی کرنے والا ہے۔ ہر فتنہ وانحراف کو بیان کرنے والا اور انسان کو دنیا سے (پستی سے سعادت) آخرت کی طرف لے جانے والا ہے اور اس میں تمہارے دین کا کمال ہے اور قرآن مجید سے کوئی شخص منہ نہیں موڑتا مگر یہ کہ اس نے جہنم کی طرف رخ کیا ہے"

قرآن مجید پر توجہ کرنے، اسے پہچاننے اور اسے ایک سعادت اور نجات بخش کتاب کی حیثیت سے منتخب کرنے کی ضرورت کے بارے میں ایک حدیث میں آیا ہے:

"من اخذ دینه من کتاب اللّٰه و سنة نبیه صلی اللّٰه علیه و آله و سلم زالت الجبال قبل ان یزول و من اخذ دینه من افواه الرجال ردّته الرّجال" [2]

"جو بھی اپنے دین کو خدا کی کتاب اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت سے حاصل کرتا ہے وہ پہاڑوں سے مستحکم تر اور جو اپنے دین کو لوگوں کی زبانوں سے حاصل کرتا ہے، وہی لوگ اسے دین سے منحرف کردیں گے"

ایک اور جگہ پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید اور اہلبیت علیہم السلام کے درمیان رابطہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"انا اول رافد علی العزیز الجبّار یوم القیامة و کتابه و اهل بیتی، ثم امّتی ثم اسالهم ما فعلتم بکتاب اللّٰه و اهل بیتی" [3]

میں پہلا شخص ہوں جو قیامت کے دن خدائے جبار کے حضور قرآن مجید اور اپنے اہلبیت کے ساتھ حاضر ہوگا، اس کے بعد میری امت (حاضر ہوگی)، اس کے بعد میں پوچھوں گا: تم لوگوں نے خدا کی

۱۔ اصول کافی ج ۴، ص ۴۱

۲۔ اصول کافی ج ۴، ص ۴۱

۳۔ مقدمہ اصول کافی، ص ۷

کتاب اور میرے اہل بیتؑ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

جو کچھ بیان ہوا، وہ اس لئے تھا کہ ہم جان لیں کہ قرآن مجید، مادی ومعنوی دونوں لحاظ سے، بابرکت رکھتا ہے اور انسان جس قدر اس سے زیادہ بہرہ مند ہوگا۔ قرآن مجید کی فضیلت اور عظمت اتنی ہی زیادہ ہوگی اس مضمون کی ایک روایت نقل ہوئی ہے کہ ایک شخص نے معصوم سے سوال کیا: دوسرے لوگوں پر آپ کی فضیلت اور برتری کا سبب کیا ہے؟ تو معصوم نے جواب میں فرمایا: دوسروں پر ہماری فضیلت اس لئے ہے کہ قرآن مجید کا علم ہمارے پاس ہے۔

پس ہمیں ہمیشہ قرآن مجید کی تکریم وتقدیس کرنی چاہئے اور قرآن مجید کو ہرگز دوسری کتابوں کی طرح نہیں دیکھنا چاہئے اور قرآن مجید کو دوسری تمام کتابوں پر فضیلت دینا صرف قلبی اعتقاد تک محدود نہ ہو، بلکہ قرآن مجید کے بارے میں ہماری رفتار دوسری کتابوں کے مقابلہ میں متفاوت ہونی چاہئے۔ ہمیں قرآن مجید کی نسبت قلبی احترام کے علاوہ اس کا ظاہری احترام بھی کرنا چاہئے یعنی ہماری ظاہری رفتار، قرآن مجید کے ساتھ ہماری قلبی رفتار کا مظہر ہونا چاہئے۔ بیشک قرآن مجید کے ساتھ ہماری یہی قابل تعظیم رفتار، ہمارے ایمان میں اضافہ کا سبب بنے گی۔

بعض بزرگان اس کمرے میں نہیں سوتے تھے، جس میں قرآن مجید ہوا کرتا تھا اور حتی اس کمرے میں قرآن مجید کے احترام میں پیر بھی نہیں پھیلاتے تھے۔ علامہ طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ اور شہید مطہری رحمۃ اللہ علیہ نے مرحوم شیخ محمد تقی آملی سے ایک داستان نقل کی ہے کہ مرحوم آملی نے ایک رات کو قرآن مجید کی تلاوت کے دوران انتہائی تھکاوٹ کی وجہ سے تکیہ سے ٹیک لگایا۔ دوسرے دن جب وہ اپنے استاد مرحوم میرزا علی آقای قاضی کہ علامہ طباطبائی اور دیگر بزرگوں کے بھی استاد تھے۔ کے پاس پہنچے تو استاد نے بغیر کسی مقدمہ کے فرمایا: قرآن مجید کی تلاوت کے وقت اچھا نہیں ہے کہ انسان تکیہ سے ٹیک لگائے!

جی ہاں، قرآن مجید کی تعظیم کے لئے اور معاشرے میں قرآنی ثقافت کو وسعت دینے کے لئے قرآن مجید کے حاملین کا اکرام کرنا چاہئے اور اگر ہم خود قرآن مجید کے حاملین میں ہوں تو دوسرے لوگ ہمارا بھی احترام کریں گے اور ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ چونکہ ہم خود قرآن مجید کے حامل ہیں، اس لئے قرآن مجید کے دوسرے حاملین کا احترام نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ ایک شخص حامل قرآن ہو اور دوسرے حاملان قرآن کا احترام کرے، چنانچہ سادات اور اولاد رسول اللہ کا احترام تمام لوگوں من جملہ سادات پر واجب ہے۔

جب انسان ایک سید کو دیکھتا ہے اسے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یاد آتے ہیں، اس لحاظ سے اس کا احترام کرنا ضروری ہے، حتی اگر خود بھی سید ہو۔

ج۔ باانصاف اور عادل حاکم کا احترام:

تیسرا گروہ: تیسرا گروہ جن کا احترام کرنا خدا کا احترام کرنا ہے، عادل اور باانصاف حکام ہیں۔ ہم عادل حاکم کا احترام ضروری ہونے کے موضوع پر بحث کرنے سے پہلے معاشرے میں حکومت اور قانون کی ضرورت اور حاکم کے شرائط پر بحث کریں گے:

معاشرے میں حکومت اور قانون کی ضرورت:

مرحوم علامہ طباطبائی فرماتے ہیں:

''ملک'' سلطنت کے معنی میں ضروریات بدیہیہ میں سے ہے کہ انسان اس سے مستغنی نہیں ہے۔ لیکن جس چیز کی بشر کو ابتدا میں ضرورت ہے، وہ اجتماع کی تشکیل ہے۔ معاشرے کے افراد کا ایک دوسرے سے ربط اور لگاؤ اس طرح سے کہ معاشرے کا ہر فرد دوسروں کے مقصد اور چاہت کے علاوہ اپنے لئے ایک مقصد اور ارادہ رکھتا ہے، نہ وہ معاشرہ جو کہ فرد فرد کے اعتبار سے ایک دوسروں سے ربط وضبط کے بغیر ہوتا ہے، کیونکہ ایک ایک فرد مختلف مطالبات اور گوناگوں مقاصد رکھتے ہیں، اس لحاظ سے ان کی ایک دوسرے سے نہیں بنتی ہے، ہر فرد دوسروں کے ماحصل کو چرا کر ان پر غلبہ پانا چاہتا ہے اور دوسروں کے حقوق کو پائمال کرنا چاہتا ہے، جس کے نتیجہ میں معاشرے میں ناامنی پھیلتی ہے اور جس معاشرے کو زندگی کی سعادت کے تحفظ کے لئے تشکیل دیا گیا تھا اسے بدبختی ونابودی کا وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہے کہ معاشرا اپنے لئے ایک قہر وغلبہ پانے والی طاقت فراہم کرے تا کہ تمام دیگر قوا اور توانائیوں کو اپنے کنٹرول میں قرار دے۔ تمام لوگوں کو اپنے فرمان کے تحت قرار دے اور نتیجہ کے طور پر دوسروں پر ظلم والی سرکش طاقتوں کو اعتدال میں لایا جائے۔ کمزور افراد کو بھی کمزوری اور سستی کے مرحلہ سے نجات دلا کر درمیانی حد تک

پہنچادیں تا کہ سرانجام معاشرے کی تمام توانائیاں قوت وضعف کے لحاظ سے برابر اور ایک دوسرے کے نزدیک ہوجائیں اور اس کے بعد ہر طاقت کو اس کی خاص جگہ پر معین کردیا جائے ،تو اس صورت میں ہر حقدار کو اس کا حق پہنچ جائے گا'' [1]

واضح ہوا کہ انسان کی زندگی ایک اجتماعی زندگی ہے۔اب یہ کہ کیوں اس کی زندگی اجتماعی ہے، کیا اجتماعی ہونا جبراً انسان پر مسلط ہے یا انسان کی فطرت پہلے سے اجتماعی زندگی کی متقاضی ہے اور کیا کوئی عقلائی اور اختیاری عامل اجتماعی زندگی کے انتخاب میں موثر ہے یا نہیں؟ یہ وہ مباحث ہیں جن کے بارے میں فراواں بحثیں ہوئی ہیں، لیکن ہماری نظر یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے انتخاب میں عقلائی عامل مؤثر ہے، چونکہ انسان اجتماعی زندگی میں اپنے لئے منافع دیکھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس کی مادی ومعنوی ضرورتیں اجتماعی زندگی کے بغیر یا اصلاً پوری نہیں ہوتی ہیں یا مطلوب صورت میں مکمل طور پر پوری نہیں ہوتی ہیں، اس لئے وہ اجتماعی زندگی کو پسند کرتا ہے اور اس کے شرائط کو قبول کرتا ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کا لازمی نتیجہ معاشرے کے مختلف افراد کے منافع کے درمیان ٹکراؤ کا پیدا ہونا ہے۔یعنی جب لوگ اجتماعی زندگی چاہتے ہیں اور آپس میں ایک ساتھ زندگی گزارتے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں، اس باہمی تعاون کے ماحصل کو آپس میں تقسیم کرتے ہیں، تو ان کے منافع اور خواہشات کے درمیان ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔بعض لوگ زیادہ سے زیادہ نفع کے درپے ہوتے ہیں اور الٰہی عطیوں اور نعمتوں سے لامحدود صورت میں فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور دوسرے انسانوں کے ساتھ برتاؤ کے طریقہ کو اپنی مرضی کے مطابق برقرار کرنا چاہتے ہیں اور ان کا یہ رویہ دوسروں کو پسند نہیں ہوتا ہے۔ پس معاشرے میں کشیدگی پیدا ہوتی ہے، کہ اس کو روکنے کے لئے حدود اور قوانین مرتب ومعین کئے جانے چاہئے یہ بھی ایک بدیہی امر ہے اور اس کا واضح ہونا یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص انسان کی خواہشات خواہ مادی یا معنوی کے بارے میں تھوڑا سا غور کرے (جو اجتماعی زندگی سے مربوط ہے) تو وہ دیکھے گا کہ تمام افراد کی لامحدود خواہشات کا پورا ہونا ممکن نہیں ہے اور اگر انسان اجتماعی طور پر زندگی گزارنا چاہے تو اسے اپنی خواہشات کے لئے ایک حد معین کرنا چاہئے اور من پسند طور پر عمل نہ کرے۔

پس ٹکراؤ کو دور کرنے یا اسے کم کرنے کے لئے ہم حدود اور قوانین کے محتاج ہیں۔اگر ہم اجتماعی

۱۔المیزان، ج۲، ص۱۴۴

زندگی میں افراد کے استفادہ کے لئے حدود کے قائل نہ ہو جائیں یا کچھ انسان ان حدود کی رعایت نہ کریں تو اجتماعی زندگی کا مقصد کہ انسان کے معنوی و مادی تکامل و ترقی کے لئے طبیعت کی نعمتوں سے استفادہ کرنا ہے حاصل نہیں ہوگا۔ پس اجتماعی زندگی اس طرح نظم وضبط کے ساتھ گزارنا چاہئے کہ معاشرے کے تمام افراد کے لئے روز افزوں ترقی اور تکامل کے مواقع فراہموں۔ صرف اسی صورت میں اجتماعی زندگی کا مقصد صحیح معنوی میں پورا ہوسکتا ہے۔

اسلامی نظام میں، جو اسلامی اصول اور نظریات پر مبنی ہے، ضرورت ہے کہ قانون الٰہی ہو۔ اس امر کی دلیل وہ دعوی ہے جسے اسلام نے معاشرے کے امور کی تدبیر میں ایک ہمہ جہت مکتب کے طور پر پیش کیا ہے۔ ہم بھی اسلام کے پیرو ہیں اور اس پر عمل کرنے کو عام سعادت کی ضمانت سمجھتے ہیں ہمیں گوناگوں مذاہب و مکاتب فکر کے مختلف رجحانات جنھیں دنیا کے اکثر ممالک نے کم وبیش قبول کیا ہے کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے عقیدہ اور ارمانوں کا استدلال و تفکر کے اسلحہ سے دفاع کرنا چاہئے۔

صالح اور شائستہ حاکم کے شرائط:

یہاں تک معاشرے میں حکومت اور قانون کے وجود کی ضرورت بیان ہوئی، اور چونکہ حکومت کی تشکیل اور قانون کا نفاذ حاکم کے وجود کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس لئے ہم امور حکومت کو سنبھالنے والے حاکم کے بعض شرائط کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ **شناخت قانون**: جو شخص قانون کو نافذ کرنا چاہتا ہو، خواہ وہ قانون داخلی امن وسلامتی کے بارے میں ہو خواہ دفاع کے بارے میں یا بین الاقوامی تعلقات، یا دوسری چیزوں کے بارے میں اسے قانون اور ان اصولوں اور قدروں کے بارے میں جن پر وہ قانون استوار ہے، کافی شناخت و معلومات ہونی چاہئے۔

۲۔ **تقویٰ**: تقویٰ، اسلامی ثقافت میں ایک کلی شرط ہے اور عام لغت میں اسے ''فرضیہ شناسی'' کہتے ہیں۔ جو شخص معاشرے کے امور کا حاکم بن جاتا ہے اور لوگوں کی مصلحتوں کو اپنے ذمہ سنبھالتا ہے، اسے ان کی مصلحتوں کو پورا کرنے کی فکر میں ہونا چاہئے، نہ یہ کہ اقتدار پر پہنچنے کے بعد اپنے ذاتی مقاصد اور دنیوی خواہشات کو پورا کرنے کی فکر میں ہو، ایسی صورت میں اس قسم کا شخص لوگوں کے جان مال، کی

حفاظت اور قانون نافذ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ قانون کو اس کے برخلاف اور اپنی خواہشات کے مطابق تفسیر وتاویل کرتا ہے یا اسے نسخ کرتا ہے اور بعض اوقات واضح طور پر اس کی مخالفت کرتا ہے۔ پس حکومتی امور کو سنبھالنے والے کے لئے دوسری شرط اخلاقی اقدار سے برخوردار ہونا، یا قرآن مجید اور اسلامی ثقافت کی اصطلاح میں صاحب تقویٰ ہونا ہے۔

۳۔ تجربہ کاری: جو بھی کسی کام کو انجام دینے کی ذمہ داری سنبھالے اس میں اس کام کو انجام دینے کی صلاحیت ہونی چاہئے، کیونکہ کسی شخص کے لئے صرف قانون کے بارے میں آگاہی رکھنا اور صاحب تقوی ہونا کام کو صحیح طور پر انجام دینے کے لئے کافی نہیں ہے، بلکہ اس کام کے بارے میں مہارت اور تجربہ کاری کا بھی ہونا ضروری ہے تاکہ اس کی مدد سے مسئولین (اراکین) کو پیش آنے والے چھوٹے بڑے مسائل ومشکلات کو حل کر سکے۔

اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے کہ انسانی معاشرے ٹکراؤ اور کشیدگیوں کو دور کرنے شخصی اور معاشرتی منافع کے بارے میں حدود معین کرنے اور بالاخر معاشرتی زندگی میں اعتدال پیدا کرنے کے لئے قانون کے محتاج ہیں، اور اس کو صحیح طور پر نافذ کرنے کے لئے اور باغیوں اور سرکشوں کو دور کرنے کے لئے والی اور حاکم کے محتاج ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ولایت اور سرپرستی کا حق فقط خدائے متعال کو ہے اور دوسرے اس کی اجازت سے لوگوں کے والی اور سرپرست ہوتے ہیں؟ یا بعض انسان بنیادی طور پر دوسروں پر ولایت وسرپرستی کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ کوئی بھی انسان دوسرے افراد پر ولایت وسرپرستی کا حق نہیں رکھتا ہے، کیونکہ انسان اسی کی اطاعت کرتا ہے کہ جس سے اس نے اپنے وجود جیسی نعمت کو حاصل کیا ہے، چونکہ عام لوگوں نے نہ انسان کو ھستی عطا کی ہے اور نہ اس کے بقا اور دوام میں مؤثر ہیں اس لئے کسی کا حکم دوسری کے لئے واجب الاطاعت نہیں ہے۔

انسانوں کی عدم ولایت میں پہلی اصل افراد کی پیروی کی عدم ضرورت ہے۔ چونکہ انسان اپنی ھستی کی پوری حیثیت کو خدائے متعال سے حاصل کرتا ہے اس لئے اس پر واجب ہے، صرف اس کے حکم کی تعمیل کرے اور اس کے علاوہ کسی اور کے حکم کی تعمیل کرنے میں یہ شرط ہے کہ وہ دوسرا خدائے

متعال کی طرف سے معین ہونا چاہئے۔

مذکورہ مطالب کے پیش نظر جب ہم قرآن مجید پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ خدائے متعال باطل ولایتوں کو، یعنی جن ولایتوں پر خداوند عالم نے دستخط نہیں کئے ہیں، مسترد کرتا ہے:

﴿یا ایها الذین آمنوا لاتتخذوا الیهود والنصاری اولیاء بعضهم اولیاء بعضٍ و من یتولّهم منکم فانّه منهم انّ اللّٰه لا یهدی القوم الظالمین﴾ (مائدہ/۵۱)

''ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو (کہ اسلام کے دشمن ہیں) اپنا دوست اور سرپرست نہ بناؤ کہ یہ خود آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو کوئی انھیں دوست بنائے گا تو (کفر و ظلم میں) انھیں میں شمار ہوگا۔ بیشک اللہ ظالم قوم کی ہدایت نہیں کرتا ہے۔''

(جملہ '' ان اللّٰه لایهدی القوم الظالمین'' اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ظالم ہیں اور ظالم کبھی ہدایت سے بہرہ مند نہیں ہوتا، ہرگز مقصد تک نہیں پہنچتا بلکہ وہ متواتر راستہ میں ہی رہتا ہے۔ پس اگر تم لوگ بھی ان کے ہی زمرہ میں قرار پائے تو مقصد تک نہیں پہنچ پاؤ گے)

پروردگار عالم ایک دوسری آیت میں حاکم برحق کا یوں تعارف کراتا ہے:

﴿انّما ولیکم اللّٰه و رسوله و الذین آمنوا الذین یقیمون الصّلوة و یؤتون الزّکوة و هم راکعون﴾ (مائدہ/۵۵)

''ایمان والو! بس تمھارا ولی اللہ ہے اور اس کا رسول اور وہ صاحبانِ ایمان جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوۃ دیتے ہیں (تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ آیہ شریفہ کے مصداق حضرت علی علیہ السلام ہیں''

پس معاشرے میں حکومت کی ضرورت کے پیش نظر اسلام میں جو شاہد پیش کئے گئے ہیں اور حاکم برحق کے لئے جو شرائط ذکر ہوئے ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے، کہ شخص معصوم کے حضور کی صورت میں (جیسے وجود مقدس رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور معصوم ائمہ علیہم السلام) وہی حکومت کا والی و سرپرست ہوگا اور فطری بات ہے کہ ایسی حکومت کافی مطلوب اور مثالی ہوگی۔ لیکن یہ صورت ہمیشہ ممکن نہیں ہے، حتی امام

معصوم کے حضور کے زمانے میں بھی وہ صرف جس جگہ پر تشریف رکھتے ہیں، اسی شہر یا صوبے کی حکومت چلا سکتے ہیں اور دیگر تمام شہروں میں اپنے کارندے اور عامل معین کر کے امور کی نگرانی اور نظارت کریں گے۔ عصر غیبت میں امام معصوم تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے، کسی کا اس منصب پر فائز ہونا ضروری ہے تا کہ اسلامی معاشرے کو قوانین الٰہی اور اسلام کے اصولی کی بنیاد پر قیادت ورہبری کرے، اس کے حسب ذیل شرائط ہیں۔

۱۔ اسلام کے بارے میں کافی آگاہی:

چونکہ رہبری اور حکومت کی مسئولیت میں، قوانین اور اسلامی اقدار کی حفاظت مسلمانوں کے حاکم کے ذمہ ہے اور وہ دین، ناموس اور احکام خدا کا امانت دار ہوتا ہے، اس لئے ان تینوں شرائط یعنی: قانون کے بارے میں آگاہی، تقوی واخلاقی صلاحیت اور حکومت چلانے کی اہلیت وقدرت کے سلسلہ میں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ آگاہی اور مہارت رکھتا ہو۔ ایک روایت کا مضمون یہ ہے کہ اگر ایک معاشرے میں کوئی شخص امامت ورہبری کو اپنے ذمہ لے لے، جبکہ دوسرے لوگ حتی ایک آدمی بھی اس معاشرے میں اس سے داناتر وشائستہ تر موجود ہوں تا تو وہ معاشرہ ہمیشہ رو بہ زوال ہوگا:

"من امّ قوماً و فیهم من هوا علم منه او افقه لم یزل امرهم الی سفالٍ الی یوم القیامة" [۱]

۲۔ تقوی:

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلاحیت رہبری کی شرائط میں سے ایک شرط کہ جو اسے خدا کے حرام سے بچاتی ہے تقوی وپرہیز گاری بیان فرمائی ہے:

"ورع یحجزه عن معاصی اللّٰه" [۲]

امام حسین علیہ السلام ایک روایت میں معاشرے کی رہبری کے بارے میں اہل کوفہ کو لکھتے ہیں:

"ما الامام الا الحاکم بالکتاب، القائم بالقسط، الدّائن بدین الحق

۱۔ بحار الانوار، ج ۸۸/، ص ۸۸/

۲۔ اصول کافی، ج ۲/، ص ۲۶۶/

الحابس نفسه علی ذات اللّٰه" [۱]

''پیشوا اور امام نہیں ہے مگر وہ جس کی حکومت قرآن مجید کی بنیاد پر ہو، عدل و انصاف کو قائم کرتا ہو اور دینِ حق پر پابند ہو اور خود کو خدا کی راہ میں وقف کرے۔''

حضرت علی علیہ السلام عثمان سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

"فاعلم انّ افضل عباد اللّٰه عند اللّٰه امام عادل هدی و هدی فاقام سنّة و معلومة و امات بدعة مجهولة ... و انّ شرّ الناس عندا للّٰه اما م جائرٌ ضلّ و ضلّ به فامات سنة ماخوذة و احیا بدعة متروکة" [۲]

''جان لو! خدا کے نزدیک بندوں میں برترین شخص عادل اور نجات یافتہ پیشوا ہے جو ہدایت یافتہ رہنما ہو اور سنت اور معروف طریقہ (پیغمبر اکرمؐ سے) کو رواج دے اور باطل و غلط بدعت کو نابود کرے۔ خدا کے پاس لوگوں میں سے بدترین شخص ظالم امام ہے جو خود گمراہ ہو اور دوسروں کو گمراہ کرنے کا سبب بنے، قبول کی گئی سنت کو نابود کرے اور چھوڑی ہوئی بدعت کو پھر سے زندہ کرے''

۳۔ تدبیر و مدیریت:

تیسری شرط امور کو چلانے کی مہارت حسن تدبیر اور معاشرے کے امور کی مدیریت ہے۔

اسلامی حاکم کے لئے، رہبری کی توانائی اور معاشرے کو اسلام کے راستہ پر چلانے کی طاقت کا ہونا ضروری شرط میں شمار کیا گیا ہے اور اس خصوصیت کے لئے بہت سے مقدمات، تجربے، آگاہی اور عوامل کی ضرورت ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص اجتماعی امور کے بارے میں سیاسی تدبیر و دیانت میں اس حد تک پہنچ جائے تو مسلمانوں کی مسئولیت و ذمہ داری کو اسے سونپا جا سکتا ہے۔

۲۔ محمد بن نعمان (مفید)، ارشاد، ص ۱۸۶/

۳۔ نہج البلاغہ (ترجمہ شہیدی) خ ۱۸۳، ص ۱۷۳

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ایھا الناس انّ احقّ الناس بھذا الامر اقواھم علیه و اعلمھم بامر الله فیه"[1]

لوگو! خلافت کا سزاوار وہ شخص ہے جو اس کام کے لئے توانا تر اور خدا کا حکم جاننے میں دانا تر ہو۔"

ولی فقیہ، صالح اور شائستہ ترین فرد:

حاکم اسلامی کے لئے بیان کئے گئے معیار وصفات کے پیش نظر ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں شائستہ ترین فرد کی حکومت کی راہ اور مواقع فراہم ہیں، گزشتہ زمانہ میں ایسے اشخاص کے توسط سے حکومت اختیار میں لینا بہت بعید اور بعض اوقات ناممکن نظر آتا تھا، ایسی بحثیں بھی نہیں ہوتی تھیں اور صرف "مرجع تقلید" کا مسئلہ پیش کیا جاتا تھا۔

اس جہت سے اسلام کے ہمدرد اور مصلحت اندیش کچھ بزرگ تھے جو "مرجع تقلید" کے عنوان سے معاشرے کی بہترین خدمت انجام دینے والی فرد کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن آج بحمد للہ صالح افراد کے ذریعہ حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے اسباب وسائل فراہم ہوئے ہیں اور اس عظیم اسلامی انقلاب اور شہیدوں کے مقدس خون کی برکت سے ایسے شرائط فراہم ہو گئے کہ اس نے ہمیں اسلامی نظام میں، رہبری (ولی فقیہ) کی نعمت سے سرفراز فرما کر ہم پر احسان کیا ہے۔ اس نعمت کی شکر گزاری کو صرف ولایت فقیہ کی اطاعت سے انجام دیا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمین کی عزت و امت اسلامیہ کی وحدت و یکجہتی کا ضامن ہے۔

حضرت امام خمینی قدس اللہ نفسہ الزکیہ کی حیات میں ہم اس نعمت سے مستفید تھے اور آج بھی افسوس کہ اس عظیم نعمت سے محروم ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود خدائے متعال نے اپنی نعمت کو ہم پر جاری رکھتے ہوئے ولی فقیہ کے سایہ کو ہمارے سروں پر استمرار بخشا ہے۔ ہم خدا کا لاکھ لاکھ شکر بجالاتے ہیں کہ امت کے ماہر اور دانا افراد (خبرگان) نے امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کے دوستوں میں سے بہترین اور شائستہ ترین فرد یعنی حضرت آیت اللہ العظمی خامنہ ای مدظلہ العالی کو ان کا جانشین منتخب کیا اور تمام لوگوں نے خوشی

۱۔ نہج البلاغہ "فیض الاسلام" خطبہ ۱۶۳ و ۵۲۶

خوشی ان کی بیعت کی ہے اور امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کے تمام ساتھیوں نے کمال ہمدلی و یکجہتی سے راہ امام کو ثبات بخشا ہے اور بحمد للہ امور کو جاری رکھنے میں کسی قسم کی سستی اور خلل کا سامنا نہیں ہوا۔ ہم بارگاہ الٰہی میں دست بہ دعا ہیں کہ مسئولین کا یہ اتحاد و یکجہتی قائم و دائم رہے اور روز افزوں مستحکم اور پائدار تر ہو جائے تا کہ انقلاب اسلامی کی یہ کشتی رہبر معظم کی قیادت میں امن و مقصد کے مطلوب ساحل سے ہم کنار ہو جائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ و آلہ وسلم جناب ابوذر غفاری کو نصیحت فرماتے ہیں کہ قانون الٰہی کے مطابق اور عدل و انصاف کی بنیاد پر حکومت کرنے والے عادل حاکم کا احترام کرو اس لئے کہ اس کا احترام کرنا، خدا کا احترام کرنا ہے، خدا کی صفات میں سے ایک صفت حاکمیت ہے، کیونکہ اسمائے الٰہی میں سے ایک اسم حاکم و مولا ہے اور خدا کا مولا ہونا اور حکومت الٰہی عملا خدا کے عادلانہ احکام میں ظہور پذیر ہے کہ اس خطیر اور عظیم ذمہ داری کی باگ ڈور حاکم اسلامی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

عادل مسلمان فرمانروا اور ولی امر مسلمین، جو قانون الٰہی کے مطابق حکم دیتا ہے، اور اسلامی معاشرہ میں احکام الٰہی کو نافذ کرنے کی کوشش کرتا ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام کی ولایت کے ایک مرتبہ کا حامل ہوتا ہے۔ کیونکہ ولایت الٰہی در حقیقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کو سپرد کی گئی ہے۔ اور اس کا ادنی درجہ سلطان عادل اور ولی امر مسلمین کو سپرد کیا گیا ہے، اس لحاظ سے اس کا احترام خدا کا احترام ہے۔

اس بنا پر بعض لوگوں کے تصور کے خلاف کہ سوچتے ہیں اسلامی حاکم کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے اگر کوئی شخص خدا کے لئے اور اسلام و اسلامی نظام حکومت کے احترام کی نیت سے رہبر معظم اور ولی امر مسلمین کا کسی ذاتی غرض کے بغیر احترام کرے، اور اس کے احترام کی دلیل یہ ہو کہ ولی امر مسلمین اسلامی احکام کو نافذ کرتا ہے اور قرآن مجید کا مروج ہے تو اس کا یہ احترام قابل اہمیت ہے۔

اس مطلب کو ذکر کرنا میں اپنا فرض جانتا ہوں کہ انقلاب اسلامی کی کامیابی کے بعد ولی امر مسلمین کے ہاتھوں جو بہترین اور شائستہ ترین سنتیں ہمارے ملک میں ایجاد ہوئیں وہ قرآن مجید کی قرائت اور حفظ کی سنت کا احیاء اور زندہ کرنا ہے۔ آپ مشاہدہ فرما رہے ہیں کہ بعض اوقات ٹیلی ویژن چھوٹے چھوٹے کمسن اور نوعمر بچوں کو دکھاتا ہے کہ جو حافظ قرآن ہیں۔ ہم کبھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک چھوٹی بچی جو ابھی اچھی طرح سے بات بھی نہیں کر سکتی ہے، قرآن مجید کا ایک تہائی حصہ حفظ کر چکی ہے، وہ بھی عربی لہجہ میں! آپ کو

یاد ہوگا کہ انقلاب سے پہلے ہمیں انتہائی محنت کرنا پڑتی تھی تا کہ لوگ حمد وسورہ کو صحیح پڑھ سکیں اور ''سین وصاد'' میں فرق کر سکیں، حتی پڑھے لکھے لوگوں کے لئے بھی حمد وسورہ کی تجوید سیکھنا مشکل امر تھا۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں ایک ۶ یا ۷ سالہ بچی قرآن مجید کے ایک تہائی حصہ کو حفظ کر چکی ہے اور تجوید کے ساتھ ہم سے بہتر تلاوت کرتی ہے! کیا یہ قابل فخر ومباہات نہیں ہے؟ کیا جس نے اس سنت کو زندہ کیا ہے، اس کا احترام نہیں کرنا چاہئے؟ یقیناً ایسے شخص کا احترام خدا کا احترام ہے، قرآن مجید کا احترام ہے، پس ہمیں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے۔ اگر ہم ان احتراموں کی رعایت نہ کریں تو شعائر اسلامی نابود ہو جائیں گے۔ معاشرے میں دین کی بقا شعائر اسلامی کی بقا پر منحصر ہے۔ اگر یہ احترام کرنا عام ہو کر رواج نہ پائے اور لوگوں میں اس کی تشہیر نہ ہو تو آہستہ آہستہ یہ قدریں فراموش ہو جائیں گی اور یہ کفران نعمت ہوگا۔

ہم اس بڑی نعمت کو درک کرتے ہیں جسے خدائے متعال نے ہمیں عنایت کی ہے، ہمیں اس کی قدر کرنی چاہئے اور نظام اسلام کی رہبری کا احترام کرنا چاہئے۔ البتہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ اس احترام کی قدر اس وقت ہے کہ جب طمع اور لالچ کی غرض سے نہ ہو، بلکہ فریضہ انجام دینے اور خدا کی خوشنودی کے لئے ہونا چاہئے اور اس لئے ہو کہ مسلمانوں کے قائد کا احترام، اسلامی نظام کا احترام ہے اور اسلام کا احترام خدا کا احترام ہے۔

۱۔ یہ ولایت اور حکومت سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۵۵ میں واضح طور پر بیان ہوئی جہاں پر خدائے متعال فرماتا ہے: ''انما ولیکم اللہ و رسولہ والذین آمنوا...''

تینتیسواں درس

زبان کو محفوظ رکھنے کی ضرورت اور اس کے آفات کی مذمت

- اعمال کا ایک دوسرے کے مقابل اثر احتیاط و تکفیر
- دوسروں کی عیب جوئی کرنے کی مذمت
- چاپلوسی اور بے جا ستائش کی مذمت
- دوسروں کی طعنہ زنی اور زخم زبان کی مذمت
- اپنی بات پر ہٹ دھرمی کرنے کی مذمت

زبان کو محفوظ رکھنے کی ضرورت اور اس کے آفات کی مذمت

"یا اباذر؛ ما عمل من لم یحفظ لسانه. یا اباذر؛ لاتکن عیّابا و لا مدّاحاً و لا طعّاناً و لا مماریاً، یا اباذر؛لایزال العبد یزداد من اللّٰه بعدا ما ساء خلقه"

"اے ابوذر! جو اپنی زبان کو کنٹرول نہ کرتا، اس کا نیک کام ضائع ہو جاتا ہے۔ اے ابوذر! عیب جوئی، بے جا تعریف، جھگڑالو، اور طنز گوئی کے مرتکب نہ ہونا۔ اے ابوذر! جب تک انسان بداخلاق رہتا ہے خدائے متعال سے دور ہوتا ہے۔"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصیحتوں کا یہ حصہ زبان سے مربوط ہے۔ (جیسا کہ ملاحظہ ہو رہا ہے کہ یہ فقرے موضوع کے لحاظ سے پہلے اور بعد والے جملوں سے کوئی ربط نہیں رکھتے ہیں، لگتا ہے کہ نقل میں آگے پیچھے ہو گئے ہیں اور ان فقروں کا ذکر زبان سے متعلق نصیحتوں کے بعد آنا چاہئے تھا اس سے پہلے جملہ ان من اجلال اللّٰہ ذکر کیا گیا ہے میرے خیال میں لگتا ہے کہ جملہ انّ من اجلال اللّٰہ کو نقل کرنے میں مقدم کر دیا گیا ہے)

اعمال کا ایک دوسرے کے مقابل اثر یا احباط و تکفیر:

ان بیانات میں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گفتگو کرنے میں احتیاط کی اہمیت کو ایک دوسرے طریقہ سے بیان فرمایا ہے۔ یہ اس جہت سے ہے کہ انسان اپنی زبان کو کھلی ڈھیل نہ دے کہ جو جی چاہے بول دے اور جو زبان پر آئے بک دے بلکہ زبان پر تالا لگائے اور فکر کرے۔ چونکہ انسان کے لئے بات کرنا بہت آسان ہے، کبھی معمولی اور چھوٹے اغراض بھی زیادہ باتیں کرنے اور دوسروں کی بدگوئی کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ بزرگان دین نے کوشش کی ہے کہ مختلف تعبیروں اور طریقوں سے ہمیں اس بات کی تاکید کریں کہ ہم اپنی زبان کے بارے میں ہوشیار رہیں اور اسے آزاد نہ چھوڑیں۔ انھیں تعبیرات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ نصیحت بھی ہے کہ جس نے اپنی زبان کو کنٹرول نہیں کیا اس نے کوئی عمل انجام نہیں دیا ہے۔ شاید اس بات میں یہ نکتہ پوشیدہ ہو کہ زبان انسان کی روح میں ایسے شر پسند عناصر کو جنم دیتی ہے کہ جو انسان کے تمام اعمال کو نابود کر دیتے ہیں چونکہ آیات و متواتر روایات میں آیا ہے کہ انسان کے اعمال ایک دوسرے میں اثر ڈالتے ہیں، کبھی انسان ایک فعل انجام دیتا ہے لیکن اس کے بعد جو فعل انجام دیتا ہے وہ پہلے والے فعل کی خاصیت کو بدل کے رکھ دیتا ہے اور اس میں ایک ایسا اثر ڈالتا ہے کہ اس کا اپنا اثر نابود ہوتا ہے، خواہ وہ اثر اچھا ہو یا بُرا۔

علم کلام کی کتابوں میں ''احباط و تکفیر'' کے عنوان سے ایک بحث پیش کی گئی ہے۔ ''حبط'' نیک کاموں کے بے اثر ہونے کے معنی میں ہیں۔ یعنی انسان کے بُرے کام اس کے اچھے کام کو حبط و ضائع کر دیتے ہیں اور انھیں بے فائدہ اور بے نتیجہ کر ڈالتے ہیں۔ اور ''تکفیر'' گناہوں کی تلافی کے معنی میں ہے اور یہ اچھا اور پسندیدہ عمل ہے، اور پہلے والے کام کے نقص کی تلافی کرتا ہے۔ چونکہ ہمارے تمام اعمال کی بنیاد ایمان و کفر پر ہے، لہذا ''احباط و تکفیر'' کے واضح ترین مصداق ایمان و کفر ہیں:

انسان جو گناہ اور بُرے اعمال کے بعد ایمان اور صالح عمل انجام دیتا ہے، وہ اپنے گزشتہ کفر و ناشائستہ عمل کی تلافی کرتا ہے اور روشن نور کی طرح گزشتہ کی تاریکیوں کو زائل کر دیتا ہے اور اس کے برعکس کفر اور ناشائستہ اعمال، گزشتہ نیک اعمال کو نابود کر کے رکھ دیتے ہیں اور انسان کے ریکارڈ کو سیاہ اور اس کے انجام کو تباہ کر دیتے ہیں یہاں تک کہ خرمن میں لگی آگ کی طرح سب کچھ خاکستر ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ

میں، ایمان اس نورانی چراغ کے مانند ہے جو دل اور روح کے گھر کو روشن اور منور کر دیتا ہے اور تاریکیوں اور سیاہیوں کو نابود کر دیتا ہے اور کفر اس چراغ کے بجھنے کے مانند ہے کہ جس کی وجہ سے تمام روشنی ختم ہو جاتی ہے اور تاریکیاں پھیل جاتی ہیں۔ جب تک انسان کی روح اس تغیر ہونے والی شی سے تعلق رکھتی ہے ہمیشہ روشنی و تاریکی، نور و ظلمت کی کمی بیشی سے دوچار ہوتی رہتی ہے، یہاں تک اس دنیا سے رخصت ہو جائے اور اس پر ایمان و کفر کو انتخاب کرنے کی راہ بند ہو جائے، پھر جس قدر بھی دوبارہ اس دنیا میں آ کر تاریکیوں کو دور کرنے کی آرزو کرے گا، کوئی فائدہ نہیں ہوگا:

﴿حتی اذا جاء احد هم الموت قال رب ارجعون لعلی اعمل صالحا فیما ترکت کلا انها کلمة هو قائلها ومن ورائهم برزخ الی یوم یبعثون﴾ (مؤمنون / ۹۹ و ۱۰۰)

''یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آ گئی تو کہنے لگا کہ پروردگار مجھے پلٹا دے، شاید میں اب کوئی نیک عمل انجام دوں (ان سے کہا جائے گا) ہرگز نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا جو یہ کہہ رہا ہے وہ حسرت کی بنا پر اور اس کے پیچھے ایک عالم برزخ ہے جو قیامت کے دن تک قائم رہنے والا ہے''

قرآن مجید کے نقطۂ نگاہ سے ایمان و کفر کے درمیان اس تاثیر و تاثر میں کسی قسم کے شک اور تذبذب کی گنجائش نہیں ہے۔ اس مطلب کی دلالت میں فراوان آیتیں موجود ہیں، من جملہ خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿ومن یؤمن باللّٰه و یعمل صالحاً یکفّر عنه سیئاته﴾ (تغابن/ ۹)

''اور جو اللہ پر ایمان رکھے گا اور نیک اعمال انجام دے گا، خدا اس کی برائیوں کو دور کرے گا''

ایک اور جگہ پر فرماتا ہے:

﴿ومن یرتدد منکم عن دینه فیمت و هو کافر فاولئک حبطت اعمالهم فی الدّنیا و الآخرة و اولئک اصحاب النار هم فیها خالدون﴾ (بقرہ/ ۲۱۷)

''اور تم ہی سے جو اپنے دین سے پلٹ جائے اور کفر کی حالت میں مرجائے اس کے

سارے اعمال دنیا و آخرت میں برباد ہو جائیں گے اور وہ جہنمی ہوگا اور وہیں ہمیشہ رہے گا"

ایمان و کفر کے درمیان جیسا رابطہ اجمالی طور پر نیک و بد کاموں میں بھی موجود ہے، لیکن کلی طور پر اور ایسا نہیں کہ انسان کے نامہ اعمال میں ہمیشہ یا نیک کام درج ہوں گے اور اس کے گزشتہ بُرے اعمال نابود ہو جائیں گے یا بُرے کام محفوظ ہوں گے اور اس کے گزشتہ نیک اعمال نابود کر دیئے جائیں گے، بلکہ اعمال کے بارے میں تفصیل کا قائل ہونا چاہئے، اس معنی میں کہ بعض نیک اعمال اگر قابل قبول اور شائستہ صورت میں انجام پائیں گزشتہ برے اعمال کے آثار کو نابود کر دیتے ہیں، جیسے توبہ اگر مطلوب صورت میں انجام پائے، تو انسان کے گناہ بخش دیئے جائیں گے:

﴿ومن یعمل سوء او یظلم نفسه ثمّ یستغفر اللّٰه یجد اللّٰه غفوراً رحیماً﴾ (نساء/۱۱۰)

"اور جو بھی کسی کے ساتھ برائی کرے گا یا اپنی نفس پر ظلم کرے گا اس کے بعد توبہ و استغفار کرے گا تو خدا کو غفور و رحیم پائے گا"

مزید فرماتا ہے:

﴿والذین اذا فعلوا فاحشة او ظلموا انفسهم ذکروا اللّٰه فاستغفروا لذنوبهم و من یغفر الذنوب الا اللّٰه ولم یصرّوا علی ما فعلوا وهم یعلمون﴾ (آل عمران /۱۳۵)

"نیک لوگ وہ ہیں کہ جب کوئی نمایاں گناہ کرتے ہیں یا اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں تو خدا کو یاد کر کے اپنے گناہوں پر استغفار کرتے ہیں اور خدا کے علاوہ کون گناہوں کا معاف کرنے والا ہے اور وہ اپنے برے عمل پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے اس لئے کہ گناہ کی پلیدی سے آگاہ ہیں"

پس توبہ بالکل نور کی شعاع کے مانند ہے جو درست تاریکی کے نقطہ پر چمکتی ہے اور اسے روشن کرتی ہے۔ پس ایسا نہیں ہے کہ ہر نیک عمل تمام گناہ کے اثر کو نابود کر دے، اس لحاظ سے ممکن ہے مومن شخص ایک مدت تک گناہ کے عذاب میں گرفتار رہے اور سرانجام ہمیشہ کے لئے بہشت میں داخل ہو جائے۔

گویا انسان کی روح کے مختلف اور گوناگوں رخ ہیں اور نیک و بد اعمال کا ہر مجموعہ ان کے ایک پہلو سے مربوط ہوتا ہے۔ مثلاً جو نیک عمل کا پہلو ''الف'' سے مربوط ہے، وہ ''ب'' کے پہلو سے ربط رکھنے والے گناہ کے اثر کو نابود نہیں کر سکتا، مگر یہ کہ عمل صالح اس قدر نوارنی ہو کہ روح کے دوسرے جوانب پر بھی سرایت کرے، یا گناہ اس قدر آلودہ کرنے والا ہو کہ روح کے تمام رخ کو بھی آلودہ کر دے۔ مثلاً نماز کے بارے میں قرآن مجید میں آیا ہے:

﴿واقم الصلوة طرفی النهار و زلفا من الّیل انّ الحسنات یذهبن السیئات﴾ (هود/۱۱۴)

''اور اے پیغمبر! آپ دن کے دونوں حصہ میں اور رات گئے نماز قائم کریں بیشک نیکیاں برائیوں کو ختم کر دینے والی ہیں''

عاق والدین اور شراب نوشی جیسے بعض گناہ ایکحد (مدت) تک عبادت کے قبول ہونے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شراب نوشی کے نامطلوب اثر کے بارے میں فرماتے ہیں:

''اقسم ربّی جل جلاله فقال: لایشرب عبدلی خمرا فی الدنیا الا سقیته یوم القیامه مثل ماشرب منها من الحمیم....'' [۱]

''میرے پروردگار نے قسم کھائی اور فرمایا: میرا بندہ دنیا میں شراب نہیں پیتا ہے مگر یہ قیامت کے دن اسے اسی مقدار میں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا جتنی کہ اس نے شراب پیے۔''

مناسب ہے اس بات کی طرف اشارہ کریں کہ نیک و بد اعمال، بعض اوقات خوشی و غم یا توفیق او رسلب توفیق جیسے اور دوسرے امور میں اسی دنیا میں مؤثر ہوتے ہیں، چنانچہ دوسروں کا احسان، خاص کر ماں باپ اور رشتہ داروں کا احسان عمر کے طولانی ہونے اور آفات و بلیات سے دور ہونے کا سبب ہے۔ اسی طرح دوسروں کی بے احترامی خاص کر استاد کی بے احترامی، سلب توفیق کا باعث ہے۔

جی ہاں، بعض اوقات نیک کام، گزشتہ برے کاموں کی تلافی کرتے ہیں اور کبھی برے کام گزشتہ

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۶/، ص ۱۳۶/

نیک اعمال کو نابود کر دیتے ہیں۔ جب تک انسان اس دنیا میں ہے اس کے اعمال میں یہ تاثیر و تاثرات موجود ہیں۔ بعنوان تشبیہ، انسان کے دل و روح کا گھر ایک کمرے کے مانند ہے، کبھی وہ کمرہ تاریک ہے اور ایک نور روشن ہوتا ہے اور اس کی تاریکی کو ختم دیتا ہے اور کبھی وہ کمرہ روشن ہے اور ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے اور اس چراغ کو بجھا دیتا ہے۔

پس جب تک انسان اس دنیا میں ہے یہ تحولات اور تغیرات پیش آتے رہیں گے اور ایسا نہیں ہے کہ اگر کوئی نیک کام انجام دیا اس کا اثر ابد تک باقی رہے گا، بلکہ ممکن ہے ایک ناشائستہ عمل سے اس کا اثر ضائع ہو جائے۔ پس اعمال کا ایک دوسرے پر اثر ڈالنا ایک کلی قاعدہ ہے کہ اس کی بنا پر بعض گناہ گزشتہ نیک اعمال کے اثرات کو نابود کر دیتے ہیں یا حتی آئندہ انجام پانے والے نیک کام کے قبول ہونے میں رکاوٹ بنتے ہیں چنانچہ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ بعض گناہ اس بات کا سبب ہیں کہ انسان کا نیک عمل اور اس کی نمازیں چالیس روز تک قبول نہ ہوں:

"من اغتاب مسلما او مسلمة لم يقبل الله تعالى صلاتة و لا صيامه اربعين يوماً وليلة الا ان يغفرله صاحبه"

"جو شخص کسی مسلمان مرد یا عورت کی غیبت کرے، چالیس دن رات تک خدائے متعال اس کی نماز و روزے قبول نہیں کرتا ہے، مگر جس کی غیبت کی ہو وہ اسے بخش دے۔" [1]

یا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی گئی ایک حدیث میں آیا ہے:

"اطب كسبك تستجاب دعوتك فان الرجل يرفع اللقمة الى فيه حراما "فما تستجاب له دعوة اربعين يوما" [2]

"اپنے کسب و معاش کو پاک کرتا کہ تمہاری دعا قبول ہو، بیشک انسان جب لقمہ حرام کھاتا ہے تو چالیس دن تک اس کی دعا قبول نہیں ہوتی ہے"

یا شراب نوشی کے بارے میں فرمایا ہے:

۱۔ مستدرک الوسائل، ج ۹، ص ۱۲۲

۲۔ مستدرک الوسائل، ج ۱، ص ۱۶۶

"من شربها لم تقبل له صلاة اربعين يوما" [۲]

"شراب پینے والے کی نماز چالیس روز تک قبول نہیں ہوتی"

حدیث کے اس حصہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان کا مضمون یہ ہے کہ اگر کوئی اپنی زبان پر قابو نہ پائے اور جو زبان پر آئے اسے کہہ ڈالے تو کوئی عمل اس کے لئے باقی نہیں بچے گا، یعنی انسان کی زبان میں ایسا اثر ہے کہ انسان کے تمام گزشتہ اعمال کو نابود کردے۔ یہ انسان کے لئے ایک انتباہ ہے کہ منہ میں موجود اس چھوٹے سے گوشت کے ٹکڑے کو معمولی نہ سمجھے اور بات کرنے سے پہلے اس پر غور کرے اور دیکھ لے کہ جس بات کو کرنا چاہتا ہے اس کا کیا اثر ہوگا، کیا خدا اس سے راضی ہے؟ کیا اس کی یہ بات انسان کی روح پر اچھا اثر ڈالتی ہے یا بُرا اثر؟

اس کلی نصیحت کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زبان کے بعض گناہوں کو بیان فرماتے ہیں۔ طبعی طور پر زبان کے بعض گناہوں کا ذکر اس کے اس فراوان نقش کے پیش نظر ہے جو وہ انسان کی ہویت میں تغیر پیدا کرنے اور اسے گرانے میں رکھتے ہیں اس کے علاوہ اس لئے بھی ہے کہ انسان کے لئے ہمیشہ اس سے آلودہ ہونے کا خطرہ ہے۔

دوسروں کی عیب جوئی کی مذمت:

بُری صفتوں میں سے ایک صفت، جس کا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ذکر فرمایا ہے، دوسروں کی عیب جوئی کرنا ہے۔ بیشک عیب جوئی ایک ناپسندیدہ اور غیر شائستہ عادت ہے۔ دشمنی اور حسد کی وجہ سے لوگوں کے عیب اور لغزشوں کی جستجو کرنے اور پھر انھیں برملا کرنے کو عیب جوئی کہتے ہیں اور انسان اس کام سے لذت محسوس کرتا ہے۔ آیات و روایات میں اس پست خصلت کی سرزنش کی گئی ہے، ہم ان افراد کی تحقیق کریں گے جو مسلمانوں کی عیب جوئی کر کے انھیں رسوا کرنے کے درپے تھے، یہ خبیث ترین اور بدترین لوگ ہیں، چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿ان الذين يحبون ان تشيع الفاحشة فى الذين آمنوا لهم عذاب اليم فى الدنيا والاخرة﴾ (نور/۱۹)

۲۔ بحار الانوار، ج ۷۶، ص ۱۲۶

''جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ صاحبان ایمان میں بدکاری کا چرچا پھیل جائے ان کے لئے بڑا دردناک عذاب ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔''

اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''من اذاع فاحشة كان كمبتدئها ومن عيّر مومناً بشيء لم يمت حتى يرتكبه'' [1]

''جو شخص کسی کے ناشائستہ عمل کو ظاہر اور نشر کرے وہ ایسا ہی ہے کہ جیسے خود اس نے وہ عمل انجام دیا ہے اور جو شخص کسی مومن کو اس کے عیب کی وجہ سے سرزنش کرے گا وہ شخص تب تک نہیں مرے گا جب تک اسی عیب کا مرتکب نہ ہو جائے گا''

منجملہ محرکات جو انسان کو دوسروں کی عیب جوئی کرنے پر مجبور کرتے ہیں احساس کمتری ہے۔ جب انسان میں کوئی کمی ہوتی ہے اور حقیر اور پست ذہنیت کا مالک ہوتا ہے اپنے دل میں اتنی وسعت نہیں رکھتا کہ دوسروں کے کمالات کو دیکھ کر برداشت کرے، اس لئے کوشش کرتا ہے کہ دوسروں کی شخصیت کو داغدار بنائے اور ان کے کمالات کو کم کر کے پیش کرے۔ کوشش کرتا ہے کہ دوسروں میں کوئی کمزور نکتہ پیدا کرے تا کہ اسے لوگوں میں پیش کر سکے۔ جب بھی کسی کی بات چھڑتی ہے، بجائے اس کے کہ اس کی زندگی کے مثبت نکات بیان کرے اس کے عیب بیان کرتا ہے۔

جب ایک مجلس میں کسی مومن کا نام لیا جاتا ہے کچھ افراد اسلامی آداب وتقوی کی بنا پر کوشش کرتے ہیں کہ اس کے اچھے اور پسندیدہ صفات کو بیان کریں اور اس کے مقابلہ میں کچھ افراد اپنے ایمان کی کمزوری، حسد اور احساس کمتری کی بنا پر اس کے کمزور اور منفی نکات، اس کی لغزشوں اور کوتاہیوں کو بیان کرتے ہیں۔ حتی کبھی اس سے بڑھ کر مشکوک اور مشتبہ امور کی اس کی طرف نسبت دے کر اسے یقین کی صورت میں پیش کرتے ہیں، اور بعض اوقات تہمت لگانے سے بھی فروگذاشت نہیں کرتے۔

یہ ایک بری خصلت ہے کہ انسان دوسروں کے ضعف کو ذکر کرنے کی کوشش کرے۔ افسوس ہے کہ اس آفت میں مبتلا افراد فراواں ہیں اور ہر ایک اپنے آپ کی آزمائش کر سکتا ہے کہ جب کسی مومن بھائی یا دوست کا نام لیا جاتا ہے، خاص کر اگر اس مومن کے ساتھ اس کی رقابت ہے، وہ مختلف طریقوں سے

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۳، ص ۳۸۴

دوسروں کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ فلاں شخص میں یہ یہ عیب موجود ہیں!

فطری طور پر انسان کو دیکھنا چاہئے کہ جب کسی شخص کا نام لیا جاتا ہے تو کیا وہ اس کی نیک صفات بیان کر کے دوسروں کے سامنے اس کی ستائش کرتا ہے اور لوگوں کی نگاہوں میں اسے محترم بیان کرتا ہے، یا جب کسی کا نام لیا جاتا ہے تو اس کی بری صفتیں بیان کر کے اسے حقیر بنا کر پیش کرتا ہے۔ یہاں انسان میں ایک بہت بڑی کمزوری اور اس کا سرچشمہ، جیسا کہ بیان ہوا، حسد اور احساس کم تری ہے یعنی دوسرے فلاں صفات کے مالک کیوں ہیں وہ اس پر وہ رنجیدہ ہے اور برداشت نہیں کرتا ہے کہ دوسرے مالدار ہوں اور وہ اس سے محروم رہے۔

ہمیں توجہ رکھنی چاہئے کہ بہت اچھا ہے کہ ہماری حالت ایسی ہو کہ مومن کا نام لیتے وقت اس کی خوبیوں کو شمار کرے، اگر چہ بعض اوقات شرائط اور محرکات کا تقاضا ہوتا ہے کہ انسان دوسروں کے عیب ذکر کرے، مثال کے طور پر انسان مشاورت کی ذمہ داری انجام دیتا ہے، ایسی حالت میں اگر کوئی کسی کے بارے میں بہ طور تحقیق پوچھ رہا ہے تو یہاں پر اسے اس کا عیب بتانا ضروری ہے، البتہ ایسے موقع استثنا ہیں۔ دوسروں کے پاس مال یا کسی اور صفات کے پائے جانے سے ہمیں رنجیدہ نہیں ہونا چاہئے اور ہمیں جاننا چاہئے کہ مومن کا اصل سرمایہ خدا سے رابطہ ہے اور مومن اس کے علاوہ کسی اور سرمایہ کو نہیں جانتا ہے۔ اگر انسان اس قسم کے سرمایہ کا مالک ہو گیا تو وہ اپنی روح میں ایک ایسی عظمت کا احساس کرتا ہے کہ دوسری عظمتیں اور سرمائے اس کی نظر میں حقیر ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں عظمت کے ایک بے انتہا سمندر میں غرق ہو کرنا قابل توصیف مسرت اور لذت کا احساس کرتا ہے، پھر اس کے لئے اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ دوسرے لوگ اس کا احترام کریں یا نہ کریں اس کی ستائش کریں یا سرزنش۔ یقیناً اس قسم کا انسان جس کے دل میں ایمان کا نور روشن ہے، مومنوں کے احترام کی فکر میں ہوتا ہے، کیونکہ وہ اس کام کو خدا کی خوشنودی اور اس کے تقرب کا سبب جانتا ہے۔

مومن کا سرمایہ صرف ایمان کا ہونا ہے۔ اس کی توجہ خدا پر ہوتی ہے وہ نہ لوگوں کے احترام کرنے پر خوش ہوتا ہے اور نہ ان کی طرف سے بے احترامی پر رنجیدہ ہوتا ہے، اس کے مقابلہ میں جو کمی کا احساس کرتے ہیں اور ایمان جیسے سرمایہ سے محروم ہیں، اپنی شخصیت کی عظمت اور اپنے وجودی سرمایہ کو لوگوں کی طرف سے کئے جانے والے احترام کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ وہ چیز جسے آج کل ''اجتماعی شخصیت'' کہتے

ہیں، یعنی اپنی شخصیت کو دوسروں کی جانب سے کئے جانے والے فیصلہ کے آئینہ میں دیکھتے ہیں اور اجتماعی عظمت بخشنے کو اپنا سرمایہ جانتے ہیں اگر دوسرے ان کی تعریف کریں تو اپنے کو محترم تصور کرتے ہیں اور اگر وہ سرزنش اور مذمت کریں تو خود کو گھٹیا اور سماج میں گرا ہوا پاتے ہیں اور جب مشاہدہ کرتے ہیں کہ لوگ ان سے بدظن ہو رہے ہیں تو فکر کرتے ہیں کہ سب کچھ لٹ گیا ہے۔ اب جو مال اور مادی کمیوں سے دوچار ہیں۔ جیسے علم، کمالات، ثروت اور دنیوی وسائل۔ وہ دوسروں کی برتری کو نہیں دیکھ سکتے، اس لئے کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کے کمالات کو شک وشبہ میں ڈال کر خدشہ دار کریں، یہ عیب جوئی کرنے والے کی فطری خصلت ہے کہ وہ دوسروں کی ٹوہ میں لگا رہتا ہے ایسا شخص اپنی دنیوی واخروی سعادت کو خطرہ میں ڈالتا ہے اور ایک مومن کے عیب کو برملا کر کے قہر الٰہی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام دوسروں کی عیب جوئی اور غیبت کی نہی کرتے ہوئے انسان کی اپنی کمیوں سے غفلت کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یا عبداللّٰہ لا تعجل فی عیب احد بذنبہ فلعلّہ مغفور لہ، و لا تامن علی نفسک صغیر معصیتک فلعلک معذّب علیہ فلیکفف من علم منکم عیب غیرہ لما یعلم من عیب نفسہ..."[1]

اے بندہ خدا! گناہ انجام دینے والے کے عیب کو بیان کرنے میں جلدی نہ کرنا، شاید اسے بخش دیا گیا ہو اپنے چھوٹے گناہ کے بارے ہوشیار رہنا، شاید تجھے اس کے لئے عذاب میں مبتلا کیا جائے، پس اگر تم میں سے کسی دوسرے کے عیب کے بارے میں علم رکھتا ہے تو وہ اپنے آپ میں پائے جانے والے عیب کے پیش نظر اس کو بیان کرنے سے پرہیز کرتا ہے۔

مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"من نظر فی عیب نفسہ اشتغل عن عیب غیرہ" [2]

"جو اپنے عیب پر نظر ڈالتا ہے وہ دوسروں کے عیب کو نہیں دیکھتا۔"

مذکورہ مطالب کے پیش نظر بجا ہے کہ ہم دوسروں کی عیب جوئی کرنے سے پرہیز کریں اور دوسروں کی شخصیت کو داغدار نہ بنائیں۔ ہمیں جاننا چاہئے کہ معاشرے میں عیب جوئی کو رواج دینے سے

۱و۲۔ نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خ ر ۱۴۰، ص ر ۴۲۹

معاشرے کی بنیاد متزلزل ہو کر اس کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اسی طرح عیب جوئی معاشرے میں بدظنی، عداوت، دشمنی نیز عزت کو پامال کرنے کا باعث بنتی ہے، اس کی وجہ سے انسان اتنا گر جاتا ہے کہ وہ دوسروں کی شخصیت کو پامال کرنے ہی کو اپنی عظمت اور بزرگی سمجھتا ہے۔ اسی طرح معاشرے میں عیب جوئی کی آفت کے پھیلنے سے اخلاقی حدود پارہ پارہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ آفت گناہ کرنے پر اکساتی ہے ان تمام لوگوں میں جو سماجی لحاظ سے بہت سے گناہوں سے پرہیز کرتے تھے مشتعل کر کے انھیں قوت بخشتی ہے۔

چاپلوسی اور بے جا ستائش کی مذمت:

جن ناپسندیدہ صفات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا ہے ان میں سے ایک دوسروں کی ستائش اور بے جا تعریف کرنا ہے۔ کاسہ لیسی اور خوشامد بھی عیب جوئی کی طرح انسان کی شخصیت کی کمزوری اور احساس کم تری کی پیداوار ہے۔ حقیقت میں یہ ان لوگوں کی خصلت ہے جو اپنی احساس کم تری کی تلافی کی جستجو میں دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرانے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ شاید دوسروں کی بے جا ستائش سے اپنے لئے ایک برتر حیثیت پیدا کر سکیں۔ یہ خصلت خود فروش اور کمزور ایمان والے افراد کی ہے کہ پروردگار عالم کی لازوال قدرت و مملکت پر نظر نہیں رکھتے، اس لئے دوسروں پر طمع آمیز نظریں رکھتے ہیں اور اپنی عزت و سرداری کی درخواست بارگاہ الٰہی کے حقیقی فقیروں سے کرتے ہیں۔ اگر کسی نے غنی مطلق کی بارگاہ کی طرف رخ کیا اور سرچشمہ ھستی سے مدد طلب کی تو وہ لالچ، چاپلوسی اور دوسروں کی ستائش کا سہارا نہیں لیتا ہے۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام اس سلسلہ میں کہ صرف خدائے متعال حمد و ستائش کا سزاوار ہے، فرماتے ہیں:

"اللّٰھم انت اھل الوصف الجمیل و التعداد الکثیر ان تومل فخیر مؤمل وان تُرَجَّ فاکرم مرجو، اللھم و قد بسطت لی فیما لا امدح به غیرک ولا اثنی به علی احد سواک... و عدلت بلسانی عن مدائح الآدمیّین و الثناء علی المربوبین المخلوقین..." [1]

۱۔ نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خ ۹۱، ص ۲۶۹

''خداوندا! صرف تو ہی نیک اوصاف کی ستائش اور بی انتہا نعمتوں کو گننے کا سزوار ہے۔ اگر تجھ سے امیدیں باندھی جائیں تو تو یقیناً بہترین ہے کہ جس سے امیدیں باندھی جائیں اور اگر تجھ سے امیدوار ہوا جائے تو تو محترم ترین ہے کہ جس سے امید کی جائے۔ خداوندا! تم نے مجھ کو اپنی بہت سی نعمتوں سے نوازا اور مجھی ایسی زبان عطا کی کہ اس سے تیرے سوا کسی کی ستائش نہ کروں لوگوں کی ستائش اور مخلوق کی ثنا خوانی سے میری زبان کو محفوظ رکھ۔''

کبھی انسان خدا کی خوشنودی اور مومنوں کے احترام کے لئے کس مومن کی ستائش کرتے ہوئے اس کی خوبیاں بیان کرتا ہے، لیکن کبھی لالچ اور نفسانی خواہشات کی بنا پر دوسروں کی ستائش کرتا ہے تا کہ اس کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر سکے اور ضرورت کے وقت وہ اس کی مادی مدد کرے، ایسا شخص درحقیقت اپنے عمل سے دوسروں کو بہ طور قرض روٹی دیتا ہے۔

چاپلوسی کی ذہنیت انسان کی بُری صفتوں میں سے ایک ہے اور یہ صفت خدا پر ایمان رکھنے سے ہم آہنگ و سازگار نہیں ہے۔ چونکہ جب انسان اپنے مقدر کو دوسروں کے ہاتھوں میں دیکھتا ہے تو اس غرض سے کہ وہ کسی طرح اس سے کوئی فائدہ حاصل کرے تو تملق اور چاپلوسی کرنے لگتا ہے، یہ اس حالت میں ہے کہ انسان کو اپنے مقدر کو خدا کے ہاتھ میں دیکھنا چاہئے۔ جیسا کہ بیان ہوا کہ اس صفت کا روحی اور نفسیاتی سر چشمہ احساس کم تری ہے کہ انسان احساس کرتا ہے کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے اور کوشش کرتا ہے کہ خود کو دوسروں سے وابستہ کرے اور اس وابستگی کے نتیجہ میں تملق اور چاپلوسی کے ذریعہ ممکن ہے وہ اسے کوئی مدد اور بھلائی پہنچا دے؟

مناسب ہے کہ ہم معاشرے میں تملق و چاپلوسی کی ذہنیت کے وسیع ردعمل پر توجہ کریں اور دیکھیں کہ دوسروں کی چاپلوسی اور افراد کی حد سے زیادہ ستائش ان پر کیا اثر ڈالتی ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دوسروں کی ستائش ان کے لئے غرور و تکبر کا سبب بنتی ہے اور افراد کو بگاڑ کر انھیں پر توقع بنا دیتی ہے اور ان میں خودستائی و بزرگ بینی کی حس کو اجاگر کر دیتی ہے، اور ظالموں کے بارے میں ستائش ان کے اعمال کی ایک طرح سے تائید و تشویق ہے۔

دوسروں کی چاپلوسی اور ستائش اس امر کا باعث ہے کہ وہ اس ستائش کو اپنے لئے خوبی اور جنبہ مثبت تصور کریں اس کے علاوہ اپنی کوتاہیوں کو بھول جائیں اور دوسری طرف سے یہ کہ، جن بُرے اور غیر

شرعی اعمال کے وہ مرتکب ہوئے ہیں، وہ ان کی نظر میں پسندیدہ کام شمار ہوگا۔

تملق اور چاپلوسی، اس کے علاوہ بعض اخلاقی اصلاحات میں رکاوٹ بنتی ہے تنگ نظر اور خودخواہ افراد کی راہ کو الٹ پلٹ کر دکھ دیتی ہے اور انھیں اپنی اخلاقی کمزوریوں، ظالمانہ اور خلاف عقل وشرع تمام روش کو نمایاں کرنے میں گستاخ بنا دیتی ہے۔ اسی لئے دین کے پیشوا خود عملا اس قابل مذمت روش سے بیزاری کا اظہار کرتے تھے اور دوسری طرف سے اپنے پیروؤں کو انتباہ کے ساتھ اس سے مبارزہ کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"احثو التراب علی وجوہ المداحین"[1]

"چاپلوسوں اور بے جا تعریف کرنے والوں کے چہروں پر مٹی پھینک دو"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ بیان اس شخص کے بارے میں ہے جو ایک مسلمان کی چاپلوسی کرے، ورنہ کافر کی چاپلوسی کرنے کا حکم اس سے شدید تر ہے۔ یہ تعبیر اس لئے ہے کہ معاشرے میں چاپلوسی کی ذہنیت کے رواج اور اس کے پھیلنے کو روک دیا جائے، یہاں تک ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام جیسے شخص جو تمام انسانی فضائل وکمالات کے جامع تھے اور عمومی انسانوں سے بلند تر اور جمال وجلال الہی کے مظہر تھے اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ کوئی ان کے سامنے ان کی ستائش کرے۔

جب ایک گروہ نے حضرت علی علیہ السلام کی آپؑ کے سامنے ستائش کی تو حضرت نے فرمایا:

"خداوندا! تو میرے بارے میں مجھ سے بہتر جانتا ہے اور میں اپنے بارے میں ان سے بہتر جانتا ہوں، خدایا! مجھے اس سے بہتر قرار دے جو یہ میرے بارے میں گمان کرتے ہیں، اور جو میرے بارے میں (برائیوں کو) نہیں جانتے، مجھے بخش دے"[2]

مرحوم الہی قشہ ای صاحبان تقوی کے متعلق دوسروں کی ستائش کے خوف کے بارے میں فرماتے ہیں:

چو آنان را بہ نیکویی ستائی — بیندیشد و بر نیکی فزاید
ہمی گویند در پاسخ ما را — بہ خود مایم دانا تر ز اغیار
سریرت ہست بر خویش آشکارا — زمابہ داند آن دانای اسرار

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۳، ص ۲۹۴

۲۔ نہج البلاغہ (فیض الاسلام) حکمت ۹۶، ص ۱۱۳۱

جب ہم ان (صاحبان تقوی) کی ستائش کرتے ہیں تو، تصور کرتے ہیں کہ ان کی نیکیوں میں اضافہ کررہے ہیں، لیکن وہ (صاحبان تقوی) ہمارے جواب میں کہتے ہیں: ہم اپنے بارے میں غیروں سے بہتر جانتے ہیں۔

اپنا باطن اپنے لئے واضح ہے ہمارے بارے میں ہم سے بہتر ہمارا خدا جانتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام انھیں یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ انھیں ان کی ستائش کی ضرورت نہیں ہے اس لئے وہ انھیں ستائش کرنے کی اجازت نہیں دینا چاہ رہے تھے تاکہ یہ ناشائستہ صفت یعنی چاپلوسی کی ذہنیت اسلامی معاشرہ میں رواج نہ پائے کیونکہ اگر اُس دن علی علیہ السلام کی ستائش کررہے تھے تو دوسرے دن دوسرے حاکم کی بھی ستائش کریں گے، سب معصوم نہیں ہیں کہ ان کی چاپلوسی کے دھوکے میں نہ آئیں بلکہ بعض لوگوں میں آہستہ آہستہ یہ چاپلوسیاں اثر ڈالتی ہیں اور وہ تصور کرتے ہیں کہ جو کچھ دوسرے لوگ ان کے بارے میں کہتے ہیں وہ سچ ہے اور یہ ایک بہت بڑی آفت ہے کہ انسان دوسروں کو جہل پر مجبور کرے اور دوسروں کے لئے سبب بنے اور لوگ خلاف واقع اس کو اس کی حیثیت سے بلند تر تصور کریں اور جو کچھ اس کے بارے میں کہا جارہا ہے وہ رفتہ رفتہ یقین میں تبدیل ہوجائے، اس طرح سے انسان اعتدال سے خارج ہوکر اپنے آپ کو اپنی حیثیت سے بالاتر تصور کرے گا اور اس بڑی آفت کا سبب بے جا ستائش کے علاوہ تملق اور چاپلوسی ہے اور تملق نفاق اور دورخی کی نشانی ہے، چنانچہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"الثناء باکثر من الاستحقاق ملق" [1]

"دوسروں کی اس کے استحقاق سے زیادہ ستائش کرنا چاپلوسی ہے"

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"من مدحک بما لیس فیک فهو خلیق ان یذمک بما لیس فیک" [2]

"جو شخص کسی ایسی فضیلت پر کہ جو تجھ میں نہیں ہے جھوٹی تیری ستائش کرے وہ دوسرے دن ایسی بری صفت پر تیری سرزنش کرنے کا سزاوار ہے جو تجھ میں نہیں ہے"

حضرت علی علیہ السلام کا بیان اس نکتہ کو آشکار کرتا ہے کہ چاپلوس حق وحقیقت کہنا نہیں چاہتا ہے،

۱۔ نہج البلاغہ (فیض الاسلام) حکمت ۳۳۹، ص ۱۳۴۹

۲۔ غرر الحکم ص ۶۷۱۸

بلکہ اس کے ذاتی اغراض نے اسے دوسروں کی ستائش پر مجبور کیا ہے۔ اس لحاظ سے اگر ایک دن پاسا الٹ گیا اور چاپلوس نے اپنے ذاتی منافع کو اس شخص کی تذلیل وتحقیر دیکھا کہ جس کی اس سے پہلے بے جا ایسی فضیلتیں بیان کر کے ستائش کرتا تھا جو اس میں موجود نہیں تھی، تو وہ اس کی سرزنش اور مذمت میں ایسی غلط باتوں کی نسبت دے گا جو اس میں موجود نہیں ہے، تا کہ اس طرح سے اسے کوئی نفع ملے یا کسی حیثیت کا مالک بنے۔

پس اسلام اجازت نہیں دیتا ہے کہ انسان چاپلوس بنے، کیونکہ چاپلوسی اور ستائش کرنے کی ذہنیت، چاپلوسی کرنے والے اور وہ شخص کہ جس کی ستائش کی جارہی ہے کی روح اور معاشرے میں بُرے اثرات پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ حقیقت میں ستائش کرنے والا اس قدر پست وحقیر اور خود فروش بن جاتا ہے کہ خلاف واقع کلمات کو زبان پر جاری کرتا ہے۔ خدائے متعال قطعاراضی نہیں ہے کہ مومن اپنی عظمت اور عزت نفس کو پامال کر کے اس قدر اپنے آپ کو ذلیل وحقیر بنالے تا کہ دوسروں کی چاپلوسی کرے۔ تملق چاپلوسی کا مدمقابل پر یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ خود کو بھول جاتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ ایسے مقام ومنزلت کا مالک ہے کہ وہ دوسروں کی ستائش کا سزاوار ہے، نتیجہ کے طور پر اپنی کوتاہیوں، کمیوں اور کمزوریوں کو فراموش کرتا ہے اور اپنی زندگی ورفتار کو برجستہ اور مثبت پہلوؤں سے لبریز تصور کرتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''اذا مدحت اخاک فی وجهه امررت علی حلقه موسی''[1]

''اپنے بھائی کی اس کے سامنے ستائش کرنا اس کی گردن پر چھری پھیرنے کے مانند ہے''

مذکورہ مطالب کے علاوہ، بد ذات اور فاسد انسانوں کی چاپلوسی وستائش کرنا، انھیں گستاخ بنا کر دوسروں کے حقوق پر تجاوز اور لوٹ مار کرنے کی جرأت بخشتا ہے۔ چاپلوسی کرنے والا، اس کے علاوہ کہ نفاق وجھوٹ کا مرتکب ہوتا ہے، اپنی بے جا تعریف وتمجید سے، سرکشی، انتہا پسندی، بے راہ روی اور فاسدوں خاص کر باطل حکام کو تجاوز کرنے کے لئے مناسب موقع فراہم کرتا ہے اور حقیقت میں وہ خود لوگوں کے خلاف فساد پھیلانے والوں کے جرم ونقصانات میں شریک بن جاتا ہے۔ اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

۱۔ جامع السعادات، ج ۲، ص ۳۲۷

"اذا مدح الفاجرا هتزّ العرش و غضب الرّب [۲]"

"جب فاجر کی ستائش کی جاتی ہے تو، عرشِ خدا کانپنے لگتا ہے اور خدائے متعال غضب ناک ہوتا ہے"

آنحضرتؐ فرماتے ہیں: عیب جو نہ بنو کہ صرف لوگوں کی کمزوریوں کو پا کر انھیں بیان کر کے ان کی عزت و آبرو کو طشت از بام کرو، کیونکہ خدائے متعال راضی نہیں ہے کہ لوگوں کی آبروریزی کی جائے، حتی وہ عیب جو اس میں موجود ہیں وہ بھی فاش نہیں ہونا چاہئے۔ اس نے لوگوں کے عیبوں پر پردہ کھینچا ہے تا کہ وہ آپس میں الفت کے ساتھ زندگی گزاریں اور اجازت نہیں دیتا ہے کہ مومنین ایک دوسرے کے عیبوں کو فاش کریں، حتی اجازت نہیں دیتا ہے کہ مومن اپنے ذاتی عیب کو بھی دوسروں سے بیان کریں، کیونکہ انسان حق نہیں رکھتا ہے کہ وہ اپنی آبروریزی کرے۔

اس طرح آنحضرتؐ مزید فرماتے ہیں: تملق اور چاپلوسی کیذریعہ دوسروں کو اُن اچھے صفات سے منسوب کرنا جو ان میں موجود نہیں ہیں۔ درحقیقت یہ افراط و تفریط ہے جو مومن کے لئے مضر ہے اور انسان کو اعتدال سے خارج نہیں ہونا چاہئے۔ اگر وہ دوسروں کی اچھی صفتوں کو بیان کرنا چاہتا ہے تو حقیقت کی حد میں اور خیر و مصلحت پر اکتفا کرے، نہ یہ کہ ان صفات کو بیان کرنے میں اپنے لئے نفع کی فکر میں ہو یا اعتدال کی حد سے خارج ہو جائے۔

دوسروں کی طعنہ زنی اور زخم زبان کی مذمت:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن ناپسند صفات کا ذکر فرمایا ہے، ان میں لوگوں کی طعنہ زنی کرنا اور ڈنک مارنے والی زبان کا ہونا بھی ہے طعنہ زن اور دلخراش باتوں سے مؤمن کو تکلیف پہنچانے کو زخم زبان کہتے ہیں، کہ انسان کوشش کرتا ہے دوسروں کی ناکامیوں اور کمزوریوں کو اس پر تھونپ دے اور اس طرح اس کے دل کو مجروح کرے۔ مناسب ہے کہ انسان دوسروں کی دلجوئی کرنے کی کوشش کرے اور اگر ان کی زندگی میں کچھ ناکامیاں ہوئی ہوں تو بھی اپنی باتوں سے ان کے دل کے زخموں پر مرہم رکھے، نہ یہ کہ انھیں ان نقصانات کا مستحق و سزاوار جانے اور زخم زبان سے ان کے دل دکھائے، حضرت امام علی علیہ السلام

۲۔ بحار الانوار، ج ۷۷، ص ۱۵۲

فرماتے ہیں:

"حدّ اللسان امضی من احد السنان"[۱]

''زبان کی تیزی اور شدت نیزہ سے زیادہ ہے''

طعنہ زنی کا سرچشمہ، عداوت و کینہ اور بعض اوقات حسد ہے کہ طعنہ دینے والے کو مجبور کرتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ بات کرتے وقت اس کی بات دلخراش ہو۔ ممکن ہے ظاہری بات اور اس کا مفہوم حق ہو، لیکن اسے دلخراش اور تکلیف دہ انداز میں پیش کیا جائے کہ جو مخاطب کی رنجش و تکلیف کا سبب ہو۔ جب انسان کسی سے بحث و مباحثہ کرتا ہے، اگر مخاطب مطلب کو پیش کرنے میں غلطی کرتا ہے، تو اس نرم لہجہ میں سمجھایا جاسکتا ہے کہ فلاں عبارت کو آپ نے صحیح نہیں پڑھا اور فلاں مطلب کو صحیح بیان نہیں کیا، لیکن کبھی وہ اسے طنزیہ کلمات کہ جو اذیت کا باعث ہیں سمجھاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کو اس کی غلطی کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہے، تو اسے ایسے لہجہ میں کہنا چاہئے کہ جو اس میں اثر کرے اور اس طرح اسے سمجھائے کہ وہ اسے قبول کرنے پر مجبور ہو جائے اور ہٹ دھرمی نہ کرے، ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی غلطی پر اصرار کرے اور پہلی غلطی کے اوپر اس کے غلط رویہ کی وجہ سے دوسری غلطی کا بھی مرتکب ہو جائے کہ جس کے نتیجہ میں وہ صحیح راستہ سے منحرف ہو جائے اور غلط طریقہ کار کے سبب جہل اور من مانی کرنے لگے اور اس کی اصلاح دشوار ہو جائے۔

بعض افراد امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سلسلہ میں ایسا برتاؤ کرتے ہیں کہ نہ صرف یہ کہ مخاطب کی اصلاح نہیں کرتے اور اسے معروف اور نیکیوں کی طرف کھینچ کر نہیں لاتے بلکہ نصیحت کے غلط طریقہ کار بلکہ ملامت و سرزنش کے ذریعہ اسے دوسری برائیوں میں مبتلا ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں، اس لئے حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ایاک ان تعاتب فیعظم الذنب و یھون العتب"[۲]

''ملامت و سرزنش سے پرہیز کرو کہ یہ کام گناہ کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے اور ملامت کو بے اثر کر ڈالتا ہے۔''

یا افراد کی سرزنش کرنے اور ملامت کی تکرار کے بارے میں فرماتے ہیں:

۱۔ غرر الحکم، ص ۳۸۲

۲۔ بحار الانوار، ج ۷۷، ۲۱۶

"الافراط فی الملامة یشبّ نیران اللّجاج"[۱]

"ملامت وسرزنش میں افراط وزیادتی، ہٹ دھرمی کی آگ کو شعلہ ور کرتا ہے۔"

"ایاک ان تکرر العتب فانّ ذالک یغری بالذنب و یھوّن بالعتب"[۲]

"بار بار سرزنش سے پرہیز کرو، کیونکہ سرزنش کی تکرار گناہ گار کو اس کے ناپسندیدہ فعل کے انجام دینے میں گستاخ بنادیتی ہے اور اس کے علاوہ خود ملامت وسرزنش کو پست اور حقیر بنادیتی ہے۔"

پس جب کسی کو اس کی کمزوری کے بارے میں توجہ دلانا چاہتے ہو تو اس کے ساتھ ہشاش بشاش مہربانی اور ہمدردی کے ساتھ پیش آؤ نہ یہ کہ تمھاری زبان بچھو کی طرح ڈسنے والی ہو۔ اس طرح بات کرو کہ وہ شخص اپنی کمزوریوں کی تلافی کرنے پر آمادہ ہو جائے ورنہ اگر اسے کہو گے کہ تم نے غلطی کی ہے، یا تم نہیں سمجھتے ہو، یا اس جیسے کلمات تو فطری بات ہے کہ وہ اسے پسند نہیں کرے گا اور رنجیدہ ہوگا۔ اور اس ردعمل کے طور پر اس کے برخلاف انجام دے گا، سواء اس کے کہ کوئی اہل تقویٰ ہو جو بزرگی کے پاس ولحاظ میں سکوت اختیار کرے اور کوئی جواب نہ دے۔

پس جب ہم ناشائستہ اور تند برتاؤ کو پسند نہیں کرتے، کس طرح توقع کریں گے کہ طعنہ زنی والے کلام سے دوسروں کی اصلاح کریں۔ ہمیں ہر حالت میں دوسروں کے ساتھ نیکی اور اچھائی کی فکر میں رہنا چاہئے اور ہماری بات اور رفتار نیک انسانی اخلاق کی ترجمان اور اس بات کی دلیل ہونی چاہئے کہ ہم اس وصف کے حامل ہیں۔ سعدی کہتا ہے:

آنکس کہ بہ دینار و درم خیر نیندوخت — سر عاقبت اندر سرِ دینـــا رو درم کرد

خواھی کہ متمتع شوی از دنیی و عقبی — با خلق کرم کن چو خدا با تو کرم کرد

(جس نے دینار و درہم سے نیکی ذخیرہ نہ کی، اس کا سرانجام دینار و درہم ہی ہوگا، اگر دنیا و آخرت سے بہرہ مند ہونا چاہتے ہو، تو لوگوں کے ساتھ اسی طرح نیکی کرو جس طرح خدا نے تمھارے ساتھ نیکی کی ہے)

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۷، ۳۳۲

۲۔ غرر الحکم، ص ۲۷۸

اپنی بات پر اصرار کرنے کی مذمت:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس چوتھی ناپسندیدہ صفت کا ذکر کیا ہے وہ مراء اور خطا پر اصرار ہے۔ مراء یعنی دوسروں کی بات کو مسترد کر کے اپنی برتری کو ثابت کرنا، اس طرح کہ جب انسان کوئی غلطی کرتا ہے تو اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا ہے اور اپنی باتوں کی دوسرے نادرست مطالب سے توجیہ کرتا ہے اور اسے ترمیم کرنے لگتا ہے اور اس کام کو مسلسل انجام دیتا ہے، جب انسان ہر بار اپنی غلطی پر اصرار کرتا ہے اور مد مقابل شخص بھی دیکھتا ہے کہ یہ آدمی ایک باطل مطلب کو حق کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کی بات کو مسترد کرنے میں اصرار کرتا ہے۔

جب جدال اور اصرار کی ذہنیت انسان میں پیدا ہو جاتی ہے تو وہ متواتر کوشش کرتا ہے تا کہ اپنی بات کا سکہ دوسرے پر بٹھائے اور اس ذہنیت کا سرچشمہ اس کی خود خواہی اور خود پسندی ہے۔ یعنی انسان یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں نے غلطی کی اور وہ اپنی غلطی کے اعتراف میں کسر شان سمجھتا ہے۔ باوجود اس کے وہ جانتا ہے کہ اس نے غلطی کی ہے، لیکن نہیں چاہتا کہ دوسرے یہ سمجھ لیں کہ اس نے غلطی کی ہے، اس لئے جب مطلب کی وضاحت کر کے اسے اپنی غلطی کے بارے میں متوجہ کرنا چاہیں تو وہ ہٹ دھری سے اسے مسترد کرتا ہے اور اپنی بات کو حق جتاتے ہوئے کہتا ہے: جو کچھ میں نے کہا وہی صحیح ہے!

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ اصرار، اور پے در پے ایک بات کی رٹ لگانا مد مقابل کے، غصہ کو برانگیختہ کرنے میں کلیدی رول انجام دیتا ہے، اس لئے اصرار سبب بنتا ہے کہ اصرار کرنے والے ایک دوسرے سے لڑ پڑیں اور ہر کوئی کوشش کرے کہ اپنی بات کو برتری بخشے اس لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"ذروا المراء فانّه لا تفهم حكمته و لا تؤمن فتنته"[1]

"ہٹ دھرمی کو چھوڑ دو اس لئے کہ اس کی حکمت روشن نہیں ہے (یعنی اس میں کوئی حکمت نہیں ہے) اور کوئی اس کے شر سے محفوظ نہیں ہے"

اپنی غلط بات پر ہٹ دھرمی اور اصرار، ایک بری صفت ہے، افسوس ہے کہ بعض اہل علم بھی اس

۱۔ بحار الانوار، ج ۲، ص ۱۳۸

سے آلودہ ہوتے ہیں۔ بحث کے دوران جب کوئی شخص ایک غلط نظریہ پیش کرتا ہے، تو وہ اپنے نظریہ پر اصرار کرتا ہے اور اگر دوست کے سامنے ہتھیار ڈالنا چاہے تو احساس ناکامی کرتا ہے، خاص کر اگر کوئی تیسرا آدمی بھی ان کی گفتگو کا مشاہدہ کر رہا ہو تو اپنی آبرو کو بچانے کے لئے کوئی کسر باقی نہیں رکھتا ہے اور اپنی بات کا دفاع کرتا ہے، خاص کر اگر وہ تیسرا شخص اس کا مرید بھی ہو؛ آخر کار یہ سب چیزیں انسان کو حق قبول نہ کرنے اور ناحق پر ترجیح دینے کے محرک بن جاتے ہیں۔

ہٹ دھرمی اور اصرار کے نتیجہ میں جن آفات سے انسان دوچار ہوتا ہے ان کے پیش نظر مناسب ہے انسان اس صفت سے مبارزہ کرنے کی ہمت کرے۔ اصرار اور ہٹ دھرمی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی آفتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ انسان خلاف حقیقت نظریات پیش کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اللّجاج یفسد الرّای" [۱]

"ہٹ دھرمی انسان کی رای کو فاسد کر دیتی ہے (اور اسے خلاف حقیقت اظہار رای کرنے پر مجبور کرتی ہے)

ہٹ دھرمی کی من جملہ آفتیں جو حضرت علی علیہ السلام کے کلام میں موجود ہیں، انسان کی روح کا مریض ہونا بھی ہے:

"اللّجاج یشین العقل" [۲]

ہٹ دھرمی روح کو ناقص اور زخمی کر دیتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کے کلام میں ذکر ہوئی آفتوں میں انسان کی فکر و نظر میں زوال بھی ہے:

"اللجوج لا رای له" [۳]

ہٹ دھرم صاحب عقل و نظر (اور صحیح نظر) نہیں ہے۔

لیکن غلط نظریہ پر ہٹ دھرمی اور اصرار کے علاج کا طریقہ یہ ہے کہ، اظہار فضیلت کا باعث بننے

۱۔ غرر الحکم، ص ۳۶

۲۔ غرر الحکم، ص ۱۷

۳۔ غرر الحکم، ص ۳۱

والے تکبر کی اپنی اندر سے بیخ کنی کی جائے اور جان لے کہ ہٹ دھرمی دشمنی اور کدورت کا سبب بنتی ہے اور الفت و برادری کو نابود کر دیتی ہے۔ اسی طرح یونیورسٹی کے طالب علموں کے لئے شائستہ ہے کہ وہ کوشش کریں کہ جدال و اصرار سے پرہیز کر کے اس کے ہٹ دھرمی پر مبنی رویہ پر کنٹرل کریں اور ہمیشہ حرف حق کے تابع رہیں اور نیک گفتار اپنا شیوہ قرار دیں تا کہ اس کے نتیجہ میں احترام وحق قبول کرنے کی ذہنیت ان میں ملکہ بن جائے اور اصرار و ہٹ دھرمی کی ناشائستہ صفت ان کے دل سے نابود ہو جائے۔

جدال اور اصرار سے پرہیز کرنے کے لئے انسان کو اپنے آپ کو باور کرانا چاہئے کہ ہر کوئی خواہ نخواہ غلطیوں اور لغزشوں سے دوچار ہوتا ہے اور ایسا نہیں ہے کہ تمام انسان غلطیوں سے محفوظ ہیں۔ صرف معصومین غلطیوں سے محفوظ ہیں اور دوسرے افراد ممکن ہے غلطی کریں، یا کسی چیز کے بیان اور نقل کرنے میں غلطی کریں یا ان کے فہم و درک کرنے میں۔ یہ چیز خلاف توقع نہیں ہے اور ہر ایک کے لئے پیش آ سکتی ہے، پس اسے عیب شمار نہیں کرنا چاہئے۔ البتہ انسان کو کوشش کرنی چاہئے کہ اس سے کم غلطیاں سرزد ہوں، خاص کر درس و مباحثہ کے لئے زیادہ مطالعہ کرے تا کہ کم تر غلطی کرے، لیکن اگر اس سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے تو اسے اپنے لئے بڑا عیب نہیں سمجھنا چاہیے اور فکر نہیں کرنی چاہیے کہ اس کی عزت ختم ہو گئی اور وہ ناکام ہو گیا۔

دوسرے مرحلہ میں جب انسان سمجھ گیا کہ اس سے غلطی سرزد ہوئی ہے، اسے فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کرنا چاہئے اور کہنا چاہئے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے اور آپ حق پر ہیں البتہ ابتدا میں اپنی غلطی کا اعترا ف کرنا مشکل ہے لیکن اس کے بعد جب اپنی غلطی کے اعتراف کی حلاوت کو درک کرتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ نظریہ کے مطابق غلطی عیب نہیں ہے، تو اس کے لئے غلطی کا اعتراف کرنا آسان بن جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے کہتا ہے: ''میں انسان ہوں اور انسان خطا سے محفوظ نہیں ہے اور کبھی میں خطا کرتا ہوں اور دوسرا صحیح سمجھتا ہے اور کبھی اس کے برعکس۔'' کیا اچھا ہے اپنے اس دوست کا شکریہ بجالائے، جس نے اسے اس کی غلطیوں کے بارے میں متوجہ کیا ہے اور اسے صحیح راستہ و نظریہ دکھایا ہے، اس کے سامنے صرف خاموش رہنے پر اکتفانہ کرے، چونکہ اگر ہم جدال اور اصرار کی خصوصیت اور اس کی آفتوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے نقطہ مقابل کو اپنانے کی کوشش کرنی چاہئے اور جدال و اصرار کا نقطۂ مقابل غلطی کا اعتراف کرنا ہے۔ اپنے دوست سے کہے: آپ نے مطلب کو اچھا سمجھا ہے اور میں متوجہ نہیں تھا۔ اس شیریں اور شائستہ برتاؤ کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ شکست و کمی کا احساس نہیں کرتا ہے بلکہ یہ مناسب برتاؤ تفاہم اور ایک

شیریں زندگی کے ایجاد کا سبب بنتا ہے اور انسان دوسروں کے دل میں بیشتر جگہ پاتا ہے اور لوگ اس کی بات پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔

اگر انسان اپنی غلطیوں کی توجیہ کرنے کی کوشش کرے گا اور ان پر پردہ ڈالنے کی جستجو کرے گا، تو لوگوں کے دلوں میں اس کا اعتماد ختم ہو جائے گا اور اگر وہ کبھی صحیح بات بھی کہے گا تو لوگ اس پر اعتماد نہیں کریں گے، لیکن جب اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتا ہے اور دوسروں کے صحیح نظریہ کے سامنے ہتھیار ڈالتا ہے، تو اس کی باتوں پر اعتماد کرتے ہیں، چونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ یوں ہی بات نہیں کرتا ہے، اور اس رفتار کے نتیجہ میں اس کی اجتماعی حیثیت بھی بہتر ہو جاتی ہے، البتہ مومن کو اپنی اجتماعی حیثیت کی خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہئے، لیکن اس رفتار اور حق کو قبول کرنے کے ایسے آثار بھی ہوتے ہیں۔ اس کی نسبت دوسروں کا اعتماد بھی بیشتر ہوتا ہے اور وہ ان میں محبوب بھی ہوتا ہے اور بہتر اجتماعی مقام بھی پاتا ہے، اس کے علاوہ بُرے اور ناپسند اخلاق سے نجات بھی پاتا ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک چیز سے وابستگی نہیں رکھنی چاہئے بلکہ خدا سے دل لگانا چاہئے اور ہر کام میں انسان کا محرک خدا کی مرضی حاصل کرنا چاہئے اور مذکورہ آثار مؤمن کے رفتار کے اضافی منافع ہیں۔

چونتیسواں درس

عبادتوں کے جلوے اور اسلام میں مسجدوں کا نقش

- عبادت کا مفہوم اور اس کی وسعت:
  الف۔ عبادت کی ایک تقسیم بندی۔
  ب۔ نماز، کمال بندگی اور تقرب الٰہی۔
  ج۔ مقدمات کے شرعی ہونے کا فلسفہ اور نماز کی جانب توجہ دینے والے عوامل۔
- مسجد، لقاء اللہ کے عاشقوں کی معراج۔
- مسجد کی طرف لوگوں کے توجہ دینے کا فلسفہ۔
- مساجد کی اہمیت کو درک کرنے کی ضرورت اور اس میں حاضر ہونے کے آداب۔
- مسجد میں حاضر ہونے اور اس میں عبادت کرنے کی فضیلت۔
- خدا کے محبوب ترین بندے۔

عبادتوں کے جلوے اور اسلام میں مسجدوں کا نقش

" یاابا ذر!الکلمة الطیبة صدقة و کل خطوة تخطوها الی الصلوٰة صدقة.یاابا ذر!من اجاب داعی اللّٰه واحسن عمارة مساجد اللّٰه کان ثوابه من اللّٰه الجنة فقلت :بابی انت وامیّ یا رسول اللّٰه کیف تعمر مساجد اللّٰه؟قال لا ترفع فیها الا صوات ولا یخاض فیها بالبا طل ولا یشتری فیها ولا یباع واترک اللغو مادمت فیها فان لم تفعل فلا تلومن یوم القیامة الا نفسک.یاابا ذر! ان اللّٰه تعالی یعطیک مادمت جالسا فی المسجد بکل نفس تنفّست درجة فی الجنه و تصلی علیک الملائکة وتکتب لک بکل نفس فیه عشر حسنات وتمحی عنک عشر سیات. یاابا ذر !أتعلم فی ایٔ شی ء انزلت هذه الآیة:﴿اصبروا ورابطوا واتقوا اللّٰه لعلکم تفلحون﴾ ؟ قلت:لا،فداک ابی وامی.قال:فی انتظار الصلوٰة خلف الصلوٰة "

یا ابا ذر!اسباغ الوضوء فی المکاره من الکفارات و کثرة الاختلاف الی

المساجد فذلكم الرباط.

يااباذر إيقول اللّٰه تبارک وتعالى:ان احب العباد الى المتحابون من اجلى،المتعلقة قلو بهم بالمساجدو المستغفرون بالاسحار اولئک اذا اردت باهلا الارض عقوبةذكرتهم فصرفت العقوبة عنهم.

"يااباذر!كل جلوس فى المسجد لغو الاّ ثلاثة:قراء ةمصل اوذكر اللّٰه او سائل عن علم"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جناب ابوذرؓ سے کی گئی پند ونصائح کے بعض حصوں پر بحث و تحقیق کے بعد اب ہم اس کے ایک اور حصہ کی بحث وتحقیق کریں گے جس کا موضوع مسجد، مسجد میں حاضر ہونے کے آداب اور نماز کی اہمیت ہے۔

عبادت کا مفہوم اور اس کی وسعت:

ابتدا میں ہم عبادت کے مفہوم اور اسکی وسعت کے بارے میں بحث کریں گے۔ چنانچہ ہم نے اس سے پہلے بیان کیا ہے کہ انسان کا حقیقی کمال قرب الٰہی میں ہے اور اس قرب الٰہی یا حقیقی تکامل کو حاصل کرنے کا وسیلہ عبادت ہے۔ عبادت و پرستش کہ جس کے بہت ہی وسیع اور عمیق مفاہیم ہیں اور یہ ایک ایسے جاذبہ سے بہرہ مند ہے کہ جو حیرت و پریشانی کے سمندر میں پھنسے ہر شخص کو آرام وسکون کے ساحل سے ہم کنار کر دیتا ہے اور آخر کار فنافی اللہ کے مقام تک پہنچا تا ہے حقیقت میں کوئی قلم اور بیان، عبادت و پرستش کے ملکوتی جاذبہ کی بلندی وگہرائی کی توصیف نہیں کرسکتا ہے اور سچ یہ ہے کہ یہ بلند مفہوم الٰہی الفاظ وبیان کے قالب میں نہیں آسکتا ہے۔ صرف وہ امام برحق سخی وجوانمرد نیز اطاعت وعبادت کے شیدائی حضرت علی ابن ابیطالب علیہما السلام ہیں کہ جو فرماتے ہیں:

"الهى كفى بى عزا ان اكون لک عبد او كفى بى فخرا ان تكون لى ربا" [1]

۔ آل عمران/۲۰۰

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۷، ص ۴۰۲

''پروردگارا! میری عزت کے لئے کافی ہے کہ تیرا بندہ ہوں اور میرے فخر کے لئے کافی ہے کہ تو میرا پروردگار ہے!''

یہ بات اللہ کی عبودیت و بندگی کے عشق میں غرق شدہ روح سے نکلی ہے، اس بلند روح سے کہ فرماتا ہے:

''...ولا لفیتم دنیا کم هذه ازهد عندی من عفطة عنز'' [1]

تم جانتے ہو: کہ یہ تمہاری دنیا میری نظروں میں بکری کی چھینک سے پست تر ہے؟

بندگی در کوی عشق ازپادشاهی خوشتر است — بندگی صدره در این دام ازرهائی خوشتر است
تجربت ها کردم از روی حقیقت چند بار — دلق درویشی زتاج پادشاهی خوشتر است
یک نظر درباره صافی کن ودرجام می — تا ببینی بی خودی از خودنمائی خوشتراست
ذوق شبهای درازونالـه هـای جـان گـداز — گرچشی دانی که شاهی ازگدائی خو شتراست

(کوی عشق میں بندگی کرنا پادشاہی سے بہتر ہے۔ اس بندگی کے پھندے میں سو بار پھنسنا رہائی سے بہتر ہے۔ میں نے حقیقت کی رو سے کئی بار تجربہ کیا ہے کہ درویشوں کا لباس تاج پادشاہی سے بہتر ہے۔ لمبی راتوں کے ذوق اور جانسوز نالہ وفریادوں کو اگر چکھ لوگے تو سمجھ لوگے کہ یہ (بندگی) ایسی شاہی ہے کہ جو اس گدائی (ظاہری پادشاہی) سے بہتر ہے۔)

جی ہاں، عبادت و پرستش کا ایک پائدار اور ثابت نظام ہے کہ بشریت کی پیاسی روح اسکے علاوہ کسی اور چیز سے سیراب نہیں ہوتی ہے اور مادی جاذبے اور مادی ترقیاں اس میں اثر نہیں ڈال سکتی ہیں اور نہ اس کے خلا کو پر کر سکتے ہیں، کیونکہ بشر جس قدر صنعت اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں ترقی کرے اور مادیات کے میدانوں کو فتح کر لے، نہ صرف غنی مطلق سے بے نیاز نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کی احتیاج اور ضرورت میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

الف۔ عبادت کی ایک تقسیم بندی:

ایک عام اور وسیع نقطہ نگاہ سے عبادت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ عبادت بہ معنی خاص جو کہ افعال عبادی سے عبارت ہے، جیسے نماز، روزہ و حج و...

۱۔ نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خ ۳، ص ۵۲

۲۔عبادت بہ معنی عام سے مراد ہر وہ اچھا کام جو خدائے متعال کی اطاعت کی نیت سے انجام دیا جائے۔اس تعریف میں حتی کھانا، بیٹھنا، اٹھنا اور بات کرنا اور دیگر وہ تمام کام جنھیں خدائے متعال نے نیک کام شمار کیا ہے اور اس کی اطاعت و بندگی کے قصد سے انجام پاتے ہیں۔پس اس لئے کہ انسان کی عمر ایک صحیح راستہ پر صرف ہو اور بیہودہ طور پر صرف نہ ہو اور اس کا سرمایہ ضائع نہ ہو، اسے کوشش کرنی چاہئے کہ اپنی زندگی کے لمحات کو زیادہ سے زیادہ خدائے متعال کی عبادت خواہ بہ معنای خاص یا عام میں گزاریں یا جو کچھ شرع میں عبادت کے طور پر بیان ہوا ہے اسے انجام دیں اور فرائض نیز افعال توصلی کو قصد قربت سے انجام دینے کی کوشش کریں۔

اگر انسان سے کوئی چھوٹا بڑا کام انجام پائے اور وہ کام مذکورہ عبارت کے زمرے میں نہ آتا ہو ،یعنی اس پر عبادت کا خاص یا عام عنوان صدق نہ آتا ہو، تو وہ کام بیہودہ اور لغو ہے اور قیامت کے دن انسان کے لئے حسرت کا باعث ہے۔اگر نعوذ باللہ، گناہ ہو تو دنیا و آخرت میں خسارت کا باعث اور ابدی عذاب کا سبب ہوگا اور اگر گناہ نہ بھی ہو بلکہ مباح یا مکروہ ہو، تو بہر حال انسان کا سرمایہ اس کے ہاتھ سے چلا گیا ہے اور ایک ایسی چیز پر خرچ ہوا ہے کہ اس کے لئے کوئی نفع نہیں ہے۔شرع میں بہت سے ذاتی طور پر مباح کام انجا م دینے کی تاکید کی گئی ہے اور یہی تشویق اور تاکید موجب ہوتی ہے کہ انسان انھیں انجام دے، اب اگر وہ کام اسی امر کی اطاعت کے قصد سے ہو کہ جس عمل عبادی سے اس کا تعلق ہے انجام دیا جائے تو عبادت ہے۔

انسان کی زندگی سے مربوط اسلامی اور قرآنی نظریہ زندگی کا مقصد اور سعادت اور اس کے اعمال و رفتار کے پیش نظر فطری بات ہے کہ اسلام کی دعوت یہ ہونی چاہئے کہ انسان سے جس قدر زیادہ اور بہتر ممکن ہو سکے عبادت کرے: کمیت اور مقدار کے لحاظ سے، انسان کے انجام دئے جانے والے تمام کام عبادت ہو سکتے ہیں اور حقیقت میں عبادت میں اس قدر وسعت پائی جاتی ہے کہ وہ انسان کی پوری زندگی کو احاطہ کر سکتی ہے۔لیکن کیفیت کے لحاظ سے (عبادت کی کیفیت انسان کی نیت و معرفت سے وابستہ ہے) جس قدر انسان کی معرفت خدائے متعال کے بارے میں زیادہ ہوگی، جس قدر خدا کے بارے میں اس کی محبت میں اضافہ ہوگا اسی اعتبار سے، عبادت کو انجام دینے میں اس کا قصد خالص تر ہوگا اور عبادت کے دوران بیشتر حضور قلب کی کیفیت پیدا ہوگی اور عبادت کی کیفیت بھی بہتر ہوتی جائے گی۔کبھی اگر انسان دو رکعت نماز با

کیفیت انجام دے تو، اس کا ثواب ہزاروں رکعت نماز سے بیشتر ہے، یہ وہ چیز ہے جس کو ہم سب جانتے ہیں اور اسی لئے اسلام نے ہمیں اس کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جس قدر زیادہ کوشش کریں گے ہمارے کام میں خدائی رنگ اتنا ہی زیادہ ہوگا اور ہماری زندگی سراسر خدا کی بندگی میں تبدیل ہو جائے گی، کیونکہ انسان کا کمال خدا کی بندگی میں ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"افضل الناس من عشق العبادةفعانقها واحبها بقلبه وبا شررها بجسده وتفرغ لها فهو لا يبالى على مااصبح من الدنيا على عسر ام على يسر"[1]

''لوگوں میں سب سے قابل قدر وہ ہے جو عبادت کے ساتھ عشق رکھتا ہے، عبادت سے بغل گیر اور ہم آغوش ہوتا ہے اور دل سے اس کے ساتھ محبت کرتے ہوئے اپنے اعضاو جوارح کے ذریعہ اس سے لمس کرتا ہے اور اپنے تمام ہم وغم کو اس کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس کے لئے دنیاوی آرام یا تکلیف کو اہمیت نہیں دیتا ہے۔''

مذکورہ مطالب کے پیش نظر، فطری بات ہے کہ پروردگار جس نے انسان کے لئے ایسے مقصد کو مد نظر رکھا ہے اور اس کیلئے ایسے اسباب فراہم کئے ہیں کہ وہ اپنے تمام کاموں کو عبادت اور خدائی رنگ دے سکتا ہے، تمام وہ وسائل اس کے لئے فراہم کئے ہیں، جن سے لوگ مدد لے کر بہتر اور زیادہ تر خدا کی عبادت کر سکیں اور اس سے قریب ہو جائیں، کیونکہ خدائے متعال کی رحمت سب سے زیادہ ہے اور وہ دوسروں سے زیادہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اس سے قریب ہو جائیں۔ جس طرح اس کا وجود اور عمل لامتناہی ہے، اسی طرح اس کی خیر خواہی بھی لامتناہی ہے۔

خدائے متعال کے تمام اوصاف لامتناہی ہیں، اپنے بندوں کے ساتھ اس کی الفت ومحبت کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ جو اس قدر بے انتہا رحمت کا مالک ہے اور اپنے بندوں کے لئے اس قدر خیر خواہ ہے تشریعی مراحل میں اس نے ایسے احکام صادر فرمائے ہیں تا کہ اس کے بندے اس سے زیادہ قریب ہو جائیں۔ اس لئے شرعی احکام، عبادت، خواہ واجب یا مستحب اور ان کی کیفیت وآداب، سب الطاف الٰہی ہیں۔ خدا وند متعال چاہتا ہے کہ ہم اپنے ارادہ واختیار سے کمال وسعادت تک پہنچیں اور بیشتر تکامل وارتقاء حاصل کریں، اسی لحاظ سے اس نے ہمارے لئے ضروری تکوینی وتشریعی وسائل فراہم کئے ہیں۔

۱۔ اصول کافی، ج ۳، ص ۱۳۱

ب: نماز، کمال بندگی اور تقرب الٰہی:

تکوینی مراحل میں، خدائے متعال جس قدر اپنے بندوں پر زیادہ لطف وعنایت کرے گا، اتنی زیادہ انھیں توفیق ہوگی کہ وہ فرائض اور عبادات کو انجام دیں، البتہ جو کچھ خداوند کریم انجام دیتا ہے وہ بیہودہ نہیں ہے بلکہ ایک خاص قوانین الٰہی کے تابع ہے۔ تشریعی مراحل میں تشویق کرتا ہے اور ایسے احکام جعل کرتا ہے کہ لوگ ان احکام کو انجام دے کر زیادہ سے زیادہ خدا سے نزدیک ہو جائیں۔ من جملہ نماز کو شرعاً واجب فرمایا ہے کہ جو تقرب الٰہی کے لئے بہترین وسیلہ ہے، چنانچہ معصوم نے فرمایا ہے:

"الصلوة قربان كل تقي" [1]

"نماز ہر باتقوی مؤمن کے لئے وسیلۂ تقرب ہے"

البتہ قابل توجہ امر یہ ہے کہ نماز کی ظاہری صورت قرب الٰہی نہیں ہے، بلکہ نماز کی حقیقت اور اس کا باطنی صورت خدا کے قرب کا سبب ہے اور آیات وروایات کے لحاظ سے یہاں نماز کی حقیقت مراد ہے نہ اسکی ظاہری صورت۔ خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿اقم الصلوة لذكرى﴾ (طہٰ/۱۴)

"نماز کو میری یاد کے لئے قائم کرو"

(اس آیت میں تعبیر "اقامہ" نماز کی حقیقت کے ساتھ تناسب رکھتی ہے، نہ اس کی ظاہری صورت سے)

خدائے متعال مزید فرماتا ہے:

﴿واقم الصلوٰة ان الصلوة تنهى عن الفحشاء والمنكر...﴾ (عنکبوت/۴۵)

"اور نماز قائم کریں کہ نماز ہر برائی اور بدکاری سے روکنے والی ہے۔"

علامہ طباطبائی فرماتے ہیں:

سیاق آیت اس بات کی شاہد ہے کہ نماز کا بدکاریوں سے روکنے سے مراد، طبیعت نماز کا بدکاریوں

۱۔ بحار الانوار ج ۱۰، ص ۹۹

اور منکرات سے روکتا ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نماز کیسے بدکاریوں اور منکرات سے روک سکتی ہے ؟جواب میں کہتے ہیں: اگر خدا کا بندہ روزانہ پانچ بار نماز بجالائے اور پوری عمر میں اس کام کو جاری رکھے، خاص کر اگر اسے ایک صالح معاشرے میں بجالائے اور اس معاشرے کے افراد بھی ہر روز نماز کو بجا لائیں اور اسی کی طرح اس کا اہتمام کریں تو فطری طور پر وہ نماز گناہان کبیرہ سے موافقت و میل نہیں کھائی گی ۔جی ہاں، بندگی کے عالم میں خدا کی طرف توجہ، وہ بھی ایسے ماحول اور ایسے افراد میں کہ جو، انسان کو ہر اس گناہ اور عمل سے کہ جس کو دینی ذوق ناپسندیدہ اور گھناؤنا عمل جانتا ہے، جیسے قتل نفس، یتیموں کے جان و مال پر تجاوز کرنا اور زنا وغیرہ سے باز رکھے بلکہ نہ صرف ان کے ارتکاب سے روکے بلکہ ان کے بارے میں تصور کرنے سے بھی منع کرے۔ چونکہ نماز ذکر خدائے متعال پر مشتمل ہے، لہذا سب سے پہلے خدائے متعال کی وحدانیت، رسالت اور روز قیامت کے جزا پر ایمان کو نماز گزار کے لئے تلقین کیا جاتا ہے اور اسے کہا جاتا ہے کہ اپنے خدا کو ایمان و اخلاص کے ساتھ خطاب کرے، اس سے مدد طلب کرے اور درخواست کرے کہ اسے سیدھے راستہ پر ہدایت کرے اسی طرح گمراہی اور اس کے قہر و غضب سے پناہ طلب کرے دوسرے یہ کہ اسے برانگیختہ کرتا ہے کہ اپنی روح و بدن کو خدائے متعال کی عظمت و کبریائی کی طرف متوجہ کرے، اپنے پروردگار کو حمد و ثنا، تسبیح و تکبیر سے یاد کرے۔[1]

لیکن روایات کے نقطہ نظر سے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت نقل ہوئی ہے کہ خدائے متعال اس نماز پر نظر نہیں ڈالتا، جس میں نمازی اپنے دل کو اپنے بدن سے ہم آہنگ نہ کرے اور اس کا دل اس نماز کے پاس نہ ہو۔ بالکل واضح ہے کہ یہ روایت نماز کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جو وہی ذکر اور خدا کی یاد ہے، کیونکہ ذکر اور خدائے متعال کی یاد عبادت کا مقصد ہے اور انسان کے دل کو جلا و روشنی بخشتا ہے اور اسے تجلیات الہی کو قبول کرنے کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام یاد حق جو عبادت کی روح ہے کے بارے میں یوں فرماتے ہیں:

"ان اللّٰہ سبحانہ وتعالی جعل الذکر جلاء للقلوب ،تسمع به بعد الوقرةو تبصربه بعد العشوةوتنقاد به بعد المعا ندة "[2]

۱۔المیزان، ج۱۶ (طبع اسماعیلیان) ص ۱۳۳

۲۔نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خ ۲۱۳، ص ۷۰۳

''خدائے متعال نے اپنی یاد کو دلوں کے لئے صیقل وجلا قرار دیا ہے کہ اس کے سبب (اس کے اوامر ونواہی) بہرے پن کے بعد سنتے ہیں اور تاریکی (نادانی) کے بعد دیکھتے ہیں اور جنگ ودشمنی کے بعد فرمانبردار ہو جاتے ہیں۔''

سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

خدائے متعال کے لئے ہمیشہ جس کی نعمتیں اور کرم فرمائیاں بلند ہیں ایک زمانے کے بعد دوسرے زمانے میں اور اسے زمانے میں جب شریعتوں کے آثار گم ہو جاتے ہیں، کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں جو اپنے خیالات وتصورات میں اس کے ساتھ راز ونیاز کرتے ہیں اور حقیقت میں عقلیں ان کے ساتھ باتیں کرتی ہیں۔

نماز کی حقیقت واہمیت کا عالم یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام جنگ صفین میں دشمن سے جہاد و برسرے پیکار ہونے کے ساتھ سخت گرمی کی حالت میں سورج کی طرف نگاہ اٹھاتے ہیں، تاکہ اگر ظہر کا وقت آپہنچا ہے تو نماز کے لئے کھڑے جائیں۔ ابن عباس سوال کرتے ہیں' کیا کر رہے ہو؟ حضرتؑ جواب میں فرماتے ہیں:

''انظر الی الزوال حتی نصلی''

(آسمان کی طرف) دیکھ رہا ہوں کہ اگر وقت زوال ہو گیا ہے تو نماز پڑھوں۔ ابن عباس کہتے ہیں: کیا یہ نماز پڑھنے کا وقت ہے؟ اس وقت تو جنگ و جہاد نے نماز پڑھنے کیلئے کوئی فرصت باقی نہیں رکھی ہے! حضرتؑ جواب میں فرماتے ہیں:

''علی مانقا تلھم؟ انمانقاتلھم علی الصلوٰۃ'' [1]

''مگر ہم ان سے کس لئے لڑ رہے ہیں؟ ہم تو ان کے ساتھ نماز کے لئے ہی تو لڑ رہے ہیں!''

جی ہاں، علی علیہ السلام کی نظر میں نماز کی اتنی عظمت وبلندی ہے کہ کوئی چیز ان کے لئے نماز سے منہ موڑنے کا سبب نہیں بن سکتی تھی۔ اس کے علاوہ آپؑ کی نظر میں عالم عبادت، لذتوں سے لبریز ہے، ایسی لذت جو مادی لذتوں سے قابل موازنہ نہیں ہے۔ آپؑ کی نظر میں، عالم عبادت سراسر نور ہے، اس میں تاریکی، کدورت اور اندوہ کا کہیں نام ونشان نہیں ہے اور عبادت بالکل نورانی اور خلوص ہے۔ آپؑ کی نظر میں

۱۔ بحار الانوار، ج ۸۰، ص ۲۳

خوش قسمت وہ ہے جو اس بے انتہا دنیا (دنیائے بندگی) میں قدم رکھے اور ایک مسکراہٹ کے ساتھ اپنی جان کو اس جان بخشنے والی حقیقت (ذات خدا) کے سپرد کردے، کیونکہ جس نے اس لامتناہی دنیا (دنیائے عبودیت) میں قدم رکھا، اس کی نظر میں دنیا چھوٹی اور حقیر بن جاتی ہے، یہاں تک وہ دشمن سے جنگ کی حالت میں نماز کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا ہے، کیونکہ وہ ہر چیز کو نماز کے لئے چاہتا ہے اور نماز کو اس لئے چاہتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ راز و نیاز اور گفتگو کرتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام عثمان بن حنیف انصاری کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''خوشا نصیب اس شخص کا کہ جس نے اللہ کے فرائض کو پورا کیا۔ سختیوں اور مصیبتوں میں صبر کیا، راتوں کو اپنی نیندوں سے پہلو تہی اختیار کی اور جب نیند کا غلبہ ہوا تو زمین کو بچھونا اور اپنے ہاتھ کو تکیہ بنالیا قیامت کے خوف نے جن کی آنکھیں بیدار، پہلو بچھونوں سے الگ اور ہونٹ یاد خدا میں زمزمہ کرتے رہتے ہیں اور کثرت استغفار سے جن کے گناہ (پراکندہ بادلوں کی طرح) چھٹ گئے ہیں [۱] ''یہی اللہ کا گروہ ہے۔ اور بیشک اللہ کا گروہ ہی کامیاب کامران ہونے والا ہے'' [۲]

ج۔ مقدمات شرعی ہونے کا فلسفہ اور نماز کی طرف متوجہ کرنے والے عوامل

نماز کی اہمیت اور انسان و معاشرہ کی سلامتی میں اس کے مؤثر ہونیکے پیش نظر، خدائے متعال نے اس کو بہتر صورت میں انجام دینے کے لئے بعض مقدمات قرار دئے ہیں اور اس کے لئے بعض آداب معین کئے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ بندے اس کو یاد کریں اور اس کی عبادت کی اہمیت کو درک کریں۔ انسان کو کسی کار خیر کو انجام دینے کے لئے، پہلے جاننا چاہئے؛ کہ وہ کام خیر ہے کہ نہیں اس کے بعد اس کے بارے میں فکر کرے۔ ہم بہت سے امور کے نیک ہونے کے بارے میں آگاہ ہیں، لیکن ان کو وقت پر انجام دینا بھول

۱۔ نہج البلاغہ (فیض الاسلام) مکتوب نمبر ۴۵، نمبر ۱۵، ص ۹۷۴

۲۔ مجادلہ/۲۲

جاتے ہیں ہمیں نماز کو بھولنے سے بچانے کے لئے، خدائے متعال نے بعض مقدمات معین کئے ہیں، مثلا اذان کو نماز کے لئے واجب قرار دیا اور تاکید فرمائی کہ اسے ترک کرنے سے اجتناب کریں۔ اس کے علاوہ ایک اور عبادت کو اذان کے نام پر معین فرمایا، یہ نماز کا مقدمہ اور اس کی یاددہانی کرنے والی ہے اور فرمایا کہ اذان کو بلند آواز میں کہو تا کہ دوسرے لوگ نماز اور اس کے وقت کے ہو جانیکے بارے میں متوجہ ہو جائیں اور ان میں نماز کو قائم کرنے کے لئے شوق پیدا ہو جائے۔ اگر چہ نماز کے شرعی ہونے کی بنیاد اور اس سلسلہ میں نقل ہوئی آیات و روایات، سب انسان کو نماز کی اہمیت اور موقعیت کو سمجھنے کے لئے مدد کرتی ہیں، لیکن جب نماز کے وقت اذان کی آواز بلند ہوتی ہے تو لوگوں کی توجہ نماز کے وقت اور اس کی اہمیت کی طرف مبذول ہوتی ہے اور یہ لوگوں کو نماز کی طرف متوجہ کرنے کے لئے ایک مؤثر سبب ہے۔

یہاں تک بہت سے ایسے لوگ جو نماز کو اول وقت پر پڑھنے کا ملکہ رکھتے ہیں، جب کسی کام کو انجام دینے میں سرگرم و مشغول ہوتے ہیں تو ممکن ہے نماز کو انجام دینے سے غافل ہو جائیں اور بھول جائیں کہ نماز کا وقت آپہنچا ہے، لیکن جب اذان کی آواز بلند ہوتی ہے تو خواہ نخواہ نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ پس شریعت میں اذان اور اس کو بہ آواز بلند کہنے کی تاکید، دوسروں کو نماز کی طرف توجہ اور تذکر دلانے کے لئے ہے اور یہ بذات خود دوسروں کو اول وقت پر عبادت انجام دینے کی دعوت ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اول وقت میں نماز پڑھنے کی فضیلت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"اذا صلّیت صلاة فریضة فصلها لو قتها صلاة مودّع یخاف ان لا یعود الیها ابدا"[1]

"جب تم واجب نماز پڑھنا چاہو تو اسے اول وقت میں اس شخص کی طرح بجالاؤ جس کا اس دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آپہنچا ہے اور ڈرتا ہے کہ کہیں پھر سے نماز پڑھنے کی اسے فرصت میسر نہ ہو، اسی طرح ابن مسعود سے نقل ہوا ہے:

"سألت رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم :ایّ الاعمال احب الی الله

۱۔ بحار الانوار، ج ۸۰، ص ۱۰

عز وجل ؟قال :الصلوة لوقتها" [1]

''میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا: کونسا عمل خدائے متعال کے نزدیک بہتر ومحبوب تر ہے؟ تو حضرتؐ نے فرمایا (محبوب ترین عمل خدا کے نزدیک) اول وقت میں نماز پڑھنا ہے۔''

پھر بھی خدائے متعال نے لوگوں میں عبادت اور بندگی کی روح کو ایجاد کرنے کے لئے مزید تشویق کی خاطر نماز کے لئے خاص زمان ومکان معین فرمائے ہیں۔ مثلا شب اور روز جمعہ کو عبادت کے لئے معین فرمایا ہے اور خود روز جمعہ کو عبادت کے لئے مخصوص کیا گیا ہے، انسان کو عبادت انجام دینے اور بیہودہ کاموں سے پرہیز کرنے کی طرف ترغیب وتلقین کرتا ہے۔ اسی طرح جو فضیلت خدائے متعال نے ماہ ذیقعدہ اور ذی الحجہ کے ابتدائی دس دنوں کے لئے قرار دی ہے وہ بذات خود خدا کی عبادت کی یاد دہانی ہے کیونکہ ان چالیس دنوں (ایک ماہ ذی القعدہ اور دس روز ذی الحجہ) تک حضرت موسی علیہ السلام کوہ طور پر عبادت پروردگار میں مشغول رہے ہیں خدائے متعال اس سلسلہ میں فرماتا ہے:

﴿وواعدنا موسى ثلثين ليلةواتممناها بعشر فتم ميقات ربه اربعين ليلة وقال موسى لأخيه هرون اخلفني في قوم واصلح ولا تتبع سبيل المفسدين﴾ (اعراف/۱۴۲)

''اور ہم نے موسیٰؑ سے تیس راتوں کا وعدہ لیا اور پھر مزید دس راتوں کا اضافہ کیا تا کہ اس طرح ان کے رب کا وعدہ چالیس راتوں کا مکمل ہو جائے اور انہوں نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ تم قوم میں میری نیابت کرو اور اصلاح کرتے رہو اور خبردار مفسدوں کے راستہ کا اتباع نہ کرنا''

حضرت موسی علی نبینا وعلیہ السلام نے چالیس دن عبادت میں گزارے وہ ((اربعین کلیمیہ)) کے نام سے مشہور ہیں اور اہل سیر وسلوک ان کیلئے فراوان اہمیت کے قائل ہیں اور ان کے لئے خاص آداب واحکام ذکر کئے ہیں اور اس کے دوران بیشتر عبادت میں مشغول رہتے ہیں، چونکہ ہماری احادیث کے منابع میں اربعین کے بارے میں ایک خاص اہمیت ذکر ہوئی ہے، مثلا ایک روایت میں آیا ہے:

۱۔ بحار الانوار، ج ۸۰، ص ۱۳۷

"من أخلص لله اربعين يوما فجر الله ينابيع الحكمة من قلبه على لسانه" [1]

جو چالیس روز تک خدائے متعال کی مخلصانہ عبادت کرے، خدائے متعال اس کے دل سے حکمت کے چشمے زبان پر جاری فرمائے گا۔

(چالیس دن تک عبادت کرنا یا چالیس حدیث حفظ کرنا وغیرہ کے بارے میں فراوان فائدے ذکر کئے گئے ہیں۔)

اسی طرح مبارک ایام، عیدیں، احیاء (بیداری) کی راتیں اور ماہ رمضان المبارک ایسے امتیازات اور خصوصیات رکھتے ہیں تا کہ ان سے استفادہ اور ان زمانوں سے مربوط مواقع کو درک کرنا لوگوں کو بیشتر خدا کی یاد میں مشغول کرے اور وہ زیادہ سے زیادہ عبادت کریں اور وہ سمجھ لیں کہ ان کی سعادت خدا کی بندگی اور اس کی عبادت میں ہے، اور شائستہ نہیں ہے کہ انسان خدائے متعال سے منہ موڑ کر دوسروں کی طرف رخ کرے۔

مادر خلوت بہ روی خلق ببستیم — از ہمہ بازآمدیم وباتو نشستیم
ہرچہ نہ پیوند یار بود بریدیم — وآنچہ نہ پیمان دوست بود شکستیم
در ہمہ چشمی عزیز و نزد تو خواریم — در ہمہ عالم بلند و پیش تو پستیم

(ہم نے خلوت اور تنہائیوں میں لوگوں سے منہ موڑ لیا ہے۔ سب کو چھوڑ کے تیرے حضور آ بیٹھے ہیں۔ جو بھی دوست کا پیوند نہ تھا اسے ہم نے پھاڑ دیا۔ اور جو بھی دوست کا عہد و پیمان نہ تھا اسے توڑ دیا، ہم سبھی کی نظروں میں عزیز ہیں لیکن تیرے حضور میں ذلیل و خوار ہیں، تمام دنیا میں بلند لیکن تیرے سامنے پست ہیں)

مسجد، لقاء اللہ کے عاشقوں کے کی معراج:

خاص زمانوں کے علاوہ خدائے متعال نے عبادت کیلئے چند خاص مکان بھی عبادت کے لئے معین فرمائے ہیں، کہ جب لوگ ان مکانوں کو دیکھتے ہیں اور ان میں داخل ہوتے ہیں تو انھیں خود بخود خدا اور اس کے عبادی فریضہ کی یاد آتی ہے اس لحاظ سے ان مکانوں کا وجود، خدا کے طرف توجہ کرنے اور اس کی

۱۔ بحار الانوار، ج ۷، ص ۲۴۹

بندگی کے لئے زیادہ شوق پیدا کرتا ہے، کلی طور پر مسجدیں اس قسم کا رول ادا کرتی ہیں۔

اگر چہ انسان کے لئے نماز کو بجالانا ہر جگہ پر غصبی جگہوں یا ایسی جگہوں پر، جہاں کسی وجہ سے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، کے علاوہ جائز ہے، لیکن اسلام میں سخت تاکید کی گئی ہے کہ انسان واجب نمازوں کو مسجد میں پڑھے اور مسجد میں رفت وآمد کے لئے پابند رہے، خاص کر ہمسایہ کی مسجد میں، چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"لا صلوة لجار المسجد الا فی مسجده"[1]

''مسجد کے ہمسایہ کی نماز قبول نہیں ہے، مگر مسجد میں۔''

روایتوں میں کی گئی تاکیدوں کے پیش نظر فقہا نے مسجد کے ہمسایوں کے لئے مسجد میں نماز پڑھنے کو مستحب موکد اور اس کے ترک کرنے کو مکروہ جانا ہے۔ مرحوم آیت اللہ سید محمد کاظم یزدی فرماتے ہیں:

مسجد کے ہمسایہ کے لئے عذر کے بغیر اس مسجد کے علاوہ کہیں اور نماز پڑھنا مکروہ ہے [2] پس انسان کو ہمیشہ مسجد میں حاضر ہونا چاہئے تا کہ نماز کو مسجد میں پڑھے اور مسجد کے مقام ومنزلت اور اس کے آداب واحترام کی رعایت اور اس میں عدم حضور کی قباحت کے بارے میں فکر کرے اور یہ بھی سوچ لے کہ مسجد میں حاضر ہونے اور وہاں پر نماز پڑھنے کے ثواب کے علاوہ خدائے متعال نے مسجد کو اپنا گھر قرار دیا ہے اور اپنے بندوں کو اس میں داخل ہونے کی اجازت دیکر انھیں اپنا مہمان منت بنایا تا کہ وہ اس میں حاضر ہو کر مستفید وبار یاب ہوں، کیونکہ مسجد خدا کا گھر ہے۔

فطری بات ہے کہ تمام زمین خدائے متعال کے نزدیک یکساں ہے اور کوئی ایک جگہ دوسری کی نسبت خدا سے زیادہ نزدیک نہیں ہے، پس کعبہ اور مسجد کے خدا کا گھر ہونے کا مقصد یہ ہے کہ خداوند متعال کا ان مکانات کے ساتھ برتاؤ ویسا ہی ہے جیسا ہم اپنے گھروں سے رکھتے ہیں۔ یعنی خدائے متعال نے ان مکانات کو اپنی ملاقات اور انس اور زیارت کی جگہ قرار دیا ہے اور اپنے بندوں اور زائرین کو وہاں پر اپنی ملاقات سے سرفراز کرتا ہے اور ان سے بات کرتا ہے اس کے علاوہ جس جگہ کے بارے میں ہم مسجد بنانے کا ارادہ کریں اور اسے خدائے متعال سے منسوب کریں اور جس جگہ کو بھی ہم اسکی ملاقات اس کے وہاں حاضر

۱۔ وسائل الشیعہ، ج ۳/ ص ۴۷۸

۲۔ عروۃ الوثقی، امام خمینی رضوان اللہ تعالی علیہ کے حاشیہ کے ساتھ، ص ۲۱۱

ہونے اور اسکی زیارت کے لئے قرار دیں وہ اسے قبول کرتا ہے اور یہ اس معنی میں ہے کہ ملاقات اور زیارت کی جگہ کو معین کرنا بھی ہمارے ذمہ رکھا ہے اور یہ خدائے متعال کی طرف سے ہمارے لئے سب سے بڑی سخاوت اور مہربانی ہے۔

پس مسجدوں کا سب سے بڑا رول، انسان کا خداوند متعال کی طرف توجہ کرنا اور ان میں عبادت و بندگی کی حس کو اجاگر کرنا ہے، اگر چہ سب مسجدیں رتبہ اور مقام کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں اور اہمیت کے لحاظ سے بعض مسجدوں کی عظمت بلند ہے۔ حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''مذہب اسلام میں تاکید کی گئی ہے کہ نماز کو مسجد میں پڑھا جائے، تمام مسجدوں میں سب سے بہتر مسجد الحرام ہے، اس کے بعد مسجد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اس کے بعد مسجد کوفہ، اس کے بعد بیت المقدس، اس کے بعد ہر شہر کی جامع مسجد اسکے بعد محلّہ کی مسجد، اور اس کے بعد بازار کی مسجد ہے۔'' [۱]

حضرت امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''اربعة من قصور الجنة فی الدنیا: المسجدالحرام، و مسجد الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و مسجد بیت المقدس و مسجد الکوفه'' [۲]

یہ چار مسجدیں دنیا میں قصر بہشت ہیں، مسجد الحرام، مسجد النبیؐ، مسجد بیت المقدس، مسجد کوفہ۔

یہ چار مسجدیں اس قدر عظیم اور مقدس ہیں کہ حتی بعض روایتوں میں تاکید کی گئی ہے کہ انسان دور و نزدیک راستوں سے سفر کر کے ان مساجد کی زیارت کرے اور ان میں اعتکاف کرنے کا ثواب ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

''لو یعلم الناس مافی مسجد الکوفه لأعدوا له الزاد و الرواحل من مکان بعید ان الصلاة فریضة فیه تعدل حجة و صلاة نافلة فیه تعدل عمرة'' [۳]

اگر لوگ مسجد کوفہ کو پہچانتے، تو دور دراز منزلوں سے اس مسجد میں پہنچنے کے لئے زادراہ اور سواری کا انتظام کرتے۔ اس مسجد میں ایک واجب نماز کا ثواب حج کے ثواب کے برابر اور ایک مستحب نماز کا ثواب ایک عمرہ کے برابر ہیں۔

۱۔ رسالہ توضیح المسائل، مسئلہ ۸۹۳

۲۔ وسائل الشیعہ، ج ۳ ص ۵۴۵

۳۔ وسائل الشیعہ، ج ۳ ص ۵۲۵

یا یہ کہ مسجد الحرام کی اس قدر عظمت ہے کہ مسلمانوں کی قبلہ گاہ یعنی کعبہ اسی میں قرار پایا ہے اور مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنی نماز کو اس مسجد اور خانہ کعبہ کی طرف بجالائیں۔ اس کے علاوہ مستطیع ہونے والوں پر اسکا حج کرنا واجب ہے اور اس مسجد میں ایک رکعت نماز کا ثواب دوسری مسجدوں میں دس لاکھ رکعتوں کے ثواب کے برابر ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

"صلاة فی مسجدی تعدل الف صلاة فی غیره وصلاة فی المسجد الحرام تعدل الف صلاة فی مسجد" ۱

''میری مسجد میں ایک رکعت نماز پڑھنا دوسری مسجدوں میں ہزار رکعتیں پڑھنے کے برابر ہے اور مسجد الحرام میں ایک رکعت نماز پڑھنا میری مسجد میں ہزار رکعتیں نماز پڑھنے کے برابر ہے''

اس کے علاوہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اس مسجد مقدس کی فضیلت میں فرماتے ہیں:

"من صلّی فی المسجد الحرام صلاةمکتوبة قبل الله منه کل صلاة صلاها منذیوم وجبت علیه الصلاة وکل صلاة یصلیهاالی ان یموت" ۲

''جس شخص نے ایک واجب نماز کو مسجد الحرام میں بجالایا، تو خدائے متعال اس پر واجب ہونے کے دن سے پڑھی گئی تمام نمازوں کو اور آئندہ مرتے دم تک پڑھی جانی والی تمام نمازوں کو قبول فرماتا ہے۔''

مذکورہ مسجدوں کے علاوہ کچھ اور مسجدیں بھی بافضیلت ہیں، یہاں تک حدیث قدسی میں آیا ہے:

"قال الله تبارک و تعالی: ان بیوتیٰ فی الارض المساجد ،تضیٔ لاهل السماء کما تضیٔ النجوم لا هل الارض. الا طو بیٰ لمن کانت المساجد بیو ته الا طوبیٰ لعبد توضأ فی بیته ثم زارنی فی بیتی الاان علی المزور کرامة الزائر. الابشر المشائین فی الظلمات الی المساجد بالنور الساطع یوم القیامة" ۳

۱۔ وسائل الشیعہ، ج ۳/ ص ۵۴۵/

۲۔ وسائل الشیعہ، ج ۳/ ص ۵۳۶/

۳۔ وسائل الشیعہ، ج ۱/ ص ۲۶۸

پروردگار عالم فرماتا ہے: زمین پر مسجدیں میرا گھر ہیں جو اہل آسمان کے لئے اسی طرح چمکتی ہیں جس طرح اہل زمین کے لئے ستارے چمکتے ہیں۔ خوشا نصیب ان کیلئے جنھوں نے مسجدوں کو اپنے گھر قرار دیا ہے۔ خوشا نصیب اس بندے کے لئے، جو اپنے گھر میں وضو کرتا ہے اور اس کے بعد میرے گھر پر میری زیارت کرتا ہے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ جس کی زیارت کی جاتی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے زائر کا احترام کرے اور اس پر احسان کرے۔ جو لوگ رات کی تاریکی میں مسجد کی طرف قدم بڑھاتے ہیں انھیں قیامت کے دن ایک چمکتے نور کی بشارت دو۔

مسجدوں کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کی حکمتیں:

لوگوں کو مساجد کی طرف متوجہ کرنے کی فراوان حکمتیں ہیں، ان کو کلی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

ا۔ اجتماعی حکمتیں: جب کی مسجد کو مرکزیت مل جائیگی اور روزانہ چند مرتبہ لوگ وہاں جمع ہوں گے یا جمعہ کے دن لوگوں کا ایک پرشکوہ اجتماع مسجد میں اکٹھا ہوگا تو معاشرے کو بہت ساری اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی برکتیں نصیب ہوں گی۔ اور مسلمان صدر اسلام سے آج تک ان منفعتوں اور برکتوں سے بہرہ مند ہوتے آئیں ہیں۔ مسجد، پوری تاریخ میں فکری، مذہبی، سیاسی اور اقتصادی ضرورتوں کو پورا کرنے کا مرکز رہی ہیں اس کے علاوہ مساجد اسلام کی غنی ثقافت کی ترویج اور معاشرے کے لئے ضروری علوم سیکھنے کا مرکز رہی ہیں۔ اس کے علاوہ مسجدیں دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے جنگجوؤں اور مجاہدین کا مرکز رہی ہیں۔ ہم کلی طور پر مسجد کے لئے چار اہم نقش کے قائل ہو سکتے ہیں:

الف۔ عبادت اور خدا کی یاد کا مرکز

ب۔ فکری جہاد اور تعلیم و معارف اسلامی سیکھنے کا مرکز۔

ج۔ مسلمانوں کی وحدت اور آشکار و مخفی دشمنوں سے مقابلہ کے لئے اتحاد و یکجہتی کے مظاہرہ کا مرکز۔

د۔ لشکر اسلام اور مجاہدین کے جمع ہونے اور دشمن سے مقابلہ کرنے کیلئے ان کو محاذ جنگ پر روانہ کرنے کا مرکز۔

۲۔ انفرادی حکمتیں: مذکورہ مطالب کے علاوہ، مسجد خود ایک فرد کے لئے بھی بہت سی برکتیں رکھتی ہے. جب کوئی شخص مسجد سے گزرتا ہے اور اس میں داخل ہوتا ہے تو اس میں عبادت کے لئے مزید آمادگی ظاہر کرتا ہے۔ پس مسجد تذکر دینے کی جگہ ہے جو انسان کو خدا اور عبادت کی یاد دلاتی ہے۔ حتی اگر انسان یاد خدا سے غافل بھی ہو، جب وہ مسجد کے سامنے سے گزرتا ہے یا مسجد کے گنبد یا مینار کو دیکھتا ہے، تو وہ متوجہ ہوتا ہے کہ یہاں پر خدا کا گھر ہے اور فوراً اسے خدا کی یاد آتی ہے۔ جو خدائے متعال کی بندگی کے خواہشمند ہوتے ہیں، ان میں عبادت کے شوق کو اجاگر کرنے والے عوامل پیدا ہوتے ہیں اس لحاظ سے وہ عوامل، اس کے تکامل وارتقاء کے لئے بہترین وسیلہ ہیں، اور انسانوں کو زیادہ سے زیادہ خدا اور اس کی عبادت کی طرف مائل کرنے والے عوامل میں عبادت و بندگی کے لئے مشخص کئے گئے مخصوص مکان بھی ہیں۔ اس لئے تاکید کی گئی ہے کہ انسان اپنے گھر میں بھی نماز خانہ یا مصلی کے طور پر ایک جگہ کو معین اور مشخص کرلے اور اس بات کا دھیان رکھے کہ وہ جگہ نجاست سے آلودہ نہ ہو، جب انسان نماز کے لئے مخصوص کی گئی اس جگہ یا نماز کے لئے بچھائی گئی جانماز کو دیکھتا ہے، اسے خدا کی یاد آتی ہے۔ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"کان علی علیه السلام قد جعل بینا فی داره لیس بالصغیر و لا بالکبیر لصلاته و کان اذا کان اللیل ذهب معه بصبی لا یبیت معه فیصلی فیه"[1]

"امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے گھر میں ایک متوسط قسم کا کمرہ نماز کے لئے قرار دیا تھا اور جو بچہ شب میں بیدار ہوتا تھا اسے ساتھ لے کر نماز پڑھنے کے لئے اس کمرہ میں جاتے تھے اور نماز پڑھتے تھے۔"

گھر کے نماز خانہ کے علاوہ، شہر اور محلہ کی مسجدیں بھی یاد دہانی کرانے والی ہیں اور انسان کو خدا کی طرف متوجہ کرتی ہیں اور ان وسائل میں سے ہیں کہ جنھیں خدائے متعال نے انسان کے لئے کمال وسعادت کی راہ میں قرار دیا ہے۔ اس لحاظ سے جب کسی جگہ پر مسجد تعمیر ہوتی ہے، تو لوگوں کو اس میں جانے کی تشویق کرنا چاہئے اور مسجد میں جانے کا ثواب اور مسجد کی طرف جانے کے لئے ہر کے لئے جو ثواب ہیں، انھیں

۱۔ وسائل الشیعہ، ج ۳، ص ۵۵۵

بیان کیا جانا چاہئے تا کہ لوگوں میں مسجد میں جانے کا شوق پیدا ہو، انھیں کہنا چاہئے کہ مسجد میں حاضر ہونا ثواب میں اضافہ ہونے اور گناہ کے نابود ہونے کا سبب ہے۔حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

" قال رسول اللہ ﷺ و من مشی الی مسجد یطلب فیہ الجماعۃ کان لہ بکل خطوۃ سبعون الف حسنۃ و یرفع لہ من الدرجات مثل ذلک"[1]

"پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: جو نماز میں شرکت کرنیکی نیت سے مسجد کی طرف قدم بڑھاتا ہے، خدائے متعال اس کے ہر قدم کے عوض میں ستر ہزار ثواب پاداش (جزا) کے طور پر دیتا ہے اور اسی قدر اس کے درجات بھی بلند ہوتے ہیں"

مساجد کی اہمیت کو درک کرنے کی ضرورت

اور ان میں حاضر ہونے کے آداب:

پیغمبر اکرم ﷺ کی اس حدیث میں نصیحتوں کا ایک حصہ مومنین کو مسجد میں حاضر ہو کر اس کے معنوی برکات سے بہرہ مند ہونے کے لئے تشویق کرنے پر مشتمل ہے۔اس کا ایک اور حصہ مسجد میں حاضر ہونے کے آداب سے مربوط ہے کہ کس طرح مسجد سے بہتر استفادہ کیا جائے، ہمیں کن قواعد وضوابط پر عمل کرنا چاہئے تا کہ خدانخواستہ اس الٰہی اور عظیم نعمت سے محروم نہ ہو جائیں، کیونکہ بعض اوقات انسان اس قدر غفلت اور شیطان وسوسوں میں مبتلا ہوتا ہے کہ خیر وسعادت کے وسائل کو اپنے ہی ہاتھ سے شر اور تاریکی کے وسائل میں تبدیل کر دیتا ہے:

﴿الم تر الی الذین بدلوا نعمت اللہ کفرا... ﴾ (ابراہیم/۲۸)

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے اللہ کی نعمت کو کفران نعمت سے تبدیل کر دیا"

جی ہاں، انسان کے لئے یہ خطرہ موجود ہے کہ اپنے ہی ہاتھوں سے خدا کی ایک نعمت کو کفران نعمت میں تبدیل کر دے اور خیر ونیکی کے وسیلہ کو شر کے وسیلہ میں تبدیل کرے، لہذا جب لوگ مسجد میں جانے اور مسجد کی طرف قدم بڑھانے کے ثواب شمار کرتے ہیں تو جایئے کہ اس کے علاوہ انھیں یہ بھی یاد دہانی کرائی

۱۔وسائل الشیعہ، ج/۵، ص/۳۷۲

جائے کہ وہ مسجد سے مناسب استفادہ کرنے کی کوشش کریں اور اس بات کی طرف متوجہ رہیں کہ کس لئے مسجد میں آئے ہیں، تا کہ خدانخواستہ دنیوی امور، خرید وفروش، گران وارزان، ڈالر اور زمین کی قیمت جیسی چیزوں کی گفتگو میں مشغول نہ ہو جائیں اور اس بات کو بالکل ہی فراموش کر جائیں کہ کہاں ہیں اور کس لئے آئے ہیں! اس لحاظ سے مسجد کے لئے کچھ مخصوص آداب معین ہوئے ہیں تا کہ ان کی رعایت سے انسان غفلت میں مبتلا نہ ہو اور مسجد کی برکات سے محروم نہ رہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیانات پر غور وتحقیقات سے پہلے ہم ایک نکتہ کی طرف یاد دہانی کرانا ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ ہے جب انسان مسجد جانیکا ارادہ کرتا ہے، تو اسے اپنی استعداد کے مطابق مسجد میں حاضر ہونے کے آداب کو جاننے کی کوشش کرنا چاہئے، کیونکہ جس قدر معرفت ہوگی، اسی قدر عمل کی قدر وقیمت میں اضافہ ہوگا اور ادب کی رعایت خود بندہ کے لئے خدائے متعال سے قریب ہونے کا سبب ہے، اس کے علاوہ جو شخص مسجد میں حاضر ہونے کے آداب کی رعایت کرتا ہے، اس کا عمل قرب الٰہی اور اعمال کے قبول ہونے کا سبب واقع ہوتا ہے ہمیں جاننا چاہئے کہ جب ہم مسجد میں حاضر ہوتے ہیں تو گویا ہم خدائے متعال کی چوکھٹ پر وارد ہوتے ہیں اور اس کے حضور میں ہوتے ہیں اور مناسب ہے حضرت حق کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے آداب کو اپنے بزرگوں اور محترم شخصیتوں کے وہاں حاضر ہونیکے آداب کو معیار قرار دیں اور دیکھیں کہ جب ہم کسی محترم بزرگ شخصیت کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، تو کس طرح خضوع وخشوع کے ساتھ نیز انکساری اور احساس کم تری کی کیفیت ہم پر طاری ہوتی ہے عع۔ اس کے پیش نظر کہ بزرگوں کی عظمت خدائے متعال کی عظمت سے قابل موازنہ نہیں ہے اور اسی طرح خدا کے حضور میں حاضر ہونے کے آداب کی نسبت بزرگوں کے حضور میں حاضر ہونے کے آداب سے قابل موازنہ نہیں ہے۔

مذکورہ مطالب کے پیش نظر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی شخص خدا کے حضور میں حاضر ہونے کے آداب کے حق کی رعایت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے ہم خدا کے حضور میں حاضر ہونے کے آداب کی رعایت نہیں کر سکتے ہیں پس کم از کم اتنا تو دیکھ لیں کہ ہماری رفتار کیسی ہے اور اپنی کوتاہیوں کو مد نظر رکھیں کہ یہی مختصر اقدام ہمارے لئے خدا کے کرم کا دروازہ کھلنے کا سبب بنے گا۔ حضرت امام صادق علیہ السلام ایک مفصل حدیث میں، مسجد میں حاضر ہونے کے آداب کو یوں بیان فرماتے ہیں:

جب کسی مسجد کے دروازہ پر وارد ہو، تو جان لو کہ تم نے ایک ایسے سلطان وبادشاہ کی ملاقات کا

ارادہ کیا ہے جس کی بساط پر پاک و پاکیزہ لوگوں کے علاوہ کوئی قدم نہیں رکھ سکتا ہے اور اس کی مصاحبت کے لئے صدیقین اور اچھے کردار والوں کے علاوہ کسی کو اجازت نہیں دی گئی ہے اور جب اسکی بساط پر قدم رکھو، تو جان لو کہ اگر معمولی سی غفلت تم سے سرزد ہوئی تو تم ایک بڑے خطرے اور خطرناک گڑھے کے دہانے پر واقع ہو اور یہ بھی جان لو کہ وہ اپنے عدل یا فضل سے تمہارے ساتھ معاملہ کرے گا۔ پس اگر اس نے مہربانی کی اور اپنے فضل و رحمت سے تمہارے ساتھ معاملہ کیا تو وہ تمہاری معمولی اطاعت کو بھی قبول کرلے گا اور اس کے مقابلہ میں تجھے ثواب دے گا اور اگر وہ تجھ سے اپنے عدل سے معاملہ کرنا چاہے اور جس چیز کے تم مستحق ہو وہ تمہیں عطا کرے تو وہ تمہیں تمہاری اطاعت سمیت واپس کردے گا چاہئے جس قدر بھی زیادہ ہو، مسترد کردے گا اور وہ جو چاہے گا وہ انجام دیگا۔

پس اسکی بارگاہ میں اپنی عاجزی، کوتاہی اور فقر کا اعتراف کرو، کیونکہ تم نے اسکی عبادت اور اس سے انس کی نیت کی ہے۔ اپنے اسرار کو اس کے سامنے پیش کرو اور جان لو کہ وہ تمام مخلوقات کے پنہاں و آشکار امور کے بارے میں علم رکھتا ہے اور ایک ذرہ بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہے اور تم اس کے حضور میں ایک فقیر ترین بندہ کے مانند رہو اور اپنے دل کو ان تمام چیزوں سے پاک کرو جو تجھے اپنی طرف مشغول کرے اور تیرے اور اس کے درمیان حجاب اور مانع ہو، کیونکہ وہ پاکیزہ ترین اور مخلص ترین دلوں کے علاوہ کسی کو قبول نہیں کرتا ہے اور اچھی طرح دیکھ لو کہ تمہارا نام کس رجسٹر میں درج ہے۔ پس اگر تم نے اس کے ساتھ مناجات کی حلاوت کو چکھا اور اسکے ساتھ گفتگو میں لذت کا احساس کیا اور اس کی رحمت و کرامت کے جام نوش کئے، تو یہ اسکی طرف تجھے قبول کرنے اور تیری دعوت کو اجابت کرنے کی نشانی ہے اور اس صورت میں جان لو کہ تم اس کی خدمت میں جانے کے سزاوار ہو پس تم مسجد میں داخل ہو جاؤ کہ تجھے پروانہ اذن و امان مل گیا اور اگر ایسا نہ ہوا تو تم ایک ایسے دربدر شخص کی طرح ہو کہ جس کے لئے تمام دروازے بند کردیئے گئے ہیں اور وہ کچھ نہیں کرسکتا ہے۔ تمہیں جان لینا چاہئے کہ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ تم نے حقیقت میں اس کے یہاں پناہ لی ہے، تو وہ تجھے مہربانی، رحمت اور کرم کی نگاہ سے دیکھے گا اور تجھے اپنی مرضی سے کامیاب بنادے گا، کیونکہ وہ کریم اور عظمت والا ہے اور اپنے ایسے بندوں سے عطوفت و محبت کرتا ہے جو بے چارہ مضطرب حالت میں اس کی بارگاہ میں کھڑے ہو کر اس کے لطف و کرم کے لئے امیدوار ہوتے ہیں، کیونکہ وہ خود فرماتا ہے:

"امن یجیب المضطر اذا دعاہ و یکشف السو ء..." (نمل/۶۲)

"بھلا وہ کون ہے جو مضطر کی فریاد کو سنتا ہے؟ جب وہ اس کو آواز دیتا ہے اور اسکی مصیبت کو دور کر دیتا ہے۔"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں حاضر ہونے کی تشویق کے لئے فرماتے ہیں:

"یا اباذر!الکلمة الطیبة صدقة و کل خطوة تخطوها الی الصلوٰة صدقة"

"اے ابوذر! نیک گفتار اور جو بھی قدم نماز کیلئے اٹھاؤ گے وہ صدقہ ہے"

"صدقہ" ان عناوین میں سے ہے جس کو اسلامی ثقافت میں مختلف صورتوں میں پیش کیا گیا ہے اور اس کی اہمیت واضح ہے، جب کہتے ہیں کہ فلاں کام صدقہ ہے، تو اس کا مفہوم و معنی یہ ہوتا ہے کہ اس کام کی غیر معمولی اہمیت ہے اور اس کا بہت زیادہ ثواب ہے۔ اس لحاظ سے جب کسی چیز کی عظمت کو بیان کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں: یہ کام صدقہ ہے۔ من جملہ جب نیک اور شائستہ بات ہم کسی سے کہنا چاہتے ہیں، تو کہتے ہیں صدقہ ہے، تا کہ اسے کم اہمیت نہ سمجھیں اور توجہ رکھیں کہ ہم نے جب کسی سے اچھی بات کہی جو اس کے کام کی تھی اور اسے خدا کی طرف متوجہ کرنے والی تھی نیز، برے کام سے باز رکھنے والی تھی یا ایسی بات جو ایک غمزدہ اور پریشان مومن کے لئے خوشنودی کا باعث ہو اور اس کی ناامیدی اور افسردگی کو برطرف کر دے تو ایسی بات مطلوب اور خدا کے نزدیک پسندیدہ ہے اگر خداوند عالم کی اطاعت کے قصد سے انجام دی جائے تو عبادت ہے۔

پہلے پیغمبر ﷺ فرماتے ہیں کہ ہر نیک بات صدقہ ہے اور اس کے بعد فرماتے ہیں جو بھی قدم مسجد کی طرف اٹھاؤ گے وہ بھی صدقہ ہے اور اس کے بعد بحث کا محور مسجد ہے۔ فطری بات ہے کہ جب ایک انسان آنحضرت ﷺ کے اس بیان کے مفہوم و معنی سے آگاہ ہو گیا اور اس نے یقین کر لیا کہ جو بھی قدم وہ مسجد کی طرف اٹھائے گا وہ صدقہ ہے اور اس بہت زیادہ اجر اور ثواب ہے، تو مسجد اس کے گھر سے چاہے جتنی دور ہو پھر بھی مسجد میں جانے کے لئے وہ عجلت کرے گا اور اس کے لئے مسجد میں جانا مشکل نہیں ہوگا اور بہانہ نہیں کر سکتا کہ مسجد دور ہے، چونکہ وہ جانتا ہے کہ جتنی زیادہ مسجد اس کے گھر دور ہوگی اتنی زیادہ وہاں جانے کا ثواب زیادہ ہوگا۔

۱۔ مصباح الشریعہ (مرکز نشر کتاب، جیبی سائز) ص ۱۰، باب ۱۲

اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں حاضر ہونے کے آداب کے بارے میں فرماتے ہیں:

"یا اباذر امن اجاب داعی اللّٰہ و احسن عمارۃ مساجد اللّٰہ کان ثوابہ من اللّٰہ الجنۃ"

اے ابوذر! جو شخص خدائے متعال کی طرف دعوت کرنے والے کی بات پر لبیک کہے اور مسجد کو آباد کرنے میں اچھی طرح حصہ لے، تو خدا کی طرف سے اس کی پاداش (جزا) بہشت ہے۔

ظاہراً خدا کی طرف بلانے والے سے مقصود وہ مؤذن ہے جو اذان کہتا ہے، کیونکہ وہ خدا کی طرف سے لوگوں کو خدا کے گھر کی جانب دعوت دیتا ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ بلند آواز میں اذان کہے اور اعلان کرے کہ نماز کا وقت آ پہنچا ہے، تاکہ لوگ عبادت کے لئے مسجد میں حاضر ہو جائیں۔ اگر کسی نے اس کی دعوت قبول کی، یعنی اذان کی آواز سن کر مسجد کی طرف روانہ ہوا، تو اس نے مسجد کو آباد کرنیکی کوشش کی، اس کی پاداش بہشت ہے۔

ابتدا میں کسی مسجد کو تعمیر کرنے سے مراد یا اس کو آباد کرنے کسی ویران ہونے والے کی مسجد کی حفاظت اور مرمت کا مسئلہ انسان کے ذہن میں آتا ہے، لیکن اس معنی کا گزشتہ جملہ کے ساتھ کوئی تناسب نہیں ہے۔ اس بنا پر عمارت یعنی مسجد کو آباد کرنے کا معنی، تعمیر اور مرمت کے معنی سے وسیع تر ہونا چاہئے۔ (عمارت مسجد) کا عنوان جو قرآن مجید اور روایات میں استعمال ہوا ہے، لغوی معنی میں مسجد کی ابتدائی تعمیر بھی ہے اور اس کی محافظت بھی ہے اور اس کے علاوہ اس کی زیارت کرنے اور مسجد میں رفت و آمد کے معنی میں بھی آیا ہے، ائمہ معصومین علیہم السلام سے نقل کی گئی ایک روایت میں ان تینوں معنی کے بارے میں تاکید کی گئی ہے: مسجد تعمیر کرنا، اس کی مرمت کرنا مساجد میں رفت و آمد کی مزید تاکید کی گئی ہے۔

مذکورہ مطالب کے پیش نظر لگتا ہے کہ جناب ابوذر بھی متوجہ ہوئے کہ "عمارت مسجد" کے عنوان سے مسجد تعمیر کرنے، ظاہری طور پر آباد کرنے اور مرمت و محافظت کے علاوہ کوئی دوسرا معنی بھی مدنظر ہے اور اسی لئے کیفیت عمارت کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ چونکہ اگر عمارت سے مسجد کو تعمیر کرنا مقصود ہوتا تو جناب ابوذر کے لئے کوئی ابہام باقی نہ تھا کہ سوال کرتے۔

جناب ابوذرؓ پوچھتے ہیں: اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، ہم مسجد کو کیسے آباد کریں؟

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جواب میں فرماتے ہیں:

"لا ترفع فیھا الاصوات ولایخاض فیھا بالباطل ولا یشتری فیھا ولا یباع واترک اللغو مادمت فیھافان لم تفعل فلا تلوا من یوم القیامۃ الا نفسک"

(مسجد کو آباد کرنا اس معنی میں ہے کہ) اس میں آواز بلند نہ ہو، باطل اور بیہودہ کام کو انجام دینے سے پرہیز کیا جائے، اس میں خرید وفروخت نہ کیا جائے اور جب تک مسجد کے اندر ہے لغو بیان سے پرہیز کرے ورنہ قیامت کے دن اپنے علاوہ کسی اور کی سرزنش نہ کرے۔

مذکورہ جملوں میں، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذر کے لئے چار اخلاقی اور تربیتی قواعد وضوابط کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

۱۔ مسجد میں شور مچانے اور بلند آواز سے بات کرنے سے پرہیز! کیونکہ مسجد عبادت کی جگہ ہے ممکن ہے اونچی آواز میں بات کرنا دوسروں کے حواس کے مختل ہونے کا سبب ہوتا ہے اور ممکن ہے عبادت گزار نماز وعبادت میں اپنی فکر کو متمرکز نہ کرسکیں۔ اس کے علاوہ کسی اجتماع میں اونچی آواز میں بولنا ایک قسم کی بے ادبی شمار ہوتا ہے اور مناسب ہے انسان مسجد میں شائستہ رفتار کا مظاہرہ کرے اور جو کام انسانی آداب کے متناسب نہ ہو اس سے پرہیز کرے۔ اس بنا پر مسجد کی آبادی کاری کا ایک مصداق یہ ہے کہ انسان اس میں وقار اور سنجیدگی کے ساتھ رہے اور خاموشی کی رعایت کرنیکی کوشش کرے اور اگر بات کرنا چاہتا ہے تو آہستہ بولے تاکہ دوسروں۔۔ جو نماز یا دوسرے کام میں مشغول افراد کے لئے رکاوٹ نہ بن جائے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں آواز کو بلند کرنے سے پرہیز کرنے کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

"اذافعلت امتی خمس عشرۃ خصلۃ حل بھا البلاء. قیل: یا رسول اللہ ماھن؟ قال: اذا ارتفعت الاصوات فی المساجد..."[1]

"جب میری امت میں پندرہ خصلتیں رائج ہوجائیں ان پر بلا نازل ہوگی، ان خصلتوں

---

[1] تحف العقول، باب مواعظ النبی وحکمہ، ص ۵۲

میں سے ایک مسجد میں آواز بلند کرنا ہے ''

۲۔ باطل اور بیہودہ گفتگو سے پرہیز کرنا: مسجد خدا کا گھر اور عبادت کی جگہ ہے اور مسجد میں باطل اور بیہودہ باتیں کرنا اور ایسی نامناسب باتیں کرنا جو بالکل ناجائز ہیں، ان کی مذمت کی گئی ہے، کیونکہ یہ مسجد کے لئے ایک قسم کی بے احترامی اور اس کی شأن کی رعایت نہ کرنے کے برابر ہے۔ جیسا کہ کوئی کسی کے گھر میں مہمان ہو اور میزبان کے دشمنوں کی بات کرے اور ان کی ستائش کرے اور ایسے موضوعات پر بات کرے کہ میزبان کے لئے اذیت و تکلیف کا باعث یا ایسا کام انجام دے جو صاحب خانہ کو پسند نہ ہو ، یقیناً اس قسم کی رفتار انسانی ادب کے خلاف ہے۔ مہمان کو میزبان کے حقوق کی رعایت کرنی چاہئے اور ایسا برتاؤ کرے کہ جس سے میزبان کو خوشی و مسرت ہو، خدائے متعال یہ پسند نہیں کرتا ہے کہ اس کے بندے ایسی بحثیں اور گفتگو کریں جو ان کیلئے مضر ہوں اور ان کی سعادت کو خطرہ میں ڈالتی ہو اس کے علاوہ مسجد میں بیہودہ کام کرنا اور باطل باتیں کرنا کہ جو، مسجد کی حیثیت کو فراموش اور مائمال کرنے کا سبب ہے، کیونکہ جب مسجد میں بیٹھ کر بیہودہ باتیں کرتے ہیں، تو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہاں پر مسجد ہے اور کس لئے وہاں گئے ہیں۔

۳۔ مسجد میں خرید و فروخت سے پرہیز کرنا: خرید و فروخت اور وہ امور جو مشغلہ شمار ہوتے ہیں ، جیسے: آہنگری، بخاری اور نائی وغیرہ کا کام، مسجد میں انجام دینا ممنوع ہے۔ حضرت امام صادق علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

''جنّبوا مساجد کم البیع والشراء ...''[1]

''اپنی مسجدوں کو خرید و فروخت کی جگہ قرار نہ دو''

تجارت، خرید و فروخت اور معاشرے کی ضروریات نیز اپنے مشغلوں کو انجام دینے کے لئے بازار بنائے گئے ہیں اور مسجد عبادت کے لئے مخصوص ہے اور اس میں دنیوی کام جیسے، خرید و فروخت انجام نہیں دینا چاہئے۔ فطری بات ہے جب مسجد بھی خرید و فروخت اور تجارت کی جگہ ہو جائے گی تو وہ یاد دہانی اور موعظہ و نصیحت کے پہلو سے عاری ہو جائے گی اور نہ صرف یہ کہ انسان کو خدا کی یاد نہیں دلائے گی بلکہ اس کی توجہ دنیا اور کسب معاش اور آمدنی کی طرف زیادہ مشغول کر دے گی، اس لحاظ سے مسجد کو بازار اور محل تجارت میں

۱۔ وسائل الشیعہ، ج ۳، ص ۵۰۷

تبدیل کر کے اس سے مناسب استفادہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مسجد خداوند متعال کے ذکر کی جگہ ہے اور اسلام کی اس پر تاکید ہے کہ یہ مکان مقدس ہر اس کام سے خالی ہو جانا چاہئے جو لوگوں کی توجہ کو غیر خدا کی طرف متوجہ کرنے کا سبب بنے۔ تا کہ اس میں ذکر وعبادت کا موقع مکمل طور پر فراہم ہو سکے۔ اس لئے کسب معاش والے کام، جیسے آہنگری اور نجاری وغیرہ بھی مسجد میں انجام دینا ممنوع قرار دیا گیا ہے، ایک روایت میں آیا ہے:

"ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم مرّ برجل یبری مشاقص له فی المسجد فنهاه و قال :انها لغیر هذا بنیت" [۱]

"رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد میں ایک آدمی کو اپنا تیر تیز کرتے ہوئے دیکھا آپؐ نے اسے اس کام سے منع کرتے ہوئے فرمایا: مسجد کو ان کاموں کے لئے تعمیر نہیں کیا گیا ہے"

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ان امیر المؤمنین علیه السلام رأی قاصا فی المسجد فضر به بالدرة وطرده" [۲]

"امیر المومنین نے مسجد میں ایک نائی کو کہ جو حجامت بنانے میں مشغول تھا کوڑے مار کر مسجد سے نکال باہر کیا"

۴۔ مسجد میں لغو کام انجام دینے سے پرہیز: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفارش کرتے ہیں کہ مسجد میں بیہودہ باتیں نہ کرو اور لغو کام انجام دینے سے پرہیز کرو۔ کوشش کرو کہ مسجد میں تمھاری رفتار مطلوب ہو تا کہ خدائے متعالی کو پسند آئے اور پاداش، ثواب اور کمال کا سبب بنے۔ جو کام تمھارے نفع میں نہ ہو، کم از کم انھیں مسجد میں انجام نہ دو اس کے علاوہ انسان کو ہر جگہ پر لغو گفتار و رفتار سے پرہیز کرنا چاہئے اور مومنین کے اوصاف یہ ہیں کہ وہ لغو بات سے پرہیز کرتے ہیں:

﴿قد افلح المومنون الذین هم فی صلاتهم خاشعون والذین هم عن اللغو معرضون﴾ (مومنون/۱۔۳)

۱۔ وسائل الشیعہ، ج ۳/ص ۴۹۶

۲۔ وسائل الشیعہ، ج ۳/ص ۵۱۵

''یقیناً صاحبان ایمان کامیاب ہوگئے، جو اپنی نمازوں میں گڑگڑانے والے ہیں، اور لغو باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں''

مومن کو بنیادی طور پر لغو کام انجام نہیں دینا چاہئے اور اسے اپنی عمر کو بیہودہ ضائع نہیں کرنا چاہئے، لیکن چونکہ عام لوگ کم وبیش بیہودہ کام بھی انجام دیتے ہیں اور کم از کم ایسے مباح کام بھی انجام دیتے ہیں جن کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، انھیں کوشش کرنی چاہئے کہ ان کاموں کو مسجد میں انجام دینے سے پرہیز کریں اور مسجد کو عبادت سے مختص رکھیں، تاکہ مسجد کی شان وعظمت محفوظ رہے اور خود اس سے زیادہ تر معنوی استفادہ کریں، تاکہ مسجد کے حوالے سے موعظہ ونصیحت اور ہدایت کرنے کا پہلو باقی رہے۔

حدیث کو جاری رکھتے ہوئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اگر تم مسجد کے آداب کی رعایت نہیں کی تو، قیامت کے دن صرف اپنی مذمت کرنا۔ اس دن انسان کو سمجھ میں آئے گا کہ مسجد سے کونسے فائدے اٹھا سکتا تھا۔ انہی لمحات سے کہ وہ جب مسجد میں بیٹھتا تھا، کس قدر اپنی آخرت کے لئے استفادہ کرسکتا تھا، لیکن نہ صرف اس نے اس سے استفادہ نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس ایسا کام انجام دیا کہ جس سے اپنی آخرت تباہ کرلی۔ اس وقت وہ ایک ایسی حسرت سے دوچار ہوگا کہ جو قابل توصیف نہیں ہے۔

مسجد میں حاضر ہونے اور اس میں عبادت کرنے کی فضیلت:

" یاابا ذر! ان اللّٰہ تعالی یعطیک مادمت جالسا فی المسجد بکل نفس تنفست درجة فی الجنة"

اے ابوذر! جب تک تم مسجد میں ہو، خدائے متعال تمھاری ہر سانس کے بدلے میں بہشت میں تمھارے لئے ایک درجہ عطا کرتا ہے۔

ہمارے گھر سے نکلنے اور مسجد کیطرف روانہ ہونے کے بعد جب ہم مسجد کے آداب کی رعایت کرتے ہیں اور اپنی نماز پڑھتے ہیں، تو ہمیں مزید تاکید کی گئی ہے کہ نماز تمام کرنے کے فورا بعد اٹھ کر نہ چلے جائیں، بلکہ کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ وقت تک مسجد میں رہیں، کیونکہ جب تک ہم مسجد میں ہیں خدائے متعال ہماری لی گئی ہر سانس کے بدلے میں بہشت میں ہمارے لئے ایک درجہ عنایت کرتا ہے۔ اگر ہم نے وہاں پر قرآن مجید کی تلاوت کی، خدا کا ذکر کیا اور عبادت وسجدہ میں مشغول رہے تو ان

اعمال کے ثواب بھی ہمیں ملیں گے اور اس کے علاوہ مسجد میں ہمارا سانس لینا بذات خود سبب بنتا ہے کہ خدائے متعال ہمارے لئے بہشت میں ہر سانس کے بدلے میں ایک درجہ عطا کرے کیونکہ یہی ہمارا سانس لینا خدا کی عبادت کی نیت سے تھا اور اس غرض سے تھا کہ ہم خدا کی خوشنودی کے لئے مسجد اور اس کے گھر میں ٹھہرے ہیں اور جو بھی کام ہم خدا کی توجہ حاصل کرنے کے لئے اور اس کی اطاعت کی غرض سے انجام دیتے ہیں، وہ عبادت ہے اور ہر عبادت کے بدلے میں بہشت میں ایک درجہ ہے۔ لیکن ہمیں توجہ رکھنا چاہئے کہ اس سانس لینے کا ثواب جو عبادت کے عالم ہو نہ کہ دنیوی امور کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے سانس لینا عبادت ہے۔

کہا گیا کہ مسجد میں رکنا اور وہاں پر سانس لینا مستحب ہے اور اس کا ثواب ہے، لیکن یہ اس معنی میں نہیں ہے ہم اپنے تمام کاروبار کو چھوڑ کر مسجد میں معتکف (اعتکاف کرنے والا) بن جائیں۔ ممکن ہے دو مستحب کاموں کے درمیان تزاحم و تضاد وجود میں آئے، اس معنی میں کہ انسان ان دو میں سے صرف ایک کو انجام دینے کی قدرت رکھتا ہو، اس صورت میں ہمیں جو زیادہ مستحب کام ہے اس کو انجام دینا چاہئے، بعض اوقات ممکن ہے مستحب اور واجب کے درمیان تزاحم و تضاد پیدا ہو تو اس صورت میں واجب کو انجام دینا چاہئے اور مستحب کو چھوڑنا چاہئے۔ اس بنا پر اگر کسی مستحب عمل کو بہت زیادہ بجالانے کی شفارش کی گئی ہے، تو وہ اس معنی میں نہیں ہے کہ اگر کسی واجب کام سے مزاحم و معارض ہو تو بھی واجب کو چھوڑ کر مستحب کو انجام دیں، ہمیں اس مطلب کی طرف توجہ رکھنی چاہئے۔

جب کسی عمل کے حسن کو بیان کرتے ہیں تو وہ حسن اس عمل کی ذات سے مربوط ہوتا ہے، یعنی دوسرے عمل سے تزاحم اور مزاحمت کے بغیر، اس لحاظ سے ممکن ہے ایک بات یا اس کا بیان کا ظاہر اطلاق ہو، لیکن دوسری عبادت سے یا کسی دوسرے واجب عمل سے تزاحم و تضاد رکھتا ہے تو اس صورت میں وہ مستحب کام مطلوبیت سے گرتا ہے اور اسے انجام نہیں دینا چاہئے۔ پس اگر اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ انسان زیادہ دیر تک مسجد میں ٹھہرا رہے، تو یہ اس معنی میں نہیں ہے کہ درس و بحث اور اپنے ضروری کام کو چھوڑ کر مسجد میں بیٹھ جائے اور ذکر خدا کرتا رہے۔ واجب درس و بحث کو مسجد میں بیٹھنے یا ذکر کرنے یا مستحب عبادت انجام دینے کے لئے نہیں چھوڑا جا سکتا ہے اور یہ درس و بحث کے جانشین نہیں بن سکتے ہیں اور کسی بھی وقت کوئی مستحب عمل واجب کی جگہ نہیں لے سکتا ہے، ضروری اور واجب تکالیف اور فرائض اہمیت کے حامل ہوتے

ہیں انھیں مسجد میں بیٹھنے اور ذکر کے بہانے سے ترک نہیں کیا جاسکتا ہے۔

"وتصلی علیک الملائکة و تکتب لک بکل نفس فیه عشر حسنات و تمحی عنک عشر سیئات"

"اور فرشتے تجھ پر درود بھیجتے ہیں اور تیری ہر سانس کے بدلے دس حسنات لکھے جاتے ہیں اور دس گناہ زائل کئے جاتے ہیں"

جو کچھ بیان ہوا وہ مسجد میں بیٹھنے کے فائدے سے مربوط تھا، چونکہ مسجد عبادت کی ایک ایسی جگہ ہے جہاں پر انسان خدا کی طرف توجہ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے روایتوں میں مسجد کو آخرت کا بازار کہا گیا ہے اور تاکید کی گئی ہے کہ انسان دوسروں سے پہلے مسجد میں داخل ہو اور سب سے آخر میں مسجد سے خارج ہو:

"قال رسو ل اللّٰه صلی اللّٰه علیه واله وسلم لجبرئیل: ای البقاع احب الی اللّٰه تعالی؟ قال: المساجد واحب اهلها الی اللّٰه اولهم دخو لا الیها و آخرهم خروجا منها"

"پیغمبر اسلامؐ نے جبرئیل سے سوال کیا: کونسی جگہ خدا کے نزدیک محبوب تر ہے؟ جبرئیل نے عرض کی: مساجد، اور اہل مسجد میں سے محبوب ترین بندہ وہ شخص ہے جو سب سے پہلے مسجد میں داخل ہوتا ہے اور سب سے آخر میں مسجد سے خارج ہوتا ہے"

" یااباذر! اتعلم فی ای شی ء انزلت هذه الآیة: ((اصبروا و صابروا ورابطوا واتقوا اللّٰه لعلکم تفلحون)) قلت: لا فداک ابی وامی. قال: فی انتظار الصلوٰة خلف الصلوٰة"

"اے ابوذر! کیا تم جانتے ہو کہ آیۂ مبارکہ: اے ایمان والو! صبر کرو، صبر کی تعلیم دو، جہاد کے لئے تیاری کرو اور اللہ سے ڈرو شاید تم فلاح یافتہ اور کامیاب ہو جاؤ" کس سلسلہ میں نازل ہوئی ہے؟ میں نے کہا: نہیں معلوم، میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں آپؐ نے فرمایا: نماز کے بعد نماز کے لئے انتظار کرنے کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے"

وسائل الشیعہ، ج ۱۲، ص ۳۲۵

آیہ مبارکہ میں ''مرابطٰ'' کے معنی ومفہوم کے بارے میں گوناگوں تفسیریں کی گئی ہیں۔اس کی ایک تفسیر یہ ہے کہ چونکہ ''مرابطٰ'' لفظ ''ربط'' باندھنے کے معنی میں بھی اور لفظ ''رباط'' کسی چیز کو کسی جگہ پر باندھنے کے معنی میں بھی آیا ہے، جیسے: گھوڑے کو ایک جگہ پر باندھنے اور اس کے بعد گھوڑوں کو قطار میں کھڑا کرنے اور انھیں دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ کرنے کے معنی میں آیا ہے۔اس لحاظ سے ''مرابطٰ'' سرحدوں کی حفاظت اور ہوشیاری اور دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ ہونے کے معنی میں ہے،لیکن اس آیت اور اس سے قبل والی آیتوں پر دقت کرنے سے آیت کا ایک وسیع تر معنی معلوم ہوتا ہے جو اسلامی ملک کی سرحدوں کی حفاظت اور دفاع کے معنی کو بھی شامل ہے اور ایمان وعقائد کی سرحدوں کے مقام کے معنی میں بھی آیا ہے،اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض احادیث میں علما اور دین کے دانشمندوں نے اسکی تعبیر ''مرابطوں'' یعنی سرحدوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''علماء شیعتنا مرابطون بالثغر الذی یلی ابلیس وعفاریته ویمنعونه عن الخروج علی ضعفاء شیعتنا وعن ان یتسلط علیهم ابلیس'' [۱]

''ہمارے شیعہ (پیرو) علماء ان سرحدی محافظوں کے مانند ہیں جو ابلیس کی فوج کے سامنے صف بستہ کھڑے ہیں اور اپنے دفاع کی طاقت نہ رکھنے والے افراد پر ان کے حملوں کو روکتے ہیں''

دانشمندوں اور علما کے علاوہ ایسے محافظ بھی ہیں جو سرحدوں کی محافظت کرتے ہیں چونکہ جغرافیائی سرحدوں کے محافظ ہیں اور علماء عقائد اسلامی ثقافت کے محافظ ہیں،اور یقیناً جس امت کی ثقافت اور عقائد کی سرحدوں پر غیروں کا حملہ ہو اور وہ اپنا دفاع نہ کر سکتے ہوں،تو انھیں مختصر مدت کے اندر عقیدہ وثقافت کے لحاظ سے شکست اٹھانا پڑے گی اور اس کے علاوہ سیاسی اور عسکری لحاظ سے بھی انھیں ہزیمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

''مرابطٰ'' جسکے بارے میں کی گئی تفاسیر میں یہ بھی ہے کہ ہر نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں رہنا اور پے در پے نماز بجالانا،اس کے علاوہ ''مرابطٰ'' مسجد میں رفت وآمد کے معنی میں بھی آیا ہے، چونکہ

۱۔ بحار الانوار، ج ۲/ ص ۵/

مساجد میں رفت وآمد انسانوں اور مومنوں کے دلوں کے درمیان روابط کا سبب بنتا ہے۔

"یاابا ذر! اسباغ الوضوء فی المکارہ من الکفّارات و کثرۃ الاختلاف الی المساجد فذلکم الرباط"

"اے ابوذر! مشکلات میں (جیسے سردیوں میں) ٹھیک طرح سے وضو کرنا کفارات میں سے ہے اور مسجدوں میں زیادہ جانا "رباط" ہے کہ آیت میں اس کا حکم ہوا ہے"

جب موسم سرد ہو تو وضو کرنا مشکل ہے، اگر کوئی شخص اس حالت میں ہمت وشادابی کے ساتھ وضو کرنے کی کوشش کرے تو اس کا یہ وضو گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے۔ یہ سرد موسم میں سرد پانی سے وضو کی فضیلت کے پیش نظر ہے، چنانچہ ایک اور روایت میں بھی آیا ہے:

"قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم ألاادلّکم علی شی یکفر اللّٰہ بہ الخطا یا ویزید فی الحسنات ؟قیل:بلیٰ یا رسول اللّٰہ. قال اسباغ الوضوء علی المکارہ و کثرۃ الخطا الی ھذہ المساجد وانتظار الصلاۃ بعدالصلاۃ" [1]

"رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تم آمادہ ہو کہ میں تمہیں ایک ایسی چیز کی راہنمائی کروں جو گناہوں کے بخش دیئے جانے اور حسنات اور خوبیوں کی افزائش کا سبب ہو؟ عرض کی: جی ہاں یا رسول اللہؐ، فرمایا: مشکلات میں صحیح طریقہ سے وضو کرنا مساجد میں بہت زیادہ پیدل جانا اور نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا"

خدا کے محبوب ترین بندے:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیث کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یاابا ذر! یقول اللّٰہ تبارک وتعالی:ان احب العباد الی المتحابون من اجلی،المتعلقۃ قلوبھم بالمساجد والمستغفرون بالاسحار اولئک اذا

۱۔ وسائل الشیعہ، ج ۱، ص ۲۶۷

اردت باهل الارض عقوبة ذكرتهم فصرفت العقوبة عنهم"

"اے ابوذر! خدائے متعال فرماتا ہے: میرے نزدیک محبوب ترین بندے وہ لوگ ہیں جو میرے لئے ایک دوسرے سے محبت اور دوستی کرتے ہیں۔ وہ جن کے دل مسجدوں سے وابستہ ہیں اور سحر کے وقت استغفار کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر اہل زمین پر کوئی عذاب نازل کرنا چاہتا ہوں تو ان لوگوں کی وجہ سے اس عذاب کو روک دیتا ہوں"

جی ہاں، خدائے متعال اپنے محبوب ترین بندوں جن کے دل مسجدوں سے وابستہ ہیں اور مسجد میں جانیکی فرصت کے انتظار میں ہوتے ہیں اور نصف شب کو اپنے پروردگار سے راز و نیاز کرتے ہیں، ان کی وجہ سے معاشرے سے بلاؤں اور عذاب کو اٹھالیتا ہے۔ اس کے علاوہ کہ وہ قیامت کے دن بلند مقامات اور بے شمار ثواب حاصل کریں گے، ان کے وجود کے آثار میں معاشرے سے عذاب کا دور ہونا بھی ہے۔ اس کے علاوہ معاشرے کے حوالے سے اس گروہ کے اور بھی بہت سے آثار ہیں کہ یہ سب آثار مسجد میں رفت و آمد اور خدائے متعال کی طرف توجہ کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں۔

انسان کو مسجد سے انس و محبت اور رفت و آمد کے نتیجہ میں جو فائدہ نصیب ہوتا ہے، وہ صرف ثواب اخروی اور دوسری دنیا میں نعمت الٰہی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ مسجد میں رفت و آمد کے طفیل میں اسی دنیا میں بھی انسان کے لئے اخلاقی، علمی، تربیتی، اجتماعی و سیاسی حتی فراوان مادی فوائد ہیں۔ امیر المومنین علیہ السلام، مسجد میں رفت و آمد کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے بعض قابل قدر اور تعمیری آثار کے بارے میں فرماتے ہیں:

"من اختلف الى المساجد اصاب احدى الثمان: اخاً مستفاداً فى الله اوعلما مستطرفا او آية محكمةاو يسمع كلمة تدل على هدى اورحمة او كلمةترده عن ردى اويترک ذنبا خشيةاوحياء" [1]

جو مسجد میں رفت و آمد کرتا ہے (کم از کم) درج ذیل آٹھ امور میں سے ایک اسکے نصیب میں ہوتا ہے:

۱۔ مومنین کے درمیان اخوت و برادری جس سے خدا کی راہ میں استفادہ کرے۔

---

[1] بحار الانوار، ج ۸۳، ص ۳۵۱

۲۔ جدید علم و دانش تک رسائی۔

۳۔ قرآن مجید کی آیات کا علم و ادراک۔

۴۔ ایک ایسی بات کو سننا جو اس کے لئے ہدایت کی رہنمائی کرے۔

۵۔ ایک ایسی رحمت، جس کا اسے انتظار تھا۔

۶۔ ایک ایسی بات جو اسے گمراہی اور ہلاکت سے بچائے۔

۷۔ مسجد میں آمد و رفت کی وجہ سے اس کے دل میں پیدا ہوئے خدا کے خوف کے نتیجہ میں گناہ کو ترک کرنا۔

۸۔ مسجد میں آشنا ہوئے اپنے مومن بھائیوں کی حیاء کی وجہ سے گناہ کو ترک کرنا۔

اس حدیث کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"یا اباذر! کل جلوس فی المسجد لغو الاثلاثة :قراء ة مصل اوذکر الله اوسائل عن علم"

"اے ابوذر! تین صورتوں کے علاوہ مسجد میں بیٹھنا بے فائدہ ہے :یا حالت نماز میں قرائت قرآن میں مشغول ہو، یا خدا کی یاد میں ذکر کہتا ہو، یا علم سیکھنے میں مشغول ہو"

مسجد میں رفت و آمد کی یہ سب تاکیدیں، مسجد میں حاضری دینے کے معنوی اور مادی آثار کو گننا اور مسجد میں سانس لینے کے ثواب کا شمار کرنا اس لئے ہے کہ انسان مسجد کو خدا سے رابطے اور معنویت حاصل کرنے کا مرکز قرار دیتا ہے اور اپنے معنوی تکامل و اور سعادت کو اس کے ذریعہ حاصل کرتا ہے ورنہ اگر آخرت سے مربوط کوئی کام نہ ہو تو، اسے مسجد میں انجام دینے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ اس لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں انجام دینے والے شائستہ اور مثبت کاموں کو تین حصوں میں تقسیم فرماتے ہیں اور ان کے علاوہ کسی کام کو مسجد میں انجام دینے کو لغو جانتے ہیں:

الف۔ انسان نماز میں مشغول ہو اور اس میں قرآن مجید پڑھے یا اس کے بعد قرآن مجید پڑھنے میں مشغول ہو۔

ب۔ خدائے متعال کے ذکر کو زبان پر جاری کرے یا قلبی توجہ خدا کی طرف مرکوز ہو۔

ج۔ مسجد میں علوم معارف سیکھنے میں مشغول ہونا اور مسجد کو علم و آگاہی کی ترویج اور اس کی نشر و

اشاعت کا مرکز قرار دینا، کہ اس صورت میں تیرا کام بھی نتیجہ بخش وقیمتی ہوگا اور تیرے درجات میں اضافہ ہوگا اور یہ تمہاری ابدی خوش قسمتی کا سبب ہوگا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث کے اس حصہ میں مساجد کی اہمیت، اس میں رفت وآمد کر نیکی ضرورت، اس میں عبادت کرنے والوں کی فضیلت اور مسجد سے مناسب استفادہ کرنے کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے اس کے پیش نظر مناسب ہے کہ مسجد، یعنی خدا کے گھر کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دیں اور کوشش کریں کہ مساجد کو آباد رکھیں اور ہمیں ڈرنا چاہئے کہ قیامت کے دن یہ مسجد ہماری بے اعتنائی کی وجہ سے شکایت نہ کرے، چنانچہ امام جعفر صادق علیہ اسلام فرماتے ہیں:

"شکت المساجد الی اللّٰہ الذین لا یشھد ونھا من جیرانھا فاوحی اللّٰہ الیھا وعزتی وجلالی لا قبلت لھم صلاۃ واحدۃ ولا اظھرنّ لھم فی الناس عدالۃ ولا نالتھم رحمتی ولا جاورونی فی جنتی" [1]

"مساجد نے اپنے ہمسایوں کے ایک گروہ کی خدا سے شکایت کی جو اس میں حاضر نہیں ہوتے ہیں. خدا متعال نے ان مساجد کی طرف وحی کی: مجھے مرے عزت وجلال کی قسم ہے کہ ان کی ایک رکعت نماز بھی قبول نہیں کروں گا اور لوگوں میں ان میں کوئی عدالت آشکار نہیں کروں گا، انھیں میری رحمت نہیں ملے گی اور وہ بہشت میں میرے ہمسایہ اور نزدیک نہیں ہوں گے۔"

۱۔ وسائل الشیعہ، ج ۳، ص ۴۷۹

پینتیسواں درس:

تقوی، زہد اور پرہیز گاری کی منزلت

- تقوی کا مفہوم اور خوف سے اس کا رابطہ
- تقوی کی اہمیت اور اس کو حاصل کرنے کے راستے
- مراتب تقوی پر ایک نظر
- آثار تقوی پر ایک نظر
- متقین کے حساب و کتاب کی خصوصیت اور چند دوسری خصوصیات
- پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان میں زہد و تقوی

تقوی، زہد اور پرہیز گاری کی منزلت

"یا اباذر؛ کن بالتقوی اشد اهتماما منک بالعمل فانه لایقل عمل بالتقوی، و کیف یقل عمل یتقبل؟ یقول اللّٰه عزوجل: ((انما یتقبل اللّٰه من المتقین)) یا اباذر؛ لایکون الرجل من المتقین حتی یحاسب نفسه اشد من محاسبة الشریک شریکه فیعلم من این مطعمه و من این مشربه و من این ملبسه؟ امن حل ذلک ام من حرام یا اباذر؛ من لم یبال من این اکتسب المال لم یبال اللّٰه عزوجل من این ادخله النار.

یا اباذر؛ من سره ان یکون اکرم الناس فلیتق اللّٰه عزوجل. یا اباذر؛ ان احبکم الی اللّٰه جل ثناؤه اکثرکم ذکرا له و اکرمکم عند اللّٰه اتقاکم له و انجاکم من عذاب اللّٰه اشدکم له خوفا. یا اباذر؛ ان المتقین الذین یتقون من الشی الذی لایتقی منه خوفا من الدخول فی الشبهة.

یا اباذر؛ من اطاع اللّٰه عزوجل فقد ذکر اللّٰه و ان قلت صلاته و صیامه و تلاوته للقرآن. یا اباذر؛ اصل الدین الورع و راسه الطاعة. یا اباذر؛ کن ورعا تکن اعبد الناس و خیر دینکم الورع.

یا اباذر؛ فضل العلم خیر من فضل العباده و اعلم انکم لو صلّیتم حتی تکونوا کالحنایا و صمتم حتی تکونوا کا لأوتار ما ینفعکم الا بورع. یا اباذر؛ اهل الورع والزهد فی الدنیا هم اولیاء اللّٰه حقا))

پیغمبر اسلام ﷺ کے کلام کے اس حصہ کا موضوع تقوی ہے۔ تقوی کے گوناگوں مواقع کے بارے میں اخلاق کی کتابوں میں فراواں بحثیں ہوئی ہیں۔ اس سے پہلے بھی ہم نے اس موضوع پر بحث کی ہے۔ اس میں آنحضرت ﷺ کے کلام کے بعض بنیادی مطالب کو بیان کریں گے جن کو تقوی کے سلسلہ میں اس کے مقدمہ کے طور پر بیان کرنا مناسب ہے۔

تقوی کا مفہوم اور خوف سے اس کا رابطہ:

لفظ ''تقوی'' مادہ ''وقایہ'' سے اور فعل ''اتقی یتقی'' کا اسم مصدر ہے اور مصدر ''اتقاء'' کا معنی اپنے آپ کو یا کسی دوسرے کو کسی خطرہ سے روکنا ہے۔ ''اتقاء'' کی تین اسم مصدر ہیں ان میں سے دو قرآن مجید میں استعمال ہوئے ہیں، یعنی ''تقوی'' اور ''تقاۃ'' اور اس کا تیسرا اسم مصدر ''تقیہ'' ہے۔ اور یہ تینوں لغت میں ایک ہی معنی میں ہیں (نہج البلاغہ میں کبھی ''تقیہ'' تقوی کی جگہ استعمال ہوا ہے)

''اتقاء'' باب افتعال کا مصدر ہے اور مادہ ''وقایہ'' سے لیا گیا ہے اور چونکہ کہا گیا کہ ''تقوی'' اتقاء کا اسم مصدر ہے کہ جو اصل میں ''وقوی'' تھا اور اس کے بعد اس کا ''فاء الفعل'' ''تا'' میں تبدیل ہوا، جیسے ''تراث'' اصل میں ''وراث'' تھا۔

پس یہ ''تقوی'' ہوا، جو لغت میں اپنے آپ کو خطرہ سے روکنے کے معنی میں ہے اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ خطرہ کیا ہے۔ لیکن جب کلمہ ''تقوی'' اخلاقی یا قرآنی مباحث میں استعمال ہوتا ہے تو اس کا سے مراد وہ خطرہ ہے جس سے اپنے آپ کو روکنا چاہئے، یہاں پر ہر خطرہ نہیں ہے بلکہ وہ خطرہ ہے جو انسان کی سعادت و آخرت میں درپیش ہے۔ اگرچہ قرآن مجید میں ''اتقاء'' اپنے آپ کو اس خطرہ سے روکنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے جسے دوسرے انسان کسی شخص کو اس کی طرف متوجہ کرتے ہیں:

''لایتخذ المؤمنون الکافرین اولیاء من دون المومنین و من یفعل ذلک فلیس من اللہ فی شئ الا ان تتقوا منھم تقاۃ ... '' (آل عمران/۲۸)

''خبردار صاحبان ایمان، مومنین کو چھوڑ کر کفار کو اپنا ولی اور سرپرست نہ بنائیں کہ جو بھی ایسا کرے گا اس کا خدا سے کوئی تعلق نہ ہوگا مگر یہ کہ تمھیں کفار سے خوف ہو تو کوئی حرج بھی نہیں ہے...''

لیکن جب بات تقوائے الٰہی کی ہو یا آیات وروایات میں مطلق تقوی ومتقین کے بارے میں بات ہوتی ہے تو اس سے مراد تقوائے الٰہی ہے، اور ایسے لوگوں سے گفتگو ہے جو دینی اور معنوی مسائل کے بارے میں خطرہ کا احساس کرتے ہیں، کیونکہ وہ اپنے دین کے بارے میں موجودہ خطرہ سے خائف ہیں، کوشش کرتے ہیں کہ خود کو اس سے بچائیں، پس ''اتقاء'' کی بنیاد خطرہ کے بارے میں احساس خوف ہے۔ احساس خطرہ وخوف کے بعد انسان ایسا کام کرتا ہے تا کہ اس خطرہ سے محفوظ رہے اور کم از کم اس خطرہ سے دور رہے۔ اس معنی ومفہوم کو پرہیز گاری کہتے ہیں (حقیقت میں پرہیز گاری تقوی الٰہی کی شرط ہے، کیونکہ گناہ اور خطرہ سے اپنے آپ کو بچانے کی شرط پرہیز اور اس خطرہ سے دوری اختیار کرنا ہے)

قرآن مجید میں بعض اوقات قیامت کا دن مطلق تقوی کے طور پر ذکر ہوا ہے کہ اس روز بُرے اعمال کے خطرات اور نتائج ظاہر ہوتے ہیں، چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿واتقوا یوما لاتجزی نفس عن نفس شیئا﴾ (بقرہ/۱۲۳)

''اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی کسی کا عوض اور بدلہ نہیں قرار دیا جائے گا۔''

اور کبھی گناہوں کی وجہ سے انسان کو سزا دینے والا متعلق تقوی کے طور پر ذکر ہوا ہے، مثال کے طور پر ''واتقوا اللہ'' کا معنی خدا سے پرہیز کرنا اور اس سے دوری اختیار کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ جو خطرہ عذاب الٰہی کی طرف سے تم پر متوجہ ہوتا ہے، اسی سے پرہیز کرو۔ پس خدائے متعال سے خوف دراصل اس عذاب سے خوف ہے جس کا انسان کو اس کے برے اعمال کی وجہ سے سامنا کرنا پڑتا ہے۔

بہر حال تقوائے الٰہی کے معنی اس کے مبدأ کے پیش نظر خوف لیا گیا ہے اور اس لحاظ سے خوفِ خدا بھی معنی کیا جا سکتا ہے۔ کبھی تقوی اس ملکہ کو بھی کہتے ہیں جو گناہ سے پرہیز اور دوری کی تکرار کے نتیجہ میں انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا جو انسان ایک بار گناہ سے دوری اختیار کرتا ہے اسے متقی نہیں کہتے ہیں، لیکن جب ترک گناہ میں اس قدر ثابت قدم رہے کہ اس میں ترک گناہ کا ملکہ پیدا ہو جائے تو اسے متقی کہتے ہیں۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ کبھی مبدا فعل کو تقوی کہتے ہیں کہ جو خوف خدا ہے اور کبھی ملکہ نفسانی کو کہتے ہیں جو گناہ سے پرہیز کی تکرار کی نتیجہ میں انسان میں پیدا ہوتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام تقوی کو ایک روحانی ومعنوی حالت کے معنی میں ذکر فرماتے ہیں جو انسان کو گناہ وانحراف سے روکتی ہے۔ اگر یہ وہیملکہ نفسانی ہے۔ تو خوف خدا کو اس کا ایک اثر تصور کرنا چاہئے:

"عباد الله ان تقوى الله حمت اولياء الله محارمه والزمت قلوبهم مخافته حتى أسهرت لياليهم و اظمات هواجرهم.." ۲

''خدا کے بندو! تقوائے الٰہی خدا کے دوستوں کو فعل حرام انجام دینے سے روکتا ہے اور (عذاب کے) خوف وترس کو ان کے دل میں قرار دیتا ہے۔ راتوں کو (عبادت کے لئے) بیدار رکھتا ہے، اور شدت کی گرمی کے دنوں (روزہ رکھنے کے لئے) انھیں پیاسا رکھتا ہے۔''

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"ذمّتي بما اقول رهينة و انابه زعيم، ان من صرحت له العبر عما بين يديه من المثلات حجزته التقوى من تقحّم الشبهات" ۳

''اپنی ذمہ داری کو اپنی بات کی ضمانت قرار دیتا ہوں اور اس طرح اپنی بات کے صحیح ہونے کی ضمانت دیتا ہوں۔ اگر انسان کے لئے گزشتہ عبرتیں آئندہ کا آئینہ قرار پائیں تو تقوی، مشکوک کاموں میں پھنسنے سے روکتا ہے۔''

جی ہاں، تقوی ایک ایسے بندے کا سب سے بڑا سرمایہ ہے کہ اس کے خطرات سے پر خوف زدہ زندگی میں اور بلاؤں وگناہوں کے پر تلاطم سمندر کی خطرناک لہروں میں اس کی مدد کرتا ہے تاکہ وہ سعادت کی راہ کو تلاش کرے اور اسے طے کرے کہ یہ راستہ تقوای الٰہی کے بغیر طے نہیں کیا جاسکتا ہے:

نیست جز تقوی در این ره توشه ای نان و حلوا را بنه در گوشه ای

(اس راستہ میں تقوی کے علاوہ کوئی اور زاد راہ نہیں ہے۔ تم روٹی اور حلوا کو ایک گوشہ میں رکھو)

تقوی کی اہمیت اور اس کو حاصل کرنے کے راستے:

تقوی کی اہمیت اور اس پر تاکید کی علت اس سے معلوم ہوتی ہے کہ بنیادی طور پر دین، پیغمبروں کا

۱۔ بقرہ/۱۹۷

۲۔ نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خطبہ/۱۱۳، ص/۳۵۳

۳۔ نہج البلاغہ، خطبہ/۱۶، ص/۶۶

مبعوث ہونا اور آسمانی کتابوں کا نازل ہونا صرف اس لئے تھا کہ بشر اپنی سعادت کی راہ کو حاصل کرلے اور سنجیدگی کے ساتھ اس راہ پر گامزن ہو جائے تا کہ خلقت کا اصلی مقصد و ہدف یعنی آخرت کی بے شمار اور لا متناہی رحمتوں سے سرفراز ہو جائے لہٰذا اس ہدف تک پہنچنے کے لئے جس قدر موثر اقدام کرے گا اتنی ہی اس کی زیادہ اہمیت ہوگی اور دوسرے الفاظ میں چونکہ نبوت اور الٰہی شریعتوں کی حقیقت بشر کو راہ راست کی ہدایت کرنا ہے، اس لئے آیات الٰہی اور جو کچھ اولیائے الٰہی کے ذریعہ لوگوں تک پہنچا ہے، اس میں کوشش کی گئی ہے کہ لوگوں کی ایسی تربیت کی جائے کہ وہ ان احکام پر عمل کریں اور چونکہ انسان کے عمل کا سرچشمہ انسان کی نفسانی خواہش ہے، یعنی انسان کا اختیاری عمل اس کی خواہشات کا سرچشمہ ہے اور انسان کے ارادہ کی عمدہ بنیادیں خوف و امید میں پیوست ہوتی ہیں، پیغمبروں اور ان کے جانشینوں نے اس راستہ سے استفادہ کیا ہے کہ ترس و امید کو انسان میں زندہ کریں اور انھیں ایک ایسی چیز کی طرف متوجہ کریں کہ جس میں انسان کی خلقت کا مقصد ہو۔

تقوی کے مفہوم اور اس کی اہمیت سے آگاہ ہونے کے بعد، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تقوی کے پیدا ہونے کی راہیں کونسی ہیں؟ اور ہم ذیل میں خلاصہ کے طور پر تقوی کے پیدا ہونے کی تین راہوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ مستقبل پر نظر: اس کے پیش نظر کہ تقوی انسان کے مستقبل کا زادراہ ہے، اس لئے دور اندیشی اور عقلی تقاضے کے مطابق آئندہ کے لئے کوشش کرنے میں، حب ذات مشتعل اور بیدار ہوتی ہے اور انسان کو مجبور کرتی ہے کہ اپنے آئندہ کے لئے تلاش کرے اور جو اس کے بے نہایت مستقبل کے لئے مفید ہو اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے، اس لئے قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿یا ایھاالذین آمنوا اتقوا اللّٰہ و لتنظر نفس ما قدمت لغد...﴾

(حشر/۱۸)

''ایمان والو؛ اللہ سے ڈرو اور ہر شخص دیکھے کہ اس نے کل کے لئے کیا بھیجا ہے۔''

۲۔ انسان کے اعمال و رفتار پر خدا کے علم و آگاہی کی توجہ: یہ راہ مذکورہ آیت کے ذیل میں بیان ہوئی ہے:

﴿... واتقوااللّٰہ ان اللّٰہ خبیر بما تعملون﴾

''اور اللہ سے ڈرتے رہو کہ وہ یقیناً تمھارے اعمال سے باخبر ہے''

یعنی خدائے متعال کی اس صفت کے پیش نظر کہ جو کچھ تم لوگ انجام دیتے وہ اس سے آگاہ ہے، تقوی کو اپنا لائحہ عمل بنالو۔ یہ تربیت کی ایک اور روش ہے جسے خدائے متعال نے انسان کو مدد کرنے کے لئے انتخاب کیا ہے تا کہ وہ تقوی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ چونکہ انسان خاص نفسیاتی خصوصیات کا مالک ہے، من جملہ ان میں یہ ہے کہ اگر وہ جانتا ہے کہ اس کے عمل پر اس کے علاوہ کوئی اور ناظر ہے اور جو کچھ وہ انجام دے رہا ہے اسے وہ دیکھ رہا ہے اور اس کے برے بھلے سے آگاہ ہے، تو وہ ناشائستہ اعمال انجام دینے سے پرہیز کرتا ہے۔ حقیقت میں خدائے متعال نے انسان کو ایسا خلق کیا ہے کہ کسی کے سامنے وہ، برا کام انجام دینے سے شرماتا ہے۔ اس لئے اگر انسان اس موضوع پر غور وفکر کرے کہ وہ ہمیشہ خدا کے حضور میں ہے اور نہ صرف وہ اس کے ظاہری اعمال کا مشاہدہ کر رہا ہے، بلکہ خدائے متعال اس تصور سے بھی واقف ہے جو اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، تو وہ حتی اپنے دل میں خطور کرنے والے آلودہ خیالات سے بھی شرماتا ہے انسان کسی کے بارے میں جس قدر احترام وعظمت کا قائل ہو، اس کا دل چاہتا ہے کہ اس کے سامنے زیادہ پاک وصاف یعنی اپنی شخصیت کو اچھا جلوہ دے انسان کے اعمال سے مربوط خدا کے آگاہ ہونے کے بارے میں قرآن مجید مزید فرماتا ہے:

﴿اولا یعلمون ان اللّٰہ یعلم ما یسرون و ما یعلنون﴾ (بقرہ/۷۷)

''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ خدا سب کچھ جانتا ہے، جس کا یہ اظہار کر رہے ہیں اور جس کی یہ پردہ پوشی کر رہے ہیں؟''

۳۔ یہ جان لینا کہ تقوی دنیا کے لئے بھی فائدہ مند ہے:

﴿...و من یتق اللّٰہ یجعل لہ مخرجا و یرزقہ من حیث لا یحتسب...﴾ (طلاق/ ۲۔۳)

''...اور جو بھی اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لئے نجات کی راہ پیدا کرتا ہے، اور اسے ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جس کا وہ خیال بھی نہیں ہوتا ہے۔''

حضرت علی علیہ السلام بھی فرماتے ہیں:

"واعلموا انہ من یتق اللّٰہ یجعل لہ مخرجا من الفتن و نورا من الظلم."[1]

۱۔ نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خطبہ ۱۸۲، ص ۶۰۲

''جان لو، جو تقوی کو اپنی زندگی کا دستور العمل قرار دیتا ہے اور خدا سے ڈرتا ہے تو خدا تعالی اسے فتنوں اور تباہیوں سے بچانے اور تاریکیوں میں اسے روشنراستہ دکھاتا ہے۔''

پہلے مرحلہ میں کہا گیا: غور کرو کہ اپنے آنے والے کل کے لئے کیا اکٹھا کر رہے ہو، اس راہ میں فرماتا ہے: تقوی کے ان فوائد کو دیکھو جو تمھاری اس دنیا کے لئے ہیں۔ تم لوگ خواہ نخواہ اپنی پوری زندگی میں فتنوں، مشکلات، شعبدہ بازیوں، تاریکیوں اور ابہامات سے دوچار ہوتے ہو، اگر تم چاہتے ہو کہ خدائے متعال تمہیں اسی زندگی میں مدد کرے اور تمہیں ان مشکلات اور پریشانیوں سے نجات دلائے تو تقوی کو اپنا دستور بنالو۔

باتقوی انسان جہاں پر اپنی فکر سے کسی راستہ کا انتخاب کرنا چاہتا ہے، خداوند متعال اس کے لئے ایک نور ظاہر کرتا ہے تا کہ وہ راستہ کو صحیح دیکھ سکے۔ اس لحاظ سے ہم کبھی دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے لئے پریشان کن اور حیرت انگیز مسائل پیش آتے ہیں اور ان مواقع پر قوی فکر اور غیر معمولی ہوش رکھنے والے انسان پریشانیوں اور مشکلات سے بچنے کا راستہ نہیں نکال پاتے، لیکن جو بہت زیادہ عقل و شعور نہیں رکھتے وہ بچاؤ کا راستہ نکال لیتے ہیں، یہ حقیقت میں خدا کی مدد ہے جو تقوی کے ذریعہ اپنے بعض بندوں کو خدائے متعال عنایت فرماتا ہے۔

تقوی اختیار کرنے کی تشویق کی تمام راستہ کے ذکر کرنے کے بعد تقوی کے نتائج اور آثار کا ذکر ضروری ہے۔ انسان اس وقت کسی کام کو انجام دینے یا کسی عزیز چیز کو ترک کرنے کے لئے آمادہ ہوتا ہے، جب وہ جانتا ہے اس کا نتیجہ اچھا ہوگا۔ وہ اس وقت ایک مشکل کام کو انجام دینے کے لئے حاضر ہوتا ہے جب وہ مطمئن ہو کہ اس کا نتیجہ اچھا ہے۔ لہٰذا اگر ہم یہ چاہتے ہوں کہ دوسرے لوگ بھی بلند و بالا مقامات تک پہنچ جائیں اور اخروی و معنوی نقصان پہنچانے والی چیزوں سے پرہیز کریں، تو ہمیں ایسا کام کرنا چاہئے کہ ان میں ذوق و شوق پیدا ہو انسان کو گناہ کی لذت سے چشم پوشی کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی محرک کا ہونا ضروری ہے، رات کے آرام کو چھوڑنے اور عبادت میں مشغول ہو جانے کے لئے محرک ہونا چاہئے۔ یا جہاں پر انسان کے فریضہ کا تقاضا ہو کہ لوگ محاذ جنگ پر جائیں اور اپنی جان کو خطرہ میں ڈالیں اور اسی طرح دوسرے فرائض کو عملی جامہ پہنانے کے لئے، محرک کا ہونا ضروری ہے اور محرک پیدا کرنے کا بہترین راستہ یہ ہے کہ انسان کو منافع اور اس کے آثار خیر کی طرف متوجہ کریں جو اس کے عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں، کیونکہ انسان کی

فطرت ان آثار کی طالب ہوتی ہے۔

انسان، معرفت وایمان کے جس مرتبہ پر بھی فائز ہو، وہ خیر کا طالب ہوتا ہے اور اگر اس کا ایمان اور اس کی معرفت ضعیف ہے تو، کم از کم وہ دنیا کی خیر چاہتا ہے، تمام لوگ وسیع رزق کے طالب ہوتے ہیں، وہ بھی زیادہ محنت وکوشش کے بغیر۔ اس لحاظ سے تقوی کے محرک کو پیدا کرنے کے لئے قرآن مجید اور اس حدیث میں ایک راستہ جو اختیار کیا گیا ہے وہ تقوی کے دنیوی منافع ہیں، کہ اگر کوئی شخص تقوی اختیار کرتا ہے تو خدائے متعال اس کے سامنے سختیوں اور مشکلات سے نجات پانے کا راستہ قرار دیتا ہے۔ بعض اوقات ممکن ہے انسان مشکلات اور پریشانیوں سے دوچار ہو جائے اور نجات کی کوئی راہ نہ ہو اور خود بھی مشکلات کو حل کرنے کے لئے کوئی راستہ پیدا نہ کر سکے، تو وہ اس حالت میں تلخیوں اور سختیوں کے باوجود زندگی کی مشکلات کو برداشت کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ خدائے متعال اسے وعدہ دیتا ہے کہ اگر تقوی رکھتے ہو تو مشکلات اور سختیوں کے دوران تیرے لئے نجات کا ایک راستہ فراہم ہوگا۔ یہ ایک بڑا وعدہ ہے جو خدائے متعال انسان کو دیتا ہے اور اسے تشویق کرتا ہے کہ ایک ایسے راستہ کا انتخاب کرے جس کا ثمرہ ونتیجہ مشکلات اور سختیوں سے نجات ہو۔

ایران کے مسلمانوں کے لئے جنگ کے دوران بعض اوقات انتہائی مشکل اور دشوار گزار مرحلے پیش آتے تھے اور کوئی ان پریشانیوں اور مشکلات سے رہائی اور نجات کا راستہ نظر نہیں آتا تھا، لیکن چونکہ یہ انقلاب تقوی کی بنیاد پر معاشرے میں تقوائے الٰہی پھیلانے اور روح بندگی پیدا کرنے اور اللہ کی حاکمیت کو برقرار کرنے کے لئے انجام دیا گیا، اس لئے خدائے متعال مسلسل عنایتیں کارفرما ہیں اور ہر موڑ پر نجات کی راہ خدا کی جانب سے الہام ہوتی رہی کہ جس کے نتیجہ میں لوگ مشکلات سے نجات پاتے تھے، اس کا نمونہ ۲۲ بہمن بمطابق (۱۹۷۹ع) کا دن ہے:

جب طاغوتی حکومت نے مارشل لا کا اعلان کیا اور لوگوں کو گھروں سے باہر نکلنے کی سختی سے ممانعت کی تا کہ اپنی شیطانی منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکیں، تو امام خمینی نے اپنی دور اندیشی اور الٰہی مدد سے تمام لوگوں کو سڑکوں پر آنے کا حکم دے دیا اور لوگ مارشل لا کی پروا کئے بغیر سڑکوں پر نکل آئے، جس کے نتیجہ میں دشمن کی تمام سازشیں طشت از بام ہو گئیں اور انقلاب اسلامی کامیابی سے ہم کنار ہو گیا۔

اس طرح خدائے متعال اہل تقوی کو ایسی راہ سے رزق پہنچاتا ہے جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا، ہم

سب اپنے لئے رزق حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے فراہم کرنے کے لئے مکلف ہیں۔ ہر کوئی اپنی جگہ پر محاسبہ کرتا ہے کہ کونسا کام انجام دے اور کونسا راستہ اختیار کرے تا کہ بیشتر نفع کمائے اور اس طرح بیشتر رزق حاصل کرے آخر کار عمومی محاسبات اور زندگی کی طبیعی راہوں سے وہ ایک راہ کا انتخاب کرتا ہے: یا کھیتی باڑی، یا صنعتی کام یا تجارت۔ قرائن کی بنیاد پر اور اپنے محاسبات کے مطابق آمدنی کی مقدار اور نفع کا اندازہ لگاتا ہے، لیکن خدائے متعال نے اہل تقوی کے لئے ضمانت دی ہے کہ ان کو حساب و کتاب کے بغیر رزق دے گا من جملہ جو خدا کی خوشنودی کے لئے فریضہ انجام دینے کی غرض سے علم حاصل کرتا ہے۔ جیسا کہ بعض روایتوں میں آیا ہے۔ خدائے متعال اسے ایک ایسی جگہ سے کہ جس کا وہ تصور بھی نہیں کرتا ہے رزق پہنچاتا ہے اس سلسلہ میں بہت سے نمونے موجود ہیں اور ہم سب نے اپنی زندگی میں کم و بیش اس کا تجربہ کیا ہے لیکن اگر کسی نے دیکھا کہ جس طرح اسے رزق ملنا چاہئے تھا نہ ملا تو اسے دیکھنا چاہئے کہ خطا کہاں ہوئی ہے۔ اس لئے خدا کے وعدہ کے مطابق اہل تقوی کا رزق عمومی محاسبات اور متوقع راستوں سے خارج ہے۔

اگر خدائے متعال ہمیں تقوی حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے، تو وہ اس لئے ہے کہ دنیا و آخرت میں اس کے اچھے نتیجہ اور بڑے مرتبہ کو حاصل کر سکیں۔ بہشت اور اخروی درجات نیز معنوی کمال حاصل کریں اور ہمارے دنیوی زندگی سلامتی سے گزرے ورنہ خدائے متعال ہمارے تقوی سے استفادہ نہیں کرتا ہے:

﴿لن ینال اللّٰہ لحومھا ولا دمائھا و لکن ینالہ التقوی منکم ...﴾ (حج/۳۷)

''خدا تک ان جانوروں کا نہ گوشت جانے والا ہے اور نہ خون، اس کی بارگاہ میں صرف تمہارا تقوی جاتا ہے''

جو ہمیں خدا سے ملاتا ہے، وہ تقوی ہے، یہی تقوی کمال و بلندی کا سبب ہے، چونکہ خدائے متعال چاہتا ہے کہ ہم کمال تک پہنچ جائیں، اس لئے تقوی کے کچھ دنیوی نتائج کو بیان کر کے ہمیں تشویق کرتا ہے کہ ہم اس کو حاصل کرنے کی جستجو کریں تا کہ اس کے نتیجہ میں اخروی منافع بھی حاصل کر سکیں۔ حقیقت میں اخروی منافع جیسا کہ ہم خیال کرتے ہیں اوجھل نہیں ہیں اور ان کا محقق ہونا نزدیک اور یقینی ہے لیکن ہم درک نہیں کرتے۔

مراتب تقوی پر ایک نظر:

اس کے پیش نظر کہ تمام معنوی کمالات کے مراتب ہیں اور تقوی بھی چونکہ بلند ترین معنوی کمالات میں سے ہے، اس لئے اس کے بھی مراتب ہیں۔ مناسب ہے یہاں پر اس کے مراتب کی طرف ایک اشارہ کریں: علمائے اخلاق نے تقوی کے لئے ایک زاویہ سے تین مراتب ذکر کئے ہیں:

۱۔ صالح اور شائستہ اعمال انجام دے کر اور صحیح عقائد رکھتے ہوئے، نفس کو جہنم کے عذاب اور اس میں داخل ہونے سے بچانا کیونکہ تقوی کے معنی نفس کا تحفظ اور اپنے آپ کو خدا کی مخالفت سے روکنا ہے، بلکہ صرف گناہ سے پرہیز اور اس سے دوری اختیار کرنے کے معنی میں نہیں ہے۔ اس لحاظ سے تقوی عقائد سے بھی مربوط ہے اور غیر عقائد سے بھی، عقائد میں تقوی، یعنی انسان اپنے اعتقادی اصول کے بارے میں غور کرے اور کوشش کرے کہ ان سے منحرف نہ ہو جائے اور اپنے صحیح اور راسخ اعتقاد کے سلسلہ میں اپنی رفتار و گفتار حتی اپنی سوچ کو بھی جہت دے۔ انسان حقیقی معنوں میں اپنے خدا اور اصلی معبود کا معتقد ہو جائے اور یقین پیدا کرے کہ دوسرے تمام خیالی خدا اور معبود باطل ہیں۔ صحیح معنوں میں معتقد ہو جائے کہ اس معبود کی تمام مخلوق حقیقت ہیں اور مخلوق کو اپنے معبود کا مطیع و فرمانبردار ہونا چاہئے، اس کے سامنے اپنی ذلت کی پیشانی زمین پر رکھے اور اس سے روگردانی نہ کرے۔

خدائے متعال کے بارے میں تقوی کے رعایت کے بعد، پیغمبروں اور ان کے جانشینوں کے تقوی کی بھی رعایت کرے۔ ان کے احکام کو دل و جان سے قبول کرے۔

۲۔ تقوی کا دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ گناہ کو ترک کرنے کے علاوہ مشتبہ چیزوں اور مکروہات سے بھی پرہیز کرے۔

۳۔ تقوی کا تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ انسان اپنے اعضاء و جوارح کو محرمات، مشتبہات اور مکروہات سے بچانے کے علاوہ اپنے دل کی بھی خدا کی مرضی کے مطابق حفاظت کرے اور گناہ اور بُرے کام کے تصور تک کو دل میں راستہ نہ دے اور کوشش کرے کہ صرف خدائے متعال اور اس کی مرضی کے بارے میں فکر کرے۔

فطری بات ہے کہ انسان جس قدر بھی عبادت کرے، لیکن گناہ سے پرہیز نہ کرے تو وہ عبادت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے۔ پس ہمیں اپنی عبادتوں اور اعمال سے بہرہ مند ہونے کے لئے، سب سے

پہلے ان کے حدود کی اچھی طرح حفاظت کرنی چاہئے تا کہ خدا کی مرضی کے خلاف کوئی کام ہم سے سرزد نہ ہو ۔روایت میں آیا ہے:

"من تورع عن محارم اللّٰہ فھو من اورع الناس" [1]

''جو شخص محرمات سے پرہیز کرے وہ پرہیز گار ترین انسان ہے۔''

آثار تقوی پر ایک نظر:

ایک اور مطلب، جس پر بحث کرنا مناسب ہے، آثار تقوی کو بیان کرنا ہے، ہم یہاں پر ان کے بعض آثار کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔حقائق کو درک کرنے میں تقوی کے اثرات:

"یا أیھاالذین آمنوا ان تتقواا اللّٰہ یجعل لکم فرقاناً" (فرقان/۲۹)

''ایمان والو! اگر تم تقوائے الٰہی اختیار کرو گے تو وہ تمھیں حق و باطل میں فرق کرنے کی صلاحیت عطا کرے گا''

عقل کی قوت جو حقائق کو پہچاننے کا سبب ہوتی ہے، انسان کے لاابالی پن سے پرہیز اور رفتار کے حدود کی رعایت کرنے کی صورت میں، زیادہ فعال ہوتی ہے، کیونکہ لاابالی اور بے راہ روی عقل کی صحیح فعالیت کے لئے مانع ہے۔ ماہرانہ صورت میں، انسان کی لاابالی طبیعت اس کی حیوانی پہلوؤں سے مربوط ہے، خواہ خوراک میں ہو یا جنسی مسائل میں اور خواہ اس کی قوت غضبیہ سے مربوط ہو۔ اب اگر انسان نے ان پہلوؤں میں اپنے لئے کسی قیود کی رعایت نہ کی، اپنے حیوانی زاویہ کو تقویت بخشی، تو جس کا ہم وغم اس کی غذا ہو، وہ اس گوسفند کے مانند ہے کہ جس کا ہم وغم گھاس کھانا ہوتا ہے۔ یقیناً ایسا انسان اپنے انسانی پہلوؤں کو تقویت نہیں بخش سکتا ہے، اور عقل ان انسانی توانائیوں میں سے ہے جو مذکورہ صورت میں یا ضعیف ہوتی ہے یا ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جس کی توجہ جنسی شہوات کو تسکین دینا ہو تو اس کی فکر و سرگرمی شہوت کے محور کے گرد چکر لگاتی ہے اور اس کی مثال اس سور کی سی ہے جو صبح سے شام تک اپنی شہوت کے پیچھے رہتی ہے۔ ایسا انسان ایسے ماحول کی تلاش میں رہتا ہے کہ جو اس کے غریزہ کے ماتحت ہوں ایسی آوازیں سنتا ہے یا ایسی

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۷، ص ۶۴

باتیں کہتا ہے جو اس کی خواہش اور غریزہ کے تابع ہوتی ہیں، ایسی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے جو جنسی مسائل سے مربوط ہوتی ہیں۔ یقیناً ایسے انسان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی ہے کہ وہ معارف الٰہی کے بارے میں فکر کرے گا اور، حقائق کو درک کرے گا اور حق و باطل کو تشخیص دے گا۔ اس قسم کا انسان درندوں کے مانند ہے، اپنی قوت غضبی کو تقویت بخشنے کی فکر میں ہوتا ہے ہر وقت غلبہ پانے اور دوسروں پر مسلط ہوجانے کی فکر میں رہتا ہے۔ اس بناء پر ایسے انسان کی فکر کا محور جبلّت اور تسلّط جمانا ہوتا ہے۔

تقوی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی حیوانی قوتوں پر کنٹرول کرے اور اس صورت میں عقل کی قوت ہمارے وجود پر حاکم ہوگی۔ اب اگر "فرقان" سے مراد عقل ہے۔ چونکہ عقل حق و باطل کے درمیان تمیز دیتی ہے۔ تو ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حیوانی قوتوں کو کنٹرول کرکے اور عقل کی حاکمیت سے تمام دیگر قوتوں کو تسخیر کرکے فرقان کی منزل تک پہنچ گئے ہیں۔

فرقان کے بارے میں ایک اور تفسیر کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے، کہ فرقان عقل سے بالاتر ایک نور ہے، کیونکہ عقل تمام انسانوں میں کم و زیاد موجود ہوتی ہے۔ پس خدا اور خوف الٰہی کو پہچاننے سے انسان اپنی زندگی میں کچھ حدود کی رعایت کرتا ہے اور جو تقوی اس کے وجود میں پیدا ہوتا ہے، اس سے یہ توانائی پیدا ہوتی ہے کہ خدائے متعال اسے فرقان کا نور عطا کرے کہ جو قوت عاقلہ کی تائید کرنے والی ہے۔

۲۔ بصیرت اور روشن فکری میں تقوی کا اثر: بہت سی آیات و روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ تقوائے الٰہی کے قیمتی آثار میں سے بصیرت اور روشن فکری کو جلا دینا ہے، چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿... و اتقوا اللّٰہ و یعلمکم اللّٰہ..﴾ (بقرہ/۲۸۲)

"تقوی الٰہی اختیار کرو اور خدا تمھیں تعلیم دے گا۔"

یہ آیہ مبارکہ اس نکتہ کی تاکید کرتی ہے کہ تقوی خدا کی طرف سے انسان کے لئے علم و آگاہی حاصل کرنے میں شائستہ اثر رکھتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک روایت میں فرمایا ہے:

"من اخلص للہ اربعین یوماً فجّر اللّٰہ ینابیع الحکمۃ من قلبہ علی لسانہ" [۱]

"جو شخص چالیس دنوں تک خود کو خدا کے لئے خالص قرار دے تو دل سے حکمت کے چشمے

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۰، ص ۲۴

اس کی زبان پر جاری ہوں گے۔''

حقیقت میں تقوی انسان کے دل میں معرفت حق پر لگے ہوئے زنگ کو صاف کرتا ہے اور انسان کے دل سے شیطان کے حجاب یعنی وسوسوں کو دور کرتا ہے، تب انسان حقائق کو صاف اور آشکار دیکھ سکتا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''لولا انّ الشیاطین یحومون حول قلوب بنی آدم لنظروا الی ملکوت السماوات''[1]

''اگر فرزندان آدم کے دلوں کے اطراف میں شیاطین نہ ہوتے، تو وہ آسمانوں کے ملکوت کا مشاہدہ کرتے!''

ہمارے دینی آثار میں اس قسم کے بیانات بہت زیادہ ہیں جو اس امر کی حکایت کرتے ہیں کہ تقوی اور گناہ سے پاک ہونا، روح کی بصیرت اور روشن بینی کی راہ میں مؤثر ہے اور بالواسطہ ہمیں متنبہ کرتا ہے کہ تقوی کی باگ ڈور کو ہاتھ سے چھوڑنا، روح کے تاریک ہونے، دل کے سیاہ ہونے اور نور بصیرت کے بجھنے کا سبب ہے۔

۳۔ تقوی کے آثار میں، خدا کی محبت کو حاصل کرنا بھی شامل ہے:

﴿بلی من اوفی بعهده و اتقی فان الله یحب المتقین﴾ (آل عمران/۷۶)

''بیشک جو اپنے عہد کو پورا کرتا ہے اور تقوی اختیار کرتا ہے تو خدا متقین کو دوست رکھتا ہے۔''

واضح ہے کہ اگر خدائے متعال کسی سے محبت کرتا ہے، تو کون سے ثمرات اور منافع اسے حاصل ہوتے ہیں۔ جب انسان کسی سے محبت کرتا ہے، تو متواتر اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں کوتاہی نہیں کرتا ہے اور اس بات کی بھی سعی کرتا ہے تاکہ اس کے مطالبات کو پورا کرے اور جو کام بھی ممکن ہوتا ہے اس کے لئے انجام دیتا ہے۔ اب خدائے متعال جو ہر چیز پر قادر ہے اور تمام کمالات کا خالق و مالک ہے اگر کسی شخص کو دوست رکھتا ہے تو معلوم ہے اس کے لئے کیا کرے گا۔ ممکن ہے ہم کسی سے محبت کرتے ہوں اور اس کے لئے کوئی کام انجام دینا چاہیں لیکن وسائل و امکانات کی عدم فراہمی کی وجہ سے شائستہ ظہور پر انجام دینے سے عاجز ہوں۔ لیکن خدائے متعال ہر چیز پر قادر ہے اور تمام چیزیں اس کی

۱۔ بحار الانوار، ج/۵۹، ص/۱۶۳

قدرت اور مشیت کے تحت ہیں اور وہ جو کام چاہئے اپنے دوست کے لئے انجام دے سکتا ہے۔

۴۔ خوف و رنج کا دور ہونا۔

چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿...فمن اتقی و اصلح فلا خوف علیهم و لاهم یحزنون﴾ (اعراف/۳۵)

''جو بھی تقوی اختیار کرے گا اور اصلاح کرے گا اس کے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ رنجیدہ ہوگا۔''

۵۔ غیبی امداد حاصل کرنا:

اور متقی کے لئے امداد غیبی کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿بلی ان تصبروا و تتقوا و یاتوکم من فورهم هذا یمددکم ربکم بخمسة ء الٰف من الملائکة مسومین﴾ (آل عمران/۱۲۵)

''یقیناً اگر تم صبر کروگے اور تقوی اختیار کروگے اور دشمن فی الفور تم تک آجائے تو خدا پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا جن پر بہادری کے نشان لگے ہوں گے''

ایک حدیث میں ہے:

''ان اللّٰه تبارک و تعالی ایّد المؤمن بروح منه یحضره فی کل وقت یحسن فیه و یتقی و یغیب عنه فی کل وقت یذنب فیه ویعتدی..''[1]

بیشک خدائے متعال مومن کی اپنی روح کے ذریعہ تائید کرتا ہے اور جس وقت بھی وہ احسان اور تقوی اختیار کرے گا تو وہ روح اس کی تائید کے لئے اس کے پاس حاضر ہوتی ہے، لیکن جس وقت وہ گناہ اور ظلم کرتا ہے، وہ روح اس سے دور ہو جاتی ہے۔

۶۔ عظمت اور قرب الٰہی کا حاصل ہونا:

انسان کا قرب الٰہی اور وکرامت سے سرفراز ہونے کے سلسلہ کرنے میں تقوی کا کیا نقش ہے اس بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿ان اکرمکم عنداللّٰه اتقیکم﴾ (حجرات/۱۳)

۱۔ وسائل الشیعہ، ج/۱۱ص/۲۳۵

''بیشک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔''

۷۔ مشکلات اور پریشانیوں سے رہائی۔

مشکلات اور پریشانیوں سے رہائی کے بارے میں تقوی کے اثرات کے موضوع پر اس سے پہلے بحث ہوئی اور سورہ طلاق آیت نمبر ۲ کی طرف اشارہ کیا گیا۔ یہاں پر ہم ایک دوسری آیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو باتقوی معاشرے کے بارے میں ہے اور وہ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۹۶ ہے، کہ جس میں فرماتا ہے:

''و لو ان اهل القری آمنوا واتقوا لفتحنا علیهم برکٰت من السماء و الارض.''

''اور اگر اہل قریہ ایمان لے آتے اور تقوی اختیار کر لیتے تو ہم ان کے لئے زمین اور آسمان سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے''

۸۔ اعمال کا قبول ہونا۔

انسان کے اعمال کے قبول ہونے میں تقوی کا اثر اور اس کے نقش کے بارے میں خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿انما یتقبل اللّٰه من المتقین﴾ (مائدہ/۲۷)

''خدائے متعال صرف صاحبان تقوی کے اعمال کو قبول کرتا ہے۔''

خدائے متعال اس آیت میں ہمیں اس نکتہ کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ اگر ہم چاہیں کہ ہمارے اعمال قبول ہوں تو ہمیں تقوی اختیار کرنا چاہئے۔ البتہ اگر تکالیف اور واجبات ان کے ظاہری شرائط کے ساتھ انجام پائیں اور صحیح ہوں، تو ہم سے تکلیف ساقط ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر ہم صبح کی نماز کو سستی اور کاہلی کی وجہ سے صبح ہونے سے پہلے عجلت کی حالت میں پڑھ لیں، تو یقیناً ہم سے تکلیف ساقط ہو جاتی ہے لیکن قبول ہونے کے مرحلہ اس سے جدا ہے اور قبول ہونے کا مرحلہ اس سے برتر ہے اور اس کے خاص شرائط ہیں، من جملہ ان شرائط میں سے ایک عمل کا تقوی کے ساتھ ہونا ہے۔ پس وہ اثر جس کا سبب انسان کا عمل خدا کے پاس بلند مرتبہ پر قرار پاتا ہے، یعنی عمل کی قبولیت، اس وقت انجام پاتی ہے جب عمل تقوی اور خدا کی نافرمانی سے پرہیز کے ساتھ ہو۔

"یا اباذر؛ کن بالتقوی اشد اهتماما منک بالعمل فانه لایقل عمل بالتقوی، و کیف یقل عمل یتقبل؟ یقول اللّٰه عزوجل :((انما یتقبل اللّٰه من المتقین))

''اے ابوذر! عمل سے زیادہ تقوی کے لئے اہتمام کرنا. کیونکہ تقوی کے ساتھ عمل کم نہیں ہے، کس طرح وہ عمل کم تصور کیا جائے گا جو درگاہ الٰہی میں قبول ہو چکا ہو؟ خدائے متعال فرماتا ہے: پروردگار صرف صاحبان تقوی کے عمل کو قبول کرتا ہے۔''

لوگ، خواہ دنیا سے مربوط ہوں یا آخرت سے، عزم وارادہ کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں اور ممکن ہے ان کے درمیان کافی فرق ہو، معاشی زندگی کے بارے میں بعض لوگوں کے عزم ارادے کمزور ہیں اور صبح سے شام تک دال روٹی کی امید میں محنت کرتے ہیں، پسینے پسینے ہوتے ہیں اور اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ اس گروہ نے زہد کی راہ کو اپنایا ہے بلکہ ان کے توقعات کم ہیں اور ان کا عزم وارادہ کم ہے۔ بعض لوگوں کا عزم وارادہ اس سے زیادہ ہوتا ہے اور مختصر پر مطمئن نہیں ہوتے اور کوشش کرتے ہیں کہ اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ منافع کمائیں، محدود اور کم چیزیں انھیں مطمئن نہیں کرتی ہیں۔ لیکن بعض لوگوں کے عزم وارادے اس گروہ سے بھی بالاتر ہیں اور وہ مادی ومحسوس منافع اور خوراک وشکم کو اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ ان کے لئے اجتماعی حیثیت اور عزت وعظمت حاصل کرنا اہم ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی کام کا انتخاب کرتے ہیں تو وہ اس لئے نہیں کہ اس کے ذریعہ ایک بڑی رقم انھیں ملنے والی ہو بلکہ وہ کام ان کی شان وحیثیت کے مطابق ہے اور ان کی عزت وشرافت کا باعث ہے اس لئے اسے انتخاب کرتے رہیں غیر شرافت مندانہ فعل چاہے جتنی دولت ونفع کا باعث ہو اسے ہاتھ نہیں لگاتے باعزت وعظمت نہ ہو تو اس کے پیچھے نہیں پڑتے۔ اس گروہ کے عزم وارادے بلند ہیں، وہ عزت نفس کے مالک ہوتے ہیں اور ان کے پاس عزت کی قدر و منزلت ہوتی ہے۔

اسی طرح آخرت کے سلسلہ میں بھی مومنوں کے عزم وارادے میں فرق ہوتا ہے: بعض لوگوں کے عزم وارادے اسی حد تک ہوتے ہیں کہ کوئی ایسا کام کریں تا کہ جہنم میں نہ جائیں اور اس کی آگ سے نجات پائیں اور وہ اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ لیکن بعض لوگ اس پر مطمئن نہیں ہوتے اور وہ بہشت کے بلند مراتب حاصل کرنے کی فکر میں بھی ہوتے ہیں ایک اور گروہ کے لوگ ایسے ہیں کہ جنھوں نے اپنے عزم و

ارادے کو بلند تر کر دیا ہے اور وہ جہنم و بہشت کو نہیں دیکھتے بلکہ اس کوشش میں ہوتے ہیں کہ خدا کے نزدیک عزیز ہو جائیں اور اس کے قرب میں پہنچ جائیں۔ جی ہاں! جنہوں نے خدائے متعال کو پہچانا ہے اور خدا کے نزدیک عزت کی بلند قدر و قیمت سے آگاہ ہیں، اگر بہشت کی نعمتیں بھی نہ ہوں، تو پھر بھی وہ خدا کے نزدیک پانے والی عظمت سے کافی خوش اور راضی ہو کر اس پر ناز کرتے ہیں۔ ان کے لئے اس میں اہمیت ہے کہ خدا ان کی عزت کرے اور انھیں عظمت بخشے اس لئے وہ بہشت کی نعمتوں کی طرف کوئی اعتنا نہیں کرتے ہیں۔ خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے:

﴿...ان اکرمکم عند اللہ اتقیکم...﴾ (حجرات/۱۳)

''بیشک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔''

اللہ تعالی یہاں یہ نہیں فرماتا ہے کہ جو زیادہ باتقوی ہے اسے میں بہشت اور بہشت کی نعمتیں عطا کروں گا یا اسے جہنم کی آگ سے نجات دلاؤنگا، بلکہ فرماتا ہے کہ وہ خدا کی کرامت حاصل کرتا ہے اور خدا کے نزدیک محترم قرار پاتا، بہشت اور اس کے ہمیشہ باقی رہنے والے محل اور جاویدانی نعمتوں سے مستفید ہونے سے بالاتر ہے۔ اب جو شخص معرفت کے اس مقام تک پہنچا ہو تو مزید تقوی کے لئے اس کی کیسے تشویق کی جائے؟ کیا اسے یہ کہیں کہ: اپنے تقوی میں اضافہ کرو تا کہ تمھاری دنیا کی زندگی بہتر ہو؟ وہ تو ان سب کو پس پشت ڈال کر عالی ترین مرحلہ پر فائز ہو چکا ہے. یا اس سے یہ کہیں: اپنے تقوی میں اضافہ کرو تا کہ بہشت کے محلوں اور حور العین سے بہرہ مند ہو جاؤ اور جہنم سے نجات پاؤ فطری بات ہے کہ ان میں سے کوئی چیز اسے بہکا نہیں سکتی اور اس میں محرک پیدا نہیں کر سکتی ہے، کیونکہ اس نے ان چیزوں سے منہ موڑ لیا ہے. وہ کمال اور بلندی کے ایک ایسے مرحلہ پر پہنچا ہے اور اس کا عزم و ارادہ اس حد تک پہنچا ہے کہ شوق لقاء اللہ اور محبت و عظمت الہی کے مقام کو حاصل کرنے کے علاوہ کسی اور چیز کی فکر نہیں کرتا ہے۔ جو چیز ایسے افراد کے شوق میں اضافہ کر سکتی ہے وہ محبوب کا دیدار اور اس کی رضایت ہے۔

توجہ کرنی چاہئے کہ قرآن مجید نے تربیت کے لئے ایک ہی قسم کے شیوہ کا انتخاب نہیں کیا ہے، بلکہ ہر سطح کے افراد کے لئے خاص شیوہ کا انتخاب کیا ہے۔ اس لحاظ سے قرآن مجید میں تربیت کے متعدد طریقے ہیں اور اس کے یہ طریقے صرف اولیائے الہی اور مقامات عالی تک پہنچنے والے افراد سے مخصوص نہیں ہیں، کیونکہ قرآن مجید تمام انسانوں کے کمال اور اصلاح کے لئے کتاب ہدایت اور دعوت عمل ہے۔ اس

لئے حتی کم عزم اور کم حوصلہ رکھنے والوں کے لئے بھی ان کی جزا اور نعمتیں ذکر کی ہیں، جو تکامل و ترقی کی راہ میں ہیں، تا کہ وہ بھی بہرہ مندی سے محروم نہ ہو رہیں۔ انھیں مادی نعمتوں، بہشت اور جہنم سے نجات کا وعدہ دیا گیا ہے۔ لیکن کرامت الٰہی، رضوان حق تک پہنچنے اور اس کے نزدیک محبوب ہونے کا وعدہ ان سے مخصوص ہے جو معرفت کے عالی درجات تک پہنچے ہیں۔

متقین کے حساب و کتاب کی خصوصیت اور ان کی چند دوسری خصوصیات:

ایک اور موضوع جس پر بحث کرنا مناسب ہے وہ ''متقین کے صفات'' ہیں۔ تقوی کی قدر و قیمت اور بلند مقام سے آگاہ ہونے کے بعد ہمیں متقین کی نشانیوں اور صفات کو جاننا چاہئے تا کہ تقوی کو حاصل کرنے کے طریقہ سے آگاہ ہو جائیں۔ اس سلسلہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"یا اباذر؛ لایکون الرجل من المتقین حتی یحاسب نفسه اشد من محاسبة الشریک شریکه. فیعلم من این مطعمه و من این مشربه و من این ملبسه؟ امن حل ذلک ام من حرام"

''اے ابوذر! انسان تب تک پرہیز گاروں میں شمار نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے شریک کا محاسبہ کرنے سے سخت تر خود کو محاسبہ کی منزل میں قرار نہ دے۔ تا کہ جان لے اس کی خوراک، پینے کی چیزوں اور پہننے کا لباس کہاں سے آیا ہے، حلال سے ہے یا حرام سے ہے۔''

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حساب و کتاب کی خصوصیات کو متقین کی جملہ صفات میں شمار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: باتقوی وہ ہے جو لاپرواہ نہ ہو اور اپنے آپ کو تحت محاسبہ قرار دے۔ اگر کسی خوراک کو حاصل کیا ہے تو دیکھ لے کہ اسے حلال راہ سے حاصل کیا ہے یا حرام راہ سے، اگر لباس فراہم ہوا ہے تو دیکھ لے کہ وہ اس کے پیسے کہاں سے لایا ہے۔ اسی طرح گھر کے بارے میں کہ اس کے پیسے کہاں سے فراہم ہوئے ہیں۔ اسی طرح اس کی گھر بنانے کا محرک یہ ہے کہ خدا کی عبادت و بندگی بہتر طور پر انجام دے سکے،

خاندان کے لئے بیشتر آرام وآسائش فراہم کرے اور بہتر عبادت کر سکے اور اپنے فرزندوں کی تربیت کر سکے یا اس کا گھر بنانے کا محرک دوسروں پر فخر ومباہات کرنا اور دوسروں کو نیچا دکھانا ہے۔

جب وہ کسی راہ میں پیسے خرچ کرنا چاہتا ہے، دیکھنا چاہئے خدا اس پر راضی ہے اور اس سے واجب تر کوئی کام تو نہیں ہے کہ جس کے لئے یہ پیسے خرچ کرنا ضروری ہوں؟ بہر صورت تمام جوانب کی پڑتال کرے اور ایسا نہ ہو کہ سر کو نیچے کر کے اور جس راہ سے بھی ممکن ہو پیسے جمع کر کے جس کام پر چاہے خرچ کرے۔ دیکھ لے کہ جو امکانات اسے حاصل ہوئے ہیں وہ حلال راہ سے حاصل ہوئے ہیں یا حرام سے۔ اگر حرام طریقے سے حاصل ہوئے ہیں تو اسے اس کیچڑ پر واپس پلٹا دے اور خود کو مصیبت میں نہ ڈالے۔

بعض اوقات انسان اس قدر دنیا داری میں ملوث ہوتا ہے اور اپنے آپ کو دنیوی امور میں گرفتار کرتا ہے کہ اس سے چھٹکارا پانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو بڑے بڑے قرضوں اور لون کی قسطوں میں پھنساتا ہے اور اپنی آبرو کو داؤ پر لگاتا ہے، حتی کسی نہ کسی طرح دوسروں کو بھی اپنے مسائل میں گرفتار کرتا ہے اور اس طرح سے نجات کا کوئی راستہ نہیں رہ جاتا، صرف اس فکر میں ہوتا ہے کہ کچھ پیسے اس کے ہاتھ آئیں ،جس طریقہ سے بھی ہو، حلال یا حرام! (یعنی پیسہ ہو جیسا ہو)

اگر ہم تقوی کے بلند مرحلہ پر نہیں پہنچے ہیں، کہ مشتبہ ومکروہ سے پرہیز کریں، تو کم از کم حرام کے حدود کی رعایت کریں! ایسا نہ ہو کہ جو مال ہمارے ہاتھ آیا ہے وہ کسی اور کا حق ہے۔ ہر مومن کو اپنی زندگی میں بعض قوانین وحدود کی رعایت کرنی چاہئے اور اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔ ایک تاجر کو ایک طرح سے شرعی احکام کی رعایت کرنی چاہئے ملازم کو دوسرے انداز سے ان کی رعایت کرنی چاہئے اور اسے دیکھنا چاہئے کہ جو وہ تنخواہ لیتا ہے، کیا اس کے ساری وہ کام کرتا ہے یا کم کام کرتا ہے؟ کام کے وقت تفریح آرام، سگریٹ پینے، اور دوسروں سے گفتگو کرنے میں وقت گزارتا ہے یا کام انجام دیتا ہے؟ بعض مومن واہل عبادت، نافلہ پڑھتے ہیں، لیکن جب اپنے کام کی کرسی پر بیٹھتے ہیں تو تمام چیزوں کو پس پشت ڈال کر اپنے فریضہ کو بھول جاتے ہیں اور تصور کرتے ہیں کہ اس کرسی پر بیٹھ جانا ہی گویا انھوں نے اپنے فریضہ کو انجام دے دیا ہے۔

سرکاری ملازم یا کسی پرائیویٹ کمپنی کے ملازم کے لئے ڈیوٹی کا وقت اس کے مالک کا حق ہے اسے اس وقت میں کسی اپنے ذاتی امور میں مشغول نہیں ہونا چاہئے، حتی اگر کبھی ذاتی کام کے لئے ٹیلیفون

کرے اور وہ ٹیلیفون کام میں رکاوٹ بنے، تو وہ اس کے مقابل میں جواب دہ ہے، ہم ان نکات کی طرف توجہ نہیں رکھتے ہیں۔ اسی طرح بیت المال سے استفادہ، بیت المال کی ہی مصلحت کی راہ میں ہونا چاہئے، اس بنا پر اگر ہم نے عہد و پیمانکیا ہے کہ ایک مشخص (معین) وقت میں ایک خاص کام انجام دیں، تو اس وقت کو کسی دوسرے کام میں صرف نہیں کرنا چاہئے، حتی اگر ہم نے ایک خاص زمانہ میں ایک کام کو اجرت پر انجام دینے کے لئے عہد و پیمان کیا ہے، تو ہمیں اس وقت میں نماز پڑھنے کا حق نہیں ہے مگر یہ کہ پہلے سے ہی مالک سے شرط رکھی ہو۔

بیت المال کے بارے میں حرام و حلال اور اس کے شرائط و حدود کی رعایت کرنا دشوار ہے۔ خوش بختی سے ایسے مسائل ہمارے لئے بہت کم پیش آتے ہیں، لیکن ہم دوسرے مسائل سے روبرو ہیں: جب ہم دین کی تبلیغ کے لئے جاتے ہیں ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ تبلیغ کی راہوں کو جانیں، ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ایسا کام انجام نہ دیں کہ جس سے دوسروں پر آنچ آئے اور دوسروں کی بے احترامی نہ کریں اور اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی فکر میں نہ ہوں۔ ممکن ہے تبلیغ کے لئے ایک ایسی جگہ پر جائیں جہاں پر ہم سے پہلے کوئی اور شخص تبلیغ کے لئے گیا ہو لوگ اس سے مطمئن اور خوش ہوں اور ہمارے سامنے اس کی تعریفیں کریں کہ فلاں شخص اچھی مجلسیں پڑھتا تھا، اس کی تقریر اچھی تھی اور لوگ اس کا استقبال کرتے تھے۔ یہاں پر ممکن ہے ہم اس شخص کی تعریف تو کریں، لیکن اشاروں میں حتی باتوں باتوں میں لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کریں کہ اس شخص کا علم مجھ سے کم ہے تا کہ بعد والے برسوں میں پھر مجھے ہی دعوت کریں! مثلا ہم اس طرح کہتے ہیں چند سال پہلے وہ شخص میرا ہم درس تھا ایک مدت کے بعد اس نے پڑھائی چھوڑ دی یا دفتری کاموں میں مشغول ہو گیا اور پڑھائی کو جاری نہ رکھ سکا، یعنی ہم علم میں آگے بڑھے اور وہ پیچھے رہا!

دوسروں کی تردید اور تضعیف کرنے کے لئے اور دوسروں کی شخصیت کو پست دکھلانے کے لئے یا اپنے ذاتی منافع و مقاصد تک پہنچنے کے لئے، شیطان مختلف طرح کے حیلوں اور بہانوں سے کام لیتا ہے کہ ان میں سے بعض خاص قسم کی ظرافت کے حامل ہوتے ہیں اور ہر ایک ان کی قباحت اور برائی کو نہیں جان سکتا ہے ممکن ہے ظاہر میں کافی پر رونق اور زیبا دکھائی دیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذرؓ سے اپنی نصیحتوں کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یا اباذر؛ من لم یبال من این اکتسب المال لم یبال اللّٰہ عزوجل من این

ادخله النار"

"اے ابوذر؛ جو بھی اس کا خیال نہیں رکھتا ہے کہ مال کہاں سے آتا ہے خدائے متعال بھی اس کی پروا نہیں کرے گا کہ اسے کہاں سے جہنم میں ڈالے۔"

انسان کو مال حاصل کرنے میں دقت کرنی چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ پیسے کہاں سے حاصل کرتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ لوگوں کی ستائش، تملق، ترویج اور ان کے سامنے سرخم کر کے پیسے حاصل کئے ہوں اس کے لئے یہ مہم نہیں ہے کہ پیسے حلال راہ سے آئے ہیں یا حرام راستہ سے، اس کا کام شرعی جواز رکھتا ہے یا نہیں ،اگر ایسا کیا تو خدائے متعال کو اسے اپنے قہر کی آگ میں جلانے اور جہنم میں ڈالنے کا حق ہے۔

"یا اباذر ؛ من سرّہ ان یکون اکرم الناس فلیتق اللّٰہ عزوجل"

"اے ابوذر! جو بھی لوگوں میں اپنے آپ کو محترم ترین شخص کے طور پر دیکھنا چاہے اسے تقوائے الٰہی اختیار کرنا چاہئے۔"

"یا اباذر! انّ احبکم الی اللّٰہ جل ثناؤہ اکثرکم ذکرا لہ و اکرمکم عند اللّٰہ اتقاکم لہ و انجاکم من عذاب اللّٰہ اشدکم لہ خوفا"

"اے ابوذر؛ تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو بیشتر اس کی یاد میں ہو اور تم میں سے خدا کے نزدیک عزیز ترین وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو اور خدا کے عذاب سے دور ترین وہ شخص ہے جو اس سے زیادہ ڈرے"

(جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے اشارہ کیا ہے کہ خوف خدا تقوی کے مقدمات میں سے ہے اور جب تک یہ خوف نہ ہو تقوی حاصل نہیں ہوتا ہے)

"یا اباذر: ان المتقین الذین یتقون من الشیء الذی لایتقی منه خوفا من الدخول فی الشبهة"

"اے ابوذر! پرہیز گار وہ لوگ ہیں جو ان چیزوں سے بھی اجتناب کرتے ہیں جن سے پرہیز نہیں کیا جاتا ہے، تاکہ شبہ سے دوچار نہ ہوں۔"

کہا گیا ہے کہ تقوی کے کچھ مراتب ہیں اور بعض لوگ صرف ان چیزوں سے دوری اختیار کرتے ہیں جو قطعا حرام ہیں اور بعض لوگ اس مرحلہ سے بالاتر قدم بڑھا کر حتی مشکوک چیزوں سے بھی پرہیز کرتے

ہیں اور بعض لوگ اس مقام پر پہنچے ہیں کہ جس چیز کے بارے میں جانتے ہیں کہ وہ مباح ہے اس سے بھی پرہیز کرتے ہیں تا کہ مشکوک چیزوں میں مبتلا نہ ہوں۔ اس کے بعد پیغمبر اسلام تقوی کے عالی ترین مرحلہ اور خدا کی اطاعت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"یا اباذر: من اطاع اللّٰہ عزوجل فقد ذکر اللّٰہ و ان قلت صلاتہ وصیامہ و تلاوتہ للقرآن"

''اے ابوذر؛ جس نے خدائے متعال کی اطاعت کی اس نے اس کو یاد کیا ہے اگر چہ اس کے روزہ ونماز کم ہوں اور قرآن مجید کی تلاوت کم کی ہے۔''

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان میں زہد وتقویٰ:

اس کے بعد آنحضرتؐ زہد کے بارے میں فرماتے ہیں:

"یا اباذر؛ اصل الدین الورع و راسہ الطاعۃ. یا اباذر؛ کم ورعا تکن اعبد الناس و خیر دینکم الورع"

''اے ابوذر! دین کی جڑ زہد اور گناہ وشبہات سے دوری اختیار کرنا ہے اور اس کی اصل خدا کی اطاعت ہے۔ اے ابوذر! اپنے نفس کو گناہوں سے بچانا تا کہ تم لوگوں میں عابد ترین شخص بن جاؤ اور تمھارے دین کا بہترین حصہ پارسائی ہے۔''

بنیادی طور پر ورع نفس کو محرمات سے روکنے اور اس سے دوری اختیار کرنے کے معنی میں ہے، اس کے بعد یہ لفظ مطلق طور پر نفس کو روکنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس کا مفہوم تقوی مفہوم سے کے بہت قریب ہے۔ لیکن غالبا ورع کو پرہیز گاری کے ملکہ (جو ایک اندورنی حالت ہے) میں استعمال کرتے ہیں اور تقوی کا مقدمات عمل، خود اچھے عمل نیز داخلی ملکہ پر اطلاق ہوتا ہے.

حضرت علی علیہ السلام انسان کو گناہ اور انحراف سے روکنے کے سلسلہ میں ورع کے نقش کے بارے میں فرماتے ہیں:

"لاشرف اعلی من الاسلام و لا عزّاعزّ من التقوی و لا معقل احسن من الورع"

''اسلام سے بالاتر کوئی عظمت و بزرگی نہیں ہے، پرہیز گاری سے بالاتر کوئی عزت واحترام نہیں ہے اور ورع و پارسائی (گناہ اور شبہات سے دوری) سے بڑھ کر کوئی مستحکم ترین پناہ گاہ نہیں ہے۔'' [۱]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''اتقوا اللّٰہ و صونوا دینکم بالورع''

''الٰہی تقوی کو اپنا لائحہ عمل پیشہ قرار دو اور پارسائی سے اپنے دین کا تحفظ کرو'' [۲]

سعادت اور بلند معنوی درجات تک پہنچنے اور ہلاکت کے بھنور میں گر کر غرق ہونے سے بچنے کے لئے سب سے بڑا ذریعہ پارسائی اور اپنے آپ کو حرام سے بچانا ہے۔ حقیقت میں ورع اور گناہوں سے اپنے کو محفوظ رکھنا خدا کی بندگی اور اس کی عبادت کا سخت ترین مرحلہ ہے۔ اس لئے امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

''ان اشد العبادة الورع''

''ورع مشکل ترین عبادت ہے۔'' [۳]

عبادت کی سلامتی میں ورع کے رول پیش نظر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''... لاخیر فی نسک لاورع فیه'' [۴]

''جو عبادت ورع کے ساتھ نہ ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

عبادت کے ساتھ ورع کی ضرورت کے پیش نظر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مزید فرماتے ہیں:

''یا اباذر! فضل العلم خیر من فضل العبادة و اعلم انکم لو صلیتم حتی تکونوا کالحنایا و صمتم حتی تکونوا کالاوتار ما ینفعکم الا بورع''

۱۔ نہج البلاغہ (فیض الاسلام) حکمت ۳۶۳/ ص ۱۲۶۱

۲۔ بحار الانوار، ج ۷۰، ص ۲۹۷

۳۔ بحار الانوار، ج ۷۰، ص ۲۹۷

۴۔ بحار الانوار، ج ۷۰، ص ۳۰۷

''اے ابوذر! علم کی فضیلت عبادت کی فضیلت سے زیادہ ہے اور جان لو اگر اس قدر نماز پڑھو کہ کمان کے مانند خم ہو جاؤ اور اس قدر روزہ رکھو کہ تیر کے مانند دبلے پتلے ہو جاؤ اگر ورع نہ ہو تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

مزید فرماتے ہیں:

''یا باذر؛ اهل الورع و الزهد فی الدنیا هم اولیا اللّٰه حقا''

''جو دنیا میں اہل ورع وزہد ہیں حقیقت میں وہ اولیائے الٰہی ہیں۔''

''زہد'' اور ''زھادہ'' لغت میں دنیا سے دلچسپی، میل ورغبت کے مقابلہ میں بی رغبتی کے معنی میں ہے۔ یعنی انسان دنیا سے رغبت اور شغف نہ رکھے اور صرف سادہ زندگی پر قناعت کرے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اسلام میں مطلوب زہد، یہ ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کو بہتر صورت میں نبھانے کے لئے، سادگی اور تجمل گرائی سے پرہیز کو اپنا شیوہ قرار دے اور زرق وبرق والی ظاہری زندگی کی نسبت بے اعتنائی دکھائے۔ بدیہی ہے کہ رفتار کا یہ طریقہ دنیا اور اس کے مظاہر کو ناپاک جاننے، دنیا و آخرت میں موجود تضاد اور اجتماعی ذمہ داریوں سے فرار کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اسلام میں زہد ذمہ داریوں کو بہتر صورت میں انجام دینے اور وافراطی میلانات کو زندگی کی ظاہری کششوں سے بچانے کے لئے ہے زہد انسان کی زیادہ خواہی کی ذہنیت کو کنٹرول کرتا ہے اور دنیا کی زندگی کی ظاہری حالت کے مقابلہ میں خود فروشی کو ختم کر دیتا ہے۔ چنانچہ حافظ کہتے ہیں:

غلام همت آنم که زیر چرخ کبود ز هر چه رنگ تعلق پذیرد آزاداست

میں اس شخص وارادے کا غلام ہوں جو اس آسمان کے نیچے خدائے متعال کے علاوہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔

اس بنا پر اسلام میں زہد، مال واقتدار سے منافات نہیں رکھتا ہے اور حقیقت میں زاہد وہ ہے جو زندگی کے مظاہر کو خدا اور حقیقت سے زیادہ دوست نہیں رکھتا ہے اور الٰہی مقاصد کو دنیوی مقاصد پر قربان نہیں کرتا ہے اور آخرت کو بنیاد قرار دے کر دنیا کو فروع، وسیلہ اور مقدمہ کے عنوان سے جانتا ہے۔

مذکورہ مطالب کے پیش نظر زہد کا رہبانیت (جو عیسائیوں اور بدھ مذہب کے پیروؤں میں رائج ہے) سے فرق واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ رہبانیت ترک دنیا، ذمہ داریوں اور اجتماع سے فرار کے معنی میں ہے

اور اس قسم کی فکر اسلام کی روح سے موافقت نہیں رکھتی، اسلام کی نظر میں زندگی کے تمام مظاہر جیسے مال، فرزند اور ریاست وغیرہ سب ترقی و تکامل کے وسائل ہیں اور خدائے متعال کی تمام نعمتیں اور ان کا صحیح استعمال اور استفادہ میں تعادل کی رعایت، اس کے علاوہ انسان کی دنیا کے آباد ہونے کا سبب ہیں، آخرت کو آباد کرنے کا بھی سبب ہے۔ صحیح استفادہ اس معنی میں ہے کہ انسان دنیا اور اس کے مظاہر کو بنیاد اور اصل قرار دینے کا قائل نہ ہو اور انھیں کمال اور سعادت اخروی تک پہنچنے کے لئے خدا کی نعمتوں کا درجہ دے، چنانچہ فرمایا گیا ہے:

"الدنیا مزرعة الآخرہ" [1]

"دنیا آخرت کے کھیتی ہے۔"

اور خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿و ابتغ فیما اتک اللّٰہ الدار الآخرۃ و لا تنس نصیبک من الدّنیا...﴾

(قصص/۷۷)

"اور جو کچھ خدا نے دیا ہے اس سے آخرت کے گھر کا انتظام کرو اور دنیا میں اپنا حصہ بھول نہ جاؤ..."

اسلام کی نظر میں، جو کچھ دنیا میں موجود ہے وہ اچھا ہے، خدائے متعال نے کسی بری چیز کو خلق نہیں کیا ہے۔ اس لئے نہ دنیا اور اس کے مظاہر برے ہیں نہ ان سے دلچسپی اور وابستگی کہ جو طبیعی میلانات کے مطابق انسان کے اندر قرار دی گئی ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

"الزھادۃ فی الدنیا لیست بتحریم الحلال و لا اضاعۃ المال و لکن الزھادۃ فی الدنیا ان لا تکون بما فی یدیک اوثق منک بما فی ید اللّٰہ" [2]

"دنیا میں زہد اور دنیا کو اہمیت نہ دینا یہ نہیں ہے کہ حلال کو اپنے لئے حرام کرو گے یا اپنے مال کو ضائع کرو گے۔ زہد، یعنی جو کچھ تمھارے ہاتھ میں ہے اسے اس سے زیادہ اعتقاد نہ

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۳، ص ۱۴۸

۲۔ نہج الفصاحۃ، ص ۳۵۸/ حدیث ۱۷۱۲

رکھنا جو خدا کے پاس ہے۔"

نیز حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ایّها الناس الزّهادة قصر الأمل و الشكر عند النعم و الورع عند المحارم..."

"اے لوگ! زھد، اپنی آرزوں کو کم کرنا، نعمتوں کی شکرگزاری اور حرام سے پرہیز ہے۔"

مذکورہ بیانات کے علاوہ، قرآن مجید رہبانیت کی مذمت کرتا ہے اور اسے ایک ایسی بدعت جانتا ہے، جسے راہبوں نے دنیا و آخرت کے درمیان تضاد کی غلط فہمی کی بنیاد پر عیسائی مذہب میں رائج کیا ہے۔ قرآن مجید یہ فرمانے کے بعد کہ: "ہم نے عیسیٰ کو بھیجا اور انھیں انجیل عطا کی اور ان کی پیروی کرنے والوں کے دل میں مہربانی اور رحم قرار دیا" فرماتا ہے:

﴿...و رهبانية ابتدعوها ما كتبناها عليهم الا ابتغاء رضوان الله فما رعوها حق رعايتها﴾ (حدید/ ۲۷)

"اور جس رہبانیت کو انھوں نے از خود ایجاد کیا تھا اور اس سے رضائے خدا کے طلبگار تھے ہم نے ان کے اوپر فرض نہیں کیا تھا اور انہوں نے خود بھی اس کی مکمل پاسداری نہیں کی۔"

ایک دن عثمان بن مظعون کی بیوی شکوہ کرنے کے لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی: اے رسول اللہؐ عثمان بن مظعون دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات کو شب بیداری کرتا ہے (اپنی زندگی اور اہل وعیال کی فکر نہیں کرتا ہے) پیغمبر اسلامؐ یہ مطلب سننے کے بعد عثمان کے پاس تشریف لے گئے اور دیکھا کہ وہ نماز کی حالت میں ہے۔ جب عثمان نے پیغمبرؐ کو دیکھا تو اس نے نماز ختم کی۔ پیغمبرؐ نے اس سے کہا:

"يا عثمان! لم يرسلني الله بالرهبانية ولكن بعثني بالحنفية السهلة السمحة أصوم و أصلي و ألمس اهلي ...[1]"

"اے عثمان! خداوند متعال نے ہمیں تصوف کے دین پر اور ترک دنیا کے لئے مبعوث نہیں کیا ہے بلکہ ایک معتدل اور آسان دین پر مبعوث کیا ہے۔ میں روزہ رکھتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور اپنی بیوی سے

۱۔ بحار الانوار، ج ۲۲، ص ۲۶۴

مباشرت بھی کرتا ہوں۔''

شہید مدرس قشمہ ای کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ: ایک دن قشہ کا ایک معروف زمیندار مدرس کے پاس آیا اور زمین کا ایک حصہ انھیں دینا چاہا۔ مدرس، باوجود اس کے کہ انتہائی فقر وتنگدستی سے دوچار تھے، زمیندار سے کہا: کیا تمہارے خاندان میں کوئی فقیر ومحتاج نہیں ہے؟ اس شخص نے کہا: کیوں نہیں، ہیں لیکن میں زمین کے اس ٹکڑے کو آپ کو بخشنا چاہتا ہوں۔ مدرس نے فرمایا: بہتر ہے اس زمین کو اپنے کسی فقیر رشتہ دار کو بخش دو۔

اسی طرح نقل کیا گیا ہے: آیت اللہ مدرس، موسم گرما وسرما میں ٹاٹ کا بُنا ہوا ایک ہی قسم کا لباس پہنتے تھے اور فرماتے تھے: ہاتھ، پاؤں اور باقی بدن کی کھال چہرے کی کھال سے نازک تر نہیں ہے۔ بدن کی جس طرح عادت بناؤ گے، بدن عادی ہوتا ہے! وہ اونی موزہ، شلوار اور اونی کرتا، قبائے سرج اور عبائے نائینی نہیں پہنتے تھے اور فرماتے تھے: ان چیزوں کے لئے پیسا ہونا چاہئے اور پیسے غلامی لاتے ہیں اور مدرس غلام نہیں ہونا چاہتا ہے (شہادت کے وقت ان کی پوری ثروت چوبیس ۲۴ تومان تھے)

آیت اللہ شہید مدرس اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ میرے والد نے مجھ سے فرمایا: کہ دن رات میں صرف ایک وقت کے کھانے پر قناعت کرنے کی عادت ڈالو اور اپنے لباس کو صاف ستھرا رکھو تا کہ نئے کپڑے سلوانے کی فکر میں نہ رہو، وہ ہمارے اجداد کو نمونہ عمل قرار دیتے تھے اور فرماتے تھے: حلم وبردباری کو اپنے جد بزرگوار رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سیکھو، شہادت وقناعت کو اپنے جد پاک علی علیہ السلام سے اور ظلم وستم کے سامنے ہتھیار نہ ڈالنے کو اپنے جد سید الشہداء سلام اللہ علیہ سے سیکھ لینا۔ ؟!

۱۔ حسینی سید نعمت اللہ، مردان علم در میدان عمل، ص ۱۲۷۔۱۲۹

چھتیسواں درس

پیغمبر اسلامؐ کی نظر میں

بردباری، تواضع اور توکل

- ☐۔حلم و بردباری کا بلند مرتبہ و منزلت
- ☐۔حلم و بردباری، اولیائے الٰہی کے لئے زینت بخش
- ☐۔نرمی و تواضع اور چاپلوسی اور خوشامد کے درمیان فرق
- ☐۔مشرکوں کے مقابلہ میں پیغمبر اسلامؐ کا نرمی سے پیش نہ آنا
- ☐۔توکل کی عظمت و منزلت
- ☐۔توکل اور مادی و معنوی اسباب و عوامل سے استفادہ
- ☐۔تقوی اور توکل کے درمیان رابطہ

پیغمبر اسلامؐ کی نظر میں

بردباری، تواضع اور توکل

"یا اباذر؛ من لم یأت یوم القیامة بثلاث فقد خسر. قلت: و ما الثلاث؟ فداک ابی و امی. قال: ورع یحجزه عما حرّم اللّٰه عزوجل علیه، و حلم یرد به جهل السفیه، و خُلُق یداری به الناس.

یا اباذر؛ ان سَرَّک ان تکون اقوی الناس فتوکل علی اللّٰه، و ان سَرَّک ان تکون اکرم الناس فاتق اللّٰه، و ان سَرَّک ان تکون اغنی الناس فکن بما فی ید اللّٰه عزوجل اوثق منک بما فی یدیک.

یا اباذر؛ لو ان الناس کلهم اخذوا بهذه الآیه لکفتهم: ﴿و من یتّق اللّٰه یجعل له مخرجا و یرزقه من حیث لا یحتسب و من یتوکل علی اللّٰه فهو حسبه ان اللّٰه بالغ امره قد جعل اللّٰه لکل شی ء قدرا﴾ [1]

جس موضوع پر گزشتہ درس میں بحث ہوئی اس کا محور تقوی اور ورع تھا، روایت کے اس حصہ میں بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ورع اور گناہ سے پرہیز کے علاوہ حلم، بردباری اور توکل کی عظمت کے بارے میں بھی بیان فرماتے ہیں:

۱۔ طلاق/۲۔۳

"یا اباذر! من لم یات یوم القیامة بثلاث فقد خسر. قلت: و ما الثلاث؟ فداک ابی و امی. قال: ورع یحجزه عما حرّم الله عزوجل علیه، و حلم یرد به جهل السفیه، و خلق یداری به الناس"

"اے ابوذر! جس کے ہمراہ قیامت کے دن تین چیزیں نہ ہوں وہ گھاٹے میں ہے ابوذر نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، وہ تین چیزیں کیا ہیں: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا:

۱۔ ورع، جو اسے حرام چیزوں سے بچائے۔

۲۔ حلم، جس کے ذریعہ بیوقوفوں کی نادانی سے مقابلہ کرے۔

۳۔ نیک اخلاق جس سے لوگوں کی خاطر تواضع کرے۔

سب سے پہلی چیز جو اگر انسان میں نہ ہو تو قیامت کے دن نقصان میں ہے، وہ ورع ہے۔

گزشتہ درس میں ہم نے کہا کہ عام طور پر ورع تقوی کے ملکہ کو کہتے ہیں اور خود گناہ سے پرہیز کو ورع نہیں کہتے ہیں۔ حدیث کے اس حصہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعبیر، اس تفسیر کی تائید کرتی ہے جو واضح طور پر بیان کرتی ہے کہ ورع وہ ملکہ نفسانی ہے جو انسان کو گناہ سے روکنے کا سبب ہے، اس بنا پر ورع کی خاصیت انسان کو گناہ سے روکنا ہے۔ فطری بات ہے کہ جس انسان میں اس قسم کی خصوصیت نہ ہو تو وہ گناہ میں ملوث ہوتا ہے اور نتیجہ کے طور پر نقصان اٹھاتا ہے اور جہنم سے دوچار ہوتا ہے۔

حلم و بردباری کا بلند مرتبہ و منزلت:

دوسری خصوصیت جو انسان کو قیامت کے دن نقصان سے بچاتی ہے، حلم و بردباری ہے۔ لغت میں آیا ہے کہ حلم، نفس کو قوہ غضبیہ کے بھڑکنے سے روکنے کے معنی میں ہے۔ بیشک حلم پسندیدہ اور قابل قدر صفات میں سے ہے، اور عقل کا سپاہی شمار ہوتا ہے، کیونکہ غضب حلم کے مقابلہ میں قرار پاپا جہل کا سپاہی شمار ہوتا ہے۔ معروف ہے کہ انسان کو چاہئے غصہ کی حالت میں نہ کوئی فیصلہ کرے، نہ کسی کو تنبیہ کرے اور نہ کوئی اقدام کرے کہ بعد میں پشیمان ہو، کیونکہ یہ تینوں چیزیں غصہ کی حالت میں عقل کے کنٹرول سے خارج ہوتی ہیں اس لئے اس حالت میں انسان کی عقل صحیح کام نہیں کرتی ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن نادانی

کی وجہ سے قنبر کی بے احترامی کی گئی اور وہ بے چین ہوئے اور جواب دینا چاہتے تھے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

"مهلا يا قنبر، دع شاتمک مهاناً ترضی الرحمن و تسخط الشيطان و تعاقب عدوک فوالذی فلق الحبة و برء النسمة ماارضی المؤمن ربه بمثل الحلم و لا أسخط الشيطان بمثل الصمت و لا عوقب الاحمق بمثل السكوت عنه" [1]

''ٹھیرو اے قنبر! گالی دینے والے سے اعتنائی کرو اور اس کو اسی کی حالت پر چھوڑ دو تا کہ خدائے متعال کو خوش کرو اور شیطان کو غضبناک اور دشمن کو سزا دو (کیونکہ دشمن کی اس سے بڑھ کر کوئی سزا نہیں ہے کہ اس کا اعتنا نہ کیا جائے) قسم اس خدا کی جو دانہ کو شگافتہ کرنے والا اور انسان کو پیدا کرنے والا ہے، مومن حلم و بردباری سے زیادہ کسی اور چیز سے خدا کو راضی نہیں کرتا ہے، غصہ کو ضبط کرنے سے زیادہ کسی اور چیز سے شیطان کو ناراض نہیں کرتا اور احمق کے مقابلہ میں خاموشی اختیار کرنے سے زیادہ اسے کسی اور چیز سے سزا نہیں دیتا ہے۔''

حضرت علی علیہ السلام ایک دوسری جگہ پر فرماتے ہیں:

"لاشرف كالعلم و لا عز كالحلم" [2]

''علم کے برابر کوئی عظمت و بزرگی نہیں ہے اور بردباری کے برابر کوئی احترام نہیں ہے۔''

حلم و بردباری کی صفت کی عظمت اور صحیح اجتماعی روابط کے تحفظ اور انسانوں کے متقابل احترام کی حفاظت میں اس کے اہم نقش کے پیش نظر ضروری ہے کہ معاشرے کا فرد فرد اس صفت سے مزین ہو، خاص کر علما جو اصلاح اور تربیت کا کام انجام دیتے ہیں. جو عالم ہدایت اور اصلاح کرنے والا ہوتا ہے، اگر ناشائستہ رفتار کے مقابلہ میں وہ بھی جواباً ویسا ہی کردار پیش کرے تو اس کے اصلاحی پروگرام بے اثر اور ناکام ہو جائیگا۔ اس لحاظ سے اسے ہمیشہ اپنے علم کو حلم و بردباری سے منسلک کرنا چاہئے تا کہ مطلوبہ نتیجہ کو حاصل

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۱، ص ۴۲۴

۲۔ نہج البلاغہ (فیض الاسلام) حکمت ۱۰۹، ص ۱۱۳۹

کر سکے۔لہذا انسان کو حقائق بیان کرنے اور ان کے تبلیغ میں صابر اور با حوصلہ ہونا چاہئے۔اس نکتہ کے پیش نظر علم و تربیت کا نتیجہ حلم و بردباری کے بغیر ممکن نہیں ہے۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"والذی نفسی بیده ما جمع شی ء الی شی ء افضل من حلم الی علم"[1]

"اس پروردگار کی قسم جس کی اختیار میں میری جان ہے، حلم کو علم کے ساتھ ملحق ہونے کے مانند کوئی چیز اس سے بہتر صورت میں دوسری چیز کے ساتھ ملحق نہیں ہوئی ہے"

جی ہاں علم کے بعد بلند ترین کمالات نفسانی میں حلم و بردباری ہے، جیسا کہ ہم نے کہا کہ علم کا حلم کے بغیر کوئی فائدہ نہیں ہے۔اس لحاظ سے جب کبھی علم کی ستائش ہوتی ہے، حلم کا بھی اس کے ساتھ ذکر ہوتا ہے، حقیقت میں علم و حلم دو قابل قدر اور لازم و ملزوم عناصر کیحیثیت سے ذکر ہوتے ہیں۔لہذا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"اللهم اغننی بالعلم و زیّنی بالحلم" [2]

"پروردگارا! مجھے علم کے سبب بے نیاز اور علم سے زینت عطا کر"

یقیناً جو انسان علم و حلم کو اپنی زینت قرار دے، بحرانی مراحل میں جب کینہ و عداوت کی آگ کسی کے داخل سے شعلہ ور ہوتی ہے، تو اس وقت وہ رحم و محبت کے بہترین شیوہ کو اپناتا ہے اور اس کا حلم کینہ کی آگ کو شعلہ ور ہونے سے روکتا ہے اور اختیار کی باگ ڈور نفسانی خواہشات کے ہاتھ میں نہیں دیتا، بلکہ اسے اپنے نفسانی خواہشات کو کنٹرول کرنے اور اپنی اور دوسروں کے غضب کی آگ کو بجھانے پر مجبور کرتا ہے۔ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ اور آپؐ کے اصحاب کے خلاف مشرکین کی طرف سے پہنچائی گئی انواع و اقسام کی اذیت و آزار کے باوجود، فتح مکہ کے وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انتہائی بردباری کا مظاہرہ فرمایا اور عفو، بخشش اور رحم دلی کو اپنی سرمشق قرار دیا۔اس وقت دشمن یہ توقع رکھتے تھے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خون کی ہولی کھیلیں گے حتی بعض اسلامی کمانڈر جو انتقام لینے کی فکر میں تھے، ابوسفیان سے مخاطب ہو کر کہنے لگے:

"الیوم یوم الملحمة"

۱۔ بحار الانوار، ج ۲، ص ۴۶

۲۔ بحار الانوار، ج ۹۷، ص ۳۶۸

''آج کا دن سخت جنگ اور انتقام کا دن ہے''

لیکن پیغمبر اسلامؐ نے انتقامی اشعار کے جواب میں یہ محبت آمیز اشعار فرمائے:

''الیوم یوم المرحمة الیوم اعزّ الله قریشا'' [۱]

آج، رحمت اور نیک برتاؤ کا دن ہے، آج کے دن خدا نے قریش کو عزت بخشی ہے۔

بیشک انسان اپنی زندگی میں دوسروں سے روابط برقرار کرنے کے لئے مجبور ہے۔ خدائے متعال نے اس کو ایسے خلق کیا ہے کہ اسے اجتماعی زندگی کو قبول کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے، اگر وہ معاشرے سے دور تنہائی میں زندگی گزارنا چاہے تو اس کو دنیا کی اکثر برکتوں سے محروم ہونا پڑے گا اور وہ تکامل و ترقی کی راہ میں قدم نہیں بڑھا سکے گا، شاید وہ اپنی زندگی کو بھی جاری نہیں رکھ سکے گا۔ لہذا وہ زندگی کو جاری رکھنے اور تکامل و ترقی کے لئے مجبور ہے، تاکہ اجتماعی زندگی اور دوسروں کے ساتھ روابط کو قبول کرے۔ دوسری طرف سے لوگ جذبات، اخلاق اور فہم و معرفت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے فراوان تفاوت رکھتے ہیں اور اس لئے انسان خواہ مخواہ ایسے افراد سے سروکار پیدا کرتا ہے جو بیوقوفانہ عادات رکھتے ہیں۔ کبھی وہ ایسے افراد سے رابطہ پیدا کرتا ہے کہ ان کی غیر عاقلانہ عادات اور برتاؤ کی وجہ سے اس کی توہین اور بے احترامی ہوتی ہے۔

کمال و معرفت انسانی کے لحاظ سے تمام انسان کمال کی حد تک نہیں پہنچے ہیں اور ایسی عقل نہیں رکھتے ہیں کہ انھیں شائستہ اور مودبانہ برتاؤ کرنے پر مجبور کرے۔ اس لحاظ سے کبھی جس شخص سے انسان رابطہ برقرار کرتا ہے یا ایک انسان اپنے اہل کار کار یا کسی مسئول سے کہ جس کے پاس لوگ مراجعت کرتے ہیں، اصلاح کے فقدان، معرفت کی کمی یا زندگی کی مشکلات اور دباؤ کی وجہ سے معاندانہ برتاؤ کا مظاہرہ کرتا ہے اور آداب اور دوسروں کے احترام کی رعایت نہیں کرتا تو فطری بات ہے کہ اگر انسان ایسے افراد کے مقابلہ میں ان کا ہی جیسا برتاؤ کرے اور فوری طور پر غضبناک ہو کر لڑائی اور جھگڑے کے لئے آمادہ ہو جائے، تو اختلاف اور ٹکراؤ میں شدت پیدا ہوگی اور اس کے بُرے نتائج نکلیں گے۔ اس طرح انسان کا وقت ضائع ہوگا، آرام و خوشحالی اس سے چھن جائے گی۔ اور وہ اپنی زندگی کی آرزوں تک نہیں پہونچ پائیگا۔ پس انسان کو اجتماعی زندگی سے مناسب طور پر بہرہ مند ہونے اور اس کی آفتوں سے بچنے کے لئے اپنے اندر حلم و بردباری ایجاد کرنی چاہئے تاکہ ایسے افراد سے روبرو ہوتے وقت اپنے آپ کو کنٹرول کر سکے۔

۱۔ بحار الانوار، ج ۲۱، ص ۱۰۹

انسان کو اپنے آپ کو گناہ سے بچانے کے لئے صاحب ورع ہونے کے علاوہ بردبار بھی ہونا چاہئے تاکہ اپنی اجتماعی زندگی سے بہرہ مند ہو اور نقصان سے دوچار نہ ہو۔ چونکہ اگر انسان اجتماع سے دور ہوتا ہے تو اس کے منافع سے محروم ہو جاتا ہے، لیکن اگر اجتماعی منافع سے اپنی اخروی زندگی کے لئے استفادہ کرنا چاہے اور کم عقل اور جھگڑالو انسانوں سے محفوظ رہنا چاہے تو ان سے ٹکراؤ کی حالت پیدا نہ ہونے کے لئے بردبار ہونا چاہئے۔ اسے بردباری کی مشق کرنی چاہئے، تاکہ حقارت اور توہین آمیز حالت کے مقابلہ میں ان سے مظاہرہ کرے اور اپنے فرائض پر عمل کر سکے اور اجتماع سے فائدہ اٹھائے اور ناشائستہ برتاؤ اس کے تکامل و ترقی میں رکاوٹ نہ بنے اور روایت کی تعبیر میں وہ ''ایک ایسے حلم کا مالک ہو کہ جہل و نادانی کو اپنے آپ سے دور کر سکے۔''

ہمارے تصور کے خلاف کہ ہم جہل کو عدم علم سے تعبیر کرتے ہیں اور اسے صرف علم کے مقابلہ میں استعمال میں لاتے ہیں، جہل بیوقوفی کے معنی میں بھی ہے اور سفاہت و حماقت کے مانند عقل کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی بنا پر جہل، جاہلانہ اور احمقانہ برتاؤ کا مظاہرہ کرنے کے معنی میں بھی ہے اور قرآن مجید کی اکثر آیات میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، مثلاً خدائے متعال حضرت یوسف علیہ السلام کی زبانی نقل کرتا ہے:

﴿والا تصرف عنّی کیدھن أصبُ الیھن وأکن من الجاھلین﴾ (یوسف/۳۳)

''اور اگر تم ان کے مکر کو میری طرف سے نہیں موڑ دو گے تو میں ان کی طرف مائل ہو سکتا ہوں اور میرا شمار بھی جاہلوں میں ہو سکتا ہے۔''

مقصود یہ ہے کہ اگر عورتوں کے حیلہ کو مجھ سے دور نہ کرو گے تو مجھ سے احمقانہ اور غیر دانشمندانہ کام سرزد ہوگا۔ ایسی آیتوں میں عدم علم کو جہل سے معنی کرنا غلط ہے دوسری طرف سے علم کا فقدان اکثر مواقع پر عذر ہے، حالانکہ یہ کلمہ بیشتر سرزنش و عدم عذر کے مقام پر آیا ہے، چنانچہ خدائے متعال یوسف کے بھائیوں کی سرزنش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿ھل علمتم ما فعلتم بیوسف و اخیہ اذ انتم جاھلون﴾ (یوسف/۸۹)

''معلوم ہے کہ تم نے یوسف اور ان کے بھائی کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے جب کہ تم بالکل جاہل تھے؟''

یقیناً یوسفؑ کے بھائی اپنے کام اور عمل سے بے خبر نہیں تھے، وہ یوسفؑ کو پہچانتے تھے اور جانتے تھے کہ ان کا یہ فعل ناشائستہ ہے اسی حالت میں جاہل بھی تھے کہ ان کا کام جاہلانہ یعنی خلاف عقل وحق تھا۔

اسی طرح جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے لوگوں سے کہا کہ خدائے متعال نے تمھیں حکم دیا ہے کہ ایک گائے کو ذبح کرنا، انہوں نے اسے کہا: کیا ہمارا مذاق اڑاتے ہو؟ فرمایا:

﴿...اعوذ باللّٰہ ان اکون من الجاھلین﴾ (بقرہ/۶۷)

''...پناہ بخدا کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں''

اس آیت میں جہل سفاہت کے معنی میں ہے نہ علم کے فقدان کے معنی میں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام عدم علم کے لئے خدا سے پناہ نہیں مانگتے ہیں بلکہ بے عقلی و بیوقوفی، جاہلانہ، اور خلاف عقل رفتار سے پناہ مانگتے ہیں۔ اصول کافی میں ایک کتاب ''علم'' کے نام سے مخصوص ہے اور ایک دوسری کتاب ''عقل و جہل'' کے نام سے ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ اس کتاب میں جہل عقل کے مقابلہ میں ہے نہ علم کے مقابلہ میں اور جیسا کہ ہم نے کہا: غالبا جہل و جہالت نادانی اور احمقانہ رفتار کو کہا جاتا ہے اور عقل کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے نہ علم کے مقابلہ میں۔

حلم و بردباری، اولیائے الٰہی کے لئے زینت بخش:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی نصیحتوں میں اس نکتہ کی طرف تاکید فرماتے ہیں کہ انسان اپنی زندگی میں کبھی مجبوراً کم عقل اور کم شعور افراد سے روبرو ہوتا ہے کہ وہ غیر عاقلانہ اور جاہلانہ رفتار رکھتے ہیں، بہترین رفتار جو ان کے ساتھ روا رکھ سکتا ہے، ان کی بے ادبی کو برداشت کرنا اور بردباری کا مظاہرہ کرنا ہے کہ اس صورت میں اجتماعی منافع سے بھی بہرہ مند ہوتا ہے اور نادانوں اور بے عقلوں سے ٹکراؤ پیش آنے سے بھی بچ جاتا ہے اور ان کی دشمنی سے نجات پاتا ہے اور اس طرح خدا کی نظر میں محبوب قرار پاتا ہے:

''قال رسول اللّٰہ، صلی اللّٰہ علیہ و آلہ و سلم، ان اللّٰہ یحب الحی الحلیم العفیف المتعفف'' [1]

خدائے تعالے باحیا، بردبار، پاک دامن اور عالی ظرف شخص کو دوست رکھتا ہے۔

۱۔ اصول کافی، ج ۳، ص ۱۷۴

قرآن مجید نادان دشمنوں سے مبارزہ کے بارے میں یوں بیان فرماتا ہے:

﴿ولا تستوی الحسنة و لا السیئة ادفع بالتی هی احسن فاذاالذی بینک و بینه عداوة کانه ولی حمیم. و ما یلقّیها الا الذین صبروا و ما یلقّیها الا ذو حظّ عظیم و اما ینزغنّک من الشیطان نزغ فاستعذ باللّٰه انه هو السمیع العلیم﴾ (فصلت/۳۴.۳۶)

''نیکی اور برائی برابر نہیں ہوسکتی، لہذا تم برائی کا جواب بہترین طریقہ سے دو کہ اس طرح وہ شخص جو تمہارا دشمن ہے وہ بھی ایسا ہوجائے گا جیسے ایک گہرا دوست ہوتا ہے۔ اور یہ صلاحیت انھیں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کرنے والے ہوتے ہیں اور یہ بات انھیں کو حاصل ہوتی ہے جو بڑی قسمت والے ہوتے ہیں۔ اور جب تم میں شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پیدا ہو تو اللہ کی پناہ طلب کرو کہ وہ سب کی سننے والا اور سب کو جاننے والا ہے''

قرآن مجید سرکشوں اور بیوقوفوں کے بارے میں جو شیوہ بیان کرتا ہے وہ ظریف ترین، اور اہمیت ترین تربیتی روش ہے۔ کیونکہ جو بھی برائی کرتا ہے، وہ مقابلہ بہ مثل کے قانون کے تحت یہی امید رکھتا ہے کہ مدمقابل بھی اس کے ساتھ یہی برتاؤ کرے گا، لیکن جب وہ توقع کے خلاف سالم اور تعمیری برتاؤ دیکھتا ہے تو بدل جاتا ہے اور اس کے اندر ایک طوفان پیدا ہوتا ہے اور ضمیر کے دباؤ کے اثر میں بیدار ہوتا ہے اور احساس کم تری سے دوچار ہوکر اپنی ناشائستہ روش کو تبدیل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد پاتے ہیں کہ فرمان الٰہی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت، اور بردباری کی صفت ان لوگوں کے جمع ہونے کا سبب بنی تھی:

﴿فبما رحمة من اللّٰه لنت لهم و لو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولک فاعف عنهم و استغفر لهم و شاورهم فی الامر...﴾(آل عمران/۱۵۹)

''پیغمبر! یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم تندخو اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے، لہذا اب انھیں معاف کردو۔ ان کے لئے استغفار کرو اور ان سے امر جنگ میں مشورہ کرو''

اس کے علاوہ خدائے متعال اپنے صالح بندوں کی منطقی رفتار کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿و عباد الرحمن الذین یمشون علی الارض هونا و اذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما﴾ (فرقان/۶۳)

''اور اللہ کے بندے وہی ہیں جو زمین پر آہستہ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے خطاب کرتے ہیں تو سلامتی کا پیغام دیتے ہیں۔''

نقل کیا گیا ہے کہ ایک دانا شخص کا دوست اس کے گھر تشریف لایا۔ دانا شخص نے اس کے سامنے کھانا پیش کیا، اس حکیم و دانا کی بداخلاق بیوی نے آ کر مہمان کے سامنے سے کھانا اٹھالیا اور حکیم کو برا بھلا کہا۔ وہ مہمان رنجیدہ ہو کر اس کے گھر سے چلا گیا۔ حکیم اس کے پیچھے پیچھے دوڑا اور جب اس کے نزدیک پہنچا تو اس سے کہا: کیا وہ دن آپ کو یاد ہے جب ہم آپ کے گھر میں مہمان تھے اور کھانا کھاتے وقت ایک مرغی پرواز کر کے ہمارے دسترخوان پر آ پڑی اور سارا کھانا خراب کر دیا اور ہم میں سے کوئی بھی رنجیدہ نہیں ہوا؟ اس وقت آپ تصور کریں کہ میری بداخلاق بیوی اسی مرغی کے مانند ہے! یہ بات سن کر اس شخص کا غصہ سرد ہوا اور کہا: دانا نے سچ کہا ہے کہ حلم و بردباری تمام دردوں کی دوا ہے۔

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی زندگی کے حالات میں ذکر ہوا ہے کہ ایک روز ایک شامی شخص نے جو بنی امیہ کے پروپگنڈا کے اثر میں اہل بیت علیہم السلام کا بغض دل میں رکھے ہوئے تھا مدینہ کے ایک کوچہ میں حضرتؑ سے ملاقات کی اور فی الفور حضرتؑ کے خلاف برا بھلا کہنا اور گالیاں دینا شروع کر دیا۔ حضرتؑ نے بردباری اور خاموشی کے بعد فرمایا: مجھے لگتا ہے تم اس شہر میں اجنبی ہو اور تم مغالطہ اور غلط فہمی سے دوچار ہوئے ہو۔ اگر گھر نہیں رکھتے ہو تو میرا گھر حاضر ہے۔ اگر مقروض ہو تو میں تمہارے قرض کو اپنے ذمہ لیتا ہوں اور اسے میں ادا کروں گا۔ اگر بھوکے ہو تو تجھے سیر ہونے تک کھانا کھلاؤں گا۔ حضرتؑ کا برتاؤ اس شخص کے لئے خلاف توقع تھا اور اس رفتار نے اس کے دل میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور حضرتؑ سے اتنا متاثر ہوا کہ کہا: اے فرزند رسول! اگر اس سے پہلے مجھ سے سوال کیا جاتا کہ روئے زمین پر کون بدترین انسان ہے تو جواب میں آپ کو اور آپ کے باپ کو بیان کرتا لیکن اب آپ کو بہترین انسان کی حیثیت سے جانتا ہوں۔

خواجہ نصیر الدین طوسی کے حالات میں کہا گیا ہے: ایک شخص خواجہ کے پاس آیا اور ایک تحریر انھیں دی کہ لکھنے والے نے اس میں خواجہ کو برا بھلا لکھا تھا، اس میں گالیاں لکھی تھیں اور اسے کلب بن کلب (کتا او

رکھتے کا بیٹا) کہا تھا: خواجہ نے اس کی اس نفرت بھری کے مقابلہ میں محبت آمیز زبان میں یوں جواب دیا: یہ جو مجھے کتا کہا گیا ہے صحیح نہیں ہے، کیونکہ کتا ان جانوروں میں ہے جو ''عوں عوں'' کرتا ہے اور اس کی کھال بال (روئیں) سے بھری ہوئی ہے اور اس کے ناخن لمبے ہوتے ہیں اور مجھ میں ان خصوصیات میں سے کوئی بھی خصوصیت موجود نہیں ہے: میرا قد بلند ہے، میرے بدن پر بال (روئیں) نہیں ہیں اور میرے ناخن لمبے نہیں ہیں، باتیں کرتا اور ہنستا ہوں اور جو خصوصیات مجھ میں ہیں وہ کتے میں نہیں ہیں۔ جو کچھ مجھ میں ہے وہ اس لکھنے والے کے دعوی کی تصدیق نہیں کرتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام حلم کے اجتماعی فوائد میں سے ایک یعنی حلم و بردباری کے بارے میں فرماتے ہیں:

''اول عوض الحلیم من حلمه ان الناس انصاره علی الجاهل'' [1]

''بردبار کی بردباری کا سب سے پہلا فائدہ یہ ہے کہ جاہل و نادان کے مقابلہ میں لوگ اس کے حامی اور مددگار بن جاتے ہیں۔''

سعدی کہتے ہیں:

از صدف یاد گیر نکتہ حلم آنکہ بر دسرت گہر بخشش

(نکتہ حلم کو صدف سے سیکھنا۔ جب اسے کاٹا جاتا ہے تو موتی بخشتا ہے)

نرمی و تواضع اور چاپلوسی اور خوشامد کے درمیان فرق:

تیسری خصوصیت، جس کی طرف توجہ کرنا انسان کو قیامت کے نقصان سے بچاتا ہے، لوگوں سے نرمی اور مہربانی سے پیش آنا ہے۔ ''مدارات'' معنی کے لحاظ سے ''نرمی'' کے نزدیک ہے، کیونکہ ''مدارات'' بہ معنی، نرمی، رفتار میں ملائمت، لوگوں کے ساتھ حسن معاشرت اور ان کی آزار رسانی اور اذیت برداشت کرنے کے معنی میں ہے۔ ''مدارات'' کی ستائش اور اس کے دنیوی اور اخروی فائدوں کے بارے میں فراوان روایتیں نقل ہوئی ہیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

۱۔ نہج البلاغہ (فیض الاسلام) حکمت ۱۹۷، ص ۱۱۷۹

"المداراۃ نصف الایمان"

''لوگوں کے ساتھ مدارات کرنا نصف ایمان ہے''

مزید فرمایا:

"ثلاث من لم یکن فیه لم یتم له عمل: ورع یحجزه عن معاصی اللّٰه و خلق یداری به الناس و حلم یرد به جهل الجاهل"

''تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر کسی میں نہ ہوں تو ان کا کام مکمل نہیں ہے: گناہ سے بچانے والا ورع، لوگوں کے ساتھ مدارات کرنے والا اخلاق، اور بے عقلوں کی بیوقوفی کو دور کرنے والا حلم'' [۱]

ایک اور جگہ پر لوگوں کے ساتھ مدارات کو واجب اور تکالیف کی فہرست میں قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

"انا معاشر الانبیاء امرنا بمدارات الناس کما امرنا باداء الفرائض" [۲]

''ہم انبیاء لوگوں کے ساتھ مدارات کرنے کے لئے مامور ہوئے ہیں جس طرح واجبات اور تکالیف کے لئے مامور ہوئے ہیں''

انسان برابر ایسے افراد سے روبرو ہوتا ہے جو اپنے خاص اغراض ومقاصد کے لئے ناشائستہ رفتار کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بعض اوقات حسد اور اور دیگر بری عادتیں انھیں دوسروں کے ساتھ معاشرت کے دوران ایسا برتاؤ کرنے پر مجبور کرتی ہیں، جن سے نقصان پہنچتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ان افراد کے ساتھ روبرو ہوتے وقت انسان کونسا رویہ اختیار کرے؟ اگر ایسے شخص کے مقابلہ میں کہ جو اس کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں یا اس کے حق میں کوتاہی یا بے ادبی سے پیش آتے ہیں ویسا ہی برتاؤ روا رکھا جائے تو ٹکراؤ اور جھگڑے کی نوبت آجائیگی اور بالکل ایسی مشکل سے دوچار ہونا پڑے گا کہ جیسا انسان کو احمقوں اور نادانوں کے ساتھ پیش آنا پڑتا ہے۔

ایسے مواقع پر جوابی کارروائی کو نظر انداز کرنا چاہئے اور مدارات کا شیوہ اختیار کرنا چاہئے۔ کوشش

۱۔ اصول کافی (باترجمہ) ج ۳، ص ۱۷۹

۲۔ بحار الانوار، ج ۷۵، ص ۵۳

کرنی چاہئے کہ عفو و گزشت اور چشم پوشی کی مشق سے ایسے افراد کے ساتھ مدارات سے پیش آئے اور ان کے مقابلہ میں جلدی کوئی ردعمل نہ دکھائے۔ بعض مواقع پر ایسے تغافل کا مظاہرہ کرے گویا متوجہ نہیں ہوا ہے کہ انھوں نے کیا کیا ہے اور کیا کہا ہے۔ بعض مواقع پر انسان کو دوسروں کے ناشائستہ برتاؤ کے مقابلہ میں چشم پوشی کرنی چاہئے باوجودیکہ اس کے حق میں دشمنی کی گئی ہے نہ صرف یہ کہ وہ دشمنی نہ کرے، بلکہ ان کی خدمت بھی کرے، اگر انسان اپنی زندگی میں اس قسم کی عادت واطوار کو اپنالے تو اس نے دوسروں کی خودغرضی اور آزار واذیت کے مقابلہ میں مدارات کا مظاہرہ کیا ہے، ایسا شخص منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اگر ہر اس شخص کے ساتھ کہ جس نے اس کے ساتھ دشمنی حق تلفی کی ہے، لڑنا چاہے تو، لڑنے جھگڑنے سے انسان کی توانائی بیہودہ امور میں صرف ہوتی ہے اور ایک جہت سے اس کا ذہن پریشان ہوتا ہے اور دوسرے وقت بھی ضائع ہوتا ہے نیز فرصت کے اوقات بھی ہاتھ سے چلے جاتے ہیں اور اس طرح رنجش اور کدورتوں کے علاوہ دشمنیاں بھی بڑھتی ہیں۔

پس ایسے افراد سے روبرو ہونے کی صورت میں بہترین طریقہ راہ مدارات ہے، کیونکہ دوسروں کے ساتھ مدارات ونرمی سے پیش آنا عاقلوں اور باشعور افراد کا شیوہ اور کامیابی کی کنجی ہے:

"علیک بالرفق فانه مفتاح الصواب و سجیّة اولی الالباب"[1]

"تمہاری لئے دوسروں کے ساتھ مدارات ونرمی سے پیش آنا لازم ہے، کیونکہ وہ دوستی کی کنجی اور عقلمندوں کی روش ہے۔"

جس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کبھی مدارات کا مداہنت سے مغالطہ ہوتا ہے، مداہنت مخالفین، حق اور انحراف کرنے والوں کے ساتھ ہماہنگی اور موافقت ہے، یعنی انسان حقائق کے بیان اور خدا کے دین کی تبلیغ وترویج میں سستی کرے اور اگر دوسروں کی طرف سے کسی انحراف کا مشاہدہ کرے تو کسی قسم کا اعتراض نہ کرے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ولعمری ما علیّ من قتال من خالف الحق و خابط الغی من ادهان و لا ایهان..."[2]

۱۔ غرر الحکم (ترجمہ محمد علی انصاری) ص ۴۷۹

۲۔ نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خطبہ ۲۴، ص ۸۷

''اپنی جان قسم، حق کے مخالفوں اور ضلالت و گمراہی میں قدم رکھنے والوں کے ساتھ تسامح و سستی نہیں برتوں گا''

ایک دوسری جگہ پر اپنے زمانے کے ان سست عناصر کی شکایت کرتے ہیں جو حق کی بات نہیں کہتے تھے اور آرام و آسائش کی راہ کو انتخاب کر چکے تھے اور فرماتے ہیں:

''و اعلموا رحمکم اللّٰہ، انکم فی زمان القائل فیہ بالحق قلیل و اللّسان عن الصدق کلیل و اللازم للحق ذلیل اھلہ معتکفون علی العصیان مصطلحون علی الادھان...''[1]

''خدا تمھیں بخش دے، جان لو کہ تم ایک ایسے زمانہ میں زندگیگزار رہے ہو کہ اس میں حق بولنے والے کم، سچ بولنے والی زبانیں کند اور حق کے طالب ذلیل ہیں۔ لوگ نافرمانی پر اتر آئے ہیں اور اپنے ہم یاروں اور ہمراہوں کے ساتھ مداہنت کرتے ہیں۔''

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرتؑ، حق کی مخالفت میں، قیام کرنے والوں کے ساتھ ہمدردی اور مداہنت کی سرزنش فرماتے ہیں اور مداہنت کو ایک پست، قابل مذمت، معاشرے کو تباہ کرنے اور اس کی عزت و آبرو کے ارکان کو منہدم کرنے والی خصلت جانتے ہیں۔ اس بنا پر مداہنت کو دشمنوں کے ساتھ مدارات، نرمی، اپنے حق اور شخصی منافع کے سلسلے میں اجتماعی مصلحتوں اور دین خدا کو احیاء اور زندہ کرنے کے پیش نظر عفو و بخشش کے معنی کے ساتھ مغالطہ نہیں کرنا چاہئے جو ایک شائستہ اور تعمیری خصلت ہے۔

معاشرے میں، ایسے ٹھنڈے مزاج کے انسان ہوتے ہیں جو اپنے بارے میں رونما ہونیوالی رودادوں کے بارے میں کسی قسم کا ردعمل نہیں دکھاتے اور لوگوں کی مشکلات، دینی اور ثقافتی مشکلات جو ان کے اپنے لئے یا دوسروں کے لئے پیش آتی ہیں، کے مقابلہ میں بے اعتنائی دکھاتے ہیں۔ اس قسم کے افراد جذبات اور احساسات سے عاری، سست، کاہل اور آرام طلب ہوتے ہیں اور ایک ایسی جگہ کی تلاش میں ہوتے ہیں جس کے ساتھ ٹیک لگا کر دنیا سے بے خبری اور خوشی کے عالم میں آرام میں ہوں۔ جب کبھی مبارزہ کا وقت آتا ہے اور جاں نثاری کا مظاہرہ کرنے کے لئے جہاد کے لئے اٹھنے کی باری آتی ہے تو یہ لوگ بھاگ جاتے ہیں اور اپنی جان بچاتے ہیں۔ فطری بات ہے کہ یہ لوگ اپنے کام کے لئے توجیہ پیش کرتے

۱۔ نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خطبہ ۲۲۴، ص ۷۲۹

ہیں، کیونکہ کوئی یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہے کہ میں بُرا انسان ہوں اور برا کام انجام دیتا ہوں بلکہ اپنی رفتار کی توجیہ کے لئے کوئی نہ کوئی ظاہری بہانا تراشتا ہے۔ عام طور پر ان لوگوں کی توجیہ یہ ہے کہ دشمنوں کے ساتھ مدارات کرنا ضروری ہے اور سخت گیری نہیں کرنی چاہئے، کیونکہ تند برتاؤ کا کوئی نتیجہ نہیں ہوتا اور کبھی اس شعر کا سہارا لیتے ہیں:

آسائش دو گیتی تفسیر این دو حرف است با دوستان مروت با دشمنان مدارا

(دو جہان کی آسائش ان دو کلموں کی تفسیر ہے، دوستوں سے مروت اور دشمنوں سے مدارات)

بعض اوقات ایسی احادیث کا سہارا لیتے ہیں جو دوسروں سے مدارت کو حاصل کرنے کے عامل کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔ اگر بنا یہ ہو کہ یہی ذہنیت اور طرز تفکر معاشرے میں پھیل جائے، تو کبھی جہاد و مبارزہ نہیں ہوگا اور کوئی تحریک محقق نہیں ہوگی اور جہاد کا راستہ بند ہو جائے گا. چنانچہ ہم نے کہا کہ، یہ نرمی او رسستی حق کے سلسلہ میں مداہنت ہے اور خود خواہ اور آرام طلب انسان ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے اسے اپنے لئے سند قرار دیتے ہیں اور اسے شرعی رنگ بھی دیتے ہیں تا کہ اجتماعی ذمہ داریوں اور دشمنوں سے جہاد کے فریضہ کے سلسلہ میں بہتر صورت میں پہلو تہی کریں اور دشمنوں سے نہ لڑیں۔ یہ شیوہ انتہائی ناپسند ہے اور اس کے ناشائستہ آثار او غلط رنتائج برآمد ہوتے ہیں۔ قرآن مجید اس کی واضح طور پر مذمت کرتا ہے۔

مشرکوں کے مقابلہ میں پیغمبرؐ کا نرمی سے پیش نہ آنا:

صدر اسلام میں کفار و مشرکین پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مکرر درخواست کر رہے تھے کہ آپ اپنے دین میں نرمی دکھائیں تا کہ وہ بھی اپنی رفتار میں نرمی دکھائیں، حقیقت میں وہ اس کوشش میں تھے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ کو کچھ امتیازات دیکر ان سے کچھ امتیازات حاصل کریں اور پیغمبر اسلامؐ کو اپنے مقابلہ میں نرمی اور انعطاف دکھانے پر مجبور کریں، وہ آپؐ سے چاہتے تھے کہ دوسرے دنیوی رہبروں کے مانند اپنے مقاصد کو نافذ کرنے کے بارے میں سخت گیری سے ہاتھ کھینچ لیں اور نرمی اور ہمدردی کا مظاہر کرتے ہوئے اپنے مخالفوں کے نزدیک آجائیں۔ خدائے متعال ان کی درخواست کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿ودّوا لو تدهن فيدهنون﴾ (قلم/۹)

''یہ چاہتے ہیں آپ ذرا نرم ہو جائیں تو یہ بھی نرم ہو جائیں''

یقیناً دشمن کے مقابلہ میں نرمی دکھانا اور احکام الٰہی کے نفاذ اور الٰہی اقدار کی ترویج، اور فساد سے مبارزہ میں پیچھے ہٹنا، مطلوب مدارات نہیں ہے بلکہ مداہنت ہے، اس لئے خدائے متعال نے اس کام کی سختی سے نہی کی ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چاہتا ہے کہ احکام الٰہی کے نفاذ میں سختی سے اقدام کریں:

﴿و ان احکم بینھم بما انزل اللّٰہ ولا تتّبع اھواء ھم واحذرھم ان یفتنوک عن بعض ما انزل اللّٰہ الیک فان تولوا فاعلم انما یرید اللّٰہ ان یصیبھم ببعض ذنوبھم...﴾ (مائدہ/ ۴۹)

''اور اے پیغمبر آپ ان کے درمیان تنزیل خدا کے مطابق حکم کریں اور ان کے خواہشات کا اتباع نہ کریں اور اس بات سے بچتے رہیں کہ یہ بعض احکام الٰہی سے منحرف کر دیں۔ پھر اگر یہ خود منحرف ہو جائیں تو یاد رکھیں کہ خدا ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے مصیبت میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔''

ہر قسم کا ساز باز اور نرمی، مدارات نہیں ہے، مدارات اس جگہ پر ہے جہاں اس کے پس منظر میں صحیح عقلائی غرض ہو کہ انسان اس عقلائی مقصد اور بالاتر مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے، لوگوں کی ایجاد کی ہوئی بعض مشکلات کو برداشت کرے۔ نہ یہ کہ انسان ہر کسی اور ہر رفتار کے مقابلہ میں ٹھنڈے مزاج سے ردعمل کا مظاہرہ نہ کرے اور مدارات کے نام پر دشمنوں کے ساتھ ساز باز کرے۔ ہمیں مدارات اور مداہنت میں فرق کرنا چاہئے اور جاننا چاہئے کہ اسلامی مقاصد اور دین کے مسائل میں عفو بخشش سے کام نہیں لینا چاہئے اور نرمی نہیں دکھانی چاہئے اور فکری اور رفتاری اصول کے بارے میں نرمی اور انعطاف دکھانا ایک ناپسندیدہ امر ہے، جب انسان کے لئے فریضہ الٰہی مشخص اور اس کے شرائط فراہم ہوں تو اسے قطعی طور پر انجام دینا چاہئے اور اس کو انجام دینے کی راہ میں مضبوط اور مستحکم ہونا چاہئے اور ہر قسم کی بے توجہی اور لاپروائی سے پرہیز کرنا چاہئے۔

یہ ذہنیت پسندیدہ نہیں ہے کہ انسان ہمیشہ نرمی دکھائے اور ہر ایک کے ساتھ ساز باز کرے، حتی الٰہی اہداف و مقاصد میں بھی ساز باز کرے۔ انسان کو زندگی کے آخری لمحہ تک الٰہی مقاصد کے نفاذ میں ڈٹ

جانا چاہئے اور استقامت دکھائے اور عفو و بخشش کا مظاہرہ نہ کرے۔ جب ہم دشمنوں کے لاؤڈ سپیکروں سے پروپیگنڈے کی گنگناہٹ سنتے ہیں، تو جو جملہ قابل توجہ ہے وہ اصول پرست کا عنوان ہے جو ہمیں دیا گیا ہے۔ البتہ ان کا اس عنوان کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری ملت کو کمزور کریں اور ہمارے چہروں کو انتہا پسند اور بے رحم کے عنوان سے پیش کریں۔ لیکن جب ہم اس عنوان پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک بہت مناسب اور بجالقب ہے، ہمیں اس کا استقبال کرنا چاہئے۔ جی ہاں! ہم اصول پرست ہیں اور ہمیشہ اپنے اصول کا تحفظ کرتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ ہمیں اپنے اصلی مقاصد اور ارمانوں سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہئے اور ان کے بارے میں سازباز نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ بعض اوقات ضروری ہے وقتی طور پر مصلحتی نرمی اور بخشش کا مظاہرہ کریں اور غیر اہم اور غیر حیاتی مسائل کے بارے میں قدرے عقب نشینی کریں لیکن بنیادی اصول پر کبھی سودا نہیں کرنی چاہئے۔

مکہ کے سخت دنوں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریش کے سخت دباؤ میں تھے اور آپؐ کے اصحاب پر مشرکوں اور بت پرستوں کی طرف سے جسمانی اذیت و آزار ڈھائے جاتے تھے، یہاں تک کہ اسلام کی تبلیغ کی راہ میں اور رسالت کے پیغام کو پہچانیمیں شدید رکاوٹیں ایجاد کی گئیں چنانچہ وقفہ وقفہ سے آپ کی پیروی اور اتباع کرنے والوں میں سے کسی نہ کسی کو بلند الٰہی ارمانوں کی قربان گاہ عشق کی راہ میں اپنی جان نچھاور کرنا پڑتی تھی۔ فطری طور پر اس پکڑ دھکڑ کے دوران مظلوم اور زیر عذاب مسلمانوں کا سب سے بڑا مقصد، ان مشکلات اور دباؤ سے رہائی حاصل کرنا اور ان افراد کی حمایت حاصل کرنا تھا، جو ان کو قریش کے مقابلہ میں مسلح کر کے نجات کے اسباب فراہم کرتے۔ مورخین نے کہا ہے کہ اس نازک وقت میں اہل طائف نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں مدد کی تجویز پیش کی تا کہ جنگوں اور لڑائیوں میں مسلمانوں کے دوش بدوش رہیں اور اپنی جان و مال سے ان کا دفاع کریں۔ ان کی یہ شرط تھی ان پر نماز پڑھنے کی پابندی نہ ہو۔ کیونکہ وہ زمین پر سجدہ کرنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے، حقیقت میں ان کی ثقافت اس قسم کی رفتار کو قبول نہیں کرتی تھی۔

پیغمبر اسلامؐ کو یہ تجویز اس وقت دی گئی جب آپؐ انتہائی مشکلات اور سختی سے دوچار تھے اور دشمنوں نے انھیں ہر طرف سے دباؤ میں رکھا تھا۔ اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسرے اجتماعی رہبروں کے مانند ہوتے تو اس قسم کی تجویز کا استقبال کرتے اور فرصت کو غنیمت سمجھتے اور تعہد نامہ منعقد کر کے

اپنے ہم پیمان سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے اور ایک مناسب فرصت کے انتظار میں رہتے، تا کہ ان کو آہستہ آہستہ نماز عبادت و بندگی سے آشنا کراتے اور ان کے لئے ثقافتی کام انجام دیتے۔ بعض مفسرین کے کہنے کے مطابق اس سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی ہے:

﴿ولولا ان ثبتناک لقد کدت ترکن الیھم شیئا قلیلا﴾

(اسراء/۷۴)

''اور اگر ہماری توفیق خاص نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو آپ (بشری طور پر) کچھ نہ کچھ ان کی طرف مائل ضرور ہو جاتے''[۱]

خدائے متعال انتباہ فرماتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ مسلمان مشرکوں کے مطالبات کی طرف رجحان پیدا کریں اور دین کے سلسلہ میں سودا کریں؟ تمام جنگ اور مبارزات دینی مسائل میں ہیں اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ لوگ خدا پرست بن جائیں اور خدائے متعال سے رابطہ پیدا کریں، پس ان کے نزدیک آنا اور ان سے سودا کرنا کیسے ممکن تھا جب تک کہ وہ خدا سے رابطہ پیدا نہ کرتے؟

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل طائف کی تجویز کے جواب میں فرمایا:

''لا خیر فی دین لا رکوع فیہ و لا سجود'' [۲]

''جس دین میں رکوع و سجود نہ ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے''

وہ چاہتے تھے پیغمبرؐ نرمی دکھائیں اور اپنے اصول سے منصرف ہو جائیں، تا کہ وہ ان کے پاس رہیں، لیکن نہ خدائے متعال اس قسم کی اجازت دیتا تھا اور نہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا سودا کرتے، لہذا ان سے فرمایا: میں اس دین کے بارے میں تم لوگوں سے سودا نہیں کروں گا جس میں نماز نہ ہو اور مجھے تمہاری حمایت کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے دین کا استحکام بنیادی طور پر نماز اور خدا سے رابطہ پر ہے اور میرے دین و رسالت کا اصلی مقصد، اصل پرستش الٰہی کو حاکمیت بخشنا ہے۔

۱۔ ابن عباس کی روایت کے مطابق یہ آیت اور سورہ اسراء کی ۷۳ ویں آیت اس وقت نازل ہوئی ہے کہ امیہ بن خلف اور ابوجہل کے علاوہ قریش کا ایک گروہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور آپؐ سے کہا: آپ ہمارے خداؤں پر ہماری طرح ہاتھ پھیرو تا کہ ہم آپ کی دین کی طرف مائل ہو جائیں اس وقت پیغمبرؐ کے لئے قوم سے دوری سخت تھی آپؐ مائل تھے کہ وہ اسلام قبول کریں۔ (المیزان، موسسہ مطبوعاتی اسماعیلیان، ج ۱۵، ص ۱۷۷)

۲۔ بحار الانوار، ج ۲۱، ص ۱۵۳

بنیادی اصول اور مقاصد کے بارے میں تمام مواقع پر تحفظ کرنے کی ضرورت ثابت ہے، من جملہ ان میں معاشرے کی قیادت اور وسیع پیمانہ پر مدیریت ہے۔ رہبر کو اصول اور بنیادی مقاصد کے تحفظ کے بارے میں ثابت قدم اور جرات مند ہونا چاہئے اور نرم نہیں ہونا چاہئے، لیکن فرعی امور میں اگر ضرورت اقتضا کرے تو نرمی اور چشم پوشی سے کام لے سکتا ہے، کیونکہ بعض اوقات اصول کا تحفظ اور بچاؤ کا تقاضا ہوتا ہے کہ انسان فرعی امور میں نرمی دکھائے تا کہ اصول کو دھچکا نہ پہنچے۔ پس معاشرے کے قائدین کو بھی کبھی سخت اور کبھی نرم ہونا چاہئے۔ چنانچہ ہم نے کہا کہ جس محور پر سخت پالیسی اپنا کر اس کا تحفظ کرنا چاہئے، وہ دین کے اصول اور بنیادی محور اور بلند الٰہی مقاصد ہیں کہ قابل گزشت اور چشم پوشی روا نہیں ہے۔ لیکن جزئی مسائل کے باب میں کبھی ممکن ہے چشم پوشی، کوتاہی اور خلاف ورزی کی جائے اور رہبر مصلحت کے پیش نظر کبھی چشم پوشی سے کام لے۔

جو کچھ بیان ہوا وہ اس نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لئے ہے کہ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ مدارات کو مداہنت سے مغالطہ نہ کریں اور ان دونوں کی سرحدوں کی تشخیص دیں۔ البتہ پسندیدہ مدارات اور مذموم مداہنت کے درمیان سرحد کی تشخیص بہت مشکل ہے۔ انسان کو انتہائی سنجیدگی سے دیکھنا چاہئے کہ کہاں پر مدارات کرنا چاہئے اور کہاں پر مدارات نہیں کرنا چاہئے اور کہاں پر چشم پوشی مداہنت ہے۔ کہاں پر ساز باز اور نرمی مداہنت کا مصداق ہے۔ مداہنت کو مدارات سے تشخیص دینے کی راہوں میں سے ایک یہ ہے کہ اگر چشم پوشی اور نرمی اصلی اور اہم مسائل کو بالائے طاق رکھنے کا سبب بنے تو مداہنت ہے۔ لیکن اگر انسان کے شخصی منافع خطرے میں پڑیں اور انسان اس لئے کہ بلند تر مقصد تک پہنچ جائے اپنے شخصی فائدہ سے چشم پوشی کرے اور اپنے دشمن سے محترمانہ برتاؤ کرے، تو اس نے مدارات کی ہے، البتہ اس پر توجہ رکھنی چاہئے بعض مشکوک مواقع ہیں، کہ جن کے پیش نظر مداہنت اور مدارات کے درمیان تشخیص دینے میں زیادہ دقت کی ضرورت ہے۔

"یا اباذر؛ ان سرّک ان تکون اقوی الناس فتوکلّ علی اللّٰہ، و ان سرّک ان تکون اکرم الناس فاتق اللّٰہ، و ان سرّک ان تکون اغنی النّاس فکن بما فی ید اللّٰہ عزوجل اوثق منک بما فی یدیک۔

"اے ابوذر؛ اگر لوگوں میں توانا ترین بننا چاہتے ہو تو خدا پر توکل کرو اور لوگوں میں

عزیز ترین بننا چاہتے ہو تو تقوائے الٰہی کے مالک بن جاؤ اور مالدار ترین بننا چاہتے ہو تو جو کچھ خدا کے پاس ہے اس پر اپنے مال کی بہ نسبت زیادہ اطمینان رکھو"

حدیث کے اس حصہ میں دوبارہ تقوی کی بحث آئی ہے چنانچہ ملاحظہ ہوتا ہے کہ گزشتہ مطالب سے رابطہ منقطع نہیں ہوا ہے اگر چہ تقوی سے ہم آہنگ کچھ دوسرے مسائل بھی ذکر ہوئے ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بیان میں تین نکتوں کی طرف یاددہانی کی ہے:

پہلا نکتہ یہ کہ اگر لوگوں میں قوی ترین بننا چاہتے ہو تا کہ بہتر طریقہ سے، اپنے مقاصد کو حاصل کر لو ضعیف نہ ہو کہ جلدی شکست نہ کھاؤ اور مقصد پہنچنے کی قدرت رکھو تو خدا پر توکل کرو۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اگر خدا کے نزدیک عزیز اور محترم ترین فرد قرار پانا چاہتے ہو، تو تقوی کو اپنا اصول بنالو، چنانچہ خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے:

﴿...ان اکرمکم عند اللہ اتقیکم﴾ (حجرات/۱۳)

"تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔"

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اگر غنی اور بے نیاز ترین شخص بننا چاہتے ہو تو، جو کچھ خدا کے پاس ہے اس پر اپنے پاس موجودہ مال کی بہ نسبت زیادہ اعتماد کرو۔ ہر شخص کسی حد تک خدا کی نعمتوں سے بہرہ مند ہوتا ہے اور کچھ مال اپنے اختیار میں رکھتا ہے۔ بعض اوقات اتنے پیسے اور مال رکھتا ہے کہ دوسروں کا محتاج نہیں رہتا اور پیسے حاصل کرنے کے لئے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا ہے۔ یا اس کے پاس کافی مقدار میں غذا اور روٹی ہے اور دوسروں سے غذا اور روٹی قرض لینے پر مجبور نہیں ہے، یہ بذات خود ایک قسم کی بے نیازی ہے۔ لیکن جان لینا چاہئے کہ ہم کس حد تک اپنے مال وثروت کے بارے میں خوش فہمی میں رہ سکتے ہیں۔ انسان کے پیسے ممکن ہے کم ہو جائے یا ممکن ہے انسان کے مال کو چور اچک لے جائے اور ممکن ہے اس کی تمام نعمتیں نابود ہو جائیں اور انسان کو اس سے استفادہ کرنے کی فرصت نہ۔ ممکن ہے ضرورت کے وقت انسان کو مال سے ہاتھ دھونا پڑے وہ اور اس سے استفادہ نہ کر سکے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے سارے پیسے گم ہو جائیں، لیکن جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ کبھی گم ہونے والا نہیں ہے اور خدا کی نعمتیں کبھی خدا کے ہاتھ سے خارج نہیں ہوتی ہیں۔

ممکن ہے کوئی مال ہمارے ہاتھ سے چلا جائے، لیکن خدا کے ہاتھ سے کوئی چیز چلی جائے یہ ممکن

نہیں اور اس کی مالکیت سے کوئی چیز کم ہو جائے یہ تصور نہیں، اس لئے خدائے متعال کی تمام اشیاء اور موجودات کی مالکیت پر قدرت اور تسلط کے پیش نظر، اور جو کچھ خدائے متعال ارادہ کرے اس میں تبدیلی نہیں ہوتی ہے، حتی اگر کرہ مریخ پر کوئی چیز ہو اور خدائے متعال ارادہ کرے کہ وہ مجھ تک پہونچ جائے تو اس کے ارادہ میں تغییر و تخلف ممکن نہیں، ہمارا اعتقاد اپنے پاس موجودہ چیزوں سے زیادہ خدا کے پاس موجودہ چیزوں پر ہونا چاہئے، کیونکہ ممکن ہے ضرورت کے وقت اپنے پاس موجودہ مال سے استفادہ نہ کر سکیں یا وہ گم ہو جائے یا کوئی اور مصیبت اس پر آپڑے اور ہمیں اس سے استفادہ کرنے سے محروم کر دے۔

اگر ہم معرفت کی اس منزل پر پہنچ جائیں کہ تمام ھستی اور تمام ظاہری اور باطنی طاقتوں کو خدا کے قبضہ میں دیکھیں اور یقین کریں کہ اس کی قدرت سے کوئی چیز خارج نہیں ہے، تو ہم خدا کی تمام چیزوں پر مالکیت اور تسلط حتی انسان کی تدبیر پر اس کے تسلط سے آگاہ ہو جائیں اور خدا پر ہمارا اعتماد بڑھ جائے گا اور خدا کی قدرت پر اپنے پاس موجودہ قدرت سے زیادہ اعتماد پیدا کریں گے۔ فطری بات ہے جو خدا کی قدرت پر اعتماد رکھتا ہے وہ غنی ترین فرد ہے، کیونکہ خدا کا ارادہ کبھی نہیں بدلتا اور اس کی قدرت سے کوئی چیز خارج نہیں ہوتی، جو شخص اپنے مال پر اعتماد کرتا ہے اور اس کے ساتھ دل وابستہ کرتا ہے، چونکہ پیسے ہر وقت انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے لہذا ممکن ہے فائدہ اٹھانے سے پہلے ہی مال اس کے ہاتھ سے چلا جائے۔

توکل کی عظمت و منزلت:

چنانچہ معلوم ہوا کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدائے متعال پر توکل کو مومن کے لئے قدرت حاصل کرنے کا سرمایہ قرار دیتے ہیں۔ توکل کے مقام کی اہمیت اور انسان کی زندگی میں اس کے رول، مختلف خطرات اور سختیوں سے روبرو ہونے اور اس سے غلط تصورات ایجاد کرنے کے پیش نظر ضروری ہے کہ توکل کے بارے میں ایک مختصر بحث کریں۔

توکل کا مادہ ''وکالۃ'' ہے اور اسلامی لغت میں اس کا معنی یہ ہے وہ انسان خدائے متعال کو اپنے لئے ایک مطمئن تکیہ گاہ قرار دے اور تمام امور اسی پر چھوڑ دے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرئیل سے توکل کے بارے میں سوال کیا، جبرئیل نے جواب دیا:

''العلم بانّ المخلوق لا یضرو لا ینفع و لا یعطی ولا یمنع و استعمال الیاس

من الخلق فاذا كان العبد كذلک لم يعمل لاحد سوى الله و لم يرج و لم يخف سوى الله و لم يطمع فى احد سوى الله فهذا هو التوكل" [1]

''توکل اس امر کی آگاہی ہے کہ بندہ انسان کو کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتا ہے اور اسے کوئی چیز نہیں عطا کرتا ہے اور کوئی چیز اس سے واپس نہیں لیتا، اور توکل مخلوق سے مایوس ہونے کے معنی میں ہے۔ پس جب بندہ معرفت کے اس مرحلہ تک پہونچ جاتا ہے، وہ غیر خدا کے لئے کام نہیں کرتا ہے اور خدا کے علاوہ کسی سے امید نہیں رکھتا ہے، اور خدا کے علاوہ کسی سے خوف محسوس نہیں کرتا یہ ہے خدا پر توکل کا معنی ہے''

قرآن مجید میں توکل کے بارے میں فراوان آیتیں موجود ہیں، من جملہ خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿و على الله فليتوكل المؤمنون﴾ (آل عمران/ ۱۲۲)

''اور ایمان والوں کو اللہ پر بھروسہ کرنا چاہئے۔''

(اس آیت میں خدائے متعال توکل اور بھروسہ کو ایمان کا اٹوٹ اور لازمی جز بیان کرتا ہے)

جس طرح انسان عام طور پر دنیوی کاموں میں اپنے لئے وکیل منتخب کرتا ہے اور اپنے بہت سے کام اس کے سپرد کرتا ہے تا کہ واضح اور فائدہ بخش نتائج و آثار حاصل کرے، شائستہ ہے خدا کا بندہ بھی اپنے تمام امور میں خدائے متعال کو اپنا وکیل قرار دے اور اس پر بھروسہ کرے، تا کہ اس کے مطالبات کسی تشویش کے بغیر حاصل ہو جائیں۔ دوسرے الفاظ میں جو اپنی حاجتوں کو برطرف کرنا چاہتا ہے، اس کے سامنے تین راہیں ہوتی ہیں: اپنی توانائی پر اعتماد کرے یا دوسروں پر اعتماد کرے اور اُن سے توقع رکھے یا پھر اپنے اعتماد کو خدائے متعال کی ذات پر قرار دے اور اس پر بھروسہ کرے اور اس کے علاوہ ہر ایک سے چشم پوشی کر لے۔

اس میں انسان کا خدا پر اعتماد اور بھروسہ کرنے کا سرچشمہ خدا کی ربوبیت کے بارے میں اس کی معرفت ہے، کیونکہ اگر انسان خدائے متعال کو مالک، صاحب اختیار اور تمام موجودات پر تسلط رکھنے والے کی حیثیت سے پہچان لے تو پھر دوسروں کے پیچھے دوڑنے اور ان کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرے گا۔ حضرت علی علیہ السلام اپنے مالک سے ایک دعا میں فرماتے ہیں:

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۱، ص ۱۳۸

"اللھم انک آنس الآنسین لأولیائک واحضرھم بالکفایه للمتو کلین تشاھد ھم فی سرائرھم و تطّلع علیھم فی ضمائرھم و تعلم مبلغ بصائرھم"

''خداوندا! تو اپنے دوستوں کے ساتھ دوسروں سے زیادہ محبت کرتا ہے اور تجھ پر توان لوگوں کے امور کیا صلاح کے لئے جو تیری ذات پر بھروسہ کرتے ہیں خود ان سے زیادہ حاضر ہے(کیونکہ ہر چیز کے لئے قدرت رکھتا ہے اور اپنے ارادے سے ہر کام کو انجام دیتا ہے)ان کے چھپے ہوئے اسرار کو جانتا ہے ان کی فکر سے آگاہ ہے ان کی بصیرت کی مقدار سے واقف ہے''

اسی کے ضمن میں فرماتے ہیں:

''ان کے اسرار تیرے پاس آشکار ہیں اور ان کے دل تیرے دیدار کی حسرت میں داغ دار ہیں، اگر تنہائی ان پر وحشت ڈالتی ہے تو تیری یادوں کے سایہ میں پناہ لیتے ہیں اور جب مصیبتیں ان پر ٹوٹتی ہیں تیری بارگاہ کی طرف رخ کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ تمام کاموں کا سرچشمہ تیرے ہاتھ میں ہے۔''[1]

خدا پر بھروسہ کرنے کے نتائج کے بارے میں حضرت محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"من توکل علی اللّٰہ لایغلب و من اعتصم باللّٰہ لایھزم"[2]

''جو خدا پر بھروسہ کرتا ہے وہ شکست نہیں کھاتا اور جو بھی خدا کے پاس پناہ لیتا ہے کبھی ناکام نہیں ہوتا ہے۔''

بہت سے انبیاء کی دعوتوں کے اجنڈے پر یہ پیغام لکھا ہوا تھا کہ خدا پر ایمان لاؤ اور اس پر بھروسہ کرو، اس لئے ایمان کی نشانیوں میں سے ایک خدا پر توکل کرنا ہے۔ اگر انسان خدا کی ربوبیت پر اعتقاد رکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ تمام کائنات اس کی حکومت اور ربوبیت کے تسلط میں ہے اور تنہا شائستہ پرستش وہ معبود ہے، تو وہ ہرگز اپنے آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ دوسروں کے پیچھے جا کر کسی اور سے مدد

۱۔ نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خطبہ ۲۱۸، ص ۷۱۹

۲۔ بحار الانوار، ج ۷۱، ص ۱۵۱

چاہے بلکہ ہمیشہ خدا کی ذات پر بھروسہ کریگا اور صرف اسی سے مدد کی درخواست کریگا۔

توکل اور مادی ومعنوی اسباب وعوامل سے استفادہ کرنا

توکل ایک قلبی امر ہے، خارجی رفتار میں سے نہیں ہے، اس لئے توکل اسے نہیں کہتے کہ انسان کسی مسجد میں معتکف ہوجائے اور صرف خدا کی عبادت اور اس سے راز و نیاز میں مشغول رہے اور تمام کاروبار سے ہاتھ کھینچ لے، اس امید سے کہ خدائے متعال خود اس کا رزق فراہم کرے گا۔ بیشک یہ تصور غلط ہے اور اس روش کا اختیار کرنے والا منحرف ہے اور توکل کے حقیقی معنی سے آگاہ نہیں ہے، چنانچہ ایک روایت میں آیا ہے:

"رای رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم، قوما لایزرعون، قال: من انتم؟ قالوا: نحن المتوکلون. قال: بل انتم المتکلون"[1]

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ کھیتی باڑی نہیں کر رہے تھے۔ ان سے کہا: تم کون ہو؟ انہوں نے جواب میں کہا: ہم توکل کرنے والے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: نہیں، بلکہ تم لوگ دوسروں کے رحم وکرم ہو۔"

جی ہاں، جو معارف الٰہی کی صحیح پہچان نہیں رکھتے، وہ خیال کرتے ہیں کہ توکل یہ ہے کہ انسان مادی وسائل اور امکانات سے استفادہ نہ کرے اور اگر کسی نے مادی وسائل سے استفادہ کیا تو وہ توکل نہیں رکھتا ہے۔ جبکہ نہ مادی وسائل کا سہارا لینے والا شخص توکل سے عاری ہے اور نہ ہر وہ شخص جو ان وسائل سے استفادہ نہیں کرتا ہے وہ صاحب توکل ہے۔ ایسے کاہل اور سست افراد بھی جو ایک لقمہ روٹی کے انتظار میں رہتے ہیں تاکہ اسے کھا کر اسی پر قناعت کریں اور کام کرنے کی ہمت نہیں رکھتے، جب ایسے لوگوں سے سوال کیا جاتا ہے کہ تم لوگ کیوں کام نہیں کرتے اور محنت نہیں کرتے ہو؟ تو جواب میں کہتے ہیں: ہم خدا پر توکل کرتے ہیں یہ توجیہ ان کی کاہلی اور سستی پر ایک پردہ ہے ورنہ وہ جھوٹ بولتے ہیں اور خدا پر بھروسہ نہیں رکھتے ہیں۔

البتہ ایسے لوگ بھی ہیں جو حقیقتاً صاحب توکل ہوتے ہیں، لیکن بہرصورت یہ تصور غلط ہے کہ توکل

۱۔ مستدرک الوسائل ج ۱۱، ۲۱۷

کے بہانہ سے عوامل واسباب سے استفادہ نہ کیا جائے۔

چنانچہ ہم نے کہا کہ توکل ایک قلبی امر ہے اور اس کا معنی خدا پر بھروسہ کرنا ہے کہ انسان اپنے دل میں خدا پر بھروسہ کرے۔ اس بنا پر ممکن ہے انسان توکل کے عالی ترین مرحلہ تک پہنچ جائے اور اسی حالت میں فریضہ انجام دینے اور حکم خدا پر عمل کرنے کے لئے مادی وسائل اور اسباب سے بھی استفادہ کرے۔ ممکن ہے کوئی شخص دوسروں سے زیادہ محنت کرے یا اپنے کام میں دوسروں سے زیادہ سنجیدگی کا مظاہرہ کرے لیکن پھر بھی اپنے کام پر اعتماد نہ رکھتا ہو اور صرف خدا پر بھروسہ کرتا ہو، چونکہ خدائے متعال بے کار اور سست انسان سے بیزار ہے اور اس پر کام کرنا واجب قرار دیا ہے اسلئے یہ شخص کام کرتا ہے، کیونکہ حکمت الٰہی کا تقاضا ہے کہ دنیا کے امور واسباب اور وسائل کے ذریعہ آگے بڑھیں:

بنیادی طور پر جو خدا کی معرفت رکھتا ہے، وہ شخص جانتا ہے کہ حکمت الٰہی کے مطابق جملہ امور اسباب کے ذریعہ واقع ہوتے ہیں۔ حکمت الٰہی کا تقاضا ہے کہ ہر مظہر اپنے اسباب کے ذریعہ واقع ہو۔ اس لحاظ سے خدائے متعال کا علم اور اس کی معرفت وحکمت اس کے مقتضائے حکمت کی شناخت نظام اسباب و علل پر برقرار ہے کا سبب ہے اور بالاخر، انسان کا تکامل اور اس کی ترقی اسی نظام سے وابستہ ہے اور اسی کے ذریعہ انسان کی آزمائش اور امتحان سے مواجہ ہوتا ہے ورنہ انسان تکامل وترقی کی طرف نہیں بڑھتا۔ انسان کے تکامل وترقی کے لئے بندگی کے فرائض انجام دینا شرط ہے اور وہ انسان کے ارتباط پر منحصر ہے اور انسان کا ارتباط نظام اسباب وعلل سے منسلک ہے۔ پس اگر انسان آرام وآسائش کی راہ پر چلے اور تنہائی اختیار کرے اور عبادت میں مشغول ہو جائے اور اپنی روزمرہ زندگی میں کسب معاش ونیز سعی وکوشش سے ہاتھ کھینچ لے تو اس نے حکمت الٰہی کے خلاف کام کیا ہے اور اس صورت میں خدا کی طرف سے روزی پہنچنے کی امید رکھنا بیہودہ ہوگا، بقول مولوی:

گر توکل می کنی در کار کن　　کشت کن پس تکیہ بر جبار کن

(اگر تم توکل کرتے ہو چاہتے ہو تو کام کرو توکل کرو، کھیتی کرنے کے بعد خدا پر بھروسہ کرو)

اس بنا پر حکمت الٰہی کا تقاضا ہے کہ انسان ضرورتوں کو پانے کے لئے اسباب وعوامل سے استفادہ کرے۔ اگر ایسا ہوتا کہ رزق کی درخواست کر کے خدا سے رزق فراہم ہو جاتا تو کوئی عملی رزق کے لئے کوشش نہیں کرتا اور انسانوں کی آزمائش نہیں ہوتی۔ اگر کہا جاتا ہے کہ مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے عوامل

اور وسائل سے استفادہ کرنا چاہئے تو اس کے یہ معنی نہیں ہے کہ تمھیں رازق دینے والی زمین، کسب معاش اور دیگر اسباب ہیں، بلکہ یہ سب خدا کی طرف سے ہیں اور تدبیر اس کے ہاتھ میں ہے، رزق بھی اسی سے ہے۔ عوامل و اسباب کے پیچھے جانا تم پر فرض ہے تا کہ دنیا کے نظام میں الٰہی مقاصد پورے ہو جائیں اور یہ مقاصد انسان کے تکامل و ترقی کے لئے ہیں۔

پس توکل اور بھروسہ کرنے والے کو کسب معاش و تلاش سے غفلت نہیں کرنی چاہئے، چنانچہ جو اہل توکل نہیں ہیں وہ ایسا ہی کرتے ہیں، ان دو گروہوں میں قلبی رابطہ کے بارے میں فرق یہ ہے کہ توکل کرنے والا خدا کے حکم کی اطاعت کی غرض اور خدا پر بھروسہ اور امید رکھ کر کوشش کرتا ہے، لیکن غیر موحد اور توکل نہ رکھنے والا انسان اپنی روزی کو اپنے کام، کاج اور کوشش دوسروں کے ہاتھ میں ڈھونڈتا ہے۔ مومن خدا کے علاوہ کسی سے امید نہیں رکھتا ہے اور تمام اسباب و وسائل کو خدا کی طرف سے دیکھتا ہے اور اگر وہ تمام اسباب وسائل سے محروم ہو جائے تو بھی اس کی خدا پر امید میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدائے متعال جو بھی اپنے بندہ کے حق میں انجام دیتا ہے وہ حکمت کی بنیاد پر اور اس کی مصلحت کے لئے ہوتا ہے اور خدائے متعال کسی بھی وقت اپنے بندے کو اس سے محروم نہیں کرتا کہ جس میں، اس کے لئے خیر ہو۔

پس ایک طرف سے دنیا کا نظام اسباب و علل کے نظام پر وجود میں آیا ہے اور اس نظام کی زنجیر میں انسان کو کام اور کوشش سے اپنے مطالبات کو حاصل کرنا چاہئے۔ دوسری طرف سے کسب معاش اور دوسروں سے اپنے مطالبات کو حاصل کرنا چاہئے۔ دوسری طرف کام، کاج اور ذریعہ معاش اور دوسروں سے روابط اس لئے ہے کہ انسان کے لئے امتحان و آزمائش کے مواقع فراہم ہو جائیں، چونکہ اگر انسان کی آزمائش نہ ہو اور اس سے امتحان نہ لیا جائے تو وہ تکامل و ترقی کی طرف قدم نہیں بڑھائے گا۔ کام اور انجام فریضہ اور کارکن و مالک کے درمیان رابطہ کی رعایت کی جانی چاہئے تا کہ ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت کے سایہ اور سعی و کوشش کے نتیجہ میں تکامل و ترقی مواقع فراہم ہوں۔ اس بنا پر انسان کا فرض ہے کہ کام اور محنت کرے اور اسی حالت میں اعتقاد رکھے کہ روزی اسے خدا سے ملتی ہے اور اس کا بھروسہ اس پر ہونا چاہئے۔ توکل کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ انسان کام نہ کرے بلکہ حقیقت توکل یہ ہے کہ انسان کا دل خدا کے ساتھ ہو اپنے رزق کو خدا کی طرف سے سمجھے، نہ کام سے تو اس صورت میں وہ کامیاب ہوگا اور زندگی کے مشکل ترین مراحل میں بھی خطرات سے گزر کر مشکلات پر قابو پائے گا۔ کیونکہ وہ خدائے متعال کی لافانی

ذات پر بھروسہ کرتا ہے۔

نقل کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام بیمار ہوئے اور بنی اسرائیل ان کی عیادت کے لئے آئے اور ان سے کہا: اگر فلاں جڑی بوٹی سے علاج کریں گے تو آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں علاج نہیں کروں گا یہاں تک خدا مجھے شفا عنایت کرے! حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیماری کی ایک مدت گزر گئی لیکن صحت یابی کی کوئی علامت ان میں ظاہر نہیں ہوئی۔ خدا کی طرف سے انھیں وحی ہوئی: مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم ہے، تجھے میں تب تک شفا نہیں دوں گا جب تک آپ اس جڑی بوٹی سے اپنا معالجہ نہ کریں کہ جس کے بارے میں بنی اسرائیل نے تمہیں خبر دی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس دوا کو کھانے کے بعد شفا پائی، لیکن جو بات انھوں نے بنی اسرائیل سے کہی تھی اس سے خائف تھے۔ خطاب آ گیا: اے موسیٰ! کیا تم اپنے توکل سے میری حکمت کو جھٹلانا چاہتے ہو؟ میرے سوا کون ہے جس نے ان جڑی بوٹیوں میں یہ تاثیر رکھی ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک زاہد شہر سے نکل کر ایک پہاڑ کے دامن میں ساکن ہوا اور کہتا تھا: میں کسی سے درخواست نہیں کروں گا یہاں تک کہ خدائے متعال خود مجھے رزق پہنچائے! اسی حالت میں سات دن گزر گئے اور کہیں سے کوئی غذا اس تک نہیں پہنچا یہاں تک وہ قریب المرگ ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے عرض کی: پروردگارا! مجھے روزی عنایت کر یا میری جان لے لے تا کہ میں مطمئن ہو جاؤں! خطاب ہوا میرے عزت وجلال کی قسم، تجھے تب تک رزق نہیں دوں گا، جب تک معاشرے میں جا کر لوگوں کے ساتھ زندگی نہ گزارو گے۔ زاہد نے پہاڑ سے اتر کر شہر کی راہ لی۔ جب لوگوں میں پہنچا تو ایک شخص اس کے لئے پانی لا رہا تھا اور دوسرا کھانا۔ اس وقت خدائے متعال نے اسے خطاب کر کے فرمایا: اے زاہد! کیا تو اپنے زہد سے میری حکمت کو جھٹلانا چاہتا ہے؟ کیا تم نہیں جانتے ہو کہ مجھے اپنے بندوں کو بندوں کے ہی ذریعہ سے روزی پہنچانا پسند ہے بجائے اس کے کہ انھیں بلا واسطہ اور بغیر سبب روزی پہنچاؤں۔[1]

رزق صرف مادی رزق اور شکم کے رزق تک محدود نہیں ہے بلکہ منافع اور معنوی نعمتیں من جملہ علم بھی رزق ہے اس لحاظ سے ممکن ہے کوئی کاہلی وسستی کی وجہ سے علم حاصل کرنے اور مطالعہ کرنے کے لئے نہ

۱۔ مہدی نراقی، جامع السعادات، ج ۳، ص ۲۲۸۔۲۲۹

۔ بحار الانوار، ج ۱، ص ۲۲۵

جائے، وقت پر کلاس میں حاضر نہ ہو اور کہے کہ میں نے خدا پر توکل کیا ہے وہ خود مجھے علم عطا کرے گا اور معصومؑ کے اس بیان کو دستاویز قرار دے کہ فرماتے ہیں:

"لیس العلم بالتعلم انما ھو نور یقع فی قلب من یرید اللہ تبارک وتعالی ان یھدیہ"

"علم پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتا ہے، بلکہ علم ایک ایسا نور ہے کہ جسے خدا ہدایت کرنا چاہے اس کے قلب میں اسے ڈال دیتا ہے۔"

جی ہاں علم خدا کی طرف سے ہے اور وہ جسے چاہے مرحمت کرتا ہے، لیکن ہمارا بھی کوئی فرض ہے کہ سبق پڑھیں اور مطالعہ کریں اور علم حاصل کرنے میں سنجیدگی کا مظاہرہ کریں اور تمام وسائل سے استفادہ کریں اور ایسا نہیں ہے کہ کوئی کوشش وجستجو، محنت اور علم حاصل کرنے کی دشواریوں کے بغیر عالم بن جائے، چنانچہ کام، کوشش وجستجو اور محنت ورنج برداشت کئے بغیر دنیوی سرمایہ بھی حاصل نہیں کرسکتا ہے۔

تمام وہ نعمتیں جن کا انسان طالب ہے، خدائے متعال کے اختیار میں ہیں اور اسباب وسائل ان کو تعین کرنے والے نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ایسے اسباب ہیں کہ خدائے متعال نے ان کو نعمتوں تک پہنچنے کے لئے وسیلہ قرار دیا ہے، اور چونکہ خدائے متعال انہی وسائل واسباب کے ذریعہ ہمیں اپنی مطلوبہ نعمتوں اور رزق تک پہنچانا چاہتا ہے، لہذا ہم پر فرض بنتا ہے کہ ان سے استفادہ کریں، اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی کسی کام اور کوشش کے بغیر جب ہم اسباب ووسائل سے کافی محروم ہوجائیں، خدائے متعال بعض منافع اور نعمتوں کو اس طرح ہمارے اختیار میں قرار دیتا ہے کہ ہم اس کا بالکل تصور نہیں کرتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں ممکن ہے کہ کام وکوشش اور وسائل سے استفادہ کرنے کے بعد بھی اپنے مقاصد تک نہ پہنچ پائیں اور ناکام رہیں، کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہمیں وسائل کے بارے میں خوش فہمی نہیں رکھنی چاہئے، بلکہ انسان کو صرف خدا پر بھروسہ اور امید رکھنی چاہئے اور اس پر اعتماد رکھتے ہوئے وسائل واسباب سے استفادہ کرنا چاہئے اور انسان امید رکھے کہ خدائے متعال اس کا رزق اس تک پہنچائے گا۔ مذکورہ مطالب کے پیش نظر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اگر لوگوں میں توانا ترین بننا چاہتے ہو تو خدا پر بھروسہ کرو اور اپنے قلبی رابطہ کو اس کے ساتھ مستحکم کرو، تاکہ اس کے اعتماد اور ارتباط کے سایہ میں اطمینان خاطر حاصل کرو اور خدا کی قدرت لایزال پر بھروسہ کرو، وہ ہر کام پر قادر ہے اور سختیوں اور مشکلات میں انسان کا بہترین یاور ومددگار

ہے۔ وہ دشمن کے ساتھ جنگ میں انسان کے بازوؤں کو قدرت بخشتا ہے اور دشمن کے بڑے لشکر کو مومن انسان کے لئے خزاں کے پتوں کی طرح گرا دیتا ہے۔

جی ہاں، اس اعتماد وارتباط کے پیش نظر یقین ہے کہ مولائے متقیان علی علیہ السلام، وہ انسان کامل جو خدا کی بندگی اور عبادت میں نیز راز و نیاز کے دوران اس کی بارگاہ میں کانپتے تھے اور بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑتے تھے اور خدا کے خوف سے بے تاب ہو جاتے تھے۔ لیکن دشمن کے ساتھ مقابلہ میں آپ کی تیوریوں پر بل بھی نہیں آتے تھے اور خوف تو آپ کے قرب بھی نہیں آتا تھا اور دشمن آپؑ کے سامنے سے دم دبا کر بھاگ گئے تھے اور آپؑ خدائے متعال اور اس کی بے نہایت قدرت سے الہام اخذ کرتے تھے اور قدرت کی طرف سے وہ پشت پناہی ہوتی تھی کہ ضعف و سستی کا تصور نہیں ہوتا تھا اور تمام چیزیں ان کے عزم وارادہ سے انجام پاتی تھیں۔ جنگ جمل میں اپنے بیٹے محمد بن حنفیہ کے ہاتھ میں پرچم اسلام تھما تے ہوئے فرماتے ہیں:

"تزول الجبال و لا تزل عضّ علی ناجذک اعر الله جمجمتک تدفی الارض قدمک ارم ببصرک اقصی القوم و غضّ بصرک و اعلم انّ النصر من عند الله سبحانه"[1]

"پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں، لیکن تم اپنی جگہ سے نہ ہلنا (تم کو میدان کارزار میں پہاڑوں سے زیادہ مستحکم اور قوی ہونا چاہئے) اپنے دانتوں کو آپس میں دبا کے رکھنا اور اپنے سر کو خدا کے سپرد کر دینا اور اپنے قدم زمین میں میخ کی طرح نصب کر دینا (میدان کارزار میں ثابت قدم رہنا اور دشمن سے خوف زدہ نہ ہونا) دشمن کی صف کے آخری حصہ پر نگاہ رکھنا اور جان لینا کامیابی خدائے متعال کی طرف سے ہے۔"

اگر انسان خدا پر بھروسہ نہ رکھے تو اس کے باطن میں ہمیشہ اضطراب، پریشانی اور تذبذب ہوگا اور اس کی زندگی پریشانی اور اضطراب میں مبتلا رہے گی اور اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ وہ سچے اور اطمینان بخش پشت پناہی سے غافل ہے اور جھوٹے اور متزلزل پشت پناہی پر اعتماد کئے ہوئے ہے۔ اس لئے توانائی حاصل کرنے کے لئے ہمیں خدا پر بھروسہ کرنا چاہئے۔

۱۔ نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خطبہ ۱۱، ص ۶۲

تقوی اور توکل کے درمیان رابطہ

حدیث کو جاری رکھتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"یا اباذر؛ لو انّ الناس کلهم اخذوا بهذه الایه لکفتهم: ﴿و من یتق الله یجعل له مخرجا و یرزقه من حیث لا یحتسب و من یتوکل علی الله فهو حسبه ان الله بالغ امره قد جعل الله لکل شی ء قدرا﴾ (طلاق/۲-۳)

اے ابوذر! اگر سب لوگ اس آیہ مبارکہ پر عمل کرتے تو ان کے لئے کافی تھا:

(اور جو بھی اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لئے نجات کی راہ پیدا کرتا ہے۔ اور اسے ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جس کا خیال اسے بھی نہیں ہوتا ہے اور جو خدا پر بھروسہ کرے گا خدا اس کے لئے کافی ہے بیشک خدا اپنے حکم کا پہنچانے والا ہے اس نے ہر شے کے لئے ایک مقدار معین کردی ہے)

(آیہ مبارکہ میں تقوی اور توکل دونوں ذکر ہوئے ہیں اور یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان دونوں کے درمیان گہرا تعلق اور رابطہ ہے اور ممکن نہیں ہے یہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ شاید تقوی کا پہلے ذکر آنا اس لئے ہے کہ تقوی کا حاصل ہونا توکل تک پہنچنے کا مقدمہ ہے اور جب تک انسان متقی نہیں بنتا خدا پر توکل کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا ہے)

بیشک تمام آسمانی اور زمینی امور خدائے متعال کے ہاتھ میں ہیں اور خدا کی قدرت کے مقابلہ میں کوئی قدرت وجود نہیں رکھتی ہے۔ یہ وہ ہے جو اپنے ارادہ سے کائنات کی تدبیر کرتا ہے اور تمام چیزیں اس کے ارادہ اور رائے کے مطابق انجام پاتی ہیں۔ پس ہمیں صرف اس پر اعتماد کرنا چاہئے اور نیازمندی کا ہاتھ اسی کی طرف پھیلانا چاہیئے اور اپنے اندر غیر خدا کی بے نیازی کو زندہ کرنا چاہئے۔ چونکہ خدائے متعال نے ہمیں دوسروں کا احترام کرنے کا حکم دیا ہے، اور ان کی نیکیوں کے مقابلہ میں شکریہ ادا کرنے کو کہا ہے، لہذا ہم فرضیۂ الٰہی کی بنیاد پر ان کا احترام کرتے ہیں، لیکن اس تصور سے کہ کسی دوسری راہ سے کوئی چیز نہیں ملی، چاپلوسی اور خوشامد سے پرہیز کرنا چاہئے۔ جو خدائے متعال پر اعتماد و توکل رکھتا ہے وہ اپنے رزق کی امید خدا سے رکھتا ہے، اس لئے دوسروں کی چاپلوسی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ بلاوجہ کسی کے سامنے

جھکے اور سرخم کرے تا کہ وہ اس کی مدد کریں۔ چاپلوسی اور کسی کے سامنے سر جھکانا انسان کی عزت نفس کے منافی ہے۔

جی ہاں! خدائے متعال اور اولیائے دین نے ہمیں حکم دیا ہے کہ، بعض افراد، جن کا ہم پر بڑا حق ہے، جیسے ماں باپ اور اساتذہ کے سامنے خضوع وخشوع سے پیش آئیں۔ اور اسی طرح تاکید کی گئی ہے کہ سادات اور پیغمبر اکرم ﷺ کی ذریت کے سامنے تواضع اور خشوع سے پیش آئیں، کہ ان کا احترام پیغمبر اکرم ﷺ سے ان کی نسبت کی وجہ اور خدا اور رسول خدا ﷺ کے احترام کی غرض سے ہے، نہ دنیوی اور مادی طمع سے۔

خدائے متعال نے ماں باپ کے ساتھ نیکی اور احترام کرنے اور ان کے سامنے خضوع وخشوع کے ساتھ پیش آنے کے لئے اپنی عبادت وبندگی کے مرتبہ کے بعد ذکر فرمایا ہے:

﴿وقضی ربک الاتعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانا اما یبلغن عندک الکبر احدھما او کلا ھما فلاتقل لھما اف ولاتنھرھما وقل لھما قولا کریما واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ وقل رب ارحمھما کما ربیانی صغیر﴾ (اسراء/۲۳۔۲۴)

''اور تمھارے پروردگار کا فیصلہ ہے کہ تم سب اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور اگر تمہارے سامنے ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو جائیں تو خبردار ان سے اف بھی نہ کہنا اور انھیں جھڑکنا بھی نہیں اور ان سے ہمیشہ شریفانہ گفتگو کرنا۔ اور ان کے لئے خاکساری کے ساتھ اپنے کاندھوں کو جھکا دینا اور ان کے حق میں دعا کرتے رہنا کہ پروردگار ان دونوں پر اسی طرح رحمت نازل فرما جس طرح کہ انہوں نے بچپن میں مجھے پالا ہے۔''

امام سجاد علیہ السلام استاد اور معلم کے حق کے بارے میں فرماتے ہیں:

''حق سائسک بالعلم التعظیم لہ و التوقیر لمجلسہ و حسن الاستماع الیہ و الاقبال علیہ و ان لا ترفع علیہ صوتک و لا تجیب احدا یسالہ عن شی حتی یکون ھو الذی یجیب و لا تحدث فی مجلسہ احدا و لا تغتاب

عنده احدا ...“[1]

”جو تجھے علم سکھاتا ہے اور تیری روح کی پرورش کرتا ہے، اس کا حق یہ ہے کہ اس کہ تعظیم کرو اس کی مجلس کا احترام کرو اس کے بیانات کو اچھی طرح سے سنو، اس کی طرف متوجہ رہو اور اس کے سامنے بلند آواز سے بات نہ کرو اور اس کی مجلس میں کسی دوسرے کے ساتھ بات نہ کرو اور اس کے سامنے کسی کی غیبت نہ کرو۔“

اگر کوئی دنیا اور مادیات کی لالچ میں کسیکے سامنے خضوع کرے تو اس نے چاپلوسی کی ہے اور اس کے کام کا باطن شرک ہے، وہ حقیقت میں خدا کو ناتواں سمجھتا ہے اس لئے دوسروں پر طمع کرتا ہے۔

جو خدا کو پہچانتا ہے اور خدا کے بارے میں اس کی معرفت مکمل ہے اور اس پر بھروسہ کرتا ہے اور خدا کے اس بیان کو کان لگا کے سنتا ہے کہ اس نے فرمایا ہے:

﴿الیس اللہ بکاف عبدہ﴾ (زمر/ ۳۶)

”کیا خدائے متعال بندہ کے لئے کافی نہیں ہے؟“

تو وہ دوسروں سے امید نہیں رکھے گا تا کہ ان کے سامنے جھکے۔ وہ صرف خدائے متعال پر توکل اور اعتماد کرتا ہے اور اسی حالت میں اپنے فریضہ پر بھی عمل کرتا ہے۔ اگر اس کا فریضہ کام کرنا ہے، تو وہ کام کرتا ہے، اگر اس کا فریضہ سبق پڑھنا ہے تو وہ سبق پڑھتا ہے اور اگر اس کا فریضہ راہ خدا میں جہاد کرنا ہے تو وہ جہاد کرتا ہے اور نتیجہ کو خداوند متعال پر چھوڑتا ہے۔

حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ بارہا فرماتے تھے:

”ہمارا فرض ہے کہ ہم مبارزہ کریں، لیکن یہ کہ ہم کامیاب ہوں یا نہ ہوں یہ خدا پر ہے، جو وہ چاہے اور مصلحت جانے وہی واقع ہوگا۔“

۱۔ بحار الانوار، ج ۲، ص ۴۲

سترہواں درس:

تقدیرات الٰہی، سچّے اعتقاد اور صحیح خود باوری کا اثر

- ☐۔حق کے سامنے تسلیم ہو جانا، پریشانیوں کے برطرف ہونے کا سبب
- ☐۔قضاوقدر پر ایک نظر
- ☐۔یقین کی اہمیت اور اس کے مراتب
- ☐۔اولیائے الٰہی اور تقدیرات الٰہی پر رضامندی
- ☐۔مقام صبر اور اس کی اہمیت پر ایک نظر
- ☐۔خدا کی مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دینے کا اثر

تقدیرات الٰہی، سچّے اعتقاد
اور صحیح خود باوری کا اثر

"یا اباذر؛ یقول اللّٰہ جل ثناوہ و عزتی و جلالی لایوثر عبدی ھوای علی ھواہ الا جعلت غناہ فی نفسہ و ھمومہ فی آخرتہ و ضمّنت السمٰوات و الارض رزقہ و کففت علیہ ضیعتہ و کنت لہ من وراء تجارۃ کل تاجر. یا اباذر؛ لو انّ ابن ادم فرّ من رزقہ کما یفرّ من الموت لأدرکہ رزقہ کما یدرکہ الموت"

گزشتہ چند جلسوں میں بحث کا محور تقوی تھا اور بیان ہوا کہ اگر کوئی باتقوی ہو تو اسے اپنی رزق کے بارے میں پریشان نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ خدائے متعال اس کے سامنے نجات کی راہیں کھولتا ہے جب اسے کوئی پیچیدہ مشکل درپیش ہوتی ہے اس کے لئے راہ نجات قرار دیتا ہے اور اس کے لئے رزق کو ایسی راہ سے پہنچاتا ہے جس کا اسے گمان تک نہیں ہوتا۔ حقیقت میں جناب ابوذرؓ سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصیحتوں کے گزشتہ حصہ میں، تقوی کے رزق کے ساتھ ربط کو پیش کیا گیا، چونکہ انسان حلال و پاک اور وسیع رزق کا طالب ہے، اب اگر اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ تقوی رزق کی وسعت کا سبب بنتا ہے، تو اس میں تقوی حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔

حق کے سامنے تسلیم ہونا پریشانیوں کے برطرف ہونے کا سبب:

یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ مومن کو اپنی روزی کے بارے میں کس قدر فکر مند رہنا چاہئے، کس قدر اسے اپنی زندگی کو وسعت اور آسودہ بنانے کی فکر میں ہونا چاہئے اور اس فکر میں ہو کہ اپنے رزق کو کیسے اور کس راہ سے حاصل کرے؟ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ انسان اپنی زندگی میں کچھ حاجتیں رکھتا ہے کہ اگر وہ پوری نہ ہوں تو زندگی کو جاری رکھنا اس کے لئے ممکن نہیں ہے. من جملہ ان چیزوں میں سے ایک روزی ہے جس پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے، فطری طور پر جو اپنی زندگی سے دلچسپی رکھتا ہے وہ اپنے رزق کی فکر میں بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم نے اس سے پہلے بھی ذکر کیا کہ، رزق صرف خوراک تک محدود نہیں ہے بلکہ تمام مادی ومعنوی نعمتیں جو خدائے متعال نے اس دنیا میں انسان کو عطا کی ہیں، سب رزق شمار ہوتی ہیں: لباس، گھر، بیوی، استاد اور علم بھی رزق ہیں۔

اس وسیع نظریہ کے مطابق جو ہم رزق کو تمام مادی ومعنوی نعمتوں پر مشتمل جانتے ہیں، اور اطمینان رکھتے ہیں کہ ہر شخص اپنا رزق حاصل کرنے کے لئے مجبور ہے، فطری بات ہے کہ ہر شخص کو اپنی رزق کے بارے میں فکر مند ہونا چاہئے، لیکن انسان کی فکر اور پریشانی کی مقدار اس کی معرفت وایمان کے مراتب پر منحصر ہے۔ یعنی جس طرح انسان کا ایمان اور اس کی معرفت یکساں نہیں ہے، اس طرح ان کا فکر مند ہونا بھی ایک حد میں نہیں ہے، جس قدر انسان کا ایمان اس کی معرفت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اس کی فکر اور پریشانیاں بھی کم ہوتی جاتی ہیں یہاں تک کہ بعض بزرگوں کی تعبیر کے مطابق بعض اولیاء خدا معرفت کی اس منزل تک پہنچے ہوئے ہیں کہ بالکل اپنی فکر میں نہیں ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کی آیات میں جو تسلیم کا مقام بیان ہوا ہے اسی مرتبہ پر وہ فائز ہیں. خدائے متعال فرماتا ہے:

﴿فلاوربک لایومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثمّ لایجدوا فی انفسھم حرجا ممّا قضیت ویسلموا تسلیما﴾ (نساء/۶۵)

''پس تمہارے پروردگار کی قسم یہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک آپ کو اپنے اختلاف میں حکم نہ بنائیں اور پھر جب آپ فیصلہ کردیں تو اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی کا احساس نہ کریں اور آپ کے فیصلہ کے سامنے سراپا تسلیم ہوجائیں''

انسان تسلیم کی منزل میں ایک ایسے مرحلہ تک پہونچ جاتا ہے کہ مکمل طور پر خدا کے حضور میں تسلیم ہوجاتا ہے اور اپنے لئے کوئی چیز نہیں چاہتا ہے اور اپنی خواہشات کو فراموش کر دیتا ہے اور صرف اس پر توجہ رکھتا ہے جو خدا کی مرضی ہو، اگر انسان اس مرتبہ تک پہونچ جائے، تو وہ پریشانیوں سے رہائی پا جاتا ہے اور اس پر مسائل آسان ہوجاتے ہیں:

"اوحی اللّٰہ تعالی الی داود: یا داود! ترید و ارید و انّما یکون ما ارید فان اسلمت لما ارید یکفیک ماترید و ان لم تسلم بما ارید اتعبتک فیما ترید ثم لا یکون الا ماارید" [1]

"خدائے متعال نے حضرت داؤدؑ کو وحی کی: اے داؤد! تم ایک چیز چاہتے ہو اور ارادہ کرتے ہو اور میں بھی ایک چیز چاہتا ہوں اور جو میں چاہتا ہوں وہ واقع ہوتا ہے، پس اگر میری چاہت کے مقابلہ میں تم تسلیم ہوجاؤ تو جو تم چاہو گے وہ تمہیں ملے گا اور اگر میری مرضی کے مقابلہ میں تسلیم نہ ہوتے ہو تو میں تمہیں تمہاری چاہت کے بارے میں رنج سے دوچار کروں گا اور اس کے بعد وہی واقع ہوگا جسے میں چاہتا ہوں"

بعض لوگ مقام تسلیم، کو مقام رضا سے بالاتر جانتے ہیں، کیونکہ وہ معتقد ہیں کہ مقام رضا میں انسان جو کچھ خدا انجام دیتا ہے، اسے اپنی خواہش کے مطابق پاتا ہے، اس بنا پر اپنے مزاج پر نظر رکھتا ہے۔ لیکن مقام تسلیم میں اپنے مزاج اور جو کچھ اس کے مخالف و موافق ہے سب کو خدا پر چھوڑتا ہے اور اسے توکل کے مرتبہ سے بالاتر جانتا ہے، کیونکہ توکل امور زندگی میں خدا پر اعتماد کے معنی میں ہے، اور خدا کو اپنا وکیل بنانا ہے، اس بنا پر بندہ بھی اپنے آپ سے تعلق رکھتا ہے، لیکن تسلیم کے مرتبہ میں اپنے سے متعلق امور سے ہاتھ کھینچتے ہوئے ہر چیز کو خدائے متعال کے سپرد کرتا ہے۔ [2]

خدائے متعال مومنوں کو مقام تسلیم کی طرف دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿یا ایھاالذین آمنوا ادخلوا فی السّلم کافّة و لا تتبّعوا خطوات الشیطان انّه لکم عدوّ مبین﴾ (بقرہ/۲۰۸)

۱۔ بحار الانوار، ج ۸۲، ص ۳۶

۲۔ جامع السعادت، ج ۳، ص ۲۱۱، ۲۱۲

''ایمان والو! تم سب مکمل طریقہ سے اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطانی اقدامات کا اتباع نہ کرو کیوں کہ وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے''

مرحوم علامہ طباطبائی اس آیت کے ضمن میں فرماتے ہیں:

کلمات ''تسلم'' و ''اسلام'' اور ''تسلیم'' ایک معنی میں ہے۔ اور کلمہ ''کافۃ'' کلمہ ''جمیعا'' کے معنی میں تاکید پر دلالت کرتا ہے، اور چونکہ آیت میں مومنین سے خطاب ہے اور وہ ''سلم'' میں داخل ہونے کے لئے مامور ہوئے ہیں، پس نتیجہ کے طور پر آیت میں حکم معاشرے کے تمام لوگوں اور فرد فرد سے مربوط ہے۔ لہذا فرد فرد پر بھی واجب ہے اور تمام لوگوں پر واجب ہے کہ دین خدا میں چون و چرا نہ کریں اور خدا اور اس کے رسولؐ کے حکم کے سامنے تسلیم ہو جائیں۔ اسی طرح چونکہ خطاب خاص کر مومنین سے ہوا ہے، اور جس ''سلم'' کے بارے میں مومنین کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولؐ کے مقابلہ میں تسلیم ہو جائیں۔ پس جس ''سلم'' کے بارے میں ان کو دعوت ہوئی ہے وہ یہ کہ خدا پر ایمان لانے کے بعد اس کے حضور میں تسلیم ہو جائیں اور اپنے لئے قرین مصلحت اور مطلق العنان ہونے کے قائل نہ ہوں اور خدا اور اس کے رسولؐ نے جو راستہ بیان فرمایا ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار نہ کریں۔ کوئی قوم ہلاک نہیں ہوئی ہے، مگر یہ کہ اس نے خدا کی راہ کو چھوڑ دیا ہو اور نفسانی خواہشات کی پیروی کی ہو اور ایسے راستہ کو اختیار کیا ہو کہ جس کے بارے میں خدا کی طرف سے کوئی دلیل نہیں تھی۔ [1]

جی ہاں! جو لوگ مقام تسلیم تک پہنچے ہیں، وہ اپنے لئے کوئی خواہش نہیں رکھتے اور ان کی مرضی خدا کی مرضی ہوتی ہے۔ وہ اس فکر میں نہیں ہوتے کہ ان کی روزی کس طرح اور کس راستہ سے حاصل ہو۔ وہ اس فکر میں ہوتے ہیں کہ کسی طرح خدا کی بندگی کریں کہ وہ زیادہ سے زیادہ راضی ہو جائے۔ یقیناً یہ گروہ نجات اور سعادت تک پہونچنے والا ہے۔ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''کل من تمسک بالعروۃ الوثقی فھو ناج''

''جس نے خدائے متعال کی مضبوط رسی کو پکڑ لیا اس نے نجات پائی''

۱۔ المیزان (دار الکتاب الاسلامیہ) ج ۲، ص ۱۰۳

جب معصوم سے سوال کیا گیا کہ خدا کہ مضبوط رسی کو پکڑنے کے کیا معنی ہے؟ تو فرمایا: وہ خدا کے مقابلہ میں تسلیم ہونا ہے [۱]

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ مقام تسلیم کا تصور کرنا ہمارے لئے مشکل ہے۔ ہم اس معنی کو سمجھنے سے قاصر ہیں کیسے کہ انسان ایمان ومعرفت کے ایک ایسے مرحلہ تک پہنچ جاتا ہے کہ اپنے آپ کو فراموش کر دیتا ہے اور صرف خدا کی مرضی پر نظر رکھتا ہے، لیکن اس مقام سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور یقینی طور پر ہم جانتے ہیں کہ خدا کے خاص بندے اس مرحلہ یعنی مقام تسلیم وتفویض تک پہنچے ہیں۔

قضاوقدر پر ایک نظر:

مقام تسلیم تک پہنچنے والوں کے علاوہ، کچھ لوگ اس سے ادنی درجہ پر فائز ہوئے ہیں کہ منجملہ ان میں وہ لوگ ہیں جو ''علم الیقین'' کے مرحلہ تک پہنچے ہیں اور جانتے ہیں کہ اس کائنات کے تمام چھوٹے بڑے حوادث ایک مستحکم نظام کے تحت ہیں کہ جو خدائے متعال کی طرف سے مقدر ہوئے ہیں، اور تقدیر کے علاوہ، حتمی قضا کے مرحلہ تک بھی پہنچے ہیں۔ یعنی تقدیرات کے علاوہ کہ جو خدا کے توسط سے انجام پاتی ہیں اور قابل تغییر ہیں تمام امور قضائے قطعی کے مرحلہ تک بھی پہنچے ہوئے ہیں، کہ جن میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی ہے۔

قضا حکم قطعی اور فیصلہ دینے کے معنی میں ہے اور قدر اندازہ اور حد کو تعیین کرنے کے معنی میں ہے۔ حوادثِ دنیا اس لحاظ سے کہ ان کا واقع ہونا علم ومشیت الٰہی میں قطعی ہے، قضائے الٰہی کا انجام پانا ہے اور اس لحاظ سے کہ حدود، اندازہ اور زمان ومکان کی موقعیت معین ہے تقدیر الٰہی مقدر ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بعض اوقات قضاوقدر کی واضح اور صحیح تفسیر نہ ہونے کی وجہ سے اس میں بعض ابہامات پائے جاتے ہیں اور بہت سے لوگ گمان کرتے ہیں کہ قضاوقدر جبر کے مساوی ہے۔ خلاصہ کے طور پر عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جبر کا مسئلہ قضاوقدر سے کوئی رابطہ نہیں رکھتا ہے اور قضاوقدر پر اعتقاد اس معنی میں نہیں ہے کہ انسان اپنے فرائض کو چھوڑ دے اور خیال کرے کہ سب چیزیں پہلے سے ہی طے شدہ ہیں اور اس پر کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ قاعدہ علیت عمومی اور اسباب ومسببات کا نظام

۱۔ بحار الانوار، ج ۲، ۲۰۴

کائنات اور تمام وقائع وحوادث پر حکم فرما ہے، اور ہر حادثہ نے، ضرورت، وجوب، قطعیت، وجود، شکل اور مکانی وزمانی خصوصیات اور اپنے وجود کی تمام خصوصیات کو اپنی علت سے حاصل کیا ہے اور من جملہ اسباب و علل میں، خود شخص کا ارادہ بھی ہے اور قضاوقدر اس وقت مستلزم جبر ہوگا، جب خود بشر اور اس کے ارادے کو اس میں دخیل نہ جانیں اور قضاوقدر کو بشر کی قدرت، طاقت اور ارادہ کا جانشین تصور کریں۔ حقیقت میں یعنی قضاوقدر الٰہی نظام سبب ومسبب کہ جو اس جہان میں جاری ہے اس کا سرچشمہ ارادہ اور علم الٰہی سے اس کے علاوہ قضاء وقدر الٰہی کوئی چیز نہیں ہے البتہ انسان کا ارادہ وانتخاب بھی من جملہ اسباب وعلل ہے۔ اس بنا پر قضاوقدر پر اعتماد انسان کی تکلیف سے منافات نہیں رکھتا ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ شفا پانے کی غرض سے جن تعویذوں کا استفادہ کیا جاتا ہے، کیا وہ قضاوقدر الٰہی کو روک سکتے ہیں؟ آنحضرتؐ نے جواب میں فرمایا:

"انّها من قدر الله" [1]

یہ خود قدر الٰہی ہیں (یعنی بیماریوں کو شفا بخشنے میں ان کا اثر بھی قضاوقدر الٰہی ہے)

حضرت علی علیہ السلام ایک ٹیڑھی دیوار کے نیچے بیٹھے تھے، اس کے بعد وہاں سے اٹھ کر ایک دوسری دیوار کے سایہ میں بیٹھ گئے، حضرتؑ سے کہا گیا:

"یا امیر المومنین اتفرّ من قضاء الله؟ فقال: افرّ من قضاء الله الی قدر الله" [2]

"اے امیر المومنین! کیا آپؑ قضائے الٰہی سے فرار کرتے ہیں؟ حضرتؑ نے جواب میں فرمایا: قضائے الٰہی سے قدر الٰہی میں پناہ لیتا ہوں۔"

یعنی ایک قسم کی قضاوقدر سے دوسری قسم قضاوقدر میں پناہ لیتا ہوں: اگر میں بیٹھا رہوں اور میرے سر پر دیوار گر جائے تو مجھے قضاوقدر الٰہی کی سزا ملے گی کیونکہ علل واسباب کی روداد کے دوران اگر کوئی انسان ٹوٹی دیوار کے نیچے بیٹھے اور وہ دیوار اس کے سر پر گرے اور اسے صدمہ پہنچے تو یہ خود قضاوقدر الٰہی ہے اور اگر خود اس سے دور ہو جائے، اس خطرہ سے محفوظ رہے تو یہ بھی قضاوقدر الٰہی ہے۔

۱۔ بحار الانوار، ج ۵، ص ۸۷

۲۔ توحید صدوق (موسسۃ النشر الاسلامی) ص ۳۶۹

قابل توجہ مطلب یہ ہے کہ اسباب وعلل، صرف اسباب مادی وعمومی سے مخصوص نہیں ہیں اور ان ظاہری اسباب ۔ جن کو ہم جانتے ہیں۔ کے علاوہ معنوی اور غیر عادی اسباب بھی موجود ہیں۔ منجملہ ان کی دعا اس دنیا کے علل میں سے ایک ہے جو انسان کے مقدر میں موثر ہے۔ دوسرے الفاظ میں دعا قضاوقدر کی زنجیر کی کڑیوں میں سے ایک کڑی ہے کہ کسی حادثہ کو رونما کرنے میں موثر ہو سکتے ہیں یا کسی قضاو قدر کو روک سکتے ہیں، اس لئے فرمایا گیا ہے:

''الدعاء یردّ القضاء و لو ابرم ابراما''[1]

''دعا قضا کو لوٹا دیتی ہے چاہے جس قدر بھی وہ قضا محکم ہو۔''

اس قسم کی احادیث نظام کلی عالم اور تمام علل واسباب اعم از مادی ومعنوی پر ناظر ہیں۔ ایسے موارد کی ناظر ہیں، کہ معنوی علل واسباب، مادی علل واسباب کو ماند کر دیتے ہیں۔ جو انسان صرف مادی اور محسوس علل واسباب کو دیکھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ سبب انہی چیزوں تک محدود ہے اور وہ نہیں جانتا کہ ہزاروں دوسرے علل واسباب بھی ممکن ہے اور قضاوقدر کے حکم کے ساتھ سرگرم ہیں اور جب وہ اسباب وعلل درمیان میں ہوتے ہیں تو مادی اسباب وعلل ماند پڑتے ہیں اور بے اثر ہو جاتے ہیں:

﴿و اذا یریکموھم اذا لتقیتم فی اعینکم قلیلا و یقللکم فی اعینھم لیقضی اللّٰہ امرا کان مفعولا و الی اللّٰہ ترجع الامور﴾ (انفال/۴۴)

''اس وقت کو یاد کرو جب خدا دشمنوں سے مقابلہ کے وقت تمھاری نظروں میں دشمنوں کو کم دکھلا رہا تھا (تا کہ تمہارے دل مضبوط ہو جائیں) اور ان کی نظروں میں تمھیں کم کر کے دکھلا رہا تھا تا کہ اس امر کا فیصلہ کر دے اور تمام امور کی بازگشت خدا کی طرف ہے''۔

بعض لوگ معرفت ویقین کے ایک ایسے مرحلہ تک پہنچ گئے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ کائنات خدائے متعال کے توسط سے ایک دقیق اور حساب شدہ نظام کی بنیاد پر چلتی ہے، اور ہر رودادو ہر حادثہ کا واقع ہونا قضاوقدر کی بنیاد پر ہے اور وہ جانتا ہے کہ تمام چیزیں منجملہ روزی خدائے متعال کے توسط سے مقدر ہوتی ہے اور جس چیز کو خداوند مقدر فرماتا ہے انسان اس سے محروم نہیں ہے وہ واقع نہیں ہوتی ہے اور انسان اسے حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ البتہ جیسا کہ ہم نے کہا اس دقیق وحکیمانہ نظام پر اعتقاد رکھنا تکلیف کے

۱۔

منافی نہیں ہے۔

انسان کے لئے ممکن ہے کہ وہ جبر اور کاہلی میں مبتلا ہوئے بغیر قضاوقدر اور توحید افعالی پر اعتقاد رکھے اور گھر میں بیٹھ کر کہے کہ اب جبکہ ہر چیز خدا کی طرف سے مقدر ہے اور ہم سے کوئی کام انجام نہیں پاسکتا ہے۔ قضاوقدر اور توحید افعالی اور اس قسم کے مسائل پر اعتقاد، مادی ومعنوی مسائل کے بارے میں کوشش وفعالیت اور فردی اجتماعی فرائض کو انجام دینے کی ضرورت کے ساتھ منافی نہیں ہے۔ بہرحال اگر کوئی معرفت کی اس حد تک پہنچ جائے تو اس کے لئے کسی قسم کا خدشہ نہیں ہوگا۔

یقین کی اہمیت اور اس کے مراتب:

اب جبکہ مقام یقین کی بات آگئی تو مناسب ہے یقین کی تعریف اور اس کے مراتب کی طرف ایک سرسری اشارہ کیا جائے:

یقین ایک ثابت و پائدار اور مطابق واقع اعتقاد ہے جو قابل زوال نہیں ہے اور انسان کے لئے آرام وسکون کا سرمایہ ہے۔ بیشک یقین معرفت اور ایک معمولی اعتماد سے برتر ہے اور شریف ترین اور بلند ترین انسانی فضیلت میں اس کا شمار ہے اور بہت کم لوگ ہیں جو اس مرحلہ تک پہونچ سکے ہیں اور یہ وہ عظیم سرمایہ ہے کہ جو بھی اسے حاصل کرلیتا ہے تو گویا اس نے ایک بڑی سعادت تک رسائی حاصل کرلی ہے۔ جو یقین کے مقام تک پہنچا ہے وہ خدا کے علاوہ کسی اور چیز پر توجہ نہیں کرتا ہے وہ صرف خدائے متعال پر بھروسہ کرتا ہے اور غیر خدا کو مؤثر نہیں جانتا حقیقت میں یقین کا مرحلہ مراحل اسلام، نیز ایمان وتقوی کے بعد حاصل ہوتا ہے، چنانچہ حضرت امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں:

"الایمان فوق الاسلام بدرجة و التقوی فوق الایمان بدرجة والیقین فوق التقوی بدرجة وما قسم فی الناس شیء اقل من الیقین"[1]

"ایمان اسلام سے ایک درجہ برتر ہے اور تقوی ایمان سے ایک درجہ برتر ہے اور یقین تقوی سے ایک درجہ برتر ہے اور خدا کے بندوں میں یقین سے کم تر کوئی چیز تقسیم نہیں ہوئی ہے۔"

۱۔ اصول کافی، ج ۳، ص ۸۷

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے، لوگوں کے ساتھ نماز صبح پڑھی، اس وقت مسجد میں آپ کی نظر ایک جوان پر پڑی جو اونگھ رہا تھا اور اس کا سر نیچے گر رہا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑا تھا، اس کا جسم لاغر ہو چکا تھا اور اس کی آنکھیں گہرائی میں چلی گئی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے جوان! تم نے کیسے صبح کی؟

عرض کی: اے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ) یقین کے ساتھ! پیغمبر اسلامؐ نے اس کی بات سن کر تعجب کیا اور فرمایا: ہر یقین کی ایک حقیقت ہے، تمہارے یقین کی حقیقت کیا ہے؟ اس نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ: میرے یقین کی حقیقت نے مجھے غمگین کر دیا ہے۔ راتوں کو مجھے (عبادت کے لئے) بیدار رکھا ہے اور دن کو پیاسا (روزہ دار) رہنے پر مجبور کیا ہے، ظاہری زندگی سے بے رغبت ہو چکا ہوں۔ گویا دیکھ رہا ہوں کہ عرش الٰہی حساب و کتاب کے لئے آمادہ ہے اور لوگ محشور ہو رہے ہیں اور میں بھی ان میں موجود ہوں۔ گویا اہل بہشت کو دیکھ رہا ہوں کہ بہشت کی نعمتوں سے بہرہ مند ہو رہے ہیں، ایک دوسرے سے سرگرم اور تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ گویا اہل جہنم کو دیکھ رہا ہوں کہ جہنم کے عذاب میں مبتلا ہیں اور فریاد بلند کرتے ہوئے مدد چاہتے ہیں۔ گویا اس جہنم کی وحشتناک آواز کو سن رہا ہوں جو اس وقت میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا: یہ وہ بندہ ہے جس کے دل کو خدائے متعال نے ایمان سے منور فرمایا ہے۔

اس کے بعد اس جوان سے کہا: یہ جو حالت رکھتے ہو اس پر پائدار رہنا اور اسے کھو نہ دینا۔ اس کے بعد اس جوان نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ، خدا سے میرے لئے دعا فرمائیں کہ اس کی راہ اور آپ کی رکاب میں مجھے شہادت نصیب ہو۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے لئے دعا کی اور زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایک جنگ میں شرکت کرنے کیلئے باہر گیا اور نو افراد کے بعد شہید ہو گیا، وہ دسواں شہید تھا۔ [1]

یقین کے تین مراحل ہیں:

۱۔ علم الیقین

۱۔ اصول کافی، ج ۳، ص ۸۹

۲۔عین الیقین

۳۔حق الیقین

قرآن مجید میں مذکورہ تینوں مراحل کا واضح طور پر ذکر آیا ہے:

﴿کلا لو تعلمون علم الیقین لترون الجحیم ثم لترونها عین الیقین"﴾

(تکاثر /۵۔۷)

''دیکھو اگر تمہیں یقینی علم ہو جاتا، تم جہنم کو ضرور دیکھتے پھر اسے اپنی چشم بصیرت اور نگاہ یقین سے دیکھتے''

﴿ان هذا لهو حق الیقین﴾ (واقعه/۹۵)

یہ (جہنم کا وعدہ) البتہ یقینی اور حقیقت ہے۔

۱۔علم الیقین: سے مراد پائدار اعتقاد اور واقع کے مطابق یقین ہے، جو لازم وملزوم کے استدلال کی راہ سے حاصل ہوتا ہے، جیسے دھویں کا مشاہدہ کر کے آگ کے وجود کا یقین۔[۱]

خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے:

﴿سنریهم آیاتنا فی الآفاق و فی انفسهم حتی یتبیّن لهم انه الحق اولم یکف بربک انه علی کل شی ء شهید﴾ (فصّلت/ ۵۳)

''ہم عنقریب اپنی نشانیوں کو تمام اطراف عالم میں اور خود ان کے نفس کے اندر دکھلائیں گے تا کہ ان پر یہ بات واضح ہو جائے کہ وہ برحق ہے اور کیا پروردگار کے لئے یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ ہر شے کا گواہ اور سب کا دیکھنے والا ہے۔''

اس آیت میں آفاقی وانفسی آیات کے ذریعہ خدا کے وجود پر استدلال ہوا ہے۔

۲۔عین الیقین: مراد یہ ہے وہ اعتقادات جو مطلوب کو دیکھنے اور چشم بصیرت سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ دیکھنا، روشنی اور اجالے میں ظاہری آنکھوں سے دیکھنے سے زیادہ قوی ہے۔[۲]

یقین کے اس مرحلے کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے توحید صدوق میں آیا ہے:

۱۔جامع السعادت، ج۱، ص۱۲۳

۲۔جامع السعادت، ج۱، ص۱۲۴

"جاء حبر الی امیر المؤمنین علیه السلام فقال: یا امیر المؤمنین هل رایت ربک حین عبدته؟ فقال: ویلک، ما کنت اعبد ربا لم اره. قال: و کیف رایته؟ قال: ویلک لاتدرکه العیون فی مشاهدة الابصار و لکن رأته القلوب بحقائق الایمان"۱

"اہل کتاب کا ایک دانشمند امیر المومنین کے پاس آیا اور کہا: اے امیر المومنین! کیا عبادت کے دوران آپ نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟ علی علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: افسوس ہو تم پر، میں اس پروردگار کی عبادت نہیں کرتا ہوں جسے میں نے نہ دیکھا ہو۔ اس نے کہا: خدا کو کیسے دیکھا؟ جواب میں فرمایا: افسوس ہو تم پر، آنکھیں اپنے مشاہدہ میں اسے درک نہیں کرتی ہیں (خدائے متعال ظاہری آنکھوں سے دیکھا نہیں جاسکتا) بلکہ (چشم بصیرت اور) ایمان حقیقی اور راسخ دل نے اس کو دیکھا ہے"

۳۔ حق الیقین: وہ اعتقاد راسخ ہے جو خودشی کو پانے اس کے ساتھ حقیقی رابطہ پیدا کرنے سے حاصل ہوتا ہے، اس طرح کہ صاحب یقین اپنی چشم بصیرت سے نور کے فیوضات کو اس کی طرف سے مشاہدہ کرتا ہے۔

اس مرحلہ کا نتیجہ فنا فی اللہ اور اس کے عشق و محبت میں محو ہونا ہے، ایسے کہ اپنے لئے کسی استقلال اور اہمیت کا قائل نہیں ہوتا، یہ مرحلہ آگ میں کود کر جلنے کے مانند۔ ۲

حدیث قدسی میں آیا ہے:

"...و ما یتقرب الیّ عبد من عبادی بشی ء احبّ الیّ ممّا افترضت علیه و انّه لیتقرب الیّ بالنّا فلة حتی احبّه فاذا احببته کنت اذا سمعه الذی یسمع به و بصره الذی یبصر به و لسانه الّذی ینطق به و یده الذی یبطش بها" ۳

۱۔ توحید صدوق (موسسہ النشر الاسلامی) ص ۱۰۹

۲۔

۳۔

''میرا بندہ واجب کی ہوئی چیز سے محبوب تر کسی چیز سے مجھ سے نزدیک نہیں ہوتا ہے اور نافلہ کے ذریعہ مجھ سے قریب ہوتا ہے تا کہ اسے دوست رکھوں۔ جب میں اسے دوست بنالیتا ہوں تو میں اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کی زبان ہو جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے اور میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے''

امام سجاد علیہ السلام دعائے ابوحمزہ ثمالی میں فرماتے ہیں:

''اللّٰھم انّی اسئلک ایمانا تباشر به قلبی و یقینا صادقا حتّی اعلم انه لن یصیبنی الا ما کتبت و رضّنی من العیش بما قسمت لی یا ارحم الرّاحمین.''

''خدایا! تجھ سے اسے ایمان کی درخواست کرتا ہوں جس سے میرا دل وابستہ ہو (یعنی باطنی اور قلبی ایمان نہ ایمان سطحی و زبانی) اور مجھے ایسے اعتقاد پر ثابت قدم رکھ تا کہ سچا یقین پیدا کر سکوں اور مجھے اس کے سوا کچھ نہ ملے جسے تم نے میرے لئے مقدر کر رکھا ہے اور مجھے اس پر راضی اور خوشحال بنانا جو تو نے مجھے عطا کیا ہے (وہی زندگی جو مجھے عنایت کی ہے) اے رحم کرنے والوں میں سب سے رحم کرنے والے۔''

امام علیہ السلام خدائے متعال سے ایک واقعی اور پائدار ایمان کی درخواست کرتے ہیں جو یقین کے مرحلہ تک پہنچا ہو اور حقیقت میں ایمان کے آخری مرحلہ کی درخواست کرتے ہیں، چونکہ اس کے بعد فرماتے ہیں: ''ویقیناً صادقا...'' جس یقین صادق کو امامؑ خدا سے چاہتے ہیں وہ اہم ترین عنایت و نعمت الٰہی ہے، جو یقین صادق اور حق الیقین کے نتیجے میں انسان کو ایک ایسا قلبی اعتقاد حاصل ہوتا ہے کہ پروردگار عالم کی قدرت کے علاوہ کسی طاقت کو کائنات پر حاکم نہیں جانتا ہے اور وہ تمام امور کو خدا کی طرف منسوب کرتا ہے اور ہمیشہ اپنے آپ کو خدا کے حضور میں دیکھتا ہے اور وہ اس بات کی طرف متوجہ ہے کہ کوئی ناشائستہ کردار اس سے سرزد نہ ہو اور خدا کی مرضی کے خلاف کوئی عمل انجام نہ پائے۔

روایتوں میں یقین کا مرتبہ انسان کے لئے خدا کی ایک بڑی نعمت ذکر ہوئی ہے اور جیسا کہ پہلے نقل ہوا کہ امام رضا علیہ السلام نے فرمایا ہے:

''انسان کے درمیان یقین سے کم تر کوئی چیز تقسیم نہیں ہوئی ہے، یعنی بہت کم ہیں ایسے لوگ ہیں جو یقین کے مرحلہ تک پہنچے ہیں۔''

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''لا یجد عبد طعم الایمان حتی یعلم انّ ما اصابه لم یکم لیخطئه و انّ ما اخطاه لم یکن لیصبه و انّ الضّار النافع هو الله عزّوجل''[1]

''کوئی بھی بندہ ایمان کے مزہ کو نہیں چکھتا ہے یہاں تک جان لے کہ جو کچھ اسے ملا ہے، وہ اس سے دور نہیں ہوگا اور جو کچھ اس سے دور ہوا ہے وہ اسے نہیں ملے گا اور یہ کہ نفع اور نقصان پہنچانے والا تنہا خدائے متعال ہے''

اگر انسان یقین و معرفت کی اس بلند مرحلہ تک پہنچ جائے کہ یقین کرے کہ ہر مصیبت و مشکلات اور ہر خیر جو اسے ملا ہے، ممکن نہیں تھا کہ اسے نہ ملے اور جو کچھ اسے نہیں ملا ہے، وہ ملنے والا نہیں تھا، تو وہ اپنے اندر ایک خاص آرام و سکون کا احساس کرتا ہے اور ایمان کی حلاوت پاتا ہے۔ اور جو معرفت کی اس حد تک پہنچ جائے، اگر چہ وہ مادی و معنوی لذتوں کا خواہشمند ہے، لیکن وہ جانتا ہے کہ ہر چیز کے لئے ایک حساب و کتاب ہے اور ایک خاص نظام کی بنیاد پر اسے ملتی ہے اور ایسا نہیں ہے کہ جو بھی چاہے اسے ملے گا اور جو نہ چاہے اس سے روک دیا جائے گا۔ بہت سے چیزیں جنھیں انسان نہیں چاہتا ہے، وہ خدا کی مصلحت کی بنیاد پر اس کے لئے مقدر ہوتی ہے اور اس کے برعکس بھی ممکن ہے ایسے چیزیں جنھیں ہم چاہتے ہیں، لیکن مصلحت الٰہی کا تقاضا نہیں ہے کہ وہ چیزیں ہمیں ملیں، لہذا جتنی بھی جستجو کریں ہم ان تک نہیں پہنچتے۔

اولیائے الٰہی اور تقدیرات الٰہی پر رضامندی:

یقین کی منزل تک پہنچنے کے بعد انسان اپنی خواہشات اور مطالبات کو نظر انداز کرتا ہے اور خدا کی مرضی پر امید رکھتا ہے اور اس کے بعد اپنے وقت کو حاصل نہ ہونے والی آرزوؤں اور خواہشات کے بارے میں سوچنے پر صرف نہیں کرتا ہے اور صرف اپنے فرائض اور تکالیف انجام دینے کا عزم و ارادہ کرتا ہے۔ وہ اس فکر میں ہوتا ہے کہ خدائے متعال اس سے کیا چاہتا ہے اور جو کچھ اس کے لئے مقدر (تقدیر میں) ہے اسی

۱۔ اصول کافی، ج ۳، ص ۹۷

پر راضی ہوتا ہے۔ اہل یقین اس کے علاوہ کہ وہ جانتے ہیں جو ان کے مقدر میں ہے وہ انھیں ملے گا، یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کے لئے خیر مقدرات الٰہی میں ہے۔ یعنی احسن نظام کے بارے میں آگاہ ہیں اور جانتے ہیں کہ جو کچھ خدائے متعال نے مقدر فرمایا ہے وہ ان کے لئے بہترین ہے، اور خدا کی طرف سے مقدر ہوئی چیز، نظام کلی عالم کا ایک جز ہے اور وہ بہترین نظام ہے اور ایک خاص اسباب وشرائط اور خاص زمان ومکان کے پیش نظر جو کچھ ہوا ہے اس سے بہتر انجام پانا ممکن نہیں ہے۔ جی ہاں! جو معرفت کی اس حد تک پہونچا ہے کہ وہ یقین رکھتے ہیں جو بھی خدا چاہے گا وہ انھیں ملے گا، وہ اپر خوش ہوتے ہیں اور فکر مند نہیں ہوتے: انھیں اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کھلے دل سے اس کا استقبال کرتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کی خیر اسی میں ہے جو رونما ہوا ہے، یہ مقام رضا ہے۔

مقام رضا کے مالک وہ ہوتے ہیں جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ تمام تقدیرات الٰہی بندوں کے فائدہ میں ہے، اس سلسلہ میں فراوان حدیثیں پائی جاتی ہیں من جملہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"عجب للمرء المسلم لا یقضی اللّٰہ عزّوجل له قضاء اَلا کان خیرا له و ان قرض بالمقاریض کان خیرا له و ان ملک مشارق الارض و مغاربها کان خیرا له"[1]

"میں تعجب میں ہوں اس مسلمان کے بارے میں کہ خدائے متعال اس کے لئے اس کے سواء کوئی سرنوشت وتقدیر معین نہ کرے مگر یہ کہ اس میں اس کے لئے خیر ہو، اگر اس کے بدن کے قینچی سے ٹکڑے ٹکڑے کردے تو بھی اس میں اس کے لئے خیر ہے اور اگر اسے تمام مشرق ومغرب کی زمینوں کا مالک بنادے تو بھی اس میں خیر ہے"

امامؑ فرماتے ہیں کہ تمام تقدیرات جو خدا نے مومن کے لئے معین کی ہیں وہ خیر ہیں، خواہ وہ ظاہر میں پسندیدہ ہوں یا ناپسندیدہ۔ ناپسندیدہ حوادث جو پیش آتے ہیں وہ یا تو اس کی صلاح کے لئے یا اخروی صلاح کے لئے۔ جو بھی اس قسم کی معرفت پیدا کرے کہ جو پیش آئے اس سے خوش اور اسی پر راضی رہے، بندگی کے مقام پر کوتاہی نہ کرے، اپنے فریضہ کو انجام دے، تو اس کو یہ فکر وپریشانی نہیں ہوتی کہ اس کا رزق

۱۔ اصول کافی، ج ۳، ص ۱۰۲/

کم ہے یا زیادہ یا یہ کہ کیا پیش آنے والا ہے، اس پر خائف نہیں ہوتا ہے، اس نے اپنے کام کو خدا کے سپرد کر دیا ہے اور خود عبادت و بندگی میں مصروف ہے اور تہہ دل سے جانتا ہے جو بھی پیش آتا ہے اسی میں خیر و بھلائی ہے اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں دیکھتا ہے۔

وہ تمام حوادث اور رودادوں پر خوش فہمی سے نظر ڈالتا ہے اور مصیبتوں اور مشکلات پر راضی ہوتا ہے۔ اگر جیل میں ڈال دیا جائے تو شکوہ نہیں کرتا، روایت کی تعبیر کے مطابق اگر اس کے بدن کے قینچی سے ٹکڑے ٹکڑے کئے جائیں، تو ہی خوش ہوتا ہے، کیونکہ وہ اپنی خیر کو اسی میں دیکھتا ہے۔

ہم نے انقلاب اور جنگ کے دوران ایسے افراد کو دیکھا ہے جو کچھ انھیں پیش آتا تھا اس کا کھلے دل سے استقبال کرتے تھے۔ محاذ جنگ پر ایسی مائیں، باپ، بھائی، بہنیں اور شہید کی بیوی بچے ہوتے تھے کہ ان کے عزیزوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے بدن یا جلے ہوئے جنازے ان کے پاس لائے جاتے تھے، لیکن وہ ہنسی خوشی اور فخر کے ساتھ اس روداد پر خدا کا شکر بجالاتے تھے!

تقدیرات الٰہی پر راضی ہونے اور پیش آنے والی مصیبتوں پر خوش ہونے کے بارے میں کہنا آسان ہے، لیکن میدان عمل میں اترنا بہت مشکل ہے۔ اس معنی کو درک کرنا بہت دشوار ہے، کیسے بعض خدا کے بندے ایسے بلند مقام تک پہنچتے ہیں کہ رونما ہونے والے حوادث کے بارے میں انھیں کسی قسم کی کوئی پریشانی لاحق نہیں ہے، ان کے لئے کوئی فرق نہیں ہے کہ کل کیا پیش آنے والا ہے، ان کا رزق ملے گا یا نہیں۔ اگر ان کا کوئی عزیز محاذ جنگ پر گیا ہے تو انھیں اس کے قتل ہونے کی کوئی فکر و پریشانی نہیں ہے یا اگر خود فداکاروں کے ہمراہ محاذ جنگ کا رخ کیا ہے، تو اسے گھر بار کی کوئی فکر نہیں ہے، کیونکہ جس نے اپنے جان اور پوری ہستی کو اخلاص کی ہتھیلی پر رکھا ہے، شہادت کے لئے آمادہ ہے، تو وہ گھر بار کی فکر میں نہیں ہوسکتا ہے کیا اچھا ہوتا اگر جمال یار کے متوالے زندہ بچ کر صحیح و سالم اپنے گھر واپس لوٹتے، اور ان بلند معنوی جذبات اور خصوصیات کو حفظ کر کے قضائے الٰہی اور تسلیم کے بارے میں لوگوں کو ہمیشہ فداکاری و رضامندی کا سبق دیتے اور ان کی زبان پر یہ ہوتا:

گر درد دہد بہ ما و گر راحت دوست　　از دوست ہر آنچہ آید نیکوست
مارا نبود نظر بہ نیکی و بدی　　مقصود رضا و خوشنودی اوست

(مجھے دوست کی طرف سے درد ملے یا آرام و سکون، دوست کی طرف سے جو بھی ملے اچھائی ہے۔

ہمیں نیکی و بدی سے سروکار نہیں ہے، بلکہ ہمارا مقصود اس (خدا) کی رضا و خوشنودی ہے)

مرحوم ملا مہدی نراقی فرماتے ہیں: قضائے الٰہی پر راضی ہونا دین کے بلند ترین مقامات اور مقربین کے شریف ترین منازل میں سے ہے اور یہ پروردگار کا عظیم دروازہ ہے۔ جو اس دروازہ سے داخل ہو جائے، بہشت میں وارد ہوتا ہے۔ مقام رضا کی اہمیت اس حد تک ہے کہ پیغمبرؐ سے نقل کی گئی ایک روایت میں آیا ہے کہ قیامت کے دن خدائے متعال میری امت میں سے ایک گروہ کو ایسے بال و پر عطا کرے گا جن کے ذریعہ وہ اپنی قبروں سے بہشت کی طرف پرواز کریں گے اور من پسند بہشت کی نعمتوں سے استفادہ کریں گے۔ ملائکہ ان سے سوال کریں گے: کیا تم نے حساب لینے کی موقف کو دیکھا؟ وہ کہیں گے: ہم سے کوئی حساب نہیں مانگا گیا۔ ان سے پوچھیں گے: کیا تم لوگوں نے پل صراط کو عبور کیا؟ جواب میں کہیں گے: ہم نے کوئی پل صراط نہیں دیکھا۔ پوچھیں گے: کیا جہنم کو دیکھا؟ کہیں گے: ہم نے کسی جہنم کو نہیں دیکھا۔ ملائکہ ان سے سوال کریں گے: تم لوگ کس کی امت سے ہو؟ جواب دیں گے: ہم امتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہیں۔

ملائکہ انھیں قسم دلا کے پوچھیں گے: تم لوگ دنیا میں کیا کرتے تھے اور کس طرح کا عقیدہ و تصور رکھتے تھے؟ کہیں گے: ہم میں دو خصلتیں تھیں اور خدائے متعال نے ہمیں انہی دو خصلتوں کی وجہ سے اپنی ان رحمتوں سے نوازا ہے اور نتیجہ میں اس مقام پر پہنچایا ہے:

"کنّا اذا خلونا نستحیی ان نعصیه ونرضی بالیسیر مما قسّم لنا" [1]

پہلی خصلت یہ کہ ہم خلوت میں ہونے کے باوجود بھی معصیت انجام دینے میں خدا سے شرم و حیا محسوس کرتے تھے۔ دوسری یہ کہ ہم اس پر راضی تھے جو خدا نے ہمارے مقدر میں رکھا تھا۔ [2]

خدائے متعال مقام رضا پر پہنچے ہوئے افراد کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿یا ایتها النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیة﴾ (فجر/۲۷۔۲۸)

یہ آیہ شریفہ مقام رضا و اطمینان کو بیان کرتی ہے جو انسان سے ہر قسم کے اضطراب، پریشانی اور تشویش

۱۔ بحار الانوار، ج ۱۰۳، ص ۲۵

۲۔ جامع السعادات، ج ۳، ص ۲۰۲

کے دور ہونے کا سبب ہے۔اس مقام کی خصوصیت یہ ہے کہ انسان راضی بھی ہے مرضی بھی، یہ معنی دوسری آیت میں یوں بیان ہوا ہے:

﴿رضی اللّٰہ عنھم و رضوا عنہ....﴾ (مائدہ/ ۱۱۹)

''پروردگار ان سے راضی ہے اور وہ بھی پروردگار سے راضی ہیں''

کلمہ((راضیۃ))اور((مرضیہ کے بارے میں علامہ طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ اس آیہ مبارکہ کے ضمن میں فرماتے ہیں:

''اگر خدائے متعال نے نفس مطمئنہ کو''راضیہ''و''مرضیہ'' سے توصیف فرمایا ہے وہ اس لئے ہے کہ پروردگار سے دل کے اطمینان وسکون حاصل کرنے کا تقاضا ہے کہ انسان خدا سے راضی ہو اور جو بھی قضاوقدر اس کے لئے مقدر فرمائے، اس پر کسی قسم کا اعتراض نہ کرے، خواہ وہ قضاوقدر تکوینی ہو یا مکتوبی کہ جسے خدا نے شرعی حیثیت دی ہو۔پس کوئی بھی غضب و غصہ پیدا کرنے والا حادثہ اسے خشمگین نہیں کرتا ہے اور کوئی گناہ اس کا دل کو منحرف نہیں کرتا ہے اور جب بندہ خدائے متعال سے راضی ہوگیا تو قہری طور پر خدائے متعال بھی اس سے راضی ہوگا، چونکہ بندہ کا خدا کی بندگی کی حالت سے خارج ہونے کے علاوہ کوئی اور عامل اسے غضبناک نہیں کرتا ہے اور جب خدا کا بندہ عبودیت کی راہ میں قدم رکھتا ہے تو خدا کی رضامندی کا حقدار بن جاتا ہے، لہذا خدائے متعال نے کلمہ''راضیہ''و''مرضیہ'' کو استعمال کیا ہے''

لہذا انسان کے لئے مکمل اطمینان و آرام اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ خدائے متعال سے راضی ہوتا ہے۔دوسرے سے راضی ہونا اس معنی میں ہے کہ انسان اس کی صفات وافعال کو پسند کرتا ہے اور شخص موحد کو جب معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کے تمام امور تدبیر الٰہی کے تحت ہیں اور جب وہ مقام رضا تک پہونچ جاتا ہے، تو وہ کسی بھی حادثہ وروداد سے پریشان نہیں ہوتا ہے، کیونکہ وہ اس حادثہ کو خدائے متعال کی طرف سے دیکھتا ہے اور اس کے ارتباط کو ذات حق سے درک کرتا ہے۔وہ جانتا ہے کہ خدا کے اذن، ارادہ اور مشیت کے بغیر کوئی حادثہ رونما نہیں ہوسکتا اور ناراض نہ ہونے کے علاوہ، اس کے پیش نظر کہ وہ حادثہ خدا کی مرضی کی بنیاد پر رونما ہوا ہے، اس سے خوش ہوتا ہے۔

حقیقت میں مقام رضا مقام صبر سے بالاتر ہے، چونکہ صبر ناراضگی سے بھی سازگار ہے؛ انسان دانت پیس کر صبر کرتا ہے، کیونکہ وہ حادثہ اس کے لئے تلخ ہے۔ لیکن جو شخص مقام رضا تک پہنچا ہے، وہ سختی اور دشواری کو درک نہیں کرتا ہے تا کہ اس پر صبر کرے، بلکہ تمام چیزیں اس کے لئے شیریں ہوتی ہیں، جو بھی پیش آئے اسے پسند ہے، پریشانی کی اس کے لئے کوئی بات نہیں ہے۔

یقیناً اس مقام کے بارے میں تصور کرنا ہمارے لئے مشکل ہے، چہ جائے کہ ہم اس مقام کو حاصل کریں کیسے ممکن ہے ایک انسان اپنی صحت وسلامتی سے بھی راضی ہو اور بیماری سے بھی راضی ہو! اگر دولت مند ہے تو اپنی دولت سے بھی راضی ہے اور اگر فقیر ہو جائے تو اپنی فقیری سے بھی راضی ہے! اس سے بڑھکر یہ کہ، جو افراد مقام رضا تک پہنچے ہیں، انھوں حالت نفسانی، (فطرت) اور رضایت نفسانی یعنی وہ اعمال کہ جو ظاہراً رضایت سے سازگاری نہیں رکھتے ہیں دونوں کو جمع کیا ہے:

یقیناً ائمہ اطہار علیہ السلام من جملہ امام حسین علیہ السلام مقام رضا کے بالاترین مرحلہ پر فائز تھے اور ہم دیکھتے ہیں جو کچھ انھیں پیش آتا تھا، اس لحاظ سے کہ خدا کی طرف سے تھا راضی تھے، لیکن پھر بھی ناراض تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے شمشیر بکف ہوکر جہاد کیا اور آخری لمحۂ حیات تک جنگ کرتے رہے۔ یہ جہاد کرنا اس وجہ سے تھا کہ وہ بنی امیہ کی حکومت سے راضی نہیں تھے۔ کیسے ممکن ہے انسان ایک حادثہ سے اس لحاظ سے کہ خدا کی طرف سے ہے راضی بھی ہو اور ناراض بھی!۔ ان دو کے درمیان فرق کرنا دشوار ہے اور انسان کو چاہئے کہ تکامل کے ان مراحل تک پہونچ جائے تا کہ مراتب اور حیثیتوں کو ایک دوسرے سے جدا کر سکے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ انسان کا نفس مراتب طولی کے اعتبار سے مختلف صورتوں کا مالک ہوتا کہ ایک مرتبہ میں حوادث کو اس کے فاعل قریب کی حیثیت سے دیکھے اور اس کیرفتار سے ناراض ہو۔ ان کے انجام دئے جانے والے گناہ، ظلم اور خیانتوں سے ناراض ہو اور ان پر حملہ آور ہو جائے، اور عین اسی حالت میں دوسرے مرتبہ پر اس کا نفس شاد و مسرور ہو۔

ذہن کو اس مطلب و مفہوم سے قریب کرنے کے لئے ایک مثال پیش کرتا ہوں: فرض کریں کسی کے سر میں درد ہے اور طبیب اس کے لئے ایک کڑوی دوا تجویز کرتا ہے، یہاں پر انسان چونکہ اپنی سلامتی چاہتا ہے اس لئے اس دوا کو کھاتا ہے، اس لحاظ سے اس کے کھانے پر راضی ہے، لیکن اس لحاظ سے کہ یہ دوا تلخ ہے ناراض ہے۔ اگر کسی کے ہاتھ میں انفکشن ہو گیا ہے اگر اسے نہ کاٹا جائے تو وہ مرض اس کے سارے

بدن میں سراعت کر جائیگا اور اس کی جان خطرے میں پڑ جائیگی تو وہ شخص اپنے ہاتھ یا پیر کے کاٹے جانے پر راضی ہو جاتا ہے کیونکہ اسی میں اس کی جان کا تحفظ ہے اور وہ عمل اس کے لئے ناراض کنندہ نہیں ہے، لیکن اس لحاظ سے کہ ایک ہاتھ سے محروم ہو جائیگا ناراض ہے خاص کر درد واذیت اور وہ پریشانیاں جو آپریشن کے بعد رونما ہوتی ہیں۔ حقیقت میں انسان کے اندر اس دورخی حالت اور خاصیت کا وجود عجیب وغریب ہے کہ ایک ہی لمحہ میں، ایک حادثہ کے بارے میں دو مختلف حالتوں سے روبرو ہوتا ہے البتہ ان دونوں حالتوں کا وجود دوسرے دو مختلف عوامل کا حاصل اور نتیجہ ہے، جب وہ سوچتا ہے کہ ہاتھ کا کاٹا جانا اس کی سلامتی کا سبب ہے، تو خوش ہوتا ہے اور اس لحاظ سے کہ اپنے ایک ہاتھ سے محروم ہو رہا ہے اور درد کی سختی کر رہا برداشت کرتا ہے، تو ناراض ہوتا ہے۔

مذکورہ مثال کے پیش نظر ہم عرض کرتے ہیں: جس انسان کی معرفت کمال تک پہنچ گئی ہے، وہ جانتا ہے کہ دنیا کے حوادث خدائے متعال کے ارادہ کے بغیر رونما نہیں ہوتے ہیں لہذا وہ اس لحاظ سے کہ وہ حوادث خدا کے ارادہ سے رونما ہوئے ہیں راضی ہے، لیکن اس لحاظ سے کہ وہ حوادث ایک ظالم کے توسط سے انجام پائے ہیں اور وہ اس ظالم کی پستی و، انحطاط نیز اس کے جودی نقص کی علامت ہے، لہٰذا ناراض ہے کہ ایک انسان کو کیوں اس قدر جاہل و گناہگار ہو کہ اس طرح کے نازیبا اور ناشائستہ عمل کا مرتکب ہو۔ لہذا ممکن ہے انسان ایک حادثہ کے بارے میں دو نظریہ رکھتا ہو اور ہر نظریہ کے مقابلہ میں متناسب ردعمل دکھائے۔

مومن کو اس جہت سے خوش ہونا چاہئے کہ حوادث ومصائب خدا کے ارادہ اور مشیت سے رونما ہوئے ہیں، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدائے متعال کسی کام کو حکمت کے بغیر انجام نہیں دیتا ہے اور احسن نظام کا تقاضا ہے کہ حوادث کو اپنی جگہ پر مناسب شرائط سے جس طرح واقع ہونا چاہئے اسی صورت میں رونما ہو۔ جب اسے معلوم ہوا کہ خدائے متعال حکیم ودانا ہے اور لغو وبیہودہ کام انجام نہیں دیتا ہے، تو وہ جانتا ہے کہ جو کچھ اس دنیا میں رونما ہوتا ہے، اس جہت سے کہ ایک ہم آہنگ اور کامل نظام کے تحت ہے، جو مخلوقات عالم کے لئے تکامل کا سبب ہے اور انسان ان گوناگوں حوادث کے سایہ میں خداوند متعال سے نزدیک ہوتا ہے اور ایسے کمالات تک پہونچتا ہے جو دنیوی لذتوں سے قابل موازنہ نہیں ہے، لہذا مومن مجموعی حوادث کی نسبت کلی طور پر خوش ہیں۔ یہاں تک اس نظریہ کے مطابق پیغمبروں اور ائمہ کے قتل ہونے سے بھی ناراض نہیں ہوتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ شہادت کے درجۂ رفیعہ پر فائز ہو کر ایک بلند مرتبہ پر پہونچ گئیں اور

اسی طرح ان کی شہادت دین کی ترقی اور پیش رفت کا سبب بنی ہے۔

سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی شہادت کے ذریعہ بلند ترین مقام تک پہنچے اور آن کی شہادت اسلام کے بقا اور پیش رفت کا سبب بنی اور اس امر کا بھی سبب بنی کہ دوسرے لوگ بھی آپؑ کی معرفت اور یاد کے سایہ میں معنوی کمالات تک پہونچیں اور صحیح زندگی اور دنیوی واخروی سعادت کی راہ کو پہچان لیں۔ اگر آپؑ شہید نہ ہوتے، تو نہ آپؑ اس مقام تک پہنچتے، نہ اسلام زندہ ہوتا اور نہ ہم امام شناس ہوتے تا کہ آپؑ کی شفاعت ہمیں نصیب ہو۔ اس جہت سے ہمیں آپؑ کی شہادت سے خوش ہونا چاہئے کہ یہ تقدیر الٰہی ہے اور ایک احسن واصلح نظام کی کڑی میں مؤثر ہے۔ لیکن غمگین اور آنسو بہانا انسانی جذبات او رہمدردی کی جہت سے ہے، چونکہ انسان ایک مہربان اور ہمدرد مخلوق ہے اور اس کی ہمدردی کا تقاضا ہے کہ جب اس کے محبوب کو کوئی مصیبت اور مشکل پیش آئے تو وہ غمگین ہو۔

جی ہاں، ضعیف افراد وہ چاقت نہیں رکھتے ہیں جو ان حیثیتوں کو ایک دوسرے سے جدا کریں اور پھر ایک دوسرے کی ردیف میں قرار دیں اور بعض اوقات ان کے وجود کا عقلانی اور جذباتی پہلو ایک دوسرے سے تزاحم وتضاد کا حامل ہوتا ہے، اس جہت سے وہ ان دونوں کو آپس میں جمع نہیں کر سکتے۔ لیکن جن کا نفس کامل ہے، وہ ان دنوں حیثیتوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں اور حیثیتوں کا جدا ہونا سبب بن جاتا ہے کہ مختلف حالات حتی ایک ہی حادثہ کے بارے میں اور ایک ہی زمانہ میں خود بخود رونما ہوں، کہ البتہ یہ نفس کے گوناگوں مراتب سے مربوط ہے کہ ایک جہت سے نفس شاد ہوتا ہے اور دوسری سے غمگین ہوتا ہے۔

جی ہاں، جو شخص مقام رضا پر فائز ہے وہ خوشیوں اور غموں کو، اس جہت سے کہ تقدیر الٰہی ہے دل وجان سے قبول کرتا ہے اور ان پر راضی ہوتا ہے۔

مقامِ صبر اور اس کی اہمیت پر ایک نظر:

بہر حال مقام، رضا اور معرفت ویقین، ایک عظیم نعمت اور بلند عطیہ ہے کہ انسان تمام تقدیرات الٰہی پر راضی وخوشنود ہو، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ پروردگار اس کی بھلائی چاہتا ہے۔ لیکن ہر شخص اس مقام پر فائز نہیں ہوتا ہے اور یہ معرفت آسانی کے ساتھ حاصل نہیں ہوتی ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیتہذیب نفس

اور بہت زیادہ کوشش کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی اس بلند مقام تک نہیں پہونچ سکا، تو مختصر طور پر اسے جان لینا چاہئے کہ تقدیرات الٰہی انسان کے لئے خیر ہے اگر چہ مشکلات اور سختیوں کو برداشت کرنا اس کے لئے تلخ و دشوار ہے، لیکن اسے صبر و تحمل کا مظاہر کرنا چاہئے اور خود کو صبر کے زیور سے مزین کرنا چاہئے۔ جو مومن رضا کے مقام تک نہیں پہنچا ہے، لیکن حوادث کے مقابلہ میں صابر اور ثابت قدم ہے، اگر چہ وہ نہیں چاہتا ہے کہ تلخ حوادث دنیا میں رونما ہوں، اور وہ اپنے فرائض پر عمل کرتا ہے اور اپنے فریضہ کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا ہے، اگر کبھی دشمن کے ساتھ جہاد و مبارزہ کا موقع آ گیا تو وہ اپنے فریضہ الٰہی کے تحت جہاد و مبارزہ کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے باوجود یکہ وہ تلخ حوادث سے خوش نہیں ہے اور دل سے راضی نہیں ہے، لیکن اسے قبول کرتا ہے اور اگر سختی و پریشانی بھی ہوئی تو اسے برداشت کر لیتا ہے، یہ اس کے لئے ہے جو مقام رضا تک نہیں پہنچا ہے، اس لئے کہ مقام صبر مقام رضا سے کمتر ہے، لہٰذا مطلوب ہے۔

صبر، مفاہیم اخلاقی میں سے ایک ہے کہ اخلاق اسلامی میں اس پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ جو کچھ اس لفظ سے ذہن میں آتا ہے، وہ ایک نفسانی حالت ہے جو بعض خاص افراد کے لئے مشکلات، مصیبتوں کے وقت پیش آتی ہے۔

حوادث سے روبرو ہوتے وقت، لوگوں کے حالات متفاوت ہوتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے حوادث کے مقابلہ میں فوراً رونا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں، یہ پریشان کن حالت ان کی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور انھیں ان کے امور اور فعالیتے معطل کر کے رکھ دیتی ہے، ایسے لوگ بے صبر و کمزور تصور کئے جاتیہیں اس کے برخلاف بعض افراد سختیوں اور مشکلات کے مقابلہ میں بہت صابر آزما ہوتے ہیں اور آرام و سکون کا مظاہرہ کرتے ہیں اور تلخ حوادث ان طبیعت میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں کرتے، یہ لوگ صبر و تحمل والے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اگر چہ تلخ حوادث کے بارے میں دل سے راضی نہیں ہوتے، لیکن انھیں برداشت کرتے ہوئے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ نا مناسب حوادث کا استقبال نہیں کرتے، ان کا دل نہیں چاہتا ہے کہ وہ محاذ جنگ پر جائیں اور شہید ہو جائیں وہ باردی سرنگوں پر جانا نہیں چاہتے ہیں، لیکن جب فریضہ و تکلیف کا تقاضا ہوتا ہے کہ محاذ جنگ پر جائیں، ایسی صورت میں روگردانی نہیں کرتے ہیں، ان کے ماں باپ نہیں چاہتے ہیں کہ ان کا فرزند محاذ جگ پر جائے لیکن جب شرعی فریضہ کے سخت جہاد واجب ہو جاتا ہے تو وہ اپنے بیٹوں کے درمیان حائل نہیں ہوتے ہیں اور صبر کرتے ہیں اور اپنے دانت پیستے ہیں

اور جانتے ہیں کہ انسان صبر و تحمل سے مشکلات اور مصیبتوں پر قابو پا سکتا ہے اور بہتر صورت میں منزل مقصود کو طے کر سکتا ہے اور اپنی زندگی کو منظم کر کے اخروی سعادت کو حاصل کر سکتا ہے۔

بعض اوقات صبر کی غلط تفسیر کی جاتی ہے اور وہم و گمان کیا جاتا ہے کہ سختیوں کے مقابلہ میں صبر کرنا یعنی ذلت کے سامنے تسلیم ہو جانا ہے اور دوسروں کے حق میں رونما ہونے والے ہر حادثہ و ظلم کے مقابلہ میں غیر جانب داری کا مظاہرہ کرنا ہے۔ یہ تفسیر اور تصور غلط ہے اور مفہوم صبر سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ اسلامی لغت میں صبر، یعنی سختی کے مقابلہ میں برداشت کرنا اور انسان کو باطل کی طرف کھینچنے اور کمال کی راہ میں مانع بننے والے عامل کے مقابلہ میں استقامت کا مظاہرہ کرنا ہے۔ یہ عامل کبھی داخلی ہوتے ہیں اور کبھی خارجی۔ خواہ وہ عوامل انسان کو حرکت کرنے کی دعوت کرے، لیکن ناحق حرکت، اور خواہ اسے سکون کی دعوت دیں چاہے یہ توقف ناحق ہی ہو، مثلاً انسان گرسنگی اور بھوک کے وقت کھانے کی طرف تمایل رکھتا ہے اب اگر اسے جو غذا فراہم و دستیاب ہے وہ غیر شرعی ہے یا مشکوک ہے، یہاں پر غریزہ اشتہا ہمیں دعوت کرتی ہے کہ ہم اس غذا کو کھالیں، لیکن اسے کھانا ناحق ہے اور اسکے مقابلہ میں استقامت کا مظاہر کرنا صبر ہے۔

محاذ جنگ پر دشمن نے حملہ کیا۔ ہر طرف سے بمباری ہو رہی ہے، نفس کہتا ہے بھاگ جاؤ اور اپنے آپ کو میدان کارزار سے باہر نکال لو، لیکن خدائے متعال فرماتا ہے استقامت کرو تا کہ اسلام کی فتح ہو جائے ، یہاں پر نفسانی عامل جو انسان کو فرار کرنے کی دعوت دیتا ہے، اس کے مقابلہ میں استقامت، دکھانا صبر ہے۔

کبھی خارجی عامل انسان کو کسی ناحق چیز کی طرف دعوت دیتا ہے اور وہ بیرونی عامل کبھی انسان کے توسط سے رونما ہوتا ہے اور کبھی غیر انسان کی جانب سے کہ جسے تقدیرات الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً زلزلہ آتا ہے اور گھر کی چھت گر جاتی ہے۔ اگر ہم اس حادثہ کے موقع پر تحمل کا مظاہرہ کریں اور اپنے فریضہ پر عمل کریں تو ہم نے صبر کیا ہے۔ پس روایات میں ذکر شدہ صبر کی مشترک تقسیم (مصیبت پر صبر اور اطاعت پر صبر) اپنے آپ پر کنٹرول کرنا اور خلاف حق اقدام نہ کرنا ہے، اور انسان کو باطل کی طرف دعوت کرنے والے عامل کے مقابلہ میں استقامت کرنا ہے۔

جب صبر کی اہمیت واضح و روشن ہو گئی تو ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی زندگی اور اس کے تکامل و ترقی کی راہ میں صبر کا کونسا کردار ہے اور اس کے علاوہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو کس وسیلہ سے تکامل و ترقی حاصل ہو

تی ہے۔انسان کا تکامل اور اس کی ترقی اس کے اختیاری اعمال کے تحت ہی ممکنہے، یعنی جب دو متضاد کششوں کے درمیان مقابلہ ہو اور انسان اس کشش کا انتخاب کرے جو اسے کمال کی طرف لے جائے، تو انسان کا کمال اور اس کا جوہر ظاہر ہوتا ہے ایسی صورت میں انسان کو چاہئے کہ جس میں خدا کی مرضی ہو اسے انتخاب کرے. لہٰذا انسان کا تکامل اور اس کی ترقی دو متضاد کششوں کی معرکہ آرائی ہی ممکن ہے۔ ایسے میدانوں میں انسان کو ایسی چیز کا انتخاب کرنا چاہئے جس میں خدا کی مرضی ہو. اگر اس صورت انسان کا میں ایمان اور اس کا فطری شوق زیادہ طاقتور ہوگا تو وہ اسے حق کی طرف دعوت دے گا اور وہ اپنے لائق کمال تک پہونچے گا، لیکن اگر نفسانی اور شیطانی عنصر زیادہ طاقتور ہوا، تو دو کششوں کے درمیان جنگ میں انسان پسل جائے گا اور ایک ایسی سمت کی طرف جھکتا چلا جائیگا جس میں اس کے لئے زلت و پستی ہے۔ یہ درحقیقت وہی آزمائش کا معنی ہے۔

﴿"تبارک الذی بیدہ الملک و ھو علی کل شی ء قدیر. الّذی خلق الموت و الحیاۃ لیبلو کم ایّکم احسن عملا...﴾ (ملک/۱-۲)

''بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھوں میں سارا ملک ہے اور وہ ہر شی پر قادر و مختار ہے۔ اس نے موت و حیات کو اس لئے پیدا کیا ہے تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں حسن عمل کے اعتبار سے سب سے بہتر کون ہے''

جی ہاں، ہم اپنے تکامل و ترقی کی راہ میں ایسے عوامل سے روبرو ہیں، جو ہمیں گوناگوں جہات کی طرف دعوت کر دیتے ہیں۔ عقلانی، ملکوتی، اور الٰہی عوامل ہمیں ایک طرف دعوت کر دیتے ہیں اور نفسانی، حیوانی اور شیطانی عوامل ہمیں دوسری طرف دعوت کر دیتے ہیں۔ صحیح انتخاب یہ ہے کہ ہم باطل کی طرف دعوت کر دینے والے عوامل کے مقابلہ میں استقامت کریں۔ پس حقیقت میں اگر ہماری زندگی تکامل و ترقی چاہتی ہے تو صبر کے ساتھ توام ہونی چاہئے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ صبر کیا ہے؟ جبرئیل نے عرض کی:

"یصبر فی الضّراء کما یصبر فی السّراء و فی الفاقۃ کما یصبر فی الغنی، و فی البلاء کما یصبر فی العافیۃ فلا یشکوا حالہ عند الخلق بما یصیبہ

من البلاء"[1]

''صبر یہ ہے کہ سختیوں اور پریشانیوں میں تحمل و استقامت کا مظاہرہ کرو، تونگری و خوشحال کی طرح فقر و افلاس میں بھی ثابت قدم رہو، صحت و سلامتی کی طرح حالت بیماری میں بھی استوار رہو، لہٰذا صابر وہ ہے جو مصیبت اور پریشانیوں میں خلق خدا کے سامنے گلہ مند نہ ہو۔''

جی ہاں، جو لوگ مقام یقین تک نہیں پہنچے ہیں تا کہ واضح طور پر پا سکیں اس بات کو درک کر سکیں جو کچھ پیش آ رہا ہے وہ سب خیر ہے، وہ بلاؤں کا دل کھول کر استقبال نہیں کر سکتے، انھیں چاہے کہ وہ صبر و تحمل سے کام لیں اور خدا سے دعا کریں کہ وہ ان کے مطالبات کو پورا کرے اور نامناسب حوادث کے رونما ہونے پر بردباری کا مظاہرہ کریں۔ جیسا کہ ہم نے کہا، جو رضا کے مقام تک پہنچا ہے وہ حوادث اور مصیبتوں سے رنجیدہ نہیں ہوتا، بلکہ خوشی کا اظہار کرتا ہے اور خدا کا شکر بجالاتا ہے۔ اگر اس کا بیٹا شہید ہوتا ہے، تو کہتا ہے: الحمدللہ، کاش میرے پاس دوسرا بیٹا ہوتا اسے بھی محاذ جنگ پر بھیجتا تا کہ وہ بھی شہید ہوتا! نہ صرف رنجیدہ نہیں ہوتا ہے بلکہ فخر کرتا ہے اور اپنے اوپر ناز کرتا ہے اور شکر بجالاتا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اس حد تک نہیں پہنچے ہیں اور خدائے متعال نے بھی فرمایا ہے:

"...و قلیل من عبادی الشّکور" (سباء/۱۳)

''میرے شکر گزار بندے کم ہیں۔''

جو رضا کی منزل تک نہیں پہنچے ہیں تا کہ مصیبتوں کے مقابلہ میں اعتراض کے لئے لب کشائی نہ کریں اور شکر کریں، اگر نامناسب حوادث پر صبر کریں تو خدائے متعال انھیں صابروں کی اجر و ثواب دیتا ہے۔ صبر کریں گریہ وزاری نہ کریں اور اطمینان کا مظاہرہ کریں، اس امید سے کہ خدائے متعال انھیں پاداش دے گا۔ اگر چہ بلائیں اور مصیبتیں ان کے لئے تلخ ہیں، لیکن ان تلخیوں کو برداشت کر لیں، اس شخص کے مانند جو تلخ دوا کھاتا ہے اور اس سے لذت کا احساس نہیں کرتا ہے، لیکن جانتا ہے کہ اس کے کھانے سے صحت یاب ہوگا۔ جیسے کوئی شخص مجبور ہے آپریشن کے ذریعہ اس کے بدن کا ایک عضو، مثلاً ایک پیر کو کاٹ لیا جائے، اس کے لئے اگر چہ یہ مشکل ہے، لیکن چونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اس لئے قضا کے سامنے تسلیم ہوتا ہے، اور حاضر ہوتا ہے، اس کا پیر کاٹ لیا جائے تا کہ اس کے بدلے اس کی جان بچ جائے۔

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۷، ص ۳۰۷

خدا کی مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دینے کا اثر:

مذکورہ بیان کے پیش نظر، قرآن مجید کی بعض آیات اور روایت میں، ان افراد کی تربیت وتہذیب کے لئے (جو دل میں آرزو رکھتے ہیں اور ابھی مقام تسلیم ورضا تک نہیں پہنچے ہیں) وعدہ کیا گیا ہے کہ اگر تقوی کو اپنا شعار بنالیا تو خدائے متعال تمہارے دنیوی مطالبات کو پورا کرے گا اور اس سلسلہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"یا اباذر؛ یقول اللّٰہ جلّ ثناؤہ و عزّتی و جلالی لایؤثر عبدی ھوای علی ھواہ الا جعلت غناہ فی نفسہ و ھمومہ فی اخرتہ..."

"اے ابوذر! خدائے تبارک وتعالی فرماتا ہے: مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم میرا بندہ میری مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح نہیں دیتا ہے مگر یہ کہ میں اسے بے نیاز کر دیتا ہوں اور ایسا کرتا ہوں کہ اس کی فکر اور خود وہ امور اخروی میں مصروف ہو جائے۔"

خدائے متعال مطلب کی تاکید کے لئے قسم کھاتا ہے، کیونکہ اس بات کا قبول کرنا عام لوگوں کے لئے آسان نہیں ہے، اسی لئے قسم کھاتا ہے تا کہ لوگ باور کریں. فرماتا ہے، اگر کبھی میری مرضی اور میرے بندہ کی درمیان تزاحم وتضاد پیدا ہو اور اس نے میری مرضی کو ترجیح دی (اگر اس کی مرضی خدا کی مرضی کے مطابق ہے، اس کی مرضی بھی واقع ہوتی ہے اور خدا کی مرضی بھی گفتگو اس میں ہے کہ اس کی مرضی خدا کی مرضی کے ساتھ جمع نہیں ہوتی ہے) تو اس کے لئے چند چیزوں کی ضمانت دیتا ہوں: پہلے یہ کہ اس کے دل میں دوسروں سے بے نیازی کا احساس ڈالتا ہوں۔ البتہ انسان ہمیشہ خدا کا محتاج ہوتا ہے اور خدا سے نیازمندی کا احساس بھی اس میں ہے اور ہونا چاہئے۔ انسان کے شرف وافتخار کی انتہا اس میں ہے کہ وہ احساس کرے کہ خدا کی بارگاہ کا فقیر ہے اور جان لے کہ اس کا نیازمند ہے اور خود کو غیر خدا کا محتاج تصور نہ کریں:

بادادہ حق اگر تو راضی باشی　　از ہمچو یی کی متقاضی باشی

(اگر خدا کے دئے ہوئے پر تم راضی ہو جاؤ گے تو تم اس سے کب متقاضی ہو گے؟)

اس کے پیش نظر کہ انسان کی خواہشات عام طور پر دوسروں کے ذریعہ پوری ہوتی ہیں، وہ اپنے آپ کو دوسروں کا محتاج تصور کرتا ہے، اور دوسروں کے سامنے ضرورت کا احساس کرنا انسان کو ذلیل وخوار

کر دیتا ہے، اور جس حد تک انسان اپنے کو دوسروں کے سامنے محتاج تصور کرتا ہے اسی اعتبار سے اس کے سامنے خاشع و متواضع نظر آتا ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تملق اور چاپلوسی کرتا ہے اور کبھی درخواست و التماس کرتا ہے۔ اپنے کو دوسروں کے سامنے حقیر اور چھوٹا بنا دیتا ہے تا کہ وہ اس کے مطالبات پورے کرے اگر انسان اپنے رابطہ کو خدائے متعال سے مستحکم کرے اور اس کی مرضی اور چاہت کو اپنی مرضی پر ترجیح دے، تو خداوند متعال اس میں دوسروں سے بے نیازی کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے اور اس کے مقاصد پورے ہونے کے لئے کافی وسائل مہیا کرتا ہے۔ البتہ وہ وسائل مقاصد اور اہداف کو حاصل کرنے کے لئے آلہ و اوزار کی حیثیت رکھتیہیں، انسان کا فرض ہے کہ ان وسائل کو استعمال میں لائے اور ان سے بہرہ مند ہونے کے لئے خدا کا شکر بجا لائے، اگر دوسرے انسان بھی من جملہ اس کے دنیوی مقاصد تک رہنمائی کرنے کے لئے واسطہ اور وسیلہ تھے، تو ان کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ اگر چہ وہ ان وسائل سے استفادہ کرتا ہے لیکن اسیصرف اپنے آپ کو خدا کا محتاج جانتا چاہئے اور غیر از خدا کی طرف محتاج نہ ہونے کا احساس نہیں چاہئے۔

غیر سے غنی اور بے نیاز ہونے کا احساس ایک عظیم نعمت ہے جو انسان کو شخصیت بخشتا ہے۔ البتہ جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے یہ گمان نہ کیا جائے کہ دوسروں کے سامنے تواضع و انکساری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔ انسان کو خدائے متعال کے برابر بھی اور اس کی مخلوق کے سامنے بھی تواضع و انکساری سے پیش آنا چاہئے۔ جو اسلامی معارف سے آشنا نہیں ہیں وہ تصور کرتے ہیں اسلام نے ہم سے چاہا ہے کہ حتی خدا کے سامنے بھی ذلت و حقارت کا احساس نہ کریں! ایسے لوگوں نے اسلام ہی کو نہیں پہچانا ہے اور اس کے بارے میں ایک باطل تصور رکھتے ہیں۔ اسلام کی بنیاد بندگی پر ہے۔ انسان کا انتہائی فخر اس میں ہے کہ خدا کے حضور میں ذلّت اور چھوٹے پن کا احساس کرے، اپنی پیشانی اور چہرے کو خاک پر رکھے۔ انسان کا کمال اس میں ہے کہ خود کو ذات باری تعالی کے سامنے ذلیل سمجھے، چونکہ خدائے متعال انسان کے کمال و بلندی کو چاہنے والا ہے، اس لئے اس سے کہا ہے کہ اس کے سامنے ذلّت کا احساس کرو اپنی حاجتوں اور ضرورتوں کو اس کی بارگاہ میں پیش کرو، چونکہ تکامل و سعادت خدا کی بندگی میں مضمر ہے، اس کے برعکس، دوسروں کے سامنے احساس کمتری و ذلت کا مظاہرہ نہ کرے اور خود کو ان کا محتاج نہ جانے۔ کیونکہ اگر اس نے اپنے آپ کو ان کا محتاج جان لیا، تو خواہ نخواہ ضرورت محتاجی کے احساس کی وجہ سے ذلّت کا احساس بھی کرے گا۔

جس قدر انسان یہ احساس کرتا ہے کہ اس کا کام دوسروں کے ذریعہ انجام پاتا ہے، اسی قدر خود کو ان کے

سامنے حقیر تصور کرتا ہے، اگر چہ زبان سے نہ کہے لیکن دل میں اپنے آپ کو ذلیل وخوار محسوس کرتا ہے۔ لیکن اگر مومن نے ایمان کی برکت سے اپنا کام خدا پر چھوڑ دیا اور اپنے آپ کو صرف خدا کا محتاج جانا تو وہ دل میں بھی دوسروں کی نیاز مندی کا احساس نہیں کرتا ہے۔ اگر چہ ممکن ہے خدائے متعال اپنے بندہ کے ہاتھ سے اس کی احتیاج وضرورت کو برطرف کرے اور انسان سے چاہے کہ اس کا شکریہ بجالائے، لیکن وہ اپنے آپ کو صرف خدا کا محتاج جانتا ہے۔ حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ السلام کی داستان میں آیا ہے کہ جب نمرود کے حکم سے بہت ساری آگ اکٹھا کی گئی کہ جس کے شعلہ اس قدر عظیم تھے کہ لوگ اس کے نزدیک جانے کی جرأت نہیں کرتے تھے، اس کی حرارت دور کے فاصلہ سے بھی افراد کو جلا دیتی تھی، یہاں تک کہ مجبور ہوئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق کے ذریعہ دور سے آگ کے اندر پھینکیں اس سخت اور دشوار حالت میں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ میں ڈالے گئے تو جبرئیل امین ان کی مدد کے لئے ان کے پاس آئے او رفرمایا:

هل لک حاجة؟ کیا میرے لائق کوئی حاجت ہے؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

"امّا الیک فلا" [1] "تجھ سے کوئی حاجت نہیں رکھتا ہوں"

حضرت ابراھیم علیہ السلام نے فرمایا: ضرورت مند ہوں اور مدد کا محتاج اور خواہشمند ہوں، لیکن غیر خدا سے نہیں، خدا میرے اسرار سے آگاہ ہے اور میری حاجتوں کو جانتا ہے وہ جو بہتر سمجھے گا انجام دے گا۔ جب حضرت ابراھیم علیہ السلام اس سخت امتحان میں پاس ہوئے تو خدائے متعال نے انھیں خلت کے مقام پر فائز کیا اور انھیں اپنا خلیل اور دوست بنا دیا۔

لیکن غنی اور بے نیازی کے مقام پر پہنچنا دوسروں کے لئے کوئی آسان کام نہیں ہے، صرف خدا کی مہربانی اور اس کی عنایت سے انسان اس مقام تک پہنچ سکتا ہے، لیکن خدائے متعال نے اس مقام تک پہنچنے کے مقدمات کو انسان کے اختیار میں قرار دیا ہے اور من جملہ ان مقدمات میں سے جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ ہے کہ جب انسان کے لئے اپنی مرضی اور خدا کی مرضی میں سے ایک کو اختیار کرنے کا وقت آتا ہے تو وہ اپنی مرضی پر خدا کی مرضی کو ترجیح دیتا ہے اور پہلے مرحلہ میں وہ لوگوں سے غنی اور بے نیاز ہونے کا احساس کرتا ہے۔

۱۔ بحار الانوار ج ۱۲/ص ۳۵

دوسرے یہ کہ: پھر وہ دنیوی امور کے بارے میں فکر مند نہیں رہتا ہے اور اپنے دنیوی خیر وصلاح کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے صرف آخرت کے بارے میں فکر مند ہوتا ہے اور اس کا ہم وغم آخرت کے بارے میں ہوتا ہے۔ وہ اس فکر میں ہوتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا، کیا اس نے اپنے اخروی فریضہ پر عمل کیا ہے؟ لہٰذا وہ ہمیشہ آخرت کی فکر میں رہتا ہے۔

"و ضمنت السّماوات و الارض رزقه و كفلت عليه ضيعته و كنت له من وراء تجاره كل تاجر"

"آسمان و زمین کو اس کے رزق کا ضامن قرار دیتا ہوں اور اس کے کسب معاش کی حفاظت کرتا ہوں اور میں اس کے لئے ہر تاجر کی تجارت سے برتر ہوں۔"

تیسرے یہ کہ: جو میری مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دیتا ہے، تو میں بھی اس کے مطالبات کو پورا کرتا ہوں اور زمین و آسمان کو اس کے رزق کا ضامن قرار دیتا ہوں اور انھیں حکم دیتا ہوں کہ اس کی روزی کا انتظام کریں۔

چوتھے یہ کہ: اس کے کاروبار کو آفات اور نقصانات کے مقابلہ میں تحفظ بخشتا ہوں۔ ہر کوئی اپنی زندگی چلانے کے لئے کسی کسب معاش کو اپناتا ہے اور کسی شغل کا انتخاب کرتا ہے تاکہ اس کے نتیجہ میں کوئی درآمد حاصل ہو سکے، فطری بات ہے کسب و کار اور کھیتی باڑی و... اور اس کے باقی رہنے اور پھل دینے کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی ہے۔ کہاں سے معلوم کہ باغ میوے دے گا، زراعت فصل کے مرحلہ تک پہنچ جائیگی، گائے اور گوسفند زندہ رہیں، کہاں سے معلوم کہ بلا و آفات انسان کے کام، کاج کو متاثر نہ کرے گی؟ جو خدا کی مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دیتا ہے خدائے متعال ضمانت دیتا ہے کہ اس کے کاروبار، اس کی زراعت اور گائے اور بکریوں بلاء و آفات اور خسارے سے محفوظ رکھے گا تاکہ موقع آنے پر نتیجہ اور پھل دے سکیں۔

پانچویں یہ کہ: میں ہر کاروبار اور تجارت میں اس کی مدد کرتا ہوں تاکہ نقصان سے دوچار نہ ہو۔ جو ہمیشہ دنیا کی فکر میں ہوتے ہیں وہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی ایسے شخص سے معاملہ کریں جس سے زیادہ فائدہ حاصل ہو۔ ایسے معاملہ و تجارت کا انتخاب کرتے ہیں جس میں بیشتر نفع ہو۔ ہمیشہ فکر مند رہتے ہیں کہ تجارت میں نقصان نہ ہو جائے یا منافع کم نہ ہو جائے۔ خدائے متعال فرماتا ہے کہ جو ہماری مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دیتا ہے میں اس کے ہر تجارت اور معاملہ کی پشت پناہی کرتا ہوں تاکہ بیشتر نفع کمائے، اس کے ہر معاملہ میں

میرے ہاتھ اس کی مدد کرتے ہیں۔ بجائے اس کے وہ خود فکر کرے، تدبیر کرے اور پلان تیار کرے کہ کس سے اور کس طرح معاملہ کرے تا کہ زیادہ سے زیادہ نفع کمائے، میں اس کی ہر تجارت میں حمایت کرتا ہوں اور اس کے منافع کو تحفظ بخشتا ہوں۔

اس کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس نکتہ کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ مومن کا ایسا یقین ہونا چاہئے کہ جس کے ذریعہ وہ اپنی روزی کے بارے میں فکرمند نہ رہے اور جان لے کہ جو کچھ خدائے متعال نے اس کے لئے مقدر کیا ہے وہ اسے ملے گا، آپ فرماتے ہیں:

"یا اباذر؛ لو انّ ابن ادم فرّ من رزقه کما یفرّ من الموت لادرکه رزقه کما یدرکه الموت"

''اے ابوذر! اگر بنی آدم اپنی روزی سے اسی طرح فرار کرے جس طرح وہ موت سے فرار کرتا ہے تو اس کی روزی اسی طرح اس تک ضرور پہنچ جائے گی جس طرح موت اس تک پہنچتی ہے۔''

انسان کو موت پسند نہیں ہے، وہ اس سے فرار کرتا ہے، لیکن بالآخر موت اسے نگل لیتی ہے۔ اس طرح اگر وہ اپنی روزی سے فرار کرے تو روزی اس تک پہونچ جائیگی اور اس کے جو مقدر میں ہے اس سے اسے راہ فرار نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی زیادہ کوشش کرتا ہے تو یہ، معلوم نہیں ہے اس کا رزق زیادہ ہو جائے گا، اس لئے کہ ایسے بھی بہت سے افراد گزرے ہیں جنہوں نے بہت زیادہ سعی وکوشش کی لیکن پھر بھی بھوکے موت کی سو گئے. اس سلسلہ میں دولتمند ترین افراد کے بارے میں عجیب وغریب داستانیں نقل ہوئی ہیں کہ اپنی زندگی میں ایسے حوادث اور روداد سے روبرو ہوئے ہیں کہ جس کے نتیجہ میں انھیں مرتے دم بھوک کے نتیجہ میں اپنے جوتے چبانے پر مجبور ہونا پڑا ہے! اور دوسری طرف ایسے افراد بھی گزرے ہیں کہ جنھوں نے زیادہ کوشش نہیں کی، لیکن خدائے متعال نے انھیں ایک عظیم ثروت ودولت سے نوازا ہے اور جو ان کے مقدر میں تھا وہ انھیں ملا۔

انسان کو فریضہ انجام دینے اور معاش کی تلاش میں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے اور اسے قضا وقدر کے بہانے سے سستی نہیں دکھانی چاہئے، کیونکہ خدائے متعال سست اور کاہل انسان سے بیزار ہے۔ لیکن اگر علم حاصل کرنے اور شغل کے انتخاب کرنے میں مختار ہو اور اس کا فریضہ ان دو میں سے ایک کو منتخب کرنا ہو تو، اگر

کافی معرفت رکھتا ہے تو ایسے شخص کے لئے درآمد کا کم ہونا اس بات کا سبب نہیں ہوسکتا ہے کہ وہ علم حاصل کرنے کے لئے نہ جائے ، بلکہ خدا کی طرف سے مقدر شدہ رزق پر اس کا ایمان، اسے مجبور کرتا ہے کہ اطمینان کے ساتھ علم حاصل کرے اور مطمئن رہے کہ اس کا رزق اسے ضرور ملے گا اور جو کچھ اس کے مقدر میں ہے وہ اس سے محروم نہیں ہوگا.

اڑتیسواں درس

خدا کی معرفت اور اس کا حکیمانہ نظام

- ☐۔انسان اور اس کا خدا سے رابطہ۔
- ☐۔مشکلات اور آسائش میں خدا کیطرف توجہ کرنے کی ضرورت۔
- ☐۔خدا سے مدد چاہنے اور اس سے درخواست کی ضرورت۔
- ☐۔خدا کی حکیمانہ تدبیر کی معرفت اور یقین کا نتیجہ۔
- ☐۔انسان کی معنوی بلندی اور تکامل میں مشکلات کا رول۔
- ☐۔قناعت اور لوگوں سے بے نیازی۔

خدا کی معرفت اور اس کا حکیمانہ نظام

"یا اباذر!الا اعلمک کلمات ینفعک اللّٰہ عزو جل بھن ؟قلت:بلی یارسول اللّٰہ. قال :احفظ اللّٰہ یحفظک ، احفظ اللّٰہ تجدہ امامک.تعرف الی اللّٰہ فی الرخاء یعرفک فی الشدۃ واذاسالت فاسال اللّٰہ عزو جل واذا استعنت فاستعن باللّٰہ. فقد جری القلم بما ھو کائن الی یوم القیامۃ ،فلو ان الخلق کلھم جھدوا ان ینفعک بشی ء لم یکتب لک ماقدروا علیہ . ولوجھدوا ان یضروک بشی ء لم یکتبہ اللّٰہ علیک ماقدروا علیہ.

فان استطعت ان تعمل للّٰہ عزوجل بالرضا والیقین فافعل و ان لم تستطع فان فی الصبر علی ماتکرہ خیرا کثیرا وان النصر مع الصبر والفرج مع الکرب وان مع العسر یسرا.

یا اباذر!استغن بغنیا للّٰہ یغنک اللّٰہ.فقلت:وماھو یا رسول اللّٰہ ؟ قال:غداء ۃ یوم وعشاء ۃلیلۃ،فمن قنع بما رزقہ اللّٰہ فھو اغنی الناس"

انسان اور اس کا خدا سے رابطہ:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصیحتوں کا یہ حصہ، خدا سے رابطہ، مشکلات میں اسکی طرف توجہ، اس سے مدد مانگنے اور دوسروں سے بے نیازی کے بارے میں ہے۔خدا سے رابطہ کے بارے میں کہنا چاہئے کہ: انسان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے تاکہ وہ قرب الٰہی کے مقام تک پہنچ جائے لہذا اس کی تمام سرگرمیاں خدا سے رابطہ کو تحفظ بخشنے کے سلسلے میں ہونی چاہئے۔اگر وہ اپنی توانائیوں کو دوسرے امور میں صرف کرتا ہے، تو اس نے انھیں ضائع کیا ہے۔تمام باطنی اور ظاہری توانائیوں اور ساری نعمتوں کو خدا سے رابطہ کی راہ میں استعمال کرنا چاہئے، گویا یہ راستہ کافی وسیع اور مختلف صورتوں میں ہے کہ ان میں سے ہر ایک ہماری روح کی مختلف جہتوں میں سے کسی ایک جہت سے مربوط ہے، کیونکہ خدائے متعال نے ہماری روح کو مختلف چہروں، پہلوؤں اور گونا گون حیثیتوں سے سزاوار کیا ہے یہتمام پہلو ایک سمت میں معین کئے گئے ہیں اور سب کا رخ خدا کی طرف ہے۔ایسا نہیں ہے کہ ہمارے وجودی پہلوؤں میں سے ایک پہلو خدا کی جہت میں ہے اور دیگر تمام پہلو ایسے نہیں ہیں۔

انسان کے وجودی پہلوؤں کے بارے میں کچھ تقسیم بندیاں ہوئی ہیں، مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ وجود انسانی کا ایک پہلو خدا سے رابطہ کے لئے ہے اور اس کا ایک پہلو اپنے آپ سے رابطہ کے لئے ہے اور ایک پہلو دوسرے انسانوں سے رابطہ کے لئے ہے اور اسکا ایک اور پہلو تمام مخلوقات سے رابطہ کے لئے ہے۔یہ تقسیم بندی انسان سے مربوط احکام کی نظر سے صحیح ہوسکتی ہے انسان کے اپنے آپ سے رابطہ کے پہلو میں بیان ہوتا ہے کہ کونسی چیزیں اس کے بدن کے لئے نفع بخش ہیں اور کونسی چیز مضر ہیں، فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام۔انسان کے بعض احکام خدا سے رابطہ کو معین کرتے ہیں، جیسے نماز اور روزہ۔انسان کے بعض احکام مخلوق سے رابطہ کو معین کرتے ہیں، جیسے ماں باپ سے برتاؤ، رشتہ داروں، دوستوں اور دشمنوں سے برتاؤ۔

یہ تقسیم بندی قابل قبول ہے، لیکن اس امر کی طرف توجہ رکھنا چاہئے کہ انسانی حیثیتوں کی یہ تقسیم بندی اس معنی میں نہیں ہے کہ ہم خدا کی بارگاہ میں تقرب کے علاوہ کوئی اور مقصد رکھتے ہوں، بلکہ اعتراف کرنا چاہئے کہ ہمارے تمام وجودی پہلو ان میں موجودہ اختلاف کے باوجود ایک نقطہ پر منتہی ہوئے ہیں

۔یعنی وہی رابطہ جو انسان دوسرے انسانوں سے رکھتا وہی خدا اور دوسروں سے رکھنا چاہئے۔

ہمارے کاموں کی صورت میں فرق ہے: ایک کام نماز کی صورت میں ہے اور ایک سبق پڑھانے کی صورت میں یا درس پڑھنے کی صورت میں یا روزمرہ کے امور انجام دینے کی صورت میں، لیکن یہ سب امور ہمارے لئے اسی وقت اور اسی حالت میں مفید ہیں کہ جب خدا کے لئے ہوں، لہذا انسان کے اپنے تمام کام حتی اس کے تفکرات خدا کے لئے ہونا چاہئے اور وہ اس کے علاوہ کسی کو نہ چاہے، نہ طلب کرے اور نہ ڈھونڈے۔

یارب زتو آنچہ من گدامی خواہم — افزون زہزار پادشاہی خواہم
ہر کس زدر تو حاجتی می خواہد — من آمدہ ام از تو ترا می خواہم

(اے پروردگار! میں بھکاری، جو تم سے مانگنا چاہتا ہوں وہ ہزاروں بادشاہوں سے زیادہ چاہتا ہوں، ہر کوئی تیرے در سے کوئی حاجت چاہتا ہے، میں آیا ہوں اور خود تجھے چاہتا ہوں)

انسان جو اپنے مادی وجود اور مادی زندگی کے تمام پہلوؤں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے جو محدود کششیں رکھتا ہے، اس کے علاوہ اپنی نامحدود زندگی، نامحدود مقصد، نامحدود جمال وکمال اور نامحدود توانائی کے لئے بھی کچھ کششیں رکھتا ہے۔ حقیقت میں انسان کی وجودی عمارت بے نہایت مقصد کے لئے تعمیر کی گئی ہے اور بے نہایت عالم کی طرف حرکت کرنے کے لئے انسان کے اندر فطرتیں معین کی گئی ہیں اور جو کچھ دنیا کے بارے میں محدود ہوتا ہے یہ اس کا مقدماتی پہلو ہے اور اس لئے ہے کہ انسان کی حرکت کا انجن رکنے نہ پائے اور اپنی راہ کو خدا کی طرف جاری رکھے۔

یاد رکھنا چاہئے جو چیز انسان کو انسان بناتی ہے وہ خدا سے انسان کا رابطہ ہے، کیونکہ انسان کا انتہائی کمال خدا سے رابطہ میں منحصر ہے اور یہ رابطہ پہچان اور عمل سے حاصل ہوتا ہے، اس کے بغیر انسان دوسرے حیوانات کی فہرست میں ہوتا ہے بلکہ ان سے پست تر:

﴿اولئک کا لانعام بل ھم اضل﴾ (اعراف/۱۷۹)

''یہ (گمراہ) چوپایوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں''

اس کے درمیان، انبیاء اور اولیائے الٰہی کا وجود ان کے علمی آثار، سنت وسیرت اور ان سے ظاہر ہونے والی طاقتیں ان کے خدا سے رابطہ کی نشانیاں تھیں۔ البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ عقلی تجزیہ کے مطابق ہر شئے

کا وجود، خالق سے عین رابطہ ہے اور ممکن نہیں ہے کی خالق اپنی مخلوق سے رابطہ نہ رکھے، لیکن یہ رابطہ تکوینی ہے کہ جو نظام ہستی کے مجموعہ میں واقع ہوا ہے اور نا قابل گریز ہے اور کوئی بھی مخلوق ممکن نہیں ہے خدا سے تکوینی رابطہ نہ رکھے۔ بالاخر اس تکوینی رابطہ کے علاوہ انسان ایک اور خصوصیت رکھتا ہے اور خدائے متعال نے یہ قدرت اسے عنایت کی ہے کہ وہ اپنی عقل، فہم وشعور کی برکت سے اس رابطہ کو درک کر سکتا ہے اور اسکی قدر و قیمت اس میں ہے کہ وہ اس رابطہ کو بہتر اور زیادہ عمیق صورت میں درک کرے۔

عام طور پر شناخت کا آغاز اور خدا سے رابطہ علم حصولی کے ذریعہ ہوتا ہے جو فکر اور عقلی و فلسفی استدلال کو بروئے کار لا کر حاصل ہوتا ہے۔ لیکن یہ معرفت و شناخت آخری اور نقطۂ کمال کی انتہا نہیں ہے اور اسے مقصد و منزل تک نہیں پہنچاتی ہے اور اس میں راسخ اعتقاد و یقین ایجاد نہیں کرتی ہے۔ مکمل شناخت، شناخت حضوری ہے۔ یعنی انسان ایک ایسے مقام پر پہونچ جاتا ہے جہاں سے پورے وجود سے خدا سے رابطہ کو درک کرتا ہے، بلکہ وہ خدا سے خود عین رابطہ ہوتا ہے، نہ یہ کہ صرف جان لے۔ دین کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو ایسے مقام تک پہنچا دے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"مارأیت شیئاً الا و رأیت اللّٰہ قبلہ وبعدہ ومعہ"

''میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا، مگر یہ کہ اس سے پہلے اس کے بعد اور اس کے ساتھ خدائے متعال کو دیکھا''

اگر انسان کو جو کمال تک کوشش کرتا ہیاس دنیا میں یہ معرفت مکمل طور پر حاصل نہ ہوئی، تو اسے ایسے مواقع فراہم کرنا چاہئے تا کہ دوسری دنیا میں اس رابطہ کو مکمل طور پر حاصل کر سکے۔ اس جہت سے دین کی زبان میں اور احادیث اہل بیت علیہم السلام میں، خدا سے رابطہ کے سلسلہ میں ''رویت'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ بہشتیوں کی بالاترین نعمت یہ ہے کہ اپنے کمال کے درجہ کے مطابق انوار الٰہی کے مشاہدہ سے فیضاب ہوتے ہیں۔ جو بلند ترین مقامات تک پہنچے ہیں ان کے لئے ہمیشہ انوار الٰہی کا مشاہدہ میسر ہوتا ہے اور جن کا مقام پست ہے، ان کے لئے کمتر تجلیات الٰہی حاصل ہوتی ہیں۔

نقل کیا گیا ہے کہ ایک تہرانی عالم دین جو ایک متقی و پرہیز گار شخص تھے کینسر کی بیماری کی وجہ سے اس دنیا سے چلے گئے مرحوم کے ایک رشتہ دار نے جوان سے بہت زیادہ محبت و عقیدت رکھتے تھے ان کو خواب میں دیکھا اور اپنے خواب کو حقیقت میں ایک سچا خواب قم کے ایک عالم دین کی خدمت میں یوں بیان کیا: جب میں نے ان کو خواب میں دیکھا تو ان سے سوال کیا: کیا آپ اس دنیا (برزخ) میں ائمہ اطہار اور

امام حسن علیہم السلام کی زیارت کرتے رہیں؟ انھوں نے جواب میں کہا: کیا کہتے ہو! اس دنیا میں ہمارے اور سید الشہداء علیہ السلام کے درمیان تیس ہزار سال کا فاصلہ ہے، ہمیں تیس ہزار سال انتظار کرنا ہے تا کہ انکی زیارت کر سکیں!

جی ہاں! دیکھنا چاہئے انسان اپنا دل کس کے سپرد کرتا ہے اور انسان کی قدر و قیمت اس چیز کی وجہ سے ہے جس چیز کو اس نے اپنا دل حوالے کیا ہے۔ جس کا دل باغ اور گھر سے تعلق رکھتا ہو، اسکی قدر و منزلت اسی حد میں ہے لیکن اگر اس کا دل خدا سے متعلق ہو اور اس کے دل کا رابطہ خدا سے ہے، تو اس کی قیمت بے بہا ہے، پھر وہ دنیا کی محدود اور ناپائدار تعلقات کی قید میں نہیں ہوتا ہے، وہ خدا کے علاوہ تمام لوگوں اور چیزوں سے دل کھینچ لیتا ہے:

آنکس کہ ترا شناخت جان راچہ کند　　فرزند وعیال وخانمان راچہ کند
دیوانہ کنی ہردو جہانش بخشی　　دیوانہ تو ہردوجہا نرا چہ کند

[جس نے تجھے پہچان لیا اس کو اپنی جان کے ساتھ کیا کام ہے۔ اپنے اہل وعیال اور خاندان سے اسے کیا لینا دینا ہے۔ (پہلے تو اپنی محبت میں) دیوانہ کرتے ہو اور پھر دونوں جہاں بخشتے ہو تیرے دیوانہ کو دونوں جہاں سے کیا کام ہے!

لہٰذا انسان کی حقیقی قدر و منزلت خدا سے اس کے رابطہ اور اس کے تقرب میں ہے، نہ مادی لذتوں اور سرمایہ میں۔ انسان کی انسانیت اس کے درک اور قلبی توجہات میں ہے، دیکھنا چاہئے کہ اس کا دل کہاں پر رابطہ برقرار کر چکا ہے اور جس قدر اسکا رابطہ خدائے متعال سے عمیق تر ہوگا اتنا ہی محکم و مستحکم تر ہوگا۔ جب انسان اس دنیائے فانی سے رخصت ہونے لگتا ہے تو انوار الٰہی اس کے لئے بیشتر تجلی کرتے ہیں اور عطیات ونعمات الٰہی سے وہ زیادہ سے زیادہ بہرہ مند ہوتا ہے اس لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"یا اباذر! الا اعلمک کلمات ینفعک اللّٰہ عزوجل بھن؟ قلت: بلی یارسول اللّٰہ. قال: احفظ اللہ یحفظک"

"اے ابوذر! کیا میں تجھے ایسی باتیں نہ سکھاؤں کہ خدائے متعال ان کی برکت سے تجھے نفع پہنچائے؟ میں نے عرض کی: جی ہاں، اے اللہ کے رسولؐ۔ آپؐ نے فرمایا: خدائے متعال سے اپنے رابطہ کو حفظ کرو تا کہ خدائے متعال اپنے رابطہ کو تیرے ساتھ حفظ کرے"

جتنی بھی نصیحتیں اب تک بیان ہوئیں فائدہ منداور نفع بخش تھیں، پس یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذر کوتوجہ دلاتے ہیں کہ تیرے لئے ایسی باتیں بیان کروں کہ خدائے متعال ان کی وجہ سے تجھے بخشے گا۔ گویا اس کا یہ معنی ہے کہ یہ باتیں گزشتہ مطالب کا خلاصہ اور منتخب مجموعہ ہے اور اس کی خاص اہمیت ہے اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذر کوان کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذر کو یاد دہانی کراتے ہیں کہ خدائے متعال نے تمھارے اور اپنے درمیان ایک تکوینی رابطہ رکھا ہے اور یہ رابطہ اعظم الوہیت اور تمہارے جیسے بندہ حقیر کے درمیان استوار ہے، کوشش کرو یہ رابطہ برقرار رہے اور ٹوٹنے نہ پائے۔ اگر اس رابطہ کو تحفظ بخشنے کیلئے تم نے تلاش وکوشش کی تو خداوند متعال بھی تمھاری حفاظت کرے گا۔ اس مفہوم کو حافظ نے اپنے ایک خوب صورت شعر میں یوں بیان کیا ہے:

گرت ہواست کہ معشوق نگسلد پیوند　　نگہدار سر رشتہ تا نگہدارد

اس سے بڑھ کر کونسی سعادت ہوسکتی ہے کہ ایک بندۂ حقیر جو دنیا میں کسی چیز میں شمار نہیں ہوتا خالق کائنات سے رابطہ رکھتا ہے اور اس سے بڑھ کر کونسی نعمت ہوسکتی ہے! پس اس کی حفاظت کے لئے کوشش کرنی چاہئے تا کہ اس کی وجہ سے خدا کی عنایتیں ہمیشہ اس پر نازل ہوتی رہیں۔ لیکن اگر اس کی حفاظت کے لئے کوشش نہ کی اور بندگی کی رسم بجانہ لایا، تو اسے خدائے متعال کی مہربانیاں اور عنایتیں حاصل کرنے کی توقع نہیں رکھنا چاہئے۔

شاید بعض لوگوں کے لئے یہ امر مبہم ہو کہ میرے اور خدا کے درمیان کس قسم کا رابطہ ہے کہ میں اس کی حفاظت کروں، میں جو اس عالم خاکی میں زندگی کرتا ہوں اور خدائے متعال اور عرش الٰہی کے درمیان کونسا رابطہ ہوسکتا ہے۔ اس ابہام کو دور کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"احفظ اللّٰہ تجدہ امامک"

''خدا سے اپنے رابطہ کی حفاظت کرو تا کہ اسے اپنے سامنے پاؤ''

یعنی تمھارے اور خدا کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے وہ ہمیشہ تمھارے پاس حاضر ہے اور تجھ سے جدا نہیں ہے۔

﴿...وھو معکم اینما کنتم واللہ بماتعملون بصیر﴾ (حدید/۴)

''وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں بھی رہو وہ تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے''

اس بنا پر انسان کو خدا کی عنایات میں شامل رہنا چاہئے تا کہ وہ بلاؤں، شیطان کے شر اور نفسانی وسوسوں سے اس کی حفاظت کرے (پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان میں حفاظت کرنا مطلق ہے اور اس میں انسان کو ہر مادی و معنوی خطرہ سے حفاظت کرنا شامل ہے) خدا کے ساتھ اپنے رابطہ کو محفوظ رکھنا چاہئے اور اسے کمزور ہونے نہیں دینا چاہئے۔

مشکلات اور آسائش میں خدا کی طرف توجہ کرنے کی رورت:

پھر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"تعرف الی اللّٰہ فی الرخاء یعر فک فی الشدة"

"گنجائش کے وقت اپنے آپ کو خدائے تعالے سے آشنا کردتا کہ وہ تجھے تنگدستی کی حالت میں پہچانے۔"

اس کے پیش نظر کہ خدائے متعال بے نہایت قدرت رکھتا ہے اور جو کچھ کائنات میں انجام پاتا ہے اسکے ارادہ ومشیت سے ہے اور اس کے ارادہ کے دائرہ سے کوئی چیز خارج نہیں ہے، ہر حالت میں انسان کو اس کی طرف توجہ رکھنی چاہئے. اگر مشکل اور گرفتاری سے دوچار ہے تو صرف خدا کی طرف توجہ کرے اور اس سے مشکلات کو دور کرنیکی درخواست کرے اسی طرح جب آسائش نصیب ہو تو خدا کو مدنظر رکھے، کیونکہ آسائش کی نعمت کو خدائے متعال نے اس کے اختیار میں قرار دیا ہے۔

فطری بات ہے کہ جب انسان کسی گرفتاری اور نامناسب حادثہ سے دوچار ہوتا ہے تو خدائے متعال کی طرف رخ کرتا ہے، چنانچہ پروردگار عالم مشرکین کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿فا ذا رکبوا فی الفلک دعواﷲ مخلصین له الدین فلما نجیهم الی البر اذاهم یشر کون﴾ (عنکبوت/۶۵)

"پھر جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں (اور کشتی خطرے سے دوچار ہوتی ہے) تو ایمان وعقیدہ کے پورے اخلاص کے ساتھ خدا کو پکارتے ہیں پھر جب وہ نجات پاکر خشکی میں پہونچ جاتے ہیں تو مشرک ہوجاتے ہیں"

یہ کوئی کمال نہیں ہے کہ انسان سختیوں ومشکلات اور ہر طرف سے بلاؤں کے حملوں کے وقت خدا کی

طرف توجہ کرے، البتہ ایسے لوگ بھی ہیں جو بارگاہ الٰہی سے اتنے دور ہو چکے ہیں کہ حتی مصیبتوں میں بھی خدا کو یاد نہیں کرتے، لیکن جس کے دل میں ذرّہ برابر بھی ایمان ہے تو کم از کم سختی اور مشکل کے وقت خدا کو یاد کرتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اگر چاہتے ہو کہ ہر وقت خدا کو یاد کرو، وہ تجھے جواب دے اور تیری فریاد رسی کرے، تو آرام و آسائش کے وقت خدا سے اپنے رابطہ کی حفاظت کرو اور اس سے آشنائی حاصل کرنا، چونکہ اگر اس وقت اس سے ناآشنا ہوئے، تو یہ توقع نہ رکھنا کہ وہ گرفتاری کے وقت تیری فریاد رسی کرے گا، آرام و آسائش کے وقت خدا کو یاد کرو، تاکہ مشکلات میں اس کو پکارتے وقت وہ تجھے لبیک کہے۔

ہم سب، کم و بیش، اپنی اپنی زندگی میں مشکلات اور مصیبتوں میں مبتلا ہوتے ہیں، اور تھوڑی دیر یا زمانے کے بعد اس سے نجات اور چھٹکارہ پا جاتے ہیں، لیکن ہم بہت ہی سادگی کے ساتھ ان قضیوں پس پشت ڈال دیتے ہیں اور اس رہائی اور آسائش کی نعمت جسے خدائے متعال نے ہمیں مشکلات کے بعد ہمیں عنایت کی تھی اس کے بارے میں غور و فکر نہیں کرتے۔ جبکہ بلائیں اور مشکلات انسان کو بیدار کرنے اور اسے خدا کی طرف توجہ دلانے کے لئے ہوتی ہیں تاکہ وہ نعمتوں کی قدر کو جان لے۔

اگر ہمارے لئے کوئی خطرناک صورت حال پیش آجاتی ہے۔ مثلاً ہمارا کوئی عزیز سخت بیمار ہو جاتا ہے امیدوں کے تمام دروازے ہمارے لئے بند ہو جاتے ہیں اور شدید خطرے سے دوچار ہوتے ہیں، اگر اس مایوسی و ناامیدی کے عالم میں کسی نے ہماری مدد کر دی، ایک طبیب یا ڈاکٹر اچانک آگیا اور اس نے ہمارے بیمار کا علاج کر دیا اور اسے ہلاک ہونے سے بچالیا اور اسی طرح سیکڑوں حوادث جو ہمارے لئے پیش آتے ہیں اور ہم اس سے نجات پا جاتے ہیں، ہمیں غور کرنا چاہئے کہ ان مشکلات سے رہائی کے بارے میں ہم کیا اخذ کیا ہے؟ کیا ان سب کو ہم اتفاقی سمجھیں اور کہیں کہ اتفاقاً ایسا ہوا ہے؟ ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ یہ سب خدائے متعال کی مہربانیاں ہیں، خدائے متعال کی مہربانیاں اور عنایتیں ہمارے شامل حال ہوتی ہیں اور ہم ان خطرات سے بچ جاتے ہیں۔

نظام خلقت میں جو کچھ واقع ہوتا ہے، سب ارادۂ الٰہی کے نتیجہ میں ہے اور کوئی چیز خدا کی مرضی کے خلاف واقع نہیں ہوتی۔ اگر انسان کو کوئی نعمت ملتی ہے یا کوئی بلا اس سے دور ہوتی ہے، سب خدائے متعال کے ارادہ سے ہے۔ وہ اسباب اور شرائط کو فراہم کرتا ہے، خواہ وہ اسباب معمولی ہوں یا غیر معمولی خواہ ہم انھیں جانیں یا نہ جانیں۔ (اگر چہ جب ہم غیر معمولی اسباب جنھیں ہم اتفاق سے تعبیر کرتے ہیں پر توجہ کرتے ہیں تو متاثر

ہوتے ہیں) یہ خدائے متعال ہے جو ہمیشہ انسان کو رزق پہنچاتا ہے، خواہ معمولی اسباب کے ذریعہ جیسے کسب معاش یا خواہ غیر معمولی اسباب کے ذریعہ، جیسے مائدہ آسمانی۔ انسان کی مشکلات کا دور ہونا بھی خدائے متعال کے توسط سے ہے، خواہ معمولی راستوں سے یا غیر معمولی راستوں سے۔

ایک تقسیم بندی کے ذریعہ انسانوں کو خدا کی طرف توجہ کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا گروہ: وہ لوگ ہیں جو ہر حالت میں، خواہ خوشحالی اور آسائش میں یا گرفتاری اور بلا میں خدائے متعال کی طرف توجہ رکھتے ہیں اور قرآن مجید کی تعبیر کے مطابق صبح و شام اس کی یاد میں مصروف ہیں اور صرف مشکلات میں اسے یاد نہیں کرتے ہیں:

﴿واذکر ربک فی نفسک تضرعا وخیفة ودون الجهر من القول بالغدو والاصال ولاتکن من الغافلین﴾ (اعراف/۲۰۵)

''اور خدا کو اپنے دل ہی دل میں بغیر منہ سے آواز نکالے ہوئے تضرع اور تنہائی کے عالم میں بھی کم بلند آواز سے صبح و شام یاد کرو اور خبردار غافلوں میں نہ ہو جاؤ''

﴿فی بیوت اذن اللّٰه ان ترفع ویذکر فیها اسمه یسبح له فیها بالغد والاصال﴾ (نور/۳۶)

(یہ چراغ) ان گھروں میں (جیسے مساجد، انبیاء اور اولیاء کے گھر) ہے، جن کے بارے میں خدا کا حکم ہے کہ انکی بلندی کا احترام کیا جائے اور ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے کہ ان گھروں میں صبح و شام اس کی تسبیح کرنے والے ہیں۔

اس گروہ کی ہر حالت میں خدا کی یاد میں ہونے کا راز یہ ہے کہ خدا کی طرف سے تمام نعمتیں حاصل کرنے کے باوجود بھی اس سے بے نیاز نہیں ہیں، اور کم از کم ان نعمتوں کی پائداری کے لئے خود کو خدا کا محتاج جانتے ہیں، چونکہ وہ اپنے مراتب میں اختلاف کے مطابق خدا سے اپنی نیازمندی کو درک کرتے ہیں، لہذا ان کے لئے نعمت و بلا میں کوئی فرق نہیں ہے وہ شائستہ بندے ہیں اور ہمیشہ خدائے متعال کو مدنظر رکھتے ہیں اور خدا کی طرف سے بھی ان پر توجہ ہوتی ہے۔

دوسرا گروہ: اکثر مومنین اس گروہ میں شامل ہیں. یہ وہ لوگ ہیں کہ نعمت و آسائش کی حالت میں کم و بیش

غفلت میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن جب کوئی مشکل اور گرفتاری پیش آتی ہے تو بیدار ہو جاتے ہیں اور خدا کی نسبت نیاز مندی کا احساس کرتے ہیں. یہ لوگ بھی نسبتاً اچھے ہیں، لیکن خدائے متعال ان سے شکوہ کرتا ہے کہ کیوں جب ہم انھیں کوئی نعمت عطا کرتے ہیں تو ہمیں فراموش کر دیتے ہیں اور جب وہ نعمت ان سے چھین لی جاتی ہے تو ہماری (خدا متعال کی) طرف متوجہ ہوتے ہیں:

﴿و اذا انعمنا علی الانسان اعرض و نئابجانبه و اذا مسه الشر فذودعاء عریض﴾ (فصلت/ ۵۱)

اور ہم جب انسان کو نعمت دیتے ہیں تو ہم سے کنارہ کش ہو جاتا ہے اور پہلو بدل کر الگ ہو جاتا ہے اور جب سخت موقع آتا ہے تو خوب لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے۔

تیسرا گروہ: یہ وہ لوگ ہیں جو کسی بھی حالت میں، حتی مصیبت اور بلاؤں میں بھی خدا کی طرف رخ نہیں کرتے اس گروہ کے بعض افراد بلاؤں کو خدا کی طرف سے جانتے ہیں، لہذا جب وہ بلائیں ان پر نازل ہوتی ہیں دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں کیونکہ ان بلاؤں کو غیر طبیعی اسباب کی پیداوار اور خدا کا قہر و غضب جانتے ہیں۔ قوم یونس کی طرح کہ جب ان کے لئے عذاب کا وقت آ گیا اور نزدیک تھا ان پر عذاب نازل ہو جائے، چونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ عذاب خدا کی غضب کی نشانی ہے اس لئے ہوش میں آ گئے اور توبہ کی، اور خدائے متعال نے بھی انھیں نجات دی۔

اس گروہ کے اکثر لوگ بلاؤں کے بارے میں یہ تصور نہیں کرتے ہیں کہ خدا کی طرف سے ہے، لہذا وہ خدا کی طرف توجہ نہیں کرتے ہیں، خدائے متعال ان لوگوں کی سرزنش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿فلولا اذجاء هم بأسنا تضرّعوا ولكن قست قلو بهم وزين لهم الشيطان ما كانوا يعملون﴾ (انعام/ ۴۳)

پھر ان سختیوں کے بعد انھوں نے کیوں فریاد نہیں کی، بات یہ ہے کہ ان کے دل سخت ہو گئے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لئے آراستہ کر دیا ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں:

﴿ثم قست قلو بكم من بعد ذلك فهى كالحجا ر ة او اشد قسوة وان من الحجارة لما يتفجر منه الا نهار وان منها لما يشقق فيخر ج منه الماء وان منها لما يهبط من خشية الله وما الله بغافل عما تعملون﴾ (بقرہ/ ۷۴)

''پھر تمہارے دل سخت ہو گئے جیسے پتھر یا اس سے بھی کچھ زیادہ سخت کہ پتھروں میں سے بعض سے نہریں بھی جاری ہو جاتی ہیں اور بعض شگافتہ ہو جاتے ہیں تو ان سے پانی نکل آتا ہے اور بعض خوف خدا سے گر پڑتے ہیں، لیکن اللہ تمھارے اعمال سے غافل نہیں ہے''

خدا سے درخواست کرنے اور مدد چاہنے کی ضرورت:

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بارے میں کہ انسان کو صرف خدائے متعال سے درخواست کرنی چاہئے اور خدا کے علاوہ کسی اور سے مدد نہیں مانگنی چاہئے، فرماتے ہیں:

"و اذا سالت فاسال اللّٰہ عزوجل و اذا استعنت فا ستعن باللّٰہ ، فقد جری القلم بما ھو کائن الی یوم القیامۃ"

اگر درخواست کرنا چاہتے ہو تو خدائے متعال سے درخواست کرو۔ اور کسی سے مدد چاہتے ہو تو پروردگار سے مدد مانگو کیونکہ قیامت تک رونما ہونے والا سب کچھ لکھا جا چکا ہے۔

طبعی بات ہے کہ انسان کی کچھ حاجتیں ہیں اور وہ ان کو پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے، اور اپنی تمام خواہشات کو پورا نہیں کر سکتا ہے۔ لہذا خواہ نخواہ کسی کے پیچھے دوڑتا ہے کہ اس کی مدد کرے اور اس کی ضرورتوں کو پورا کرے ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذر سے فرماتے ہیں کہ اگر کسی سے کوئی چیز مانگنا چاہتے ہو تو خدائے متعال سے مانگو۔ جب دیکھتے ہو کہ کسی چیز کے حاجت مند ہو اور خود اس کو پورا نہیں کر سکتے ہو اور کسی اور سے مدد مانگنے پر مجبور ہو تو خدائے متعال سے مانگو، کیونکہ تیری حاجت کے بارے میں اس سے بہتر کوئی آگاہ نہیں ہے اور اس کی طرح کوئی یہ طاقت نہیں رکھتا ہے کہ تیری حاجتوں کو پورا کر سکے. پوری ھستی اس کی ملکیت ہے اور اس کی قدرت تمام چیزوں پر تسلط رکھتی ہے اگر کوئی امر واقع ہونا چاہتا ہے تو وہ اس کے ارادہ ومشیت سے واقع ہوتا ہے اس کے علاوہ خدائے متعال ہر شخص سے زیادہ اپنی مخلوق اور اپنے بندہ سے محبت رکھتا ہے اور اس کی بھلائی چاہتا ہے، اس لئے خود اپنے بندہ کو حکم دیا ہے کہ اس کو پکارے اور اسی سے مدد کی درخواست کرے. ہم دعائے افتتاح میں پڑھتے ہیں:

"اللھم اذنت لی فی دعائک و مسئلتک"

''پروردگارا! تم نے مجھے اجازت دی ہے کہ تجھے پکاروں اور تجھ سے درخواست کروں''

فطری وطبیعی بات ہے جب خدائے متعال انسان کے لئے دعاومناجات کا دروازہ کھولتا ہے،تو اس کا جواب دینے اور قبول کرنے کیلئے آمادہ ہے اور اس کے علاوہ خدائے متعال انسان کو ہمیشہ اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے۔اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے اسکی جملہ نعمتوں میں بلاؤں سے رہائی اوران کو دور کرنا بھی ہے یہ نعمت بھی خدا کے توسط سے انسان متواتر خدا کی مہربانیوں اور محبتوں کا مرہون منت ہے اور اسے جاننا چاہئے کہ صرف خدا اس کی مدد کرنے پر قادر ہے اور کائنات میں اس کی اجازت کے بغیر کوئی کام انجام نہیں پاتا ہے ،لہذا صرف اس سے مدد مانگنی چاہئے۔ہم دعائے افتتاح کے ایک دوسرے حصے میں پڑھتے ہیں:

"فکم یا الھی من کربة قد فرجتھا و ھموم قد کشفتھا و عثرة قد اقلتھاورحمة قد نشرتھا وحلقة بلاء قدفککتھا"

پروردگارا! کتنی زیادہ مصیبتوں کو تو نے مجھ سے دور کیا اور اسے برطرف کردیا،میری لغزشوں کو معاف فرمایا،رحمتوں کو پھیلایا اور بلاؤں کے حلقہ کو توڑ دیا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اذا اراد احدکم ان لا یسال ربه شیئا الا اعطاه فلییاس من الناس کلھم ولا یکون له رجاء الا عنداللّٰه فاذا علم اللّٰه عزوجل ذلک من قلبه لم یسال اللّٰه شیئا الا اعطاه"

چونکہ اگر تم میں سے کسی نے یہ چاہا کہ جس چیز کی پروردگار سے درخواست کرے وہ اسے مل جائے تو اسے لوگوں سے ناامید ہوجانا چاہئے اور جو خدا کے پاس ہے اس کے علاوہ کسی چیز کی امید نہیں رکھنا چاہئے ،چونکہ خدائے متعال اس کے دل پر نظر رکھتا ہے اور جو بھی اس سے چاہتا ہے،عطا کرتا ہے

ہم میں سے ہر ایک کم از کم روزانہ کہتا ہے:"ایاک نستعین"لیکن ہم عمل میں ایسے نہیں ہیں۔جیسے کہ ہم بہت سے لوگوں کا عمل یہ ثابت کرتا ہے کہ ہم صرف خدا سے مدد نہیں چاہتے ہیں بلکہ دوسروں سے بھی مدد طلب کرتے ہیں۔البتہ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس بات میں صادق ہیں اور جب"ایاک نعبدوایاک نستعین" کہتے ہیں تو حقیقت میں اسی کی عبادت کرتے ہیں اور صرف اسی سے مدد طلب کرتے ہیں۔لیکن ہم

۔اصول کافی ج۳،ص۲۱۹

سچ نہیں کہتے ہیں اور ہمیشہ خدا کے بندوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ مصیبتوں اور مشکلات میں امید رکھتے ہیں کہ ماں، باپ، بھائی، بہن اور دوست واحباب ہماری مدد کریں اور کبھی اپنی امید اور توقع کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تاکید فرماتے ہیں کہ صرف خدائے متعال سے درخواست کرو اور اسی سے مدد چاہو۔ اس کے بعد جناب ابوذر کو قضاوقدر اور تقدیرات الٰہی کی طرف توجہ دلاتے ہیں اس سے پہلے بھی اس کے بارے میں بحث ہوئی ہے۔ تقدیرات الٰہی اور قضاوقدر پر اعتقاد کے فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ اگر انسان کو آرام وآسائش، دولت اور خوشحال کرنے والا کوئی واقع پیش آتا ہے تو بہت زیادہ اترتا نہیں ہے اسی طرح پریشانی اور ناگواری کے کوئی واقعات پیش آتے ہیں تو بہت زیادہ رنجیدہ اور کبیدہ خاطر نہیں ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جو کچھ پیش آتا ہے وہ تقدیرات الٰہی ہے، اس سے فرار نہیں کیا جاسکتا۔

﴿ماصاب من مصیبة فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبراها ان ذلک علی اللّٰه یسیر﴾ (حدید/۲۲)

زمین میں کوئی بھی مصیبت (قحط، آفت، فقر وظلم) وارد ہوتی ہے یا تمہارے نفسے تم کو پہنچتی ہے تو دنیا میں وارد ہونے سے پہلے وہ کتاب الٰہی (لوح محفوظ) میں ثبت ہو چکی ہے اور یہ خدا کے لئے بہت آسان شے ہے۔

یہ تصور نہ کیا جائے کہ خدائے متعال اپنے بے شمار بندوں میں سے ہر بندہ کے لئے، پوری تاریخ میں جو کچھ اس کے لئے واقع ہوا ہے یا واقع ہوگا وہ کس طرح مقدر کرتا ہے! کیونکہ یہ کام اسکے لئے آسان ہے جیسی وہ ارادہ کرتا ہے تمام معلومات جو اس کے پاس موجود ہے لوح محفوظ میں بھی درج ہے۔ پھر بعد والی آیت میں اس مطلب کی دلیل یوں ذکر کرتا ہے:

﴿لکیلا تاسوا علی مافاتکم ولاتفرحوا بما اتکم واللّٰه لا یحب کل مختال فخور﴾ (حدید/۲۳)

یہ تقدیر اس لئے ہے کہ جو تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اس کا افسوس نہ کرو اور جو مل جائے اس پر غرور نہ کرو کہ اللہ اکڑنے والے مغرور افراد کو پسند نہیں کرتا ہے۔

تقدیرات الٰہی پر اعتقاد کے من جملہ فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان کی نظر ہمیشہ خدا پر ہوتی

ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جس چیز کو اس نے مقدر بنایا ہے وہ اس میں تبدیلی لاسکتا ہے، غیر از خدا دوسرے اس سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتے ہیں، کہ کوئی ان سے امید رکھے۔ اگر اس کے لئے کوئی ناخوشگوار واقعہ اور مصیبت پیش آئے، تو وہ جانتا ہے کہ خدا نے اپنی حکمت کے پیش نظر اسے مقدر فرمایا ہے۔ یا اگر اس سے کوئی چیز چھین لی جاتی ہے، تو وہ جانتا ہے کہ وہ لوح محفوظ میں لکھی گئی ہے اور خدا کے حکیمانہ تدبیر کی بنیاد پر اس قسم کے واقعات رونما ہونے چاہئے، اس لئے ناراض نہیں ہوتا ہے اور پھر بھی بارگاہ الٰہی میں اپنے ہاتھ پھیلاتا ہے اور اس سے چاہتا ہے اس کی مشکلات اور گرفتاریوں کو دور کرے۔ اگر ہمیں کوئی نعمت عطا ہو تو ہمیں مست و مغرور نہیں ہو ناچاہئے اور خدائے متعال کو نہیں بھولنا چاہئے، بلکہ اس حالت میں بیشتر خدا کی طرف توجہ کریں اور اس نعمت کے عطا ہونے پر شکر بجالائیں اور بارگاہ الٰہی میں اپنی تواضع اور گدائی کی حالت کی حفاظت کریں، نہ یہ کہ قارون کے مانندان نعمتوں کو اپنی تلاش وجستجو کا نتیجہ جان لیں:

﴿قال انما اوتیته علی علم عندی اولم یعلم ان اللّٰہ قد اھلک من قبله من القرون من ھو اشد منه قوة واکثر جمعا...﴾(قصص/۷۸)

قارون نے کہا کہ مجھے یہ سب کچھ میرے علم کی بنا پر دیا گیا ہے تو کیا اسے یہ معلوم نہیں ہے کہ اللہ نے اس سے پہلے بہت سی نسلوں کو ہلاک کر دیا ہے جو اس سے زیادہ طاقتور اور مال کے اعتبار سے دولت مند تھیں اور ایسے مجرموں سے تو ان کے گناہوں کے بارے میں سوال بھی نہیں کیا جاتا ہے۔

جان لو جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ تقدیر الٰہی کی بنیاد پر تجھے ملا ہے اور خدائے متعال نے اس کے اسباب فراہم کئے ہیں، اس بنا پر اگر کسی سے مدد کی درخواست کرنا چاہتے ہو، تو اس سے مدد طلب کرو کہ تمام امور جس کے ہاتھ میں ہیں اور تمام کام اس کی تقدیر کے مطابق انجام پاتے ہیں، اگر وہ مصلحت جان لے تو اپنے مقدرات میں تبدیلی لاسکتا ہے، بہر حال تمہیں اس کے سامنے ہاتھ پھیلانا چاہئے اور اسی کی رحمت سے امید باندھنی چاہئے اور جب کسی بلا یا مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ تو، تم میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ وہ بلا و مصیبت ایک حساب شدہ پروگرام کے تحت اور حکیمانہ تدبیر کی بنیاد پر رونما ہوئی ہے لہٰذا گریہ وزاری نہ کرو اور اپنے گریبان چاک نہ کرو کہ کیوں ایسا ہوا؟! ہمارے جزع فزع اور آہ وزاری سے خدائے متعال اپنے حکیمانہ تدبیر سے صرف نظر نہیں کریگا۔

اگر کوئی نعمت تجھے عطا کی گئی ہے، تو یہ تصور نہ کرو کہ اسے تم نے اپنی فطانت اور زیرکی سے حاصل کیا

ہے بلکہ تقدیرات الٰہی اور خدا کی حکیمانہ تدبیر کے سبب وہ نعمت تجھے ملی ہے اس کے علاوہ یہ تیرے امتحان وآزمائش کے لئے ہے کہ تم اس نعمت سے کیا کرتے ہو پس قضاوقدر پر اعتقاد کے فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ انسان جان لے کہ جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ حکیمانہ تدبیر کی بنیاد پر ہوتا ہے اور اگر اس نے کسی قسم کی کمی بیشی کا مشاہدہ کیا تو زیادہ ناراض نہیں ہوتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جس نے اس نظام کو قائم کیا ہے، اس نے اس تقدیر کو تدبیر قرار دیا ہے، وہ اپنے کئے پر اس سے آگاہ تھا اور اپنے بندوں کی بھلائی اور مصلحت سے واقف تھا۔ مذکورہ مطالب کے پیش نظر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذر کو خدا سے مدد مانگنے کی تاکید کرنے کے بعد انھیں تقدیرات الٰہی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فقد جری القلم بما ھو کائن الی یوم القیامۃ"

کیونکہ جو کچھ قیامت تک واقع ہوگا، قلم اس پر جاری ہو چکا ہے

ہم نے اس سے پہلے بھی یاددہانی کرائی ہے اور یہاں پر بھی تاکید کر رہے ہیں کہ ہمیں قضاوقدر اور معارف الٰہی کے مسئلہ سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم بیان معارف میں پوشیدہ حکمتوں سے غافل ہو جائیں اور فکر کریں کہ جو کچھ ہونا ہے وہ واقع ہو کر رہے گا، اور ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے! پس ہم کنارہ کشی کریں اور اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے پہلو تہی کریں! بلکہ ہمیں جاننا چاہئے ہماری تلاش وکوشش بھی تقدیرات الٰہی کے زمرے میں ہے، اس بنا پر ہمیں بیشتر کوشش وجستجو کرنی چاہئے اور اپنے فرائض کے بارے میں بیشتر عزم وارادہ کا مظاہرہ کرنا چاہئے ایسا نہ ہو کہ قضاوقدر پر بھروسہ کر کے فرائض و تکلیف سے پہلو تہی اختیار کی جائے اور سستی وکاہلی کو اپنایا لیا جائے، یہ شیطان کے وسوسے میں سے ہے۔

قضاوقدر پر اعتقاد اس امر کا سبب بننا چاہئے کہ ہم خدا کی طرف بیشتر توجہ کریں اور صرف اس کا دامن تھامے رہیں اور بیہودہ طور پر دوسروں کے پیچھے نہ جائیں اور ان کی چاپلوسی نہ کریں اور اپنی ذاتی غرض کے لئے اپنے فرائض اور تکالیف کو ترک نہ کریں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم شیطان کے دھوکے میں آئیں اور تصور کریں، اب جب کہ سب چیزیں مقدر ہیں، ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے، لہذا گوشہ نشینی اختیار کریں، اگر علم حاصل کرنے میں مشغول ہیں تو اسے چھوڑ دیں، اپنی جگہ پر کہیں کہ اگر مقدر میں ہوگا ہم عالم بن جائیں، تو خواہ درس پڑھیں یا نہ پڑھیں عالم تو ہو ہی جائیں گے! حقیقت میں اگر مقدر میں عالم ہونا ہے از راہ تعلیم تو اگر ہم درس پڑھیں گے تب عالم بن جائیں اور اگر ہم درس نہ پڑھیں تو عالم نہیں بنیں گے البتہ ممکن ہے کسی تلاش و

محنت کے بغیر ہی کوئی علم انسان کو عطا ہو جائے تو یہ فضل الٰہی ہے جو کبھی انسان کو نصیب ہوتا ہے، لیکن بہر حال انسان کو اپنے فریضہ کو انجام دینے کی راہ میں کوشش کرنی چاہئے اور کسی بھی کوشش سے فروگزاشت نہیں کرنا چاہئے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیث کو جاری رکھتے ہوئے اپنے گذشتہ بیانات کی تاکید میں فرماتے ہیں:

"فلو انّ الخلق کلّهم جهدوا ان ینفعوک بشیء لم یکتب لک ماقدروا علیه ولو جهدوا ان یضروک بشیء لم یکتبه الله علیک ما قدروا علیه"

اگر تمام انسان تجھے کوئی فائدہ پہنچانا چاہیں جسے خدائے متعال نے تیرے مقدر میں نہیں لکھا ہے تو وہ اس کی قدرت نہیں رکھتے ہیں، اسی طرح اگر تمام لوگ تجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہیں جسے خدا نے تمھارے لئے نہ لکھا ہو تو وہ ہرگز ایسا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں۔

اگر خدائے متعال کی مرضی وارادہ کسی کام سے متعلق ہو تو، دنیا کی تمام قابل تصور طاقتیں اسے روک نہیں سکتی ہیں:

﴿واللّٰه غالب علی امره ولکن اکثر الناس لا یعلمون﴾ (یوسف/ ۲۱)

اور اللہ اپنے کام پر غلبہ رکھنے والا ہے یہ اور بات ہے اکثر لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے۔

ایک دوسری آیت میں فرماتا ہے:

﴿و ان یمسسک اللّٰه بضرّ فلا کاشف له الاّ هو وان یمسسک بخیر فهو علی کل شیء قدیر﴾ (انعام ۱۷)

اگر خدا کی طرف سے تم کو کوئی نقصان پہنچ جائے تو اس کے علاوہ کوئی ٹالنے والا بھی نہیں ہے اور اگر وہ خیر دے تو وہی ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔

اس لحاظ سے آخری فیصلہ اور قطعی وحتمی ارادہ خدائے متعال کے ہاتھ میں ہے، پس اگر کوئی چیز چاہتے ہو تو اس سے مانگو جس کے پاس اس قسم کا ارادہ وقدرت موجود ہو ایسے افراد کے پیچھے نہ جاؤ جو تمھارے مانند دوسروں کے گدا ہوں اور وہ کوئی کام نہ کر سکیں اور جان لو کہ اگر خدائے متعال نہ چاہے تو کوئی تمھاری مدد نہیں کر سکتا ہے۔

خدا کی حکیمانہ تدبیر کی معرفت اور یقین کا نتیجہ:

آخری نکتہ جس کی ،پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذر کو یاد دہانی کراتے ہیں، کہ اگر اپنے اندر یہ وصف پیدا کرلو تو اس کا بہت زیادہ ثمرہ اور فائدہ ہے ،وہ نکتہ یہ ہے کہ خدا کے بارے میں اس کی معرفت یقین کی منزل تک پہنچ جائے .یقین پیدا کرے کہ جو کچھ خدا نے مقدر کیا ہے وہ واقع ہوگا اور جو مقدر میں نہیں ہے وہ انجام نہیں پائے گا اور جو مقدر ہے وہ لغو اور بیہودہ نہیں ہے بلکہ وہ حکیمانہ تدبیر کے مطابق انجام پاتا ہے۔اس معرفت وشناخت سے مومن اطمینان پیدا کرتا ہے کہ جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ اسکی مصلحت میں ہے ،کیونکہ خداوند متعال اپنے بندہ کا ضرر ونقصان نہیں چاہتا ہے بالخصوص اس بندہ کے لئے جس نے اپنا کام خدا کے سپرد کیا ہے۔وہ اطمینان کے ساتھ اپنا فریضہ انجام دینے کی کوشش کرتا ہے، وہ مطمئن ہے کہ جو واقع ہوتا ہے وہ حکمت الٰہی کے موافق ہے اور اس کی مصلحت اور نفع میں ہے ،خواہ وہ ظاہرا خوش گوار ہو یا ناخوش گوار۔وہ جانتا ہے کہ جو کچھ قضاوقدر الٰہی کی بنیاد پر رونما ہوتا ہے اس میں خیر ہے اور تقدیرات الٰہی میں شر کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔فطری بات ہے کہ اگر انسان یقین اور معرفت کے اس مرحلہ تک پہنچ جائے کہ دنیا کے تمام حوادث اور روداد کو خیر اور حکیمانہ تدبیر الٰہی کے تناظر میں دیکھے تو جو بھی واقع ہوگا اس پر راضی اور مطمئن ہوگا اور جو بھی واقع ہوگا وہ خیر ہے اور انسان خیر سے خوشحال ہوتا ہے اور ممکن نہیں ہے وہ اسے برا لگے۔

البتہ یہ یقین اور معرفت اور یہ ایمان کا بلند درجہ آسانی کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا ہے اور ہر آدمی اس قسم کے ایمان کو آسانی کے ساتھ اپنے دل میں پیدا نہیں کرسکتا ہے اور ہر کوئی یہ لیاقت نہیں رکھتا کہ اس مقام تک پہنچ جائے۔جو شخص اس قسم کے مقام تک پہنچنا چاہے اسے چاہئے کہ وہ تہذیب نفس کے لئے سخت کوشش کرے اور ایک ایسے مرحلہ پر پہنچ جائے کہ اپنے نفس پر مکمل طور پر کنٹرول حاصل کرلے اور الٰہی احکام پر عمل کرنے کے لئے اور اولیائے الٰہی کی سیرت سے سبق حاصل کرے نیز انسانیت کے عالی مراتب تک پہنچ جائے تاکہ ہمیشہ اپنی مرضی پر خدا کی مرضی کو ترجیح دے اور فطری بات ہے کہ ہر کوئی اس مقام تک پہنچ سکتا ہے .پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تاکید کرتے ہیں کہ اگر کسی یقین ومعرفت کی منزل کو اس حد تک درک کرلیا کہ حوادث کو اپنی صلاح اور خیر کے تناظر میں دیکھے اور ناخوشگوار حالت پر رنجیدہ وکبیدہ خاطر نہ ہو اور کم

از کم تلخ اور ناخوشگوار حوادث کے مقابلہ میں صبر اور بردباری کا مظاہرہ کرتا ہو۔اسے جاننا چاہئے کہ مقدر کے مطابق انجام پانے والے حوادث کے مقابلے میں کمزوری اور بے صبری کا کوئی فائدہ نہیں ہے انسان جس قدر بے تابی کرے، خدا کی مرضی کے مطابق انجام پانے والا حادثہ انجام پائے گا اور اس کو روکنے کے لئے ہم کچھ نہیں کر سکتے ہیں

اگر اس کے لئے کوئی مصیبت پیش آئے، کسی بیماری یا فقر میں مبتلا ہو جائے، زلزلہ یا سیلاب کے نتیجہ میں اس کا سب کچھ لٹ جائے، یا کوئی اور حادثہ پیش آجائے، تو وہ صبر کرے اور برداشت کو اپنا پیشہ قرار دے، تو اس صورت میں وہ خدا کی عنایتوں کا حقدار و مستحق ہے۔البتہ اگر کسی حادثہ کی پہلے سے پیش بینی (اطلاع) سے پہلے ہو تو کچھ مقدمات کے بارے میں غور و حوض کر کے اسے روکا جا سکتا ہے تو انسان پر فرض ہے اسے روکے۔لیکن بہت سے ترقی یافتہ ممالک بھی تمام امکانات اور جدید ترین وسائل کے باوجود ایسے ناگہانی حادثات و آفات سے روبرو ہوتے ہیں کہ جس کی پہلے سے اطلاع اور پیش بینی ممکن نہیں ہوتی اور وہ اسکے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے ہیں. چنانچہ مشہور ہے کہ جاپان سب سے زیادہ زلزلہ زلزلہ کی زد میں آنے والا ملک ہے، اور سے مقابلہ کرنے کیلئے مدافعت کرنے والی عمارتیں وہاں تعمیر کی گئی ہیں، متوقع مصیبت اور حادثہ سے متاثر ہونے والوں کی بروقت امداد کے لئے پہلے سے ہی وسائل آمادہ رکھے گئے ہیں، کیونکہ وہ ملک اس سلسلہ میں کافی رکھتا ہے اور وہ لوگ ترقی یافتہ ہیں اور اس پر کافی سرمایہ بھی خرچ کرتے ہیں۔اس کے باوجود مشاہدہ کیا گیا ہے کہ دنیا ایک سب سے افسوس ناک اور خطرناک زلزلہ جاپان میں آیا اور اس کے نقصانات ان نقصات سے کہیں زیادہ تھے جو دوسرے پسماندہ ممالک میں زلزلوں سے ہوا کرتے ہیں.

پس حوادث مقدر ہیں اور رونما ہوتے ہیں۔لوگ اس سے بے خبر ہیں۔ان حوادث کا امر ایک ایسے مدبر عالم کے ہاتھوں میں ہے کہ کائنات اسکی تدبیر سے چلتی ہے۔وہ جانتا ہے کہ کس فارمولے کے مطابق، کب اور کہاں زلزلہ آنا چاہئے۔اور کہاں سیلاب آنا چاہئے۔ممکن ہے خدا نہ کرے ہمارے لئے بھی کوئی مصیبت نازل ہو جائے، اب اگر ہم خدا کی حکیمانہ تدبیر اور خدا کے احسن نظام پر یقین اور معرفت رکھتے ہیں تو ناراض نہیں ہوں گے، کیونکہ ہم الٰہی تدبیروں پر حسن ظن رکھتے ہیں اور سب کو خیر اور اپنی اصلاح کے ذریعہ جانتے ہیں. جب ہم کمی اور کسی کمزوری کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اس سے ناراض ہوتے ہیں، لیکن اگر ہم اسے سو فیصدی اپنی مصلحت اور بھلائی میں دیکھیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس سے ناراض ہو جائیں اور ہمیں

غصہ آئے۔ ممکن ہے کوئی انسان تکلیف اور بیماری کی شدت سے تڑپے اور درد اسے فرصت نہ دے، لیکن جب دیکھتا ہے وہ بیماری اس کے حق میں بہتر ہے اور اس کے لئے صلاح کا باعث ہے تو اس کی آؤ بھگت کرتا ہے بالکل اسی طرح کہ جس کا دانت خراب ہو گیا ہے اور اسے نکالوانا چاہتا ہے۔ وہ دانت نکالنے کے لئے خود پیشکش کرتا ہے اور اس کے لئے پیسے بھی صرف ہے، کیونکہ وہ اس کام کو اپنی مصلحت میں جانتا ہے اور کبھی ناراض نہیں ہوتا ہے کہ اس کا کیوں دانت کو نکالا گیا، کیونکہ وہ جانتا ہے خراب شدہ دانت بدن کے لئے مضر ہے اور اسے نکالا جانا چاہئے۔ کبھی انسان ایسی تکلیف اور بیماری میں مبتلا ہوتا ہے کہ اسے علاج کرنے کے لئے کسی دوسرے ملک جانے کی ضرورت ہوئی ہے اور لاکھوں روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے، یا اپنی صحت یابی کے لئے مجبور ہوتا ہے اپنے بدن کے کسی عضو سے محروم ہو جائے اور اس کے معالجہ کے لئے پیسے بھی خرچ کرتا ہے یا جس کے کسی اعضاء کے کاٹے جانے پر راضی ہو جاتا ہے، لیکن اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ وہ مقام رضا تک پہنچا ہے اور دل سے اس کے لئے آمادہ ہے جو اسے درپیش ہے اور کسی قسم کا شکوہ نہیں رکھتا ہے۔ بلکہ ممکن ہے پیش آنے والی چیز سے گلہ مند ہو، اگر جرأت ہو تو خدا سے شکوہ کے لئے لب کشائی کرتا۔ چنانچہ ضعیف الایمان افراد پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو اپنی طاقت کو کھو دیتے ہیں اور حتی خدائے متعال سے بھی شکوہ کرتے ہیں۔ اسی مطلب کے پیش نظر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"فان استطعت ان تعمل للّٰہ عز وجل بالرضا والیقین فافعل وان لم تستطع فان فی الصبر علی ما تکرہ خیراً کثیراً وان النصر مع الصبر والفرج مع الکرب وانّ مع العسر یسرا"

"پس اگر تم اپنی رضا و یقین کے ساتھ خدا کے لئے کوئی کام انجام دے سکتے ہو تو اسے انجام دو اور اگر انجام نہیں دے سکتے تو جس چیز سے تمہیں نفرت ہے اس پر صبر و تحمل کرنے میں تمہارے لئے فراوان خیر ہے۔ کامیابی صبر کے ساتھ ہے اور آسائش و آسودگیغم واندوہ کے ساتھ ہے۔ بیشک ہر دشواری کے ساتھ آسانی بھی ہے۔"

اگر مقام رضا تک تمہارے لئے پہونچنا ممکن ہوتا کہ البتہ رضا، یقین کے سایہ میں حاصل ہوتی ہے اور جب تک انسان مقام یقین تک نہیں پہونچتا ہے وہ مقدرات الٰہی پر راضی نہیں ہو سکتا بیتم کتنے خوش قسمت ہو کہ انسانیت کے بہترین مقام تک پہونچ گئے۔ اس لئے انسان کا بہترین مقام اور خصوصیت یہ ہے

کہ وہ تقدیرات الٰہی پر راضی ہو اور تہہ دل سے خوش ہو اور کسی قسم کا گلہ وشکوہ نہ کرے۔ پس کوشش کرو کہ تمھاری رفتار رضا و یقین کی بنیاد پر ہو۔ اس صورت میں تلخ و شریں حوادث کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کر سکتے ہو اور کسی قسم کی ناراضگی اور شکوہ سے عاری ہو۔ لیکن اگر اس حد تک نہیں پہنچے اور نا راضگیوں اور ناخوشگوار حوادث کے بارے میں اپنے لئے توجیہ نہیں کر سکتے کہ جس کی وجہ سے راضی ہو سکو، تو سختیوں کے مقابلہ میں صابر بننے کی کوشش کرو، گریہ وزاری نہ کرو اور اپنے آرام وسکون کی حفاظت کرو۔ اگر ان مشکلات کے بارے میں دل سے راضی نہ ہو سکے، تو جان لو کہ یہ تمھاری معرفت کی کمی ہے کہ مقام رضا تک نہیں پہونچ سکے ہو، کم از کم بے تابی نہ کرو اس لئے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے اپنی عقل و ایمان کی حفاظت کرو۔ جان لو کہ اگر تم نے مصیبتوں اور مشکلات کے مقابلہ میں صبر کیا تو خدائے متعال تمہیں فراوان خیر عنایت کرے گا۔

انسان کی معنوی بلندی اور تکامل میں مشکلات کا رول:

اس کے بعد اپنی بات کی تاکید فرماتے ہیں: صبر و شکیبائی کے سائے میں کامیابی ہے اور ہر غم واندوہ کے ساتھ راحت و آسودگی ہے اور ہر سختی کے ساتھ آسانی بھی ہے۔ قرآن مجید میں خدائے متعال بھی فرماتا ہے:

﴿فان مع العسر یسرا. ان مع العسر یسرا﴾ (انشراح/۵۔۶)

ہاں زحمت کے ساتھ آسانی بھی ہے۔ بیشک تکلیف کے ساتھ سہولت بھی ہے۔

قرآن مجید میں بہت کم کوئی مطلب دو بار تکرار ہوا ہے اور وہ بھی صرف تاکید ''انّ'' سے۔ یہ خدائے متعال کی اس مطلب کے بارے میں توجہ اور عنایت کی دلیل ہے۔ خدائے متعال مذکورہ آیہ شریفہ میں فرماتا ہے: ہر سختی کے ساتھ آسانی ہے، یہ نہیں فرماتا ہے کہ ہر سختی کے بعد آسانی ہے، گویا آسانی خود سختی کے اندر پوشیدہ ہے۔

خدائے متعال سورہ ''انشراح'' میں محبت آمیز لہجہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہ جو گویا آزردہ خاطر۔ تسلی دیتا ہے اور آپؐ کو آرام واطمینان دلاتا ہے کہ کس طرح خدائے متعال نے ان کے کندھوں سے سنگین بوجھ کو اٹھا کر، دشواریوں کو آسانیوں میں تبدیل کیا ہے۔ اس کے بعد فرماتا ہے: ہر رنج و سختی کے ساتھ آسانی ہے، پس اگر فراغت ملے تو اپنے آپ کو پھر سے زحمتوں میں ڈالنا اور کوشش کو پھر سے شروع کرنا حقیقت میں خدائے متعال اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ سختیاں اور مصیبتیں انسان کے

کمال و پیش رفت کا مقدمہ ہیں، جو اس کے لئے توانائی حاصل کرنے کا سبب بنتی ہیں۔ اس لحاظ سے مصیبتیں اور سختیاں انسان کے تکامل و ترقی کے لئے ضروری ہیں:

﴿لقد خلقنا الانسان فی کبد﴾ (بلد/۴)

''بیشک ہم نے انسان کو رنج و مشقت میں رہنے والا بنایا ہے۔''

یہ آیہ شریفہ انسان کی خلقت اور تکامل ترقی میں رنج و مصیبت کے اہم رول کو بیان کرتی ہے۔ اگر اس کے علاوہ کچھ اور ہوتا تو خدائے متعال جو مہربانیوں اور رحمتوں کا سرچشمہ ہے اور اپنے بندے کے لئے ہمیشہ خیر و سعادت چاہتا ہے اسے رنج و مصیبت سے دوچار نہ کرتا۔

مذکورہ مطالب کے علاوہ، خدائے متعال اپنے بندوں کی متواتر آزمائش کرتا ہے تاکہ شائستہ افراد کی پہچان کی جاسکے، اس سلسلہ میں خدائے متعال نے انسانوں کی تربیت و پرورش کے لئے دو پروگرام مقرر فرمائے ہیں: عبادات کا تشریعی پروگرام اور مصائب و مشکلات کا تکوینی پروگرام۔ بالآخر جو احکام الٰہی کی صحیح معنوں میں پیروی کرتے ہیں اور سختیوں اور دشوایوں کو دل و جان سے قبول کرتے ہیں، ان کی رحمت اور معرفت الٰہی کی طرف راہنمائی کی جاتی ہے:

﴿ولنبلونکم بشیء من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس و الثمرات وبشر الصابرین. الذین اذا اصابتهم مصیبة قالوا انا لله وانا الیه راجعون﴾ (بقرہ/۱۵۵۔۱۵۶)

اور ہم یقیناً تمھیں تھوڑے خوف تھوڑی بھوک اور اموال، نفوس اور ثمرات کی کمی سے آزمائیں گے اور اے پیغمبر! ان صبر کرنے والوں کو بشارت دیں جو مصیبت پڑنے کے بعد یہ کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی بارگاہ میں واپس جانے والے ہیں۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

((ان اللّٰه عزو جل لیتعاهد المومنین بالبلاء کما یتعاهد الرجل اهله بالهدیة من الغیبة...)) [1]

خدائے متعال اپنے بندہ پر مہربانی کرتا ہے اور اس کے لئے بلاؤں کو تحفہ کے طور پر پیش کرتا ہے،

۱۔ اصول کافی، ج ۳ ص ۳۵۴

اسی طرح جیسے ایک مرد سفر سے اپنے بال بچوں کے لئے تحفے لاتا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مسلمان کے گھر مدعو ہوئے۔ آپؐ جب میزبان کے گھر میں داخل ہوئے تو ایک مرغی کو دیکھا کہ جس نے دیوار کے اوپر انڈا دیا تھا اور وہ انڈا ایک میخ پر رک گیا اور زمین پر نہیں گرا، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تعجب میں پڑ گئے۔ میزبان نے کہا: آپؐ نے تعجب کیا؟ اس خدا کی قسم جس نے آپؐ کو پیغمبری کے لئے مبعوث فرمایا ہے، مجھے کبھی نقصان نہیں پہنچا ہے! رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جیسے یہ جملہ سنا، آپؐ کھڑے ہو گئے اور اس شخص کے گھر میں کھانا نہیں کھایا اور فرمایا: جس نے کبھی کوئی مصیبت نہ دیکھی ہو اس پر خدا کی مہربانی نہیں ہوتی ہے!

اس بنا پر اگر بلاؤں کو صحیح نگاہ سے دیکھا جائے، تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ سختیاں اور بلائیں تربیت اور بیداری کا رول انجام دیتی ہیں۔ مشکلات اور سختیاں سوئے ہوئے اور بے حرکت انسانوں کو بیدار و ہوشیار کر دیتی ہیں اور ان کے عزم و ارادہ کو ابھارتی ہیں اور حقیقت میں سختیاں انسان کو استقامت و مقامت کی قدرت بخشتی ہیں۔ انسان کی دنیوی زندگی کی خاصیت سختیوں کے ساتھ ہے، اس میں جس قدر انسان کی قوت مقاومت میں اضافہ ہوگا اسی اعتبار سے اس کے تکامل میں اضافہ ہوتا جائیگا اور رفتہ رفتہ اس کی فطانت اور پوشیدہ قابلیتیں ظاہر ہوتی جائیں گی اور یہ لطف و عنایت الٰہی کی دلیل ہے۔ مولانا رومی اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

گندمی را زیر خاک انداختند　　پس ز خاکش خوشه هابر ساختند

بار دیگر کوفتندش ز آسیا　　قیمتش افزون و نا ن شد جانفرا

با ز نان را زیر دندان کوفتند　　گشت عقل و جان وفهم سود مند

(گندم کے ایک دانہ کو زیر خاک رکھا جاتا ہے، پھر اس کے خوشے نکل آتے ہیں، پھر اس گندم کے دانے کو چکی میں پیسا جاتا ہے، اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے پھر وہ روٹی میں تبدیل ہو جاتے ہیں، پھر اس روٹی کو دانتوں سے چبایا جاتا ہے، پھر وہ فائدہ بخش عقل، جان و شعور میں تبدیل ہو جاتے ہیں)

﴿...سیجعل اللّٰہ بعد عسر یسرا.﴾ (طلاق/۷)

"...عنقریب خدا تنگی کے بعد وسعت عطا کرے گا"

یہ آیت ان افراد کے لئے قابل توجہ ہے جن کی ظرفیت کم ہے اور جب وہ سختی اور مصیبت میں

گرفتار ہوتے ہیں تو نا امیدی سے دوچار ہوتے ہیں اور خیال کرتے ہیں سب کچھ لٹ گیا ہے۔ حتی، دعا اور اولیائے الٰہی سے توسل اور خدا سے التجا کی طرف بھی رخ نہیں کرتے اور اپنے لئے تمام دروازے بند دیکھتے ہیں۔ مومن کو مصیبتوں کے مقابلہ میں بیقرار ہو کر اپنے ہوش نہیں کھونا چاہئے، بلکہ اسے اپنے آرام وسکون کی حفاظت کرنی چاہئے اور جاننا چاہئے کہ ہر سختی کے بعد ایک آسانی ہے اور خدائے متعال نے ایسا مقدر نہیں کیا ہے کہ اس کا بندہ ہمیشہ سختیوں سے مقابلہ کرتا رہے اور پوری زندگی سختیوں اور مشکلات میں گزارے۔ بلکہ اگر خدائے متعال سختی کو قرار دیتا ہے تو اس کے بعد آرام وآسائش کو بھی قرار دیتا ہے اور اس کے انتظار میں رہنا چاہئے۔

قناعت اور لوگوں سے بے نیازی:

اس بحث کے اختتام پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیث کے اس حصہ میں فرماتے ہیں:

"یا اباذر! استغن بغنی اللہ یغنک اللہ"

"اے ابوذر! خداداد دولت کے توسط سے بے نیازی کی جستجو کرو تا کہ خدا تجھے بے نیاز کردے۔"

گویا اس بیان سے پیغمبر اسلام ﷺ کا مقصود جناب ابوذرؓ کے لئے صحیح طور پر واضح نہیں تھا۔ چونکہ معلوم ہے کہ جو شخص دولت حاصل کرتا ہے وہ اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتا ہے اور کسی کی تلاش میں نہیں جاتا اور اس میں کوئی مفہوم نہیں ہے کہ ایسے شخص کو کہا جائے کہ اپنے کو بے نیاز شمار کرو اور کسی کی طرف اپنا ہاتھ نہ پھیلاو۔ پس قطعاً پیغمبر اکرم ﷺ کے کلام میں کوئی راز مضمر ہے اور اس میں کوئی نکتہ پوشیدہ ہے۔ اسی جہت سے آنحضرت ﷺ کے مقصود کے بارے میں جناب ابوذرؓ سوال کرتے ہیں اور آنحضرت ﷺ جواب میں فرماتے ہیں:

"غداء ة یوم و عشاء ة لیلة، فمن قنع بما رزقه الله فهو اغنی الناس"

"(خدا کی دولت کا مقصود جس سے تم اپنے کو دوسروں سے بے نیاز سمجھتے ہو) تمھاری شب وروز کی غذا ہے جو شخص خدا کی دی ہوئی ہر چیز پر قناعت کرے وہ غنی ترین لوگوں میں سے ہے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: جب آج دن کے لئے تیرے پاس غذا موجود ہے تو دوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاو اور اس فکر میں نہ رہو کہ کل کیا ہوگا۔ جو کچھ اس وقت تمھارے ہاتھ میں ہے اسی پر قناعت کرو اور اس کے علاوہ اپنے کو بے نیاز جانو اور دل میں دوسروں کی نیازمندی کا تصور تک نہ کرو اگر نیاز مندی کا احساس کیا اور کل کی بہبودی کی فکر میں رہے تو خود کو دوسروں کا محتاج بنایا ہے اور کل کی بہبودی کے لئے وسائل حاصل کرنے کی غرض سے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہوگے اور اس طرح ذلیل ہوگے، کیونکہ جو بھی دوسروں کے سامنے اپنی نیازمندی کا ہاتھ پھیلاتا ہے وہ ذلیل ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر عزیز اور سربلند رہنا چاہتے ہو اسی رزق پر قانع و راضی رہو جسے خدائے متعال نے تمھارے لئے مقدر کیا ہے۔ اگر انسان طمع اور لالچ میں مبتلا ہوا، تو جس قدر آرام و آسائش کے وسائل اس کے لئے فراہم ہو جائیں، پھر بھی وہ اسی فکر میں رہتا ہے کہ کیا کروں تا کہ اپنے مال و دولت میں اضافہ کروں اور اپنے لئے مزید وسائل و امکانات حاصل کروں۔ وہ اس طرز تفکر کی وجہ سے ہمیشہ اپنے آپ کو دوسروں کا محتاج پاتا ہے اور اپنے بارے میں سوچنے کی فرصت پیدا نہیں کرتا ہے تا کہ کمالات انسانی کے بارے میں غور و فکر کرے۔ کہ کس لئے پیدا کیا گیا ہے، اپنی آخرت کے لئے کیا کیا ہے۔ وہ دنیا میں طمع اور لالچ کے دام میں گرفتار ہوتا ہے اور ایک لمحہ بھی فراغت و آسائش سے نہیں گزارتا اور بالآخر زاد راہ کے بغیر خالی ہاتھ اس دنیا سے رخت سفر باندھتا ہے۔

اگر انسان آج کے رزق پر مطمئن ہو جائے اور خود کو بے نیاز کرلے اور دوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے، تو وہ اپنا وقت اپنی ترقی، بلندی اور کمال حاصل کرنے کے لئے صرف کرسکتا ہے۔ اپنے قناعت کے سرمایہ سے کہ جس کو اس نے ذخیرہ کر رکھا ہے اسے مواقع فراہم کرلے تا عبادت، تحصیل علم، جہاد، خدمت خلق بالآخر خدا کی مرضی کے مطابق اور اپنی آخرت کے لئے ہر مفید کام کو انجام دے۔

حضرت امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اظهر الياس من الناس فان ذلک من الغنا ..." [1]

"لوگوں سے ناامیدی کا احساس ظاہری کرو، کیونکہ یہ حالت غنی اور بے نیاز ہونے کا نتیجہ ہے۔"

اور حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اشرف الغنى ترک المنى" [2]

۱۔ بحار الانوار، ج ۷۱، ص ۱۸۵

۲۔ نہج البلاغہ (فیض الاسلام) حکمت ۳۳۲، ص ۱۱۰۳

''بالاترین بے نیازی طولانی آرزوں سے دوری ہے''

انسان کو لوگوں کے پاس موجودہ چیزوں سے زیادہ اس پر امید رکھنی چاہئے جو خدا کے پاس موجود ہے اور یہ نفس وخلق سے بے نیازی تب تک حاصل نہیں ہوسکتی ہے جب تک کہ انسان خدائے متعال پر اطمینان، اس پر توکل، دوسروں پر اعتماد نہ کرنا اور نفع ونقصان کے خدا کے ہاتھ میں ہونے کا یقین پیدا نہ کرے اور جان لے کہ جو بندوں کے حق میں ہے اسے خدا انجام دیتا ہے، اور جو ان کی صلاح میں نہیں ہے اس سے انھیں باز رکھتا ہے، اس صورت میں بندہ دوسروں سے بے نیاز ہوتا ہے، حتی اگر اس کا ہاتھ مال دنیا سے خالی بھی ہو تو بھی اپنے آپ کو دولت مند تصور کرتا ہے، چنانچہ نبی اکرمؐ فرماتے ہیں:

''لیس الغنا فی کثرة العرض انما الغنی غنی النفس'' [1]

''دولت مندی اور غنی ہونا زیادہ مال میں نہیں ہے اور بیشک دولت مندی نفس کی بے نیازی میں ہے۔''

۱۔ بحار الانوار ج ۱۰۳، ص ۳۰

انتالیسواں درس:

خدا کی نظر میں قدر و منزلت کا معیار

- ایمان و عمل صالح اور انسان کی بلندی کا معیار۔
- اسلام کی نظر میں مفید اور قابل قدر مشغلے۔
- ثقافتی اور مذہبی پروگراموں میں اخلاص کی اہمیت۔
- نیت اور اندرونی رجحانات کی اہمیت۔
- محرک اور نیت کو صحیح و سالم بنانے کا راستہ۔

خدا کی نظر میں قدر و منزلت کا معیار

"یااباذر!ان اللہ عز وجل یقول: انی لست کلا م الحکیم اتقبل ولکن همه وهـوا ه،فـا ن کان همه وهواه فیما احب وارضی جعلت صمته حمد الی وذکـراو[وقـارا] وان لـم یتکلم.یااباذر!ان اللہ تبارک وتعالی لا ینظرالی صـور کـم ولا الـی امـوالـکـم و اقـوالـکم ولکن ینظر الی قلو بکم واعما لکم.یا اباذر! التقوی هیهنا ،التقوی هیهنا واشار الی صدره"

چنانچہ ملاحظہ فرمایا کہ گزشتہ بحثوں کا محور تقوی تھا۔ان بحثوں میں تقوی کی اہمیت اور انسان کی زندگی میں اس کے آثار کے بارے میں بحث کی گئی ہے اسکے علاوہ تقوی کے اخروی ثمرات کے بارے میں بھی ذکر کیا گیا ہے، چونکہ ممکن ہے بعض افراد تقوی کے بارے میں غلط تصور رکھتے ہوں اور حقیقی تقوی اور ظاہر و تصوراتی تقوی کے درمیان فرق نہ کرسکیں، اس لئے اس بحث میں اعمال و رفتار کی قدر و قیمت کے معیار پر بحث کی جائے گی۔

بہت سے لوگوں کی عادت ہے کہ وہ افراد کے متعلق ظاہری بنیاد پر فیصلہ کرتے ہیں۔اگر کوئی زیادہ عبادت کرتا ہے، ذکر خدا بجالاتا ہے، قرآن پڑھتا ہے اور نماز کو اول وقت انجام دیتا ہے، تو اسے باتقوی جانتے ہیں۔یا اگر کوئی طہارت کے بعض مسائل کی زیادہ رعایت کرتا ہے اسے ایک باتقوی شخص کی حیثیت سے پہنچانتے ہیں یہ سرسری نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے۔قدر و قیمت کے معیار کو پہنچاننے کے لئے علمائے اخلاق نے کام کے اچھے یا برے ہونے اور انسان کی قدر و قیمت کے معیار کے بارے میں نظری اور بنیادی بحث کی ہے۔ہم یہاں پر اس کی طرف اشارہ کریں گے:

ایمان وعمل صالح اور انسان کی بلندی کا معیار

قرآن مجید کی نظر میں انسان کی قدر و قیمت ایمان اور عمل صالح ہے، شاید قرآن مجید کے ایسے کم صفحات ملیں گے جن میں ان دو مسئلوں کا ذکر نہ آیا ہو:

﴿و اما من امن وعمل صالحافله جزاء الحسنى وسنقول له من امرنا يسرا﴾ (کہف/۸۸)

''اور جس نے ایمان اور عمل صالح اختیار کیا ہے اس کے لئے بہترین جزا ہے اور میں بھی اس کے امور کو اسی پر آسان کردوں گا۔''

دوسری جگہ فرماتا ہے:

﴿الا من تاب وامن وعمل صالحا فاولئک يدخلون الجنة ولا يظلمون شيئا﴾ (مریم/۶۰)

''علاوہ ان کے جنہوں نے توبہ کرلی ایمان لے آئے اور عمل صالح انجام دیا وہ جنت میں داخل ہوگے اور ان پر کسی طرح کا ظلم نہیں کیا جائیگا۔''

انسان دو مد مقابل اوصاف اور مقام کا مالک ہے: ان میں سے ایک صاحبان تقوی اور صاحبان فضیلت، یعنی انبیاء، صالحین، اولیاء، صدیقین اور شہدا سے مربوط ہے۔ اسی لئے حضرت آدمؑ مسجود ملائکہ قرار پائے اور اسی وجہ سے انسان ایک ایسے مقام پر پہنچا تا ہے، جہاں پر اس کے وصف میں کہا گیا ہے:

﴿فی مقعد صد ق عندملیک مقتدر﴾ (القمر/۹۵۵)

''اس پاکیزہ مقام پر جو صاحب اقتدار بادشاہ کی بارگاہ میں ہے۔''

اس نقطۂ اور پہلو کے مد مقابل، زوال، پستی اور خدا سے دوری ہے جب کوئی انسان خدا کی بندگی و عبادت اور انفرادی واجتماعی فرائض کو انجام دینے، خلاصہ یہ کہ انسانیت کے اصول سے جب انسان پہلو تہی اختیار کرلیتا ہے اور زوال کی راہ پر قدم رکھتا ہے تو ایک ایسی جگہ پر پہنچ جاتا ہے، جہاں پر وہ حیوانوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے:

﴿ان هم الا كا لانعام بل هم اضل﴾ (فرقان/۴۴)

''یہ سب جانوروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ ہی گمراہ ہیں''

انسان کے ملکوتی والٰہی پہلوؤں کے لحاظ سے قدر و منزلت کے بعد اس کا وجود ہے جو اس کے دل کا سرچشمہ ہے اور وہاں سے دوسرے اعضاو جوارح پر جاری ہوتا ہے۔ خدا کی یاد میں زبان کا ایک کردار ہے، آنکھ کا قرآن مجید کی تلاوت میں، کانوں کا حق بات کے سننے میں اور ہاتھ اور پاؤں کا خدا کی راہ میں گامزن ہونے کے لئے ایک اہم رول ہے۔ پس اگر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں خدا کے ذکر کی اس قدر تعریف کی گئی ہے، یا اگر انسان کے لئے واجب قرار پایا ہے کہ روزانہ پانچ وقت نماز پڑھے، وہ اس جہت سے ہے کہ انسان کی زندگی کی ذکر خدا کے بغیر کوئی قیمت نہیں ہے اور صرف اسی راہ سے قرب الٰہی تک پہنچ سکتا ہے۔

اسلام اور تمام الٰہی ادیان انسان کیلئے دو متضاد اقدار، مثبت و منفی کے بے حد قائل ہیں۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو انسان کے معمولی معیاروں سے قابل درک نہیں ہیں اور صرف الٰہی معیاروں سے قابل توجیہ ہیں۔ اس کے علاوہ اسلام نہ صرف انسان کی مجموعی عمر کے لئے اس قسم کی قدر و قیمت کا قائل ہے بلکہ اس کی عمر کے گھنٹوں کے لئے بھی اس قدر واہمیت کا قائل ہے، یعنی اسلام کہتا ہے: انسان ایک گھنٹے کے اندر اپنے وجودی قدر و منزلت کو لامتناہی منزلتک پہنچا سکتا ہے، وہ ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو خوش قسمت بنا سکتا ہے اور ابدی و بے نہایت سعادت تک پہنچ سکتا ہے اور ایک گھنٹے کے اندر شقاوت اور بے نہایت بدقسمتی کو بھی اپنے لئے فراہم کرسکتا ہے۔ پس اسلام کی نظر میں قدر و منزلت کا معیار انسان کی صلاحیت، اور خود کی شائستگی اور اسکی صالح نیت ہے اور حتی اسلام کی نظر میں ایک شخص کا معاشرے کے لئے مفید ہونا قدر و منزلت کا معیار نہیں ہے، اگر چہ معاشرہ فرد کے لئے جس اہمیت کا قائل ہے وہ اس فرد کا معاشرے کے لئے مفید ہونے کے اعتبار سے ہے، اسلام نہ صرف ایسے فرد کے لئے قدر و قیمت کا قائل نہیں ہے بلکہ اس کے لئے منفی تصور رکھتا ہے، چونکہ وہ شخص اندر سے فاسد ہے اور اپنے دلفریب و پسندیدہ ظاہر کے پیچھے ایک گری ہوئی اور پست و آلودہ ذہنیت رکھتا ہے۔

اس بنا پر ممکن ہے ایک فرد معاشرے کے لئے زیادہ فائدہ مند ہو، لیکن خود بدبخت اس عالم دین کے مانند جو لوگوں کو دینی معارف سکھاتا ہے اور لوگ اس سے استفادہ کرتے ہیں اور سعادت حاصل کرتے ہیں، لیکن وہ خود بدبخت ہے چونکہ وہ اپنے علم پر عمل نہیں کرتا ہے، اس لئے جہنم میں جائے گا۔ یا اس دولت مند کے مانند جو اپنا مال معاشرے پر خرچ کرتا ہے اور عوام کی بہبودی کے خدمت انجام دیتا ہے، لیکن اس کا

مقصد شہرت حاصل کرنا اور لوگوں کے درمیان سر بلند ہونا ہے اس لئے یقیناً اس کا کام اسلام کی نظر میں کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا ہے۔ جو چیز انسان کے وجود اور اس کے اعمال کو قدر و قیمت بخشتی ہے، وہ اس کا ابدیت اور عالم بے نہایت سے رابطہ ہے یہ رابطہ ایک قلبی رابطہ ہے اور نیت و خدا سے دل کی توجہ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔

پس اگر خدا کے لئے کوئی کام انجام دیا جاتا ہے، اس کی قیمت بے نہایت ہے، خواہ ظاہر میں وہ کام چھوٹا ہو یا بڑا۔ فطری بات ہے کہ جس قدر خدا کے بارے میں انسان کی معرفت زیادہ ہوگی اور کام کو اخلاص کے ساتھ انجام دیا جائیگا اسی اعتبار سے، اس کی قدر و قیمت زیادہ ہوگی، اس کے برعکس جس قدر اس کا خلوص کم تر ہوگا اور اس کی توجہ لوگوں کی طرف اور ان کا دل جیتنے کے لئے اور شہرت و جاہ طلبی پر مرکوز ہو، کی اس کی اہمیت اور وقعت کم ہوتی جائیگی اگر چہ حجم کے لحاظ سے عظیم بھی ہو، نتیجہ کے طور پر جو چیز انسان کی زندگی کو قدر و اہمیت بخشتی ہے، وہ حقیقت میں خدا کی طرف توجہ ہے۔ اگر انسان خدائے متعال کی یاد میں ہو تو اس کے لئے کام انجام دے سکتا ہے، اس کے بغیر ممکن نہیں ہے وہ خدا کے لئے کام کرے اور نتیجہ کے طور پر اس کے کام کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی۔

اسلام کی نظر میں مفید اور قابل قدر مشغلے:

بہت سے لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ ہر وہ کام جو معاشرے کے لئے مفید ہے، اس کی معنوی قدر قیمت بھی زیادہ ہے اور اس کام کا انسان کی معنوی بلندی اور روحی کمالات پر بہت زیادہ اثر ہو۔ وہ تصور کرتے ہیں کہ وہ کام خدا کے لئے یا خدا کی راہ میں ہے جو لوگوں کے لئے سود مند ہو اور اس لحاظ سے وہ زیادہ تر کام کے حجم کو اہمیت دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ فلاں نے کس قدر اپنا سرمایہ خرچ کیا ہے اور ہسپتال یا مسجد کی تعمیر کرائی ہے۔ یہ تصور اور نظریہ بہت ہی سطحی ہے۔ صحیح ہے کہ اچھے کام کے معیاروں میں سے ایک یہ ہے کہ کام معاشرہ اور لوگوں کے لئے مفید ہو، لیکن ایسا نہیں ہے کہ ہر اچھا کام جو حسن فعلی رکھتا ہے، وہ انجام دینے والے کے لئے کمال کا سبب بنے، بلکہ وہ کام کمال کا سبب بنتا ہے جو حسن فعلی کے علاوہ وہی عمل کی نیکی ہے حسن فاعلی بھی رکھتا ہو۔ یعنی فاعل کی نیت اور اس کے کام کرنے کا مقصد خدا اور اس کی مرضی کے لئے ہو۔ اسلام کی نظر میں کام کا خدا کے لئے ہونے اور خدا کی راہ میں ہونے اور اسکی انسان کی بلندی و کمال میں اس کا موثر ہونا، اس

میں نہیں ہے کہ وہ کام صرف لوگوں کے لئے سودمند ہو۔ بلکہ خدائی کام کا معیار یہ ہے کہ انسان اس کام کو خدا کی مرضی کے لئے انجام دے اور خدائی محرک اسے وہ کام انجام دینے پر مجبور کرے۔

خدا کی راہ میں ہونا، یعنی کام ایک ایسی راہ اور جہت میں قرار پائے جس کی انتہا خدائے متعال ہو ،اور جب تک مقصد و ہدف خدائے متعال نہ ہو اسے خدائی راستہ نہیں کہا جاسکتا۔ اگر مقصد لوگوں کی توجہ حاصل کرنا ہے، تو راہ بھی لوگوں کی توجہ جلب کرنے کیلئے ہے۔ اس وقت کام خدا کے لئے اور اس کی راہ میں انجام پاتا ہے کہ فاعل کی توجہ اس کو انجام دیتے وقت خدا کی طرف ہو اور یہ اس کے لئے ممکن ہے جو خدائے متعال کو پہچانتا ہو اور اس کے تقرب کی قدر و قیمت کو سمجھتا ہو۔

اگر چہ کام کے نیک ہونے اور کام کے حسن کا ایک معیار، اسکا لوگوں کے لئے سودمند ہونا بھی ہے، اور جو بھی اپنے کام سے معاشرے کی زیادہ خدمت کرے گا، اس کا کام نیک ہے۔

ہمیں قرآن مجید کی آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہبعض کام جو ہماری نظر میں اچھے ہیں، نہ صرف قرآن مجید نے ان کی تمجید نہیں کی ہے، بلکہ انھیں پست اور ناپسند کے طور پر بیان کیا ہے۔ من جملہ ان میں سے دوسروں کو انفاق کرنا ہے کہ ہم اسے نیک اور اچھے کاموں میں شمار کرتے ہیں اور اگر کسی کو رفاہی اور امدادی امور انجام دیتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس کی ستائش کرتے ہیں جبکہ بعض خالص نیت نہ رکھنے والے انفاق کرنے والوں کی قرآن مجید نے سرزنش کی ہے اور وہ قیامت کے دن پشیمان ہوں گے اور کف افسوس ملیں گے کہ کیوں اپنے مال کو لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے ہم نے خرچ کیا۔ ممکن ہے دنیا میں لوگ انھیں ستائش کریں، اس کی تصویر کو در و دیوار پر نصب کریں یا حتی اس کا یادگاری مجسمہ بھی بنائیں ،تا کہ سب لوگ اسے ایک خیر کے عنوان سے پہچان لیں۔ لیکن قرآن مجید ان کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿یا ایها الذین آمنوا لا تبطلوا صد قا تکم با لمن و الأذی کا لذی ینفق ما له رئاء الناس... ﴾ (بقرہ/۲۶۴)

''ایمان والو! اپنے صدقات کو منت گزاری اور اذیت سے برباد نہ کرو اس شخص کی طرح جو اپنے مال کو دنیا والوں کو دکھانے کے لئے صرف کرتا ہے۔''

اگر انفاق، ریا اور خودنمائی کی غرض سے ہو خدا اور معاد پر ایمان کی بناء پر نہ ہو، تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اس ریا کی مثال اس شخص کی جیسی ہے جو بیج کو زرخیز زمین کے بجائے ایک ہموار پتھر پر رکھ

کر اس کے اوپر تھوڑی سی مٹی ڈالتا ہے اور منتظر رہتا ہے سبز ہو کر اس سے پھل حاصل ہوگا! وہ اس سے غافل ہوتا ہے کہ ایک تیز ہوا یا بارش سے وہ مٹی ڈھلجائے گی! اس بنا پر اس قسم کا انفاق کرنے والوں کو، ان کے خرچ کئے گئے پیسوں اور محنتوں کے عوض میں کچھ نہیں ملے گا، کیونکہ ان کا عمل خدا اور آخرت پر ایمان کی بنیاد نہیں تھا۔

یہ لوگ خودنمائی، دوسروں سے مقابلہ اور رقابت نیز اپنی نیک نامی اور شہرت کے لئے انفاق اور معاشرے میں خدمت کرتے ہیں کہ لوگ ان کی ستائش کریں۔ اگر کوئی شخص کسی عہدے پر فائز ہے، لوگوں کا نمائندہ ہے، تو یہ اس لئے خدمت کرتا ہے کہ لوگ اسے دوسرے انتخاب میں ووٹ دے کر پھر سے انتخاب کریں یا اگر کوئی انتظامی منصب رکھتا ہے تو اس لئے خدمت کرتا ہے کہ اسے ترقی ملے۔ پس اس قسم کے افراد کے انفاق کی خدا کے نزدیک ذرہ برابر قدر و قیمت نہیں ہے اور اس کا اخروی سعادت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ اس بنا پر اچھے اور شائستہ کام کا ملاک جو انسان کے لئے آخرت میں سعادت کا سبب بنے یہ ہے کہ وہ کام ایمان کے ساتھ ہمراہ ہو اور اس کا سرچشمہ ایمان ہو۔ اس جہت سے خدائے متعال قرآن مجید میں ایمان کو عمل صالح کے ساتھ منسلک کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿وبشر الذین آمنوا وعملوا الصالحات انّ لهم جنات تجری من تحتها الانهار...﴾ (بقرہ ۲۵)

''پیغمبر! آپ ایمان اور عمل صالح والوں کو بشارت دیں کہ ان کے لئے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔''

﴿والذین امنوا وعملوا الصالحات اولئک اصحاب الجنة هم فیها خالدون﴾ (بقرہ ۸۲)

''اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل انجام دیا وہ اہل جنت ہیں اور وہیں ہمیشہ رہیں گے''

خدائے متعال دوسری جگہ فرماتا ہے:

﴿من عمل صالحا من ذکر او انثی وهو مومن فلنحیینه حیوة طیبة و لنجزینهم اجرهم باحسن ما کانوا یعملون﴾ (نحل/۹۷)

''جو شخص بھی نیک عمل کرے گا وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو ہم اسے پاکیزہ حیات عطا کریں گے اور انھیں ان اعمال سے بہتر جزا دیں گے جو وہ زندگی میں انجام دے رہے تھے۔''

اس بنا پر ایمان و عمل کے درمیان رابطہ محفوظ ہونا چاہئے، کیونکہ صرف وہ عمل خدا کی طرف پہونچنے والا ہوسکتا ہے، جس کا سرچشمہ خدا پر ایمان و اعتقاد ہو۔

﴿الذی یوتی مالہ یتز کی وما لاحد عندہ من نعمة تجزی .الا ابتغاء وجہ ربہ الا علی﴾ (لیل/۱۸،۲۰)

''جو اپنے مال کو (خدا کی راہ میں) دے کر پاکیزگی کا اہتمام کرتا ہے۔ جبکہ اس کے پاس کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کی جزا دی جائے، سوائے یہ کہ وہ خدائے بزرگ کی مرضی کا طلبگار ہے''

وہ انفاق کرتا ہے. زکوٰۃ دیتا ہے، لیکن اس کا ارادہ خودنمائی، لوگوں کی توجہ جلب کرنا، اور ان سے تشکر اور قدردانی حاصل کرنا نہیں ہوتا ہے حتی اگر لوگ اسے برا بھلا بھی کہتے ہیں، وہ اپنے کام سے ہاتھ نہیں کھینچتا ہے چونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ انفاق کرو لہذا وہ انفاق کرتا ہے:

﴿و یطعمون الطعام علی حبہ مسکینا ویتیما واسیرا﴾

(انسان/۸)

((یہ اس کی محبت میں مسکین، یتیم، اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں))

مذکورہ آیت کے ضمن میں فرماتا ہے:

﴿انّما نطعمکم لوجہ اللّٰہ لا نرید منکم جزاء ولا شکورا﴾

(انسان/۹)

(کہتے ہیں) ''ہم صرف اللہ کی مرضی کی خاطر تمھیں کھلاتے ہیں ورنہ نہ تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ''

پس اگر ہمارے عمل کا سرچشمہ ایمان ہو اور وہ کام خدا کے لئے ہو، تو صالح ہوتا ہے، لیکن اگر تقرب الٰہی کی نیت کے بغیر انجام دیا جائے اور غیر خدا کی نیت کے ساتھ ہو، تو ایک بے روح اور مردہ جسم کے مانند ہے، جس کے ڈھانچے کو ہم نے بنایا ہے، لیکن روح نہیں رکھتا ہے تاکہ تحول اور ترقی کا سبب بنے، اور

طبعی طور پر بے روح بدن کیطرح گلکر نابود ہو جاتا ہے۔ پس جس عمل میں روح نہ ہو، نہ صرف وہ نمو نہیں کرتا ہے، بلکہ خرابیاں بھی ایجاد کرتا ہے۔ اس لئے یہ طرز تفکر صحیح نہیں ہے کہ جو بھی کام عام لوگوں کے مفاد میں ہو اور معاشرے کے لئے خدمت شمار ہوتا ہے اسے ہم اچھا جان لیں اور اس کے ساتھ اس کی نیت اور اس کے مقصد کو مدنظر نہ رکھیں۔

مذکورہ مطالب صرف عام لوگوں سے مخصوص نہیں ہیں، بلکہ بعض تعلیم یافتہ بھی عمل کی شائستگی اور اچھائی اس میں جانتے ہیں کہ ظاہری عدالت کی بنیاد پر عام لوگوں کی خدمت اور منفعت کے لئے انجام دیا جائے ،جبکہ عمل کی خوبی اور اچھائی اور انسان کی سعادت کے لئے موثر ہونے کا معیار دوسری چیز ہے۔

ظاہر پرست اور سرسری نظر رکھنے والا انسان کام کے حجم اور اس کے اجتماعی اثرات کو اپنے فیصلہ کا معیار قرار دیتا ہے، لیکن یہ الٰہی معیار نہیں ہے اور خدائے متعال کام کے حجم پر نظر نہیں رکھتا ہے۔ وہ نہیں دیکھتا ہے کہ کس قدر پیسہ خرچ ہوا ہے، کس قدر توانائی صرف ہوئی ہے، بلکہ وہ دیکھتا ہے یہ کام کتنا خدا کے لئے انجام دیا گیا ہے اور اسی اعتبار سے وہ کام انسان کی سعادت کا باعث ہوگا۔ لیکن عبادات میں قصد قربت کی شرط سے مراد یہ ہے کہ اگر ذرّہ برابر بھی نیت میں غیر خدا شامل ہو جائے یعنی اس عمل میں کسی کو خدا کا شریک قرار دے، تو وہ عمل باطل ہو جاتا ہے۔ تعبدی واجبات اور مستحبات اور وہ اعمال جن میں قصد قربت ضروری ہے، وہ صرف خدا کے لئے انجام دیا جائے اور اگر انسان نے ایسے کسی کام میں خودنمائی کی، اور لوگوں کی خوشنودی کے لئے آداب کی رعایت کی، نیز نماز کو آب وتاب کے ساتھ بجالائے اور مقصد لوگوں کی توجہ جلب کرنا ہو، تو نہ صرف اس کا عمل باطل ہے بلکہ حرام ہے اور سزا کا بھی مستحق ہے۔ حتی عمل کا وہ حصہ جو خدا کے لئے انجام دیا گیا ہے، وہ بھی قبول نہیں ہوتا ہے، کیونکہ خدائے متعال فرماتا ہے:

"انا خیر شریک من اشرک معی غیری فی عمله لم اقبله الا ما کان خالصا" [1]

''میں بہترین شریک ہوں جو شخص اپنے عمل میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک قرار دے اس کے عمل کو میں قبول نہیں کرتا ہوں، اس عمل کے سوا جو خالص ہو''

پس اگر کسی نے تعبدی عمل میں غیر خدا کو خدا کے ساتھ شریک قرار دیا ہے، تو چونکہ یہ عمل خالص نہیں ہے

۱۔ بحار الانوار ج ۷۰، ص ۲۴۳

ضائع ہو جاتا ہے ممکن ہے ایک عمر تلاش و کوشش کے بعد انسان کے دن سیاہ ہو جائیں اور بد بخت ہو جائے، جیسے ایک عمر اس نے علم حاصل کرنے میں بسر کی اس خیال میں خدا کے لئے علم حاصل کرتا تھا، لیکن جب وہ اپنی نیت کو ٹٹولتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد مقام اور عہدہ حاصل کرنا تھا یا اپنی اجتماعی حیثیت کو بنانا تھا، وہ اس لئے کوشش کرتا تھا کہ لوگ اسے نیک اور پارسا جان لیں اور لوگوں میں شہرت پائے یا کسی عہدے پر فائز ہو جائے۔

اگر اس قسم کا شخص کہے: میں نے لوگوں کی خدمت کی ہے، بہت سے فقیروں کو بھوک سے نجات دلائی ہے، بہت سے بیماروں کے لئے علاج و معالجہ کے وسائل فراہم کئے ہیں اور میں نے مدرسہ و ہسپتال بنائے ہیں، تو خدائے متعال اسے فرماتا ہے: ان میں سے کوئی چیز تمہارے فائدے کی نہیں ہے، تمہارا اجر و ثواب وہی لوگوں کا تمہاری تعریفیں کرنا، تمہاری تصویر کو دیواروں پر نصب ہونا، جرائد و اخباروں میں تمہاری شہرت کا اعلان ہونا اور وہ ستائش ہے جو تمہاری ایک خیر اور نیک انسان کی حیثیت سے کی گئی ہے۔!

پس عمل کی شائستگی و پستی کا ملاک و معیار اس کے دل سے مربوط ہے۔ دیکھنا چاہئے کہ ان امور کو انجام دینے کا سرچشمہ کیا تھا، کیا سرچشمہ دنیا کی محبت ہے یا خدا کی محبت؟ اگر کام خدا کے لئے مخلصانہ انجام دیا ہے تو انسان کی بلندی اور کمال کا موجب ہے اگر ایسا نہیں ہے تو نہ صرف انسان کی بلندی اور روحی کمال کا سبب نہیں ہے، بلکہ ممکن ہے زوال اور اس کی تنزلی کا باعث ہو۔ اگر وہ کام عبادات کے زمرے میں ہوگا تو ریا کے ذریعہ باطل بھی ہو جائیگا اور اگر امور توصلی سے وابستہ تھا اور قصد قربت اس میں شرط نہ تھی تو وہ اپنی قدر و قیمت کھو دیتا ہے، اور جو ثواب قصد قربت کی وجہ سے اس پر مرتب ہوتا ہے وہ نہیں ملتا ہے۔ پس ہر وہ کام جو لوگوں اور اسلامی یا غیر اسلامی معاشرے کے نفع سے مربوط ہے، وہ قدر و قیمت کا حامل نہیں ہے۔ حتی کام کی قدر و قیمت صرف اس لئے نہیں ہے کہ دین اور دینداروں کے لئے فائدہ مند ہے بلکہ ممکن ہے انسان ایک کام انجام دے کہ جو دین کے لئے سودمند ہو، لیکن نہ صرف یہ کہ خود اس کے لئے کوئی فائدہ نہیں بلکہ مضر بھی ہو، کیونکہ اس کا یہ کام اخلاص کی بنا پر نہیں تھا۔

تاریخ اسلام میں کتنے ایسے افراد گزرے ہیں جنہوں نے کچھ ایسے کام انجام دئے ہیں جو دین کے لئے مفید تھے اور کبھی دین کی ترویج اور نشر کا سبب بھی بنے ہیں لیکن چونکہ وہ قصد قربت نہیں رکھتے تھے اس لئے وہ کام ان کے لئے سودمند نہیں تھے، ان کا قصد کشور کشائی، شہرت حاصل کرنا اور لوگوں میں اپنے لئے

محبوبیت پیدا کرنا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی کام انسان کے کمال و بلندی کا سبب نہیں بن سکتا ایک روایت میں آیا ہے:

"ان اللّٰہ یؤید ھذا الدین برجل فاجر" [1]

''خدائے متعال کبھی اپنے دین کو فاسد شخص کے توسط سے تائید کراتا ہے''

ممکن ہے پوری تاریخ میں کچھ فاسق و فاجر حکام نے، اپنے شخصی اغراض اور شہوت طلبی کی بنا پر اپنی مملکت کو وسعت بخشنے کیلئے کشور کشائی کی ہو اور وہ اسطرح دین اسلام کی ترویج کا سبب بھی بنے ہوں اور اگر چہ ان کا یہ کام دین اسلام کے لئے مفید تھا، لیکن خود ان کے لئے فائدہ مند نہیں تھا۔ اس بناء پر اندرونی عوامل اور نیت کے نقش کو ملحوظ نظر رکھنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ جو چیز امور کی اہمیت و منزلت کا باعث ہے وہ صرف خدائی عنصر اور الٰہی انگیزہ ہے، اور ممکن ہے کوئی کام ظاہر میں حقیر اور پست نظر آئے، لیکن چونکہ شائستہ اور خالص الٰہی انگیزہ کے تحت انجام دیا گیا ہے، اسلئے وہ مقدس اور قیمتی ہے۔

ثقافتی اور مذہبی پروگراموں میں اخلاص کی اہمیت:

اس سلسلہ میں دین کے مبلغین اور مروجین کو توجہ کرنی چاہئے کہ تبلیغ اور دینی اور مذہبی پروگراموں کے انعقاد میں نیز، مذہبی مراکز کی تاسیس اور ان امور کیطرف دوسروں کو تشویق کرنے میں ان کا محرک اور نیت خالص ہونی چاہئے۔ یہ ممکن ہے کہ تبلیغات اور اپنے موعظوں سے دوسروں کی صحیح راستہ پر رہنمائی کریں اور انھیں دینی و ثقافتی مسائل کی طرف جذب کریں اور مسجد تعمیر کرنے اور مذہبی مراکز تاسیس کرنے میں تلاش اور عزم و ارادہ کا مظاہرہ کریں اس طرح ثقافتی مسائل کی ترویج کے لئے، اور معاشرے کے ثقافتی پہلوؤں کو مقدار و کیفیت کے اعتبار سے فروغ دینے کے لئے ماحول سازگار بنائیں۔ لیکن انھیں یہ تصور نہیں کرنا چاہئے کہ ان کی یہ سرگرمیاں ہمیشہ خود ان کے لئے سودمند ثابت ہوں گی اور قطعاً ان سے اخروی اعتبار سے فائدہ اٹھائیں گے۔ وہ سرگرمیاں اس وقت ہمارے لئے مفید ہیں اور ہمارے لئے کمال و بلندی کا سبب ہیجب ہمارا مقصد خدائے متعال ہو۔ ہماری فعالیت اور کوشش صرف ترویج دین کے لئے ہو اور ان سے ہمارے ذاتی اغراض وابستہ نہ ہوں تو اس صورت میں ہمیں ایک عظیم سعادت ملے گی، لیکن اگر

۱۔ کافی ج ۵، ص ۱۹

ہمارے ذاتی اور مادی اغراض، ہماری فعالیت اور کوشش کا سبب بنے ہوں، تو ہمیں اپنے کام کے بارے میں خدائے متعال سے کوئی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ پس ہمیں اس نکتہ سے غافل نہیں ہونا چاہئے اور خیال نہیں کرنا چاہئے کہ جب کسی کام کا بہت اچھا نتیجہ نکلے، تو ہمارے لئے بھی مفید ہے اور ہم مغرور ہو جائیں، بلکہ ہمیں اپنی نیت کو ٹٹولنا چاہئے، اس صورت میں نہ صرف ہم مغرور نہ ہوں گے بلکہ ممکن ہے شرمندہ بھی ہو جائیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مطلب کے بارے میں فرماتے ہیں:

"یا اباذر! ان اللّٰہ عز وجل یقول: انی لست کلا م الحکیم اتقبل ولکن همه وهواه، فان کان همه وهواه فیما احب وارضی جعلت صمته حمدا لی وذکرا ووقاراوان لم یتکلم"

"اے ابوذر! خدائے عزوجل فرماتا ہے: میں دانشمند حکیم کی اس بات کو قبول نہیں کرتا ہوں جو وہ زبان پر جاری کرتا ہے، بلکہ اس کو قبول کرتا ہوں جو اس کے دل میں ہے اور وہ اس کا ہدف مقصد ہے۔ اگر اس کا ارادہ وقصد وہ ہو جسے میں چاہتا ہوں اور جس پر راضی ہوں، تو اس کی خاموشی کو بھی اپنے ذکر وحمد وثنا کے طور پر قبول کرتا ہوں، اگر چہ اسنے بات نہ کی ہو۔"

جو لوگ حکمت آمیز باتوں کو سیکھ کر لوگوں کو بتاتے ہیں، ان کی لوگوں کی طرف سے ستائش وتمجید کی جاتی ہے اور لوگ انھیں حسن ظن سے دیکھتے ہیں اور ان کے لئے شائستہ مقام کے قائل ہو جاتے ہیں البتہ انسان کا فریضہ یہ ہے کہ دوسروں کے بارے میں حسن ظن رکھے، لیکن بولنے والے کو اپنے بارے میں دیکھنا چاہئے کہ اس کے کام پر کس قدر اطمینان کیا جا سکتا ہے۔ کیا جس وقت اچھی اور نصیحت آموز باتیں کرتا ہے، تو خدا اسے قبول کرتا ہے اور اسکا تقرب حاصل کرتا ہے یا نہیں؟ خدائے متعال نے خود اس سوال کا جواب دیا ہے کہ مجھے حکیمانہ باتوں سے کوئی کام نہیں ہے بلکہ میں اس مقصد ونیت کو دیکھتا ہوں جو اس بات کے پس پردہ پوشیدہ ہے۔ میں افراد کے میلانات اور رجحانات کو دیکھتا ہوں۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ بات کرتے وقت اس کا دل لوگوں کی طرف متوجہ ہے تا کہ لوگ اس کے بیان کی ستائش کریں اور اس سے خوش ہوں، یا یہ کہ وہ صرف اپنے فریضہ کو دیکھتا ہے اور اس فکر میں ہے کہ اپنے فریضہ پر عمل کرے اور اس کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ لوگ اس کی باتوں سے خوش ہوں یا خوش نہ ہوں، حتی اگر اس کی باتیں انھیں بری بھی لگتی ہیں جب بھی وہ

اپنے فریضہ کو انجام دینے میں کوتاہی نہیں کرتا۔

پس جب اسکے میلانات اور رجحانات میری مرضی کے مطابق ہوں، تو میں اسکی خاموشی پر بھی اس کو ذکر اور حمد وثنا کا ثواب بخشتا ہوں، کیونکہ اس کا دل میری طرف متوجہ ہے اور وہ ایسا کام انجام دینا چاہتا ہے جو میری مرضی کے مطابق ہے۔ وہ جب میری مرضی کو خاموشی میں دیکھتا ہے تو خاموشی اختیار کرتا ہے، اس لحاظ سے اسکی خاموشی عبادت ہے، اور ممکن ہے اس کی یہ خاموشی دوسروں کی عبادتوں سے زیادہ ثواب رکھتی ہو اور اسکی روحی اور معنوی تکامل ترقی میں زیادہ مؤثر ہو جس کی باتیں اور جس کے کام لوگوں کے لئے ہوں اور اس کا دل لوگوں کیطرف متوجہ ہو، وہ کوئی فضیلت وثواب حاصل نہیں کرتا ہے۔ اس کا ثواب وہی لوگوں کی تعریف وتمجید ہے، کیونکہ اس نے خدا کے لئے کام ہی نہیں کیا ہے کہ وہ اسچز ادے۔

مذکورہ مطالب اور عمل کی ہویت وماہیت میں اندرونی محرکات ومیلانات کے اثرات کی شناخت کے پیش نظر اگر ہم نے مشاہدہ کیا کہ کوئی شخص اپنے فریضہ کو تشخیص دینے کے بعد بات کرتا ہے، اگر چہ لوگ اسے پسند بھی نہ کریں، تو ہمیں جاننا چاہئے کہ اس کا مقصد وہدف الٰہی تھا، اس لحاظ سے اس کا عمل اور بیان بلند قدر وقیمت کا حاملہے۔ لیکن اگر بات کرنے میں لوگوں کو مدنظر رکھے اور یہ بھی جانتا ہو کہ اس بات کے کہنے پر خدائے متعال بھی راضی ہے، لیکن چونکہ اجتماعی شرائط کے تحت حالات کے نامساعد ہونے کی وجہ سے بات نہیں کرتا ہے، اور ڈرتا ہے کہ لوگ اس کی بات سے ناراض ہو جائیں، تو اس کا انگیزہ وہدف خدائی نہیں ہے اور اس کا دل لوگوں کی مرضی کا پابند ہے، اس جہت سے اگر دوسرے مواقع اور فرصتوں میں بھی بات کرے، تو اس کی باتوں کا کوئی فائدہ اور کوئیقدر وقیمت نہیں ہے، کیونکہ اسکی توجہ لوگوں کی طرف ہے۔

نیت اور اندرونی رجحانات کی اہمیت:

"یا اباذر ان اللّٰہ تبارک وتعالی لا ینظر الی صورکم ولا الی اموالکم و اقوالکم ولکن ینظر الی قلوبکم واعما لکم"

"اے ابوذر! خداوند تبارک وتعالی تمہاری چیزوں یا تمہارے مال ودولت (اور باتوں) کو نہیں دیکھتا ہے، بلکہ وہ تمہارے دلوں اور اعمال کی طرف دیکھتا ہے۔"

(اصطلاح "صورکم" کے بعد اصطلاح "اقوالکم" کا استعمال مناسب تر وصحیح تر لگتا ہے البتہ اصطلاح

''اموالکم'' کا استعمال بھی ممکن ہے صحیح ہو۔)

خدائے متعال افراد کے ظاہر پر نگاہ نہیں کرتا ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں اور کیا دعوی کرتے ہیں۔یعنی کس کی پیشانی پر سجدہ کے نشان نمایاں ہے یا کس نے کون سا لباس پہنا ہے،اس پر نظر نہیں کرتا ہے بلکہ افراد کے دلوں پر نظر ڈالتا ہے اور ان کے اعمال کو دیکھتا ہے کہ کس قدر وہ اپنے دعوے میں سچا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ جو کچھ اس کے دل میں ہے کیا وہ اسکے ظاہر سے بہتر ہے،یا خدانخواستہ اس کا باطن پلید اور آلودہ ہے اور ظاہر خوشنما! کہ اس صورت میں نہ صرف خدائے متعال اسے کوئی ثواب نہیں دیتا ہے بلکہ اسے منافقین کے زمرے میں قرار دیتا ہے۔

حدیث کا یہ حصہ دل ہلا دینے والا اور متنبہ کرنے والا ہے اور اگر ان امتیازات پر سنجیدہ گی سے غور کیا جائے تو اس صورت میں اپنے بارے میں بہت سے فیصلے کو تبدیل کرنا پڑے گا۔(البتہ دوسروں کے بارے میں ہمیں حسن ظن رکھنا چاہئے) اگر انسان اپنی نیتوں کو ٹٹولے،تو اسے معلوم ہوگا کہ اس میں بہت سی خامیاں ہیں اور وہ خدا کے لئے خالص نہیں ہے،کم از کم اسکی نیتوں کا ایک حصہ غیر الٰہی ہے اور وہ کسی دوسرے انسان کو خدائے متعال کا شریک قرار دیتا ہے اور خدائے متعال نے خود فرمایا ہے کہ اگر کسی نے کسی دوسرے کو میرا شریک قرار دیا،تو اپنے حصہ کو شریک پر ہی چھوڑتا ہوں۔(یعنی اسے چاہئے کہ اس کی جزا شریک سے دریافت کرے)

ہمیں دیکھنا چاہئے کہ جو ہم بات کرتے ہیں جو کام انجام دیتے ہیں،سبق پڑھتے ہیں،موعظہ کرتے ہیں یا جو نماز ہم با جماعت پڑھتے ہیں انمیں ہماری نیت اور غرض کیا ہے.کیا ہم اس لئے نماز جماعت کے لئے جاتے ہیں کہ خدا اسے پسند کرتا ہے،یا اس کے علاوہ دوسرے اغراض و مقاصد ہیں؟ اگر ہمارے عبادی کام خالص نہ ہوں اور ان میں غیر الٰہی اغراض شامل ہوں تو ہمارے دیگر تمام کاموں میں بھی نیت خالص نہیں ہوگی۔اس کے علاوہ اگر ہمارے عبادی اعمال و فرائض خالص نہ ہوں تو وہ اصلا باطل ہیں۔ممکن ہے لوگوں کی ہدایت کرنے والوں کی عبادتوں میں ریا،ظاہر داری،اور نفسانی اغراض کی دخالت جیسی آفتیں، دوسروں سے زیادہ پائی جاتی ہوں۔ایک مزدور اور کسب معاش کرنے والا جو روزمرہ کے کام اور تکان کے بعد،سورج ڈوبتے ہی ایک مختصر نماز پڑھتا ہے،وہ ریا نہیں کرتا ہے۔لیکن جو امامت جماعت کی ذمہ داری انجام دیتا ہے اور لوگوں کو موعظہ،علوم دینی کی تعلیم اور دوسروں کی ہدایت میں وقت صرف کرتا ہے،اس کے

لئے ریا کا مسئلہ اور غیر الٰہی عناصر و مقاصد میں آلودہ ہونا واقعی طور پر حساس ہے اس لئے کہ ریا میں آلودہ ہونے کی صورت میں ممکن ہے انسان دنیوی ضرر سے بھی دوچار ہوگا اور آخروی نقصان سے بھی اٹھانا پڑے گا۔

اس کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بیان کہ ظاہری رفتار و اعمال اور تقوی کا دعوی کرنا تقوی کی دلالت نہیں ہے اور تقوی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ جو افراد کے باطن اور اس کے دل کے اندر پایا جاتا ہے اور یہ عمل کی بلندی اور نیت و مقصد کے خالص ہونے کا معیار ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے سینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یا اباذر! التقوی ھیھنا، التقوی ھیھنا"

"اے ابوذر! تقوی یہاں ہے، تقوی یہاں ہے"

جو بھی ظاہر میں، شائستہ اعمال انجام دیتا ہے، نمازیں زیادہ پڑھتا ہے اہل ذکر اور لوگوں کی خدمت کرنے والا ہے تو یہ سارے امور اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ وہ شخص باتقوی ہے، بلکہ اس کی نیت اور اس کے اندر کے عوامل کو دیکھنا چاہئے اگر خالص خدا کے لئے تھے تو وہ شخص متقی ہے ورنہ ظاہرا تقوی نمائی کرتا ہے۔

ہم نے اس سے پہلے کہا کہ کبھی محرمات سے پرہیز، تکالیف اور واجبات پر عمل کرنا تقوی ہے اور کبھی اس ملکہ نفسانی کو تقوی کہتے ہیں جو شائستہ و صالح اعمال کا سرچشمہ ہو، اس تصور کے پیش نظر، ہمارے اعمال، ہماری عبادتیں اور دیگر نیکیاں اس وقت تقوی کا مصداق بنیں گی کہ جب ان کا منشا و بنیاد خدا کی محبت ہو اور ان کا محرک رضای الٰہی ہو۔ پس ہمیں عمل کی بنیاد پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے، کیونکہ کوئی بھی کام کسی محرک اور نفسانی انگیزہ کے بغیر انجام نہیں دیا جاتا۔ انسان کے اختیاری اعمال اس کے اندرونی ارادے اور نیت کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں اور وہ انگیزہ انسان کے اندر کام کو انجام دینے کا شوق پیدا کرتا ہے اور حقیقت میں وہ رفتار و گفتار ہماری نیت و ارادہ کا مظہر ہے۔ البتہ ممکن ہے انسان کسی کام کو انجام دینے کی نیت رکھتا ہو اور اپنے آپ کو اس کام کو انجام دینے کیلئے آمادہ کرے، لیکن اس کام کے خارجی عوامل ایک دفعہ نابود ہو جائیں اور وہ اس کام کو انجام دینے سے قاصر ہو جائے۔ اس صورت میں کام کا معنوی اثر اس کے دل میں باقی رہتا ہے، اگرچہ خارج میں اسکا کوئی اثر رونما نہیں ہوا ہے۔ وہ اثر معنوی اسکے داخلی میلان اور نیت

پر منحصر ہے کہ جس کو روایت میں لفظ (ھم) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: دیکھ لو کہ تمھارے کام کا محرک کہاں سے وابستہ ہے تمھارے داخلی رجحانات کس سمت میں گامزن ہیں۔ کیا خدا اور اس کی مرضی پر تمہاری نظر ہے، یا لوگوں اور اپنے دنیوی منافع پر؟ اگر تم نے کام کو غیر الٰہی محرک کے ایماء پر انجام دیا ہے، خواہ وہ کام نیک اور پسندیدہ ہو، لیکن اس میں معنوی اور الٰہی اثر پیدا نہیں ہوسکتا، حتی اگر وہ کام دین کی ترویج اور اشاعت کا سبب بھی بنے جب بھی انسان کی سعادت کا سبب نہیں بن سکتا، کیونکہ الٰہی نیت اس میں نہیں ہے جو خدا کا تقرب حاصل کرنے کا سبب ہو۔ خدائے متعال، عمل کے باطن اور اسکے انجام دئے جانے والے منشا پر نظر رکھتا ہے۔ اب اگر وہ منشا و محرک الٰہی تھا تو اس عمل کو قبول کرتا ہے ورنہ عمل کو مسترد کر دیتا ہے اور عمل کی ظاہری صورت سے کوئی سروکار نہیں رکھتا ہے:

﴿لن ینال اللہ لحومھا ولا دماوھا ولکن ینالہ التقوی منکم﴾ (حج/۳۷)

''خدا تک ان جانوروں کا نہ گوشت جانے والا ہے نہ خون۔ اس کی بارگاہ میں صرف تمہارا تقوی جاتا ہے۔''

محرک اور نیت کو صحیح و سالم بنانے کا راستہ:

پس صورت عمل کا خدا سے کوئی ربط نہیں ہے، بلکہ صورت عمل کا لوگوں اور طبیعت سے رابطہ ہے جو چیز عمل کو خدا سے مربوط بناتی ہے وہ انسان کا دل اور اسکی نیت ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمودات کے پیش نظر ہمیں دیکھنا چاہئے کہ کونسا محرک ہمیں وہ کام انجام دینے کا سبب بنا ہے اگر ہمارے محرکات خالص نہ تھے، ہمیں انھیں خالص کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ البتہ نیتوں اور محرکات کو خالص کرنا ایک مشکل کام ہے اور اسکے لئے مقدمات و مواقع فراہم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اس راہ میں سب سے پہلے ہمیں خدا سے مدد مانگنی چاہئے اور غیر الٰہی تمایلات کے شائبوں سے اپنے نفس کو پاک کرنے کے لئے عزم و ارادہ کی ضرورت ہے ریاضت، مشق اور خودسازی سے ہمیں یہ مرحلہ حاصل ہوسکتا ہے۔

ممکن ہے جب انسان دیکھے کہ اس کی نیت خالص نہیں ہے اور اس میں غیر الٰہی عنصر شامل ہے تو وہ اپنی نیت کو خالص کرنے کے لئے کوشش کرنے کے بجائے کام کو ہی ترک کر دے۔ یہ بھی شیطان کا پھندا ہے

کہ جو انسان کو نیک کام انجام دینے سے روکتا ہے۔ مثلاً جب عشرۂ محرم آتا ہے، فیصلہ کرتا ہے تبلیغ کے لئے جائے، لیکن جب اپنے انگیزہ اور نیت پر غور وخوض کرتا ہے تو اسے ناخالص پاتا ہے اور تبلیغ پر جانے سے ہی منصرف ہو جاتا ہے اور اپنے آپ سے کہتا ہے: چونکہ میری نیت خالص نہیں ہے۔ اس لئے تبلیغ پر نہیں جاؤں گا۔ یہ کام بالکل وہی ہے جو شیطان چاہتا ہے۔ کیونکہ انسان کا فرض یہ ہے کہ تبلیغ پر جائے اور لوگوں کو ہدایت کرے، اگر ہم نے شیطان کے وسوسہ کی وجہ سے تبلیغ پر جانا چھوڑ دیا، تو شیطان کو ایک مناسب فرصت مل گئی کہ جس میں وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرے۔ اس بنا پر اگر ہم نے دیکھا کہ ہماری نیت خالص نہیں ہے، تو ہمیں فریضہ اور تکلیف کو ترک نہیں کرنا چاہئے بلکہ ہمیں اپنی نیت کو خالص کرنیکی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر ہماری تبلیغی سرگرمیوں کے عوض ہمیں کچھ پیسہ دیئے گئے تو یا ہم اسے نہ لیں یا اس میں سے تھوڑا بہت قبول کرلیں یا اسے ضروری امور میں صرف کرنے کا فیصلہ کریں کہ اگر ہم نے کسی کو اپنے سے محتاج تر پایا، تو اس کی مدد کردیں گے۔ اس قسم کے کام نفسانی خواہشات اور غیر الٰہی محرکات میں کمی واقع ہونے اور عمل کے خالص تر انجام پانے کا سبب بنتے ہیں۔

میرے ایک دوست نے نقل کیا ہے کہ وہ طالب علمی کے دوران اطراف تہران کے ایک شہر میں تبلیغ کے لئے گیا۔ وہاں ایک محترم عالم دین تھے کہ لوگ جنھیں اچھی طرح پہچانتے تھے اور وہ لوگوں میں کافی اثر رسوخ رکھتے تھے۔ مجھے اس شہر کے اطراف میں واقع ایک گاؤں میں بھیج دیا گیا۔ چونکہ میں تبلیغی کام میں تجربہ نہیں رکھتا تھا اور پہلی مرتبہ تبلیغ پر گیا تھا، اس لئے عشرہ کے دوران میری مجلسوں کو لوگوں نے پسند نہیں کیا اور کوئی خاص آؤ بھگت بھی نہیں کی، آخر میں ایک مختصر نذرانہ مجھے دیا گیا۔ تبلیغ کے اختتام پر میں اور دوسرے مبلغین اس عالم دین سے رخصت ہونے کے لئے ان کے پاس گئے۔ اس عالم دین نے انتہائی فروتنی اور تواضع سے ہماری مہمان نوازی کی، گفتگو ختم ہونے پر مذاق میں ہم سے کہا: دوستو! آؤ ہم اپنی آنکھوں کو بند کرکے جو کچھ اس عشرہ میں بطور زندہ ہمیں ملا ہے اسے ایک جگہ جمع کریں اور اس کے بعد اسے آپس میں مساوی صورت میں تقسیم کریں! معلوم تھا کہ وہ عالم دین ایک مشہور ومعروف شخصیت تھے اور ان کی مجلسیں بھی موثر تھیں اور پیسے بھی انھیں کافی ملے تھے۔ وہ چونکہ جانتے تھے کہ ہمیں کوئی خاص پیسے نہیں ملے ہیں، اور وہ اس طرح ہماری مدد نہیں کرنا چاہتے تھے کہ جس سے ہماری شخصیت مجروح ہو، اس لئے مذاق میں ہم سے اس قسم کا تقاضا کیا۔ ہم بھی تہہ دل سے خوش ہوئے، چونکہ انہوں نے مذاق میں ہم سے وہ

درخواست کی تھی اس لئے ہمیں برا بھی نہیں لگا۔ خلاصہ یہ کہ ہم نے اپنی آنکھیں بند کر کے پیسوں کو ایک جگہ جمع کیا، جب پیسے افراد کے درمیان تقسیم ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ ہم میں سے ہر ایک کو اپنی رقم کے کئی گنا پیسے ملے تھے! جی ہاں، ایسے افراد گزرے ہیں اور موجود بھی ہیں جن میں مادی محرکات ضعیف ہیں یا اس قسم کے کام سے ان محرکات کو ضعیف کرنا چاہتے ہیں۔

آخر کار انسان اپنی زندگی میں مشکلات اور ضرورتوں کا سامنا کرتا ہے، خاص کر گرانی اور مہنگائی ، مادی رجحانات کو ہوا دیتے ہیں، اب ان محرکات اور رجحانات میں قدرے کمی واقع ہونے کے لئے مناسب ہے کہ ہم نذر کریں اور ارادہ کریں کہ جو کچھ ہمیں بطور نذرانہ ملے گا اس میں ایک حصہ اہم ایسے لوگوں کے حوالہ کریں گے جو ہم سے زیادہ محتاج ہیں، کیونکہ جس طرح ہم سے زیادہ مالدار بہت ہیں اسی طرح ہم سے زیادہ فقیر بھی بہت ہیں جو ہم سے زیادہ محتاج ہیں۔ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ جو کچھ ہمیں ملے اس میں سے کچھ حصہ اپنے سے محتاج تر لوگوں کو پہنچا دیں۔ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ جو چیز اپنے لئے پسند کرتے ہیں وہی دوسروں کے لئے بھی پسند کریں، اس طرح دنیا سے ہماری وابستگی بھی کم ہوگی اور نیکی کاروں کی صفت بھی ہم میں پیدا ہوگی۔

﴿لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون...﴾ (آل عمران/۹۲)

''تم نیکی کی منزل تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے جب تک اپنی محبوب چیزوں میں سے راہ خدا میں انفاق نہ کرو۔''

جب انفاق کرنا چاہتے ہو تو نئے نوٹ دینے کی کوشش کرو نہ فرسودہ اور پھٹے پرانے نوٹ، کہ یہ امر بھی تمہارے معنوی درجات میں اضافہ کرتا ہے اور تمہاری دنیا سے وابستگی کو بھی کم کرتا ہے اور سبب بنتا ہے کہ تمہارے اعمال اس کے بعد خالص تر بن جائیں لہذا جیسے عرض کر چکا ہوں، طے کر لیں کہ جو کچھ ہمیں ملا ہے اس کا ایک حصہ دوسروں کو دیدیں، کیا بہتر ہوتا اگر ہمیں ان پیسوں کی زیادہ ضرورت نہ ہونے کی صورت میں، اپنے اطراف میں موجود کسی مقروض شخص کو دیدیں، جس کے گھر میں روز انہ طلب گار (قرض دینے والا) آکر اپنے پیسہ کا تقاضا کرتا ہے اور وہ پیسے نہ ہونے کی وجہ سے شرمندگی سے دوچار ہوتا ہے ایسا کیوں نہ کریں کہ سارا پیسہ اسے دیدیں تا کہ وہ اپنا قرضہ چکا دے ہم تو قرضدار نہیں ہیں، کیا حرج ہے فرض کریں ہم تبلیغی سفر پر نہیں گئے۔ فرض کریں خدا نہ کرے ہمارے گھر میں ہمارا کوئی عزیز بیمار ہو اور اس کی بیمارداری کی وجہ سے تبلیغ پر جانا ہمارے نصیب میں نہ ہو۔ اگر کوئی مقروض مسلسل اپنے قرض کو ادا کرنے میں

تاخیر کرتا ہے اور اس کی آبرو خطرے میں پڑی ہے اور وہ جانتا ہے کہ اگر تبلیغ پر نہیں گیا تو اپنا قرض ادا نہیں کرسکتا ہے، تو اسے تبلیغ پر جانے سے نہیں روکنا چاہئے۔ بہر حال قرض ادا کرنا ایک واجب تکلیف ہے، کیا حرج ہے تبلیغ پر جائے اور اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے بدلے میں محترمانہ اور شان روحانیت کی رعایت کرتے ہوئے نیز کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے روحانیت کی بدنامی ہو، اگر اسے کوئی نذرانہ دیا گیا تو وہ اسے قبول کرلے اگر اسکی نیت یہ ہو کہ تبلیغ پر جائے اگر اسے کوئی نذرانہ دیا گیا تو اس سے اپنا قرض ادا کرے گا تو اس نے کوئی خلاف شرع کام انجام نہیں دیا ہے، اگر چہ نفس کو جس کمال تک پہنچنا چاہئے تھا نہیں پہنچتا ہے۔ لیکن اس کام میں بھی اخلاص کا قصد کیا جاسکتا ہے، کیونکہ قرض ادا کرنا واجب ہے اور اگر اس کی نیت یہ ہو کہ چونکہ خدائے متعال نے واجب کیا ہے کہ قرض کو ادا کیا جائے میں راہ خدا کی تبلیغ پر جاتا ہوں تا کہ کچھ پیسے حاصل کروں اور اس سے قرض ادا کروں، اس طرح اس کا عمل عبادت ہو جائیگا۔

بہر صورت ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ دینوی تمایلات کو کم کریں اور مال دنیا کی نسبت بے اعتنائی دکھائیں اور دیکھ لیں کہ ہمارے مولا و مقتدا حضرت علی علیہ السلام ہیں کہ جن کی نظر میں دنیا کی رعنائیاں کس قدر پست و حقیر تھیں فرماتے ہیں:

(دیکھو اس ذات کی قسم کہ جس نے دانے کو شگافتہ کیا اور ذی روح چیزیں پیدا کیں۔ اگر بیعت کرنے والوں کی موجودگی اور مدد کرنیوالوں کے وجود سے مجھ پر حجت تمام نہ ہوگئی ہوتی اور وہ عہد نہ ہوتا جو اللہ نے علما سے لے رکھا ہے کہ وہ ظالموں کی شکم پری اور مظلوم کی گرسنگی پر سکون و قرار سے نہ بیٹھیں، تو میں خلافت کے اونٹ کی باگ ڈور اسی کی پشت پر ڈال دیتا اور اس کے آخر کو اسی پیالے سے سیراب کرتا جس پیالے سے اس کے اول کو سیراب کیا تھا۔)

اس کے بعد آپؑ نے فرمایا:

"ولألفيتم دنيا كم هذه ازهد عندى من عفطة عنز" [1]

''اور تم اپنی دنیا کو میری نظروں میں بکری کی چھینک سے بھی زیادہ ناقابل اعتنا پاتے۔''

دوسری جگہ پر فرمایا ہے:

"والله لدنياكم هذه اهون فى عينى من عراق خنزير مجزوم" [2]

۱۔ نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خطبہ ۳، ص ۵۲

۲۔ نہج البلاغہ حکمت ۲۲۸، ص ۱۱۹۲

''خدا کی قسم: یہ تمہاری دنیا میری نظروں میں سور کی اس بے گوشت ہڈی سے بدتر ہے جو کسی مجزوم و مبروص کے ہاتھ میں ہو''

جزام و برص میں مبتلا شخص کی صورت اس قدر بری اور گھناونی ہوتی ہے کہ کوئی اسکے نزدیک جانا پسند نہیں کرتا ہے، خاص کر اس وقت جب بیماری کے سرایت کرنے کا خوف ہو۔ اب اگر اس جزام و برص کے مریض کہ جس کو انسان دیکھنا بھی برداشت نہیں کرتا چہ جائے کہ اس کے ہاتھ میں سور کی ہڈی ہو، کون چاہے گا کہ اس ہڈی کو اس کے ہاتھ سے لے! دنیا، اس کی رعنائیاں، لباس، گاڑی، گھر، فرش اور دوسرے دنیوی امکانات و وسائل حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں جزامی کے ہاتھ میں سور کی ہڈی سے بدتر ہے!

ایک دوسری جگہ پر فرماتے ہیں:

''فلتکن الدنیا فی اعینکم اصغر من مثاله القرظ وقراضة اللحم واتعظوا بمن کان قبلکم قبل ان یتعظ بکم من بعدکم وارفظوها ذمیمة فانما قد رفضت من کان اشغف بها منکم'' [1]

''پس تمہاری نظر میں دنیا درخت سلم کے پتے کے کوڑے سے پست تر ہونی چاہئے (سلم بیابان میں اگنے والا ایک درخت ہے اس کے بدبودار پتے دباغت میں استعمال کئے جاتے ہیں) اور کپڑے کو کاٹتے وقت قینچی سے گرے ہوئے کپڑوں کے ٹکڑوں سے زیادہ چھوٹی ہونی چاہئے۔ اپنے اسلاف کے حالات سے سبق حاصل کرو، اس سے پہلے کہ آنے والی نسل تم لوگوں سے سبق حاصل کرے۔ دنیا کو چھوڑ دو یہ قابل مذمت اور ناپسندیدہ ہے، کیونکہ اس دنیا نے ان لوگوں کے ساتھ وفا نہیں کی ہے جو تم لوگوں سے پہلے اس سے محبت کرتے تھے''

البتہ فرائض کو انجام دینے کے لئے اور جس حد میں خدائے متعال راضی ہے اور تمام شرعی حدود کی رعایت کرتے ہوئے انسان کے لئے مباح مال کو حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ورنہ یہ انتہائی بے غیرتی ہے کہ انسان حیلہ، فریب کاری، لوگوں کی چاپلوسی، اور دوسروں کی بے احترامی اور اسلام و روحانیت کو

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ ۳۲، ص ۱۰۸/

خطرے میں ڈال کر مال دنیا حاصل کرنے یا اس میں اضافہ کرنے کی کوشش کرے۔کیا خوب ہے کہ امیر المؤمنین علیہ السلام کے ان بیانات کو اپنا سرمشق اور نصب العین قرار دیں تا کہ دنیا کے لالچی نہ بنیں، کیونکہ اگر اس پست وحقیر دنیا کی محبت ہمارے دلوں میں جگہ پا گئی ،تو تقوی اور خدا کی محبت ہم سے دور ہو جائے گی۔جس دل میں دنیا کی محبت جگہ بنالے وہ حضرت علی ں کی نظر میں ایک جزامی کے ہاتھ میں سور کی ہڈی سے پست تر ہے اس دل میں خدا علی علیہ السلام اور حسینؑ کی محبت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ہمیں دل کی صفائی کرنی چاہئے اور آلودگیوں اور کدورتوں سے پاک کرنا چاہئے تا کہ اس میں خدائے متعال اور امام حسین علیہ السلام کی محبت جگہ بنالے،اور اگر دین خدا،الہی اقدار اور اسلامی اخلاق کی بات آئے تو دل کو اس کی ہمراہی کرنا چاہئے تا کہ دوسروں پر شائستہ اثر پڑے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ الطیبین الطاہرین

ولعنۃ اللہ علی اعدائہم اجمعین



www.ahl-ul-bayt.org

ISBN 964-529-149-6

9 789645 291493